خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ ۹۹ء

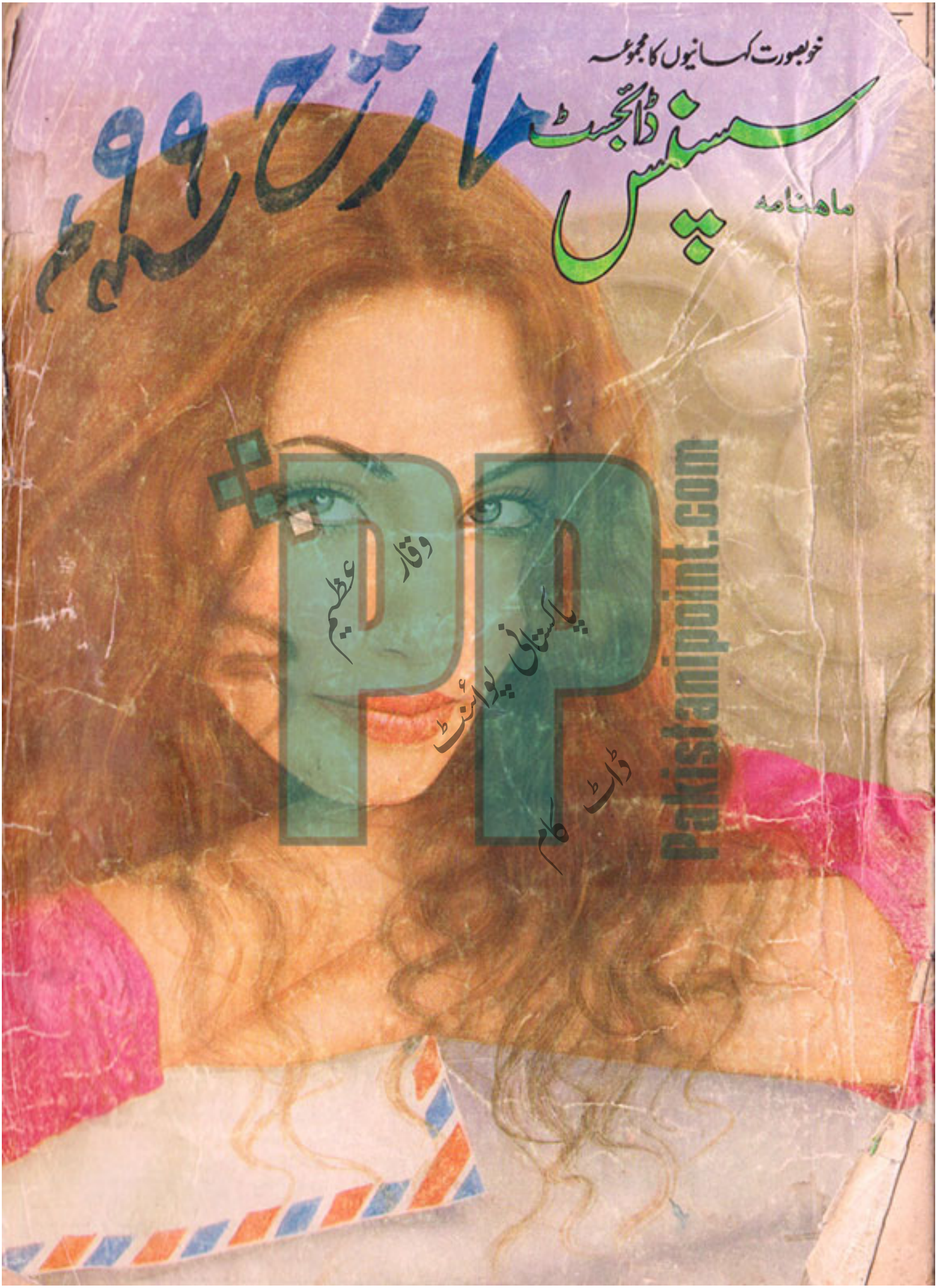

PP
Pakistanipoint.com
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ: معراج رسول

معاون: شکیل عدنان

انشائیہ — 11 — جون ایلیا

آپ کے خط — 12 — مدیر اعلیٰ

دیوتا — 76 — فرہاد علی تیمور

سوزِ دروں — 18 — الیاس سیتاپوری

غم اور خوشی — 121 — مقارب اشرف محمد ارشد پھلی

صِلہ — 73 — ابنِ منذر بچہ مودی

گم شُدہ — 124 — ڈاکٹر مساجد مجید

زر پرست — 142 — مرزا مجید بیگ

موم بتیوں کی چوری — 221 — طاہر پرویز

محفلِ شعر و سخن — 173 — قارئین

ذاتی گھر — 235 — مجود احمد مودی

موت کے سوداگر — 176 — اقلیم علیم

ننانوے سال پہلے — 248 — ضیا تسنیم بگوئی

وابستگی — 139 — کامل ظہیر

پبلشر: ماہ مبین ایم اے ○ پرنٹر: جمیل حسن ○ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم، کراچی ○ پتہ (مطبوعات جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز، مقامِ اشاعت: سعید ہیلتھ، ہیلمیوریا اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی

جلد: 18 ○ شمارہ: 3 ○ مارچ 1999 ○ قیمت فی پرچہ: 30 روپے ○ زرِ سالانہ: 360 روپے ○ قیمت سعودی عرب: 12 ریال

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر: 215 کراچی 74200 ○ FAX:(9221-263 7060) فون سرکولیشن 211328 E-mail address: jasoosi @ ibm.net

PP پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وقار عظیم

PakistaniPoint.com

اولیائے کرام کی سوانح نگار ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ

عظمت کے مینار

قیمت ۱۵۰/- روپے

اولیائے کرام جو مینارۂ رُشد ہدایت تھے
ضیاء تسنیم بلگرامی نے انہیں اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے۔

اسلام کے خاموش مبلغوں کے پُر اثر واقعات

کہانیوں سے زیادہ دلچسپ، داستانوں سے زیادہ اثر انگیز۔

اُن دنوں جب ہر طرف حرص و طمع، عیش کوشی، خود غرضی اور نفسا نفسی کا دَور دَورہ تھا۔ انسان دُنیاداری، جاہ طلبی اور جاہ پرستی میں مبتلا تھا۔ روشنی کے ان میناروں نے انسانیت کو نجاتِ ابدی کی راہ دکھائی۔ دُکھی انسانوں کی راہ نمائی کی اور اُن کے کام آئے۔

عظمتوں کے ان میناروں کے کارنامے

اُن کی منوّر زندگی آج بھی ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ وہ ہم میں موجود نہیں لیکن اپنے کام میں موجود ..... ہمیں بتا رہے ہیں کہ دُنیا سائے کی طرح ہے، اس کے پیچھے بھاگو گے تو یہ آگے ہی آگے رہے گی۔ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا لیکن اگر اس سے بھاگو گے تو یہ تمہارے پیچھے دوڑے گی۔ ایک ایسی چیز، جو سائے کی طرح ہو، اس کے پیچھے بھاگنے سے کیا حاصل؟

مصنفہ کی ایک اور کتاب "روشنی کے مینار" بھی دستیاب ہے

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ سعید منشن، بلیو یا اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی ۱

انشائیہ

حاکم تو تم ہو

جون ایلیا

میں نے زندگی کے بارے میں بہت سوچا اور ہر خواستہ اور نخستہ زندگی سوچنے ہی میں گزرتی ہے اور گزاری جاتی ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ پر یہ ایک ایسی بات ہے جسے دفتردار اور افسر شاہی کے یونے سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جانا جائے کہ پہلے سوچنا ہے اور پھر کرنا ہے یا یوں کہہ لو کہ عمل خیال کا معمول ہے اور خیال اس کا عامل۔ اماں ایک نکتہ سنو جو اسی پل ذہن میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خیال ہی عمل کا آفریدگار ہے۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں نے زندگی میں بہت سوچا، بہت سوچا اور بس سوچا۔ مگر میں نے اپنے بارے میں کم اور اپنے لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچا۔ میرا گمان ہو، شاید ہے یوں کہ اپنے بارے میں کم اور اپنے لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچنے والے ایک اول جلول، فضول اور یک سر ایک استخوانی کالبد ہی کا نام جون ایلیا ہے۔ جون ایلیا ہونا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے یعنی جون ایلیا ہونا بس ایک ہنسی ٹھٹھا ہے اور کچھ نہیں۔

بات یہ ہے کہ قاعدے، قرینے اور منصوبہ بندی کے ساتھ چیخے سود و زیاں کی دکانوں اور دفتروں میں کارگزاریاں یعنی کارستانیاں دکھانے اور اپنی ذات کی ساری پونجی چٹ کھانے والے انسانوں، نیم انسانوں اور لاانسانوں کے انبوہ میں جون ایلیا ایک بے تکا ہنسی ٹھٹھا نہیں تو کیا ہے؟

میں کہہ رہا تھا کہ میں نے بہت سوچا مگر اپنے بارے میں کم اور اپنے لوگوں کے بارے میں زیادہ۔ لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ میرے لوگ کون ہیں، کون ہیں میرے لوگ؟ تمہارے خیال میں میرے لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ تمہیں میرے اس سوال کا جواب میری اس بات سے مل جائے گا کہ وہ لوگ ہرگز میرے لوگ نہیں ہو سکتے جو زندگی کے شاداب شجر کے پھل کھاتے اور ان کا رس چوستے ہیں جو اس کی شاخوں میں جھولتے ہیں، جن کے عیش اور عیاشی کی گزران کے روز و شب اس کے سائے میں پھلتے اور پھولتے ہیں جو برلذت کی غذا ہضم کرتے چلے جا رہے ہیں، جن کے معدے انسان کے بدن کی ذلت اور جن کے مثانے اہل کی رذیلت ہیں، جن سے انسانیت اور انسانی شرافت اور نفاست کے خیال اور خواب تک ہیں۔ جو رات ہوئے تک ان کی ساری لذت نچوڑ لیتے ہیں، جو دن ہوئے تک اپنی رات بھر کی ساری حرام کوشی اور حرام کاری کے پھل توڑ لیتے ہیں۔

میں جو ہوں یعنی میں یعنی کوئی نہیں۔ میرے لوگ تو وہ ہیں جن کے دن کا پہلا پہر نیم دلی سے آغاز کر ہوتا ہے۔ دوسرا پہر بے دلی میں بسر ہوتا ہے۔ تیسرے پہر کا سارا حساب کتاب شکستہ دلی کے سر ہوتا ہے اور چوتھا پہر نیم جانی کا تمام تر ہوتا ہے۔

میں قلم کا آدمی ہوں سو رقم کرتا ہوں مگر رقم کا آدمی نہیں ہوں۔ جس کے انگوٹھے اور اس کے برابر کی دو انگلیوں کے بیچ قلم ہو اور جنبش میں ہو اس پر سارے انسانوں کا برابر کا حق ہوتا ہے۔ جو قلم صرف کسی ایک گروہ، ایک نسل اور ایک ملت کے حق میں سفید صفحے سیاہ کرتا ہو، اس کے اہل کو چاہیے کہ وہ اسے توڑ دے۔

میں قلم فرسائی کر رہا ہوں مگر مجھ پر ایک اداسی طاری ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے لوگوں، ساری دنیا کے مظلوم لوگوں کے ایک گروہ یعنی پاکستان کے لوگ ایک زمانے سے بری طرح بے آرام اور بدانجام چلے آ رہے ہیں۔ مگر اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اذیت میں ہیں۔ وہ سخت بیزار ہیں، ان کے دن اور رات کے لمحے بے نہایت دشوار ہیں۔ وہ دل شکستہ اور دل برداشتہ ہیں۔ ان کی نگاہیں ہر آنے والی صبح کی رخشندگی اور درخشانی سے بے رشتہ ہیں۔ وہ لوگ، میرے لوگ سوختہ اور بے طرح برافروختہ ہیں۔

میرے خواہش کے لحاظ سے انہیں اور بھی برافروختہ ہونا چاہیے مگر ان کا وجود شل ہو چکا ہے۔ وہ چاہے دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے، ان کے بازو ان کی پشت سے بندھے ہوئے ہیں اور انہیں اپنی یہ ہیئت ذرا بھی اولو الو نہیں لگتی۔ گویا وہ پیدا ہی اس ہیئت میں ہوئے تھے۔ انہیں پچاس برس سے یہ جانے اور مانے کی عادت پڑ گئی ہے کہ وہ اپنے خادموں کے خادم اور اپنے محکوموں کے محکوم ہیں۔

سنو اور سمجھو کہ تمہارے حکمراں اور سیاست داں، پاکستان کے یہ دونوں پچوڑے ہوئے ٹولے تمہارے محکوم ہیں مگر تم ان کے تلوے چاٹتے ہو۔ تم ان سے اپنے حق کی بات کیوں نہیں کرتے۔ تم بہرے اور گونگے کیوں ہو گئے ہو۔ تم ان کے ٹینٹوے کیوں نہیں چبا لیتے۔

سن لو کہ انہیں کچھ نہیں کرنا اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے وہ تمہیں کرنا ہے۔ انہیں کوئی قوت حاصل نہیں ہے۔ قوت تو صرف تمہیں حاصل ہے۔ وہ بے چارے کیا بیچتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جو کچھ بھی قوت ہے وہ تمہاری بخشی ہوئی ہے۔ سو ان کے ہاتھوں سے بدکار ہاتھوں سے اپنی بخشی ہوئی قوت واپس لے لو۔ حاکم تو تم ہو، وہ تو غلام ہیں۔

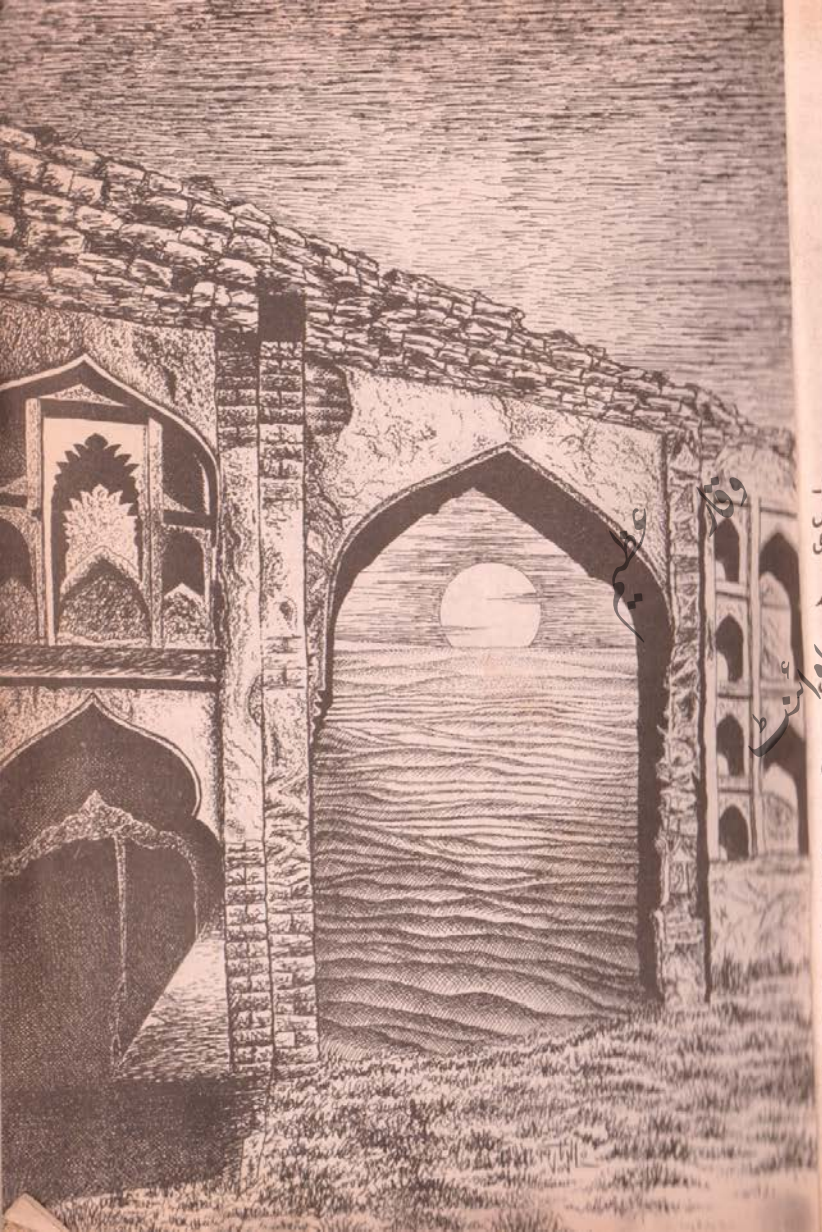

ایک بڑے آدمی کا انجام

الیاس سیتاپوری

سوزِ دروں

شمع حیات جھلملا رہی تھی۔ اُس نے زندگی بھر کی کمائی پر نظر ڈالی تو اس کا حاصل ریگِ رواں کی طرح کچھ سکتا محسوس ہوا۔ اُس نے زندگی بھر جن چیزوں کو جتنی قیمتیں ادا کر کے حاصل کیا تھا، وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ اُس کی اولاد اُس کی طرح ان پر فدا بضد رہنے سے قاصر تھی۔ اُس نے اپنے اسی سوزِ دروں سے جب حاصلِ حیات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ حسرتیں لیے جا رہا ہے۔ یہ حسرتیں اُس کی اولاد سے تعلق رکھتی تھیں کہ اے کاش اس کی اولاد بھی اس کی طرح کامیاب و کامران زندگی گزار سکتی لیکن اس کے حاصل کی عمارت کی بنیاد میں خرابی چھپی ہوئی تھی۔

سعد نے ایک بڑے ریشمی رومال میں بندھے ہوئے المنصور کے بیٹے عبداللہ کا سر المنصور کی خدمت میں پیش کرنا چاہا تو اس کے کئی ساتھیوں نے منع کیا کہ وہ سر پیش کرنے سے پہلے المنصور کو یہ خبر پہنچائے کہ عبداللہ کو قتیل حکم میں قتل کر دیا گیا اور پھر یہ دیکھے کہ اس بری خبر کا المنصور پر کیا اثر ہوا۔

سعد نے المنصور کے خیمے کے برابر جہاں اس کا عملہ بیٹھتا تھا، عبداللہ کے سر والا ریشمی رومال رکھ دیا اور المنصور کی خدمت میں حاضری دی۔

المنصور نے اس کو خالی ہاتھ دیکھ کر بے چینی سے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟ تو خالی ہاتھ کیوں آیا؟"

سعد نے جواب دیا۔ "میں نے تو عبداللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا اور میں اس کی جتنی عزت کر سکتا تھا اس میں کمی نہیں کی اور پھر جیسے ہی عبداللہ کو لانے والی قشالہ کی فوج واپس گئی، میں اپنے فوجی دستے کے عقب میں چلا گیا اور آپ کے فرمان پر کسی اور نے عمل کیا ہے۔"

المنصور نہایت اضطراب کے عالم میں یہ روداد سنتا رہا۔ جیسے ہی سعد چپ ہوا، المنصور نے کہا۔ "ایک تو تم لوگ بات کو طول بہت دیتے ہو۔ میں نے تجھ سے تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ میری امانت کہاں ہے۔ میں تو صرف وہ شے دیکھنا چاہتا ہوں جسے دیکھ کر یہ یقین ہو جائے کہ فرمان کی تعمیل کر دی گئی۔"

سعد نے متصل خیمے میں جا کر رومال والی پوٹلی اٹھائی اور واپس جا کر المنصور کے حوالے کر دی۔

رومال کا رنگ سرخ تھا اس لئے کٹی ہوئی گردن سے بہتے ہوئے خون کے دھبے اس کے سرخ رنگ میں چھپ گئے تھے۔ المنصور نے حکم دیا۔ "اسے کھول۔"

سعد نے رومال کھول کر سر نکالا اور ایک تپائی پر رکھ دیا۔ المنصور نے خنجر کی نوک سے اس کا ذرا سا منہ کھولا اور کہا۔ "اس نے میرے خلاف کتنا زہر اگلا ہوگا اور میرے خلاف کتنی باتیں کی ہوں گی۔"

سعد المنصور کی سخت دلی پر حیران ہو رہا تھا۔ المنصور نے سعد سے پوچھا۔ "یہ میرا کون تھا؟"

سعد نے جواب دیا۔ "ایک باغی، آپ کا دشمن۔"

المنصور نے کہا۔ "بے شک یہ باغی بھی تھا اور میرا دشمن بھی۔ اس نے میری زندگی حرام کر رکھی تھی۔"

پھر المنصور نے پوچھا۔ "اس کا دھڑ کہاں ہے؟"

سعد نے جواب دیا۔ "دریائے [illegible] کے دوسرے کنارے پر، جہاں اسے قتل کیا گیا تھا۔"

المنصور نے کہا۔ "اسے بھی وہیں پھینکوا دیا جائے۔"

سعد نے سر کو دوبارہ رومال میں باندھا۔ اتنے میں المنصور نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور کہا۔ "فوج میں اس کا حامی منذر موجود ہوگا۔ یہ سر اس کے حوالے کر دیا جائے۔"

فوج میں منذر کو تلاش کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ قرطبہ واپس چلا گیا۔

اس وقت تو المنصور نے منذر کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن سعد نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب منذر کی بھی خیر نہیں ہے۔

فوج کو قشالہ کے سامنے رہتے ہوئے خاصا وقت گزر گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ المنصور نے قشالہ کے حکمران غرسیہ کے خلاف اس کے بیٹے شانجہ کو کھڑا کیا اور غرسیہ سے اپنے بیٹے عبداللہ کو واپس لے کر اسے قتل بھی کروا دیا ہے تو اب قرطبہ کی فوج کو یہاں

مزید نہیں رکنا چاہیے۔

لیکن المنصور کے ارادوں کا کسی کو علم نہیں تھا۔

کئی دن بعد قشتالہ سے ایک وفد آیا۔ اسے غرسیہ کے بیٹے شانجہ نے بھیجا تھا اور وہ شانجہ کی طرف سے المنصور کو یہ بتانے آیا تھا کہ اس نے باپ کے خلاف بغاوت کردی ہے۔ اس لئے قشتالہ کے اختیاراتِ کلی شانجہ کو منتقل ہونے والے ہیں۔ اب شانجہ قرطبہ کی خلافتِ بنو امیہ کے زیرِ سایہ رہنا چاہتا ہے اس لئے اس زیرِ سایہ رہنے کی شرائط سے اسے آگاہ کیا جائے۔

المنصور نے جواب میں کہلوایا۔ "میں نے تیرے زریعے بیٹے عبداللہ کو پالیا۔ اب تو اس شخص کو میرے حوالے کردے جس نے عبداللہ کو میری مرضی کے خلاف پناہ دی تھی۔ یعنی اپنے باپ غرسیہ کو۔ اس کے علاوہ اب تو قرطبہ کو مستقلاً خراج ادا کرتا رہے گا۔"

اب جو فوجیوں کو اس نئی گفتگو کا علم ہوا تو انہیں یقین ہوگیا کہ شانجہ خراج دے سکتا ہے مگر اپنے باپ کو نہیں دے سکتا اور اس طرح اب قشتالہ کے نئے بادشاہ سے محاذ آرائی شروع ہوجائے گی۔ یہ محاذ آرائی پتا نہیں مسلم افواج کو یہاں کتنا عرصہ مزید رہنے پر مجبور کرے جب کہ لوگ اپنے گھروں کو جانے کے لئے بے چین ہورہے تھے۔

فوج میں نامی گرامی شاعر صاعد بھی موجود تھا۔ یہ شوخ و شریر اور چالاک شاعر المنصور سے وہ باتیں کہہ گزرتا تھا جنہیں کہنے کی دوسرے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب شاعر سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ المنصور سے واپسی کی بات کرے تو صاعد حقیقتِ احوال سے واقف ہونے کی وجہ سے چپ ہوگیا۔ لوگوں کے زیادہ مجبور کرنے پر اس نے پوچھا۔ "کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ المنصور غرسیہ کو حاصل کئے بغیر واپس نہیں جائے گا؟"

لوگوں نے کہا۔ "یہ تو درست ہے کہ المنصور غرسیہ کو حاصل کئے بغیر نہیں جائے گا مگر تیری جو خدمت حاصل کی گئی ہے وہ اسی لئے کہ تو اس مسئلے کو حل کرسکتا ہے۔"

صاعد ہنسنے لگا اور کہا۔ "بہتر ہے صاحبان! اب میں غرسیہ کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ کہیں نہ کہیں وہ مجھے مل ہی جائے گا اور جو کام غرسیہ کا بیٹا شانجہ نہیں کرسکا وہ میں کر دکھاؤں گا۔"

اسی دوران میں المنصور نے شانجہ کو پیغام بھیجا۔ "میں تیرے باپ غرسیہ کا منتظر ہوں۔ اسے میرے پاس بھیج دے۔"

شانجہ کو معلوم تھا کہ اگر غرسیہ کو المنصور کے حوالے کردیا گیا تو اس کے باپ کے واپس آنے یا زندہ رہنے کا امکان ہی ختم ہوجائے گا۔ شانجہ نے المنصور کو راضی رکھنے اور غافل کردینے کی دوسری تدبیر سوچی۔ چند خوبصورت لڑکیوں کا انتظام کیا۔ یہ لڑکیاں خوبصورت ہونے کے علاوہ عربی زبان سے بھی واقف تھیں اور ان میں ایک شاعرہ بھی تھی۔ شانجہ کو معلوم تھا کہ المنصور شاعروں اور ادیبوں کی بڑی عزت کرتا ہے۔

المنصور نے اپنے انتہائی معتمد مشیر ابو مغیرہ بن حزم کو شانجہ کے پاس بھیجا اور کہا۔ "شانجہ سے کہنا کہ میں حیل و حجت اور بے جا طوالت کو پسند نہیں کرتا۔ اپنے باپ غرسیہ کو فوراً میرے حوالے کردے۔"

ابو مغیرہ بن حزم نے شانجہ کو جب یہ پیغام دیا تو اسے یہ بھی بتا دیا کہ اگر غرسیہ کو المنصور کے حوالے نہ کیا گیا تو قشتالہ کو مسلمان اپنی تحویل میں لے لیں گے اور غرسیہ کو خودہی تلاش کرلیں گے۔

شانجہ کے لئے یہ دھمکی کافی تھی۔ اس نے بتایا۔ "یقیناً... تم لوگ اس حقیقت سے تو واقف ہو گے کہ یہ مقام قشتالہ کیوں کہلاتا ہے۔ اس کو دوسرے مغربی ملک کیسل کہتے ہیں۔ یہ کیسل یہاں قشتالہ ہوگیا۔ یہاں ہر شہر اور قصبے میں یہ کیسل نظر آئیں گے۔ میرے باپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ تمہارے آقا المنصور کو میرے باپ غرسیہ کی ضرورت ہے تو وہ علاقے کے کسی مضبوط قلعے میں منتقل ہوگئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس قلعے میں روپوش ہیں۔ میں انہیں تلاش ضرور کررہا ہوں۔ وہ جیسے ہی مل جائیں گے انہیں المنصور کی خدمت میں روانہ کردیا جائے گا۔"

ابو مغیرہ بذاتِ خود بڑا حسین تھا۔ شانجہ نے اس کے حسن سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر سوچی۔ چار کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کنیزیں تحفے کے طور پر لے جائیں۔ یہ تینوں کنیزیں المنصور کی خدمت میں پیش کرنا اور کہہ دینا کہ میں اپنے باپ غرسیہ کو تلاش کروا رہا ہوں۔ وہ جیسے ہی ملیں گے انہیں قرطبہ روانہ کردیا جائے گا۔"

ابو مغیرہ نے چاروں کنیزوں کو دیکھا۔ جو کنیز ابو مغیرہ کو پیش کی گئی تھی اس نے ابو مغیرہ کو دیکھا اور ابو مغیرہ نے اس کو پھر دونوں ایک دوسرے کے گھائل ہوگئے۔

ابو مغیرہ نے شانجہ سے پوچھا۔ "میں اسے کس طرح قبول کرسکتا ہوں کیونکہ مجھے ذاتی طور پر کسی کنیز کو تحفے قبول کرنے کا حق نہیں؟"

شانجہ نے جواب دیا۔ "میرے پاس تیری اس تشویش اور کمزوری کا کوئی علاج نہیں ہے کہ تو کسی کا تحفہ قبول کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔ میں نے یہ حسینہ تجھ کو دے دی ہے ورنہ تینوں کے ساتھ اسے بھی المنصور کے حوالے کردے۔"

وہ ان چاروں کنیزوں کو لے کر اپنے لشکر میں واپس آیا اور غرسیہ کے سلسلے میں شانجہ نے جو جواب دیا تھا وہ المنصور کے گوش گزار کردیا پھر چاروں کنیزوں کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! یہ شانجہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں۔"

المنصور نے چاروں کنیزوں کو دیکھا اور وہی کنیز اسے سب سے زیادہ پسند آئی جو ابو مغیرہ کو دی گئی تھی اور دونوں میں محبت کا تعلق پیدا ہوگیا تھا۔

ابو مغیرہ نے اس کر کہا۔ "تو شانجہ نے یہ کام بھی شروع کردیا ہے۔"

ابو مغیرہ نے شانجہ کی وکالت کی۔ "جناب! شانجہ تو آپ سے وفاداری کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت ملول اور غمزدہ کھائی دیتا ہے۔"

المنصور نے چاروں کنیزوں سے پوچھا۔ "تم میں کوئی شاعرہ بھی ہے؟"

ابو مغیرہ کی محبوبہ نے جواب دیا۔ "میں شاعری کرتی ہوں۔"

المنصور نے ابو مغیرہ سے کہا۔ "تو شانجہ کو میرا پیغام بھجوادے کہ مجھے اس کے چاروں تحفے پسند آئے مگر جب تک غرسیہ نہیں مل جاتے گا میں یہیں ٹھہرا رہوں گا۔"

ابو مغیرہ نے کہا۔ "جناب! غرسیہ مشکل سے ملے گا اس لئے اب ہمیں قرطبہ پہنچ کے غرسیہ کا انتظار کرنا چاہیے۔"

المنصور نے کہا۔ "مجھے قرطبہ بہت یاد آرہا ہے مگر مجھے قرطبہ سے زیادہ غرسیہ یاد آرہا ہے۔ جب تک غرسیہ مل نہیں جاتا مجھے شانجہ کی تینوں کنیزوں سے دل بہلانا پڑے گا۔"

اس وقت المنصور نے جشن کا اہتمام کیا۔ بڑے بڑے سرداروں کو دعوت دی گئی اور شانجہ کو بھی پیغام بھیجا گیا کہ وہ بھی اس جشن میں شریک ہو۔

شانجہ نے المنصور کو راضی رکھنے کے لئے اس کی دعوت قبول کرلی اور کہلوا دیا کہ وہ اس جشن میں ضرور شریک ہوگا۔

ابو مغیرہ کی کنیز کڑھ رہی تھی کہ ابو مغیرہ نے اس کو المنصور کے حوالے کردیا تھا حالانکہ یہ کنیز ابو مغیرہ کو دی گئی تھی۔

اس جشن کا اہتمام ابو مغیرہ کے سپرد کیا گیا اسی لئے چاروں کنیزیں بھی اسی کی نگرانی میں رہیں۔

اس کنیز کا نام زبیدہ تھا اور یہ مسلسل گنگنائے جارہی تھی۔ ابو مغیرہ خود بھی شاعر تھا اور اس کی اسی شاعری نے ابو مغیرہ کو المنصور سے قریب کردیا تھا۔ ابو مغیرہ نے زبیدہ سے کہا۔ "تو شاعرہ ہے۔ تو بہت جلد المنصور کے دل و دماغ پر مسلط ہوجائے گی۔"

زبیدہ نے کراہت سے کہا۔ "مجھے المنصور کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے مجھ پر ظلم کیا کہ مجھے المنصور کے حوالے کردیا۔"

ابو مغیرہ نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔ "میں نے جو کچھ کیا مجبوری اور مصلحت اندیشی سے کیا۔ تو المنصور کو نہیں جانتی۔ یہ بہت کینہ پرور اور تنگ نظر انسان ہے۔"

زبیدہ نے کہا۔ "مجھے اس کی کینہ پروری اور تنگ نظری سے کوئی غرض نہیں۔"

ابو مغیرہ نے جواب دیا۔ "تجھے المنصور کی کسی بات سے غرض ہو یا نہ ہو مگر مجھے المنصور کی رفاقت اور مشیری کا منصب حاصل ہے۔ اس لئے میری آزادی جاتی رہی۔ میں عشق کرنے کے معاملے میں بھی آزاد نہیں ہوں۔"

اس روز فضا ابر آلود تھی اور موسم بہت پُرکیف تھا۔ المنصور مذہبی ہونے کے باوجود شراب کا بڑا شوقین تھا۔ رات کو جب شانجہ اس محفلِ موسیقی میں شریک ہونے آیا تو اپنے ساتھ بہترین قسم کی شراب بھی لایا۔

یہاں زبیدہ نے شانجہ سے شکایت کی کہ اسے ابو مغیرہ نے اس کی مرضی جانے بغیر المنصور کے حوالے کردیا۔

شانجہ نے زبیدہ کو مشورہ دیا۔ "اگر ابو مغیرہ نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے تو تو ابو مغیرہ کے ساتھ زیادتی کر۔"

زبیدہ نے دریافت کیا۔ "میں کس طرح زیادتی کرسکتی ہوں؟ میں تو شراب کے پیالے کی طرح مجبور اور بے بس ہوں۔ اگر مجھے میرا مالک دوسرے کی طرف بڑھادے تو میں کیا کرسکتی ہوں۔"

شانجہ نے جواب دیا۔ "تو شاعرہ ہے۔ شاعری میں اپنی وارداتِ قلبی کچھ اس طرح بیان کر کہ المنصور کو تیرے اور ابو مغیرہ کے بارے میں شبہ پیدا ہوجائے۔"

زبیدہ نے کہا۔ "واہ جناب! آپ تو مجھے قتل کروا دینا چاہتے ہیں۔ المنصور تو مجھے فوراً قتل کروادے گا اور میرے ساتھ ابو مغیرہ ناحق مارا جائے گا۔"

شانجہ نے کہا۔ "بات ذرا ہوشیاری اور عقلمندی سے کی جائے تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں عمر رسیدہ المنصور کے جذبات میں ہلچل دیکھنا چاہتا ہوں۔"

زبیدہ نے عبداللہ کے بارے میں سن رکھا تھا کہ اسے المنصور نے بیٹا ہونے کے باوجود قتل کروا دیا ہے۔ زبیدہ کے خیال میں المنصور اب کسی اور کا کیا خیال کرے گا۔

رات کو محفلِ موسیقی میں شراب کا دور چلا تو اس وقت ہلکی ہلکی بارش بھی ہورہی تھی۔ ہر کسی کو اس موسم میں مے نوشی اور موسیقی مزہ دے رہی تھی۔ ابو مغیرہ کو خود پر اختیار نہ رہا۔ وہ کسی بہانے محفل سے اٹھ گیا۔

المنصور زبیدہ کی شاعری، اس کی آواز اور اس کے حسن سے بے حد متاثر ہوا۔ اسے اپنا عہدِ رفتہ یاد آتا رہا۔

ملکہ صبح بھی یاد آئی، منذر کی بہن بھی یاد آئی جس کے دو بیٹے

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیے۔

اس کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے اور مشہور سپہ سالار غالب کی بیٹی اسما بھی اس محفل میں یاد آتی رہی۔ اسما وہ واحد لڑکی تھی جس نے ملکہ صبح سے اس کے تعلقات کشیدہ کروا دیے تھے۔

عبدالرحمن اس کا تیسرا چھوٹا بیٹا اس کی عیسائی بیوی سے پیدا ہوا تھا اور اس عیسائی عورت نے المنصور سے شادی کرنے کے بعد بھی اپنا مذہب نہیں چھوڑا تھا۔ المنصور نے بھی اس کو ترکِ مذہب پر اس لئے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی اس عیسائی بیوی کو بھی بہت چاہتا تھا۔ اب جو زبیدہ اس کے سامنے آئی تو اس نے بھی کنارے لگا دیا۔ المنصور کو اس نے بری طرح مسخر کر لیا تھا۔

جب تک ابو منیہ محفل میں موجود رہا، زبیدہ کی جولانیِ طبع بھی عروج پر رہی مگر ابو منیہ کے جاتے ہی زبیدہ ست پڑ گئی۔

اس فرق کو سب سے پہلے شانجہ نے محسوس کیا اور دل میں بہت خوش ہوا کہ المنصور اور ابو منیہ میں رقابت کی ابتدا ہو چکی ہے۔ زبیدہ سے دونوں کا بلاخیز عشق دونوں میں معرکہ آرائی شروع کروا دے گا۔ بعض اوقات یہ عشق ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس نے المنصور اور ابو منیہ کے دلوں میں عشق کی چنگاریاں پیدا کر دی تھیں جو رفتہ رفتہ انگاروں کی شکل اختیار کر سکتی تھیں۔ یہ انگارے ایک دوسرے کو نقصان ہی پہنچا سکتے تھے۔

شانجہ المنصور اور اس کے قریبی آدمیوں میں انتشار پیدا کروانا چاہتا تھا اور یہ انتشار عشق کے ذریعے پھیلے تو زیادہ کارآمد ہو سکتا تھا۔

اچانک المنصور کو شراب کے سرور کی کیفیت میں ابو منیہ کی کمی محسوس ہوئی تو اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے سعد سے پوچھا۔ "یہ ابو منیہ کہاں چلا گیا؟"

سعد نے بتایا۔ "شاید نغمہ و موسیقی نے اسے پریشان کر رکھا ہے اور یہ موسم اسے راس نہیں آ رہا ہے۔"

المنصور نے سعد سے کہا۔ "اسے بلواؤ اور اس سے کہہ کہ اس کے بغیر محفل بے کیف ہو رہی ہے۔"

سعد باہر چلا گیا تو المنصور نے شانجہ سے پوچھا۔ "سنا ہے تو نے زبیدہ کو بطور تحفہ ابو منیہ کو دیا تھا؟"

شانجہ نے جواب دیا۔ "ہاں مگر ابو منیہ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس نے اپنے طور پر اس کو آپ کے حوالے کر دیا۔"

المنصور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔ پتا نہیں تو نے میرے ہوتے ہوئے ابو منیہ کو اتنی اہمیت کیوں دی؟"

شانجہ نے ابو منیہ کی تعریفیں کیں اور کہا۔ "مجھے آپ کا یہ آدمی بہت اچھا لگا۔"

المنصور نے شانجہ کو تنبیہ کی۔ "اس وقت تک تیرا اقتدار مستحکم نہیں ہو گا جب تک تیرا باپ کسی قلعے میں موجود ہے۔ میں نے تجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ اپنے باپ کو میرے حوالے کر دے مگر تو ایسا نہیں کر سکا۔"

شانجہ نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ غریبہ میرا باپ ہے اور وہی قشتالہ کا بادشاہ ہے۔ اس کی موجودگی میں میرا بادشاہ بن جانا کچھ لوگوں کے لئے تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے مگر سب کے لئے نہیں۔ چنانچہ وہ جس قلعے میں بھی جائے گا اس کو پناہ مل جائے گی۔"

المنصور نے کہا۔ "میری یہ عادت ہے کہ میں جو ارادہ کر لیتا ہوں اسے پورا کر کے رہتا ہوں۔ میں غریبہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جب تک وہ مجھے مل نہیں جاتا، میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔"

محفلِ موسیقی پھیکی پڑ چکی تھی۔ شانجہ اور المنصور کی باتوں نے محفل کو بدمزہ کر دیا تھا۔ جو لوگ نشے میں تھے انہیں بھی المنصور اور شانجہ کی باتیں ناگوار گزر رہی تھیں مگر وہ اس سلسلے میں اف بھی نہیں کر سکتے تھے۔

سعد کچھ دیر بعد واپس آیا اور المنصور کو بتایا۔ "ابو منیہ کا کہیں کوئی پتا نہیں۔"

المنصور نے غصے میں کہا۔ "محفل سے اجازت کے بغیر غائب ہو جانا گستاخی ہے۔" اور شانجہ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ غریبہ کہاں ہے۔ تو خود جا اور اسے لے کر آ۔ باپ کو میرے حوالے کرنے میں شرم محسوس کر رہا ہے تو مجھے بتا دے کہ وہ کس قلعے میں موجود ہے۔ میں اس کو خود گرفتار کروں گا۔"

زبیدہ کو گانے میں مزہ نہیں آ رہا تھا کیونکہ لوگ بے کیفی کا شکار تھے اور ابو منیہ کا بھی پتا نہ تھا۔ المنصور نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو گانے سے روک دیا اور قریب بلایا۔ زبیدہ قریب آئی تو المنصور نے پوچھا۔ "تیری آواز بہت اچھی ہے۔ جو ساری تھی وہ کلام بھی اچھا تھا اور آواز کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ تو باکمال مغنیہ ہے پھر تو ہمیں متاثر کیوں نہیں کر سکی؟"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "صرف اس لئے کہ آپ کی توجہ کسی اور طرف تھی اور لوگوں میں بھی بے کیفی محسوس ہوتی ہے۔"

المنصور نے اس کو جھڑک دیا۔ "باتیں نہ بنا۔ اگر تیرا دل بے کیفی کا شکار نہ ہوتا اور تو دل سے گا رہی ہوتی تو ہم فضول باتیں نہ کر سکتے اور سننے والوں کے کیف میں اضافہ ہو جاتا۔"

زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔ "مگر سچ یہی ہے کہ لوگوں کی بے کیفی نے مجھے بے کیف کر دیا۔"

المنصور نے سعد سے کہا۔ "یہ لڑکی مجھے نادان سمجھتی ہے۔ ابو منیہ مل جائے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ اپنی حد میں رہے۔ زبیدہ مجھے بہت پسند ہے۔"

اسی محفل میں شعلہ نامی خدمت گار نے المنصور کو مطلع کیا۔ "جناب! شاعر الحسن صاعد ایک پہاڑی بکری کے ساتھ حاضری کا طلب گار ہے۔"

المنصور نے پوچھا۔ "وہ تنہا آیا ہے یا اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

شعلہ نے جواب دیا۔ "تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ چند فوجی سوار بھی ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "صاعد کو تو اس محفلِ موسیقی میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہاں غائب تھا؟"

شعلہ نے کہا۔ "جناب! ان سوالوں کا جواب شاعر خود دے گا۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسے شرفِ باریابی ملے گا یا نہیں؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "اسے بلاؤ، مگر اس کی بکری کو باہر ہی رہنے دو۔"

شعلہ واپس چلا گیا لیکن کچھ دیر بعد لوگوں نے یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ شاعر صاعد ایک پہاڑی بکری کی رسی پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔ شعلہ اسے قدم قدم پر روک رہا تھا مگر صاعد اس کو دھکا دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

المنصور نے صاعد کو ڈانٹا۔ "یہ تو کس حلیے اور کس انداز میں آیا ہے؟"

صاعد نے کہا۔ "جنابِ والا! یہ پہاڑی بکری بہت ہی اہم ہے۔ آپ جب اس کی صفات جانیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔"

المنصور کبھی تو شاعر صاعد کو دیکھتا اور کبھی پہاڑی بکری کو۔ "تیرے تمسخر اور تیکھی حاضر جوابیوں سے میں واقف ہوں مگر میں پھر بھی کہوں گا کہ مجھے اس پہاڑی بکری کا وجود بہت ناگوار گزر رہا ہے۔"

شاعر صاعد نے شانجہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اس مجرّ کوہی کا تجھ سے گہرا تعلق ہے۔" اور المنصور سے کہا۔ "جناب! اس قیدی بکری کی شانِ نزول میں میں نے چند اشعار کہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔"

المنصور نے اشعار سنانے کی اجازت دے دی۔

صاعد نے بکری کو المنصور کے تخت کے پائے سے باندھا اور اپنی نظم پڑھنی شروع کر دی۔

"اے میرے محافظ اور خوفزدہ کو پناہ دینے والے! اپنے احسان کو ہر امیدوار کے لئے عام کر دے۔ میرے آقا! اپنے جس غلام کو تو نے بازو پکڑ کر اوپر چڑھایا ہے اور اپنی نعمت کی آغوش میں پالا ہے وہ ایک بزِ کوہی تیری خدمت میں پیش کرتا ہے۔ میں نے اس کا نام غریبہ رکھا ہے اور اسے رسی سے باندھ دیا۔ اب اس کو تیری خدمت میں پیش کرتے ہوئے میں یہ شگون لے رہا ہوں کہ قشتالہ کا بادشاہ گرفتار ہو چکا ہے اور اس وقت وہ تیرے تخت کے پائے سے بندھا ہوا ہے۔

"تو میری پیشکش قبول فرما جس سے میری توقیر بڑھے گی اور تیرے جود و کرم کا نام ہو گا۔ خدا تجھے غلبہ عطا فرمائے۔ تجھے اس مسرت سے ہمکنار کرے اور علوئے مراتب میں تیرا عروج ابرِ باراں

غیر ممالک میں رہنے والے قارئین کے لیے

ہر ماہ گھر بیٹھے رجسٹرڈ ایر میل سے فراہمی

جاسوسی ڈائجسٹ — سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

کسی بھی پرچے کے ۱۲ شمارے کے لیے زرِ سالانہ

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لیے ۱۵۰۰ روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی امریکا کے لیے ۱۸۰۰ روپے

آج کی قیمت پر اکیسویں صدی کا سب سکرپشن

کسی اضافی زحمت کے بغیر

ایک سے زائد رسائل اور ایک سے زائد سالوں کے لیے رقم ارسال کر کے اپنے قیمتی وقت اور پیسے کی بچت کے ساتھ اپنے پسندیدہ ماہناموں سے بروقت لطف اندوز ہوتے رہیں

اپنی رقوم

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

کے نام

31- RAMZAN CHAMBERS
DR. BILLMORIA STREET
OFF I.I.CHUNDRIGAR ROAD
KARACHI 74200 - PAKISTAN

کے پتے پر ارسال کریں۔ ڈرافٹ کی رقم کراچی میں واقع کسی بھی ملکی یا غیر ملکی بینک کی شاخ میں قابلِ ادائی ہونا ضروری ہے۔ ڈرافٹ یا چیک کی ہیرونِ پاکستان کلیرنس کے لیے زرِ سالانہ کی رقم میں بینک چارجز (دس ڈالر کے مساوی) اضافہ کرنا ہوگا۔ اپنی یہ رقم ضرور بھجوائیں۔

FAX : (92) (21) 263.7960
E - MAIL : jasoosi @ ibm.net

کے اوپر تک ہو۔"

اس نظم کو سن کر المنصور مسکرایا اور شانجہ سے کہا۔ "تو نے صاعد کے اشعار سنے؟"

شانجہ نے جواب دیا۔ "نے۔ اس نے ایک بزدل کوی کو میرا باپ بنا کے پیش کیا۔ یہ میرے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "شاعر نے تیرے باپ کو بزدل کوی کہا ہے کیونکہ تیرا باپ بھی بکریوں کی طرح بزدل ہے۔ بکری جو بزدل کہلاتی ہے اور جب اس کے ساتھ دل لگا دیا جائے تو یہ مرکب بزدل بن جاتا ہے۔ خوف سے کسی قلعے میں چھپ کر بیٹھ جانا بزدلی ہے۔"

شانجہ نے المنصور کو یقین دلایا۔ "میں تو آپ کی سرپرستی میں ہوں مگر میرے باپ کو آپ سے اختلاف ہے۔ اس کا کیا منصوبہ ہے؟ میں نہیں جانتا لیکن آپ کا یہ پیغام اپنے باپ تک پہنچا دوں گا کہ اسے بزدلی کا طعنہ دیا گیا ہے۔ اس نے وہ اپنے دامن سے اس داغ کو دھو ڈالے۔" شانجہ رات ہی کو واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد المنصور نے صاعد سے پوچھا۔ "تو نے بزدل کوی کو غریسہ کا نام کیوں دیا؟"

صاعد نے جواب دیا۔ "فوجی یہاں قیام کے طویل دورانیے سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ جنگ کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں تشتالہ کے بادشاہ غریسہ کو قید کروا دوں گا۔ سو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔"

○☆○

دوسرے دن ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ ہراول دستے نے المنصور کو خبر دی کہ تشتالہ کے قلعے سے فوج نمودار ہونا شروع ہو گئی ہے۔

المنصور نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے بعد منادیوں نے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ جملہ سپاہی میدانِ جنگ میں پہنچ جائیں اور اپنی صفیں آراستہ کریں۔

ایک ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ المنصور کو اپنے بیٹے عبدالملک کو حکم دینا پڑا کہ وہ فوج کی کمان سنبھال لے۔

عبدالملک نے کمان سنبھالی لیکن المنصور اس سے بھی پہلے اپنی فوج لے کر قلعے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

قلعے کے سامنے موجود عیسائی سپاہیوں میں بلا کا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اس قلعے کا والی شانجہ تھا۔

المنصور کو یہ باپ بیٹے کی ملی بھگت معلوم ہوتی تھی کیونکہ رات ہی شانجہ نے یہ بتلایا تھا کہ اس کا باپ غریسہ کسی قلعے میں روپوش ہے مگر طلوعِ آفتاب سے قبل ہی خاص تشتالہ کے قلعے سے عیسائی فوج کا نمودار ہو جانا المنصور کو شک و شبے میں ڈال رہا تھا۔ کیا غریسہ بزدلی کا طعنہ سن کر مقابلہ پر آ گیا ہے یا خود شانجہ کی نیت بدل گئی تھی اور اس نے تیاریوں کے بعد فیصلہ کن معرکے کا ارادہ کر لیا ہے۔

المنصور نے اپنا تخت ایک ٹیلے پر رکھوا دیا اور کچھ دیر بیٹھا میرے اور قلب کی ترتیب میں مشغول رہا۔

قلب میں اپنے بیٹے عبدالملک کو رکھا، میسرے پر عبدالرحمٰن کو تعینات کیا اور میمنہ ابو مغیو کے حوالے کیا اور خود ٹیلے پر بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ کر جنگ کا نظارہ کرتا رہا۔

جنگ شروع ہوئی تو المنصور نے تیز نظریں رکھنے والوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائیوں میں شانجہ کو تلاش کریں۔

ہر کسی نے یہی بتایا کہ یہاں شانجہ موجود نہیں ہے۔

خوفناک معرکہ شروع ہو گیا اور عین لڑائی کے دوران میں فریق کے تینوں حصوں کے سرداروں کو المنصور کا حکم پہنچا کہ دشمن کو اس طرح گھیرے میں لیا جائے کہ وہ قلعے میں واپس نہ جا سکے۔

چنانچہ جنگ کے شروع ہوتے ہی دو گھنٹے کی سخت معرکہ آرائی کے بعد مسلمانوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

عیسائیوں کو خوش فہمی ہوئی کہ انہیں فتح حاصل ہو رہی ہے وہ قلعے سے بہت آگے بڑھ آئے۔ اب جو قلعے اور ان سپاہیوں کے درمیان جگہ خالی ہو گئی تھی اسے مسلمانوں نے بند کر دیا۔ اس طرح تشتالہ کی فوج بیچ کے دو پاٹوں کے درمیان پس گئی۔

پیچھے ہٹنے والے مسلمانوں نے مڑ کے عیسائیوں پر حملہ کیا اور اب یہ عیسائی پیچھے جو مڑے تو ان کے قلعے کے سامنے مسلمان موجود تھے۔

اب ان عیسائیوں کو دو سمتوں میں جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔ یہ کارخ قلعے کی طرف پہنچ جانے والی اسلامی فوج کی طرف تھا اور یہ تہِ مقابل اسلامی فوج سے نبرد آزما تھے۔

عیسائیوں کی دونوں ٹکڑیاں جب پیچھے ہٹیں تو دونوں کی پشتیں آپس میں ٹکرائیں اور پیچھے ہٹنے کا سلسلہ بھی موقوف ہوا۔ یہ مقابلہ بمشکل ڈیڑھ پونے دو گھنٹے جاری رہا اس کے بعد عیسائیوں نے ہتھیار پھینکنا شروع کر دیے اور خود کو گرفتاریوں کے لئے پیش کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کیا اور شکست تسلیم کر لینے والوں کو باندھنا شروع کر دیا۔ کچھ فوج قلعے میں داخل ہو گئی۔

کچھ عیسائی فرار ہو چکے تھے اور مسلمان ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ المنصور نے فوج کو حکم دیا کہ شانجہ کو تلاش کیا جائے۔

جو عیسائی مارے جا چکے تھے ان میں شانجہ کی لاش نہیں ملی۔

شام سے کچھ پہلے کچھ عیسائی گرفتار کر کے لائے گئے۔ ان میں ایک شخص بہت زخمی تھا۔ اسے بھاگتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا اس لئے اسے رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ ان قیدیوں کو المنصور کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

المنصور بہت ناراض تھا کہ قلعے میں داخل ہونے والی اسلامی

فوج نے اپنی اگلی تھی کر کے نہیں لا اگلی تھی۔ اس نے ابو مغیو سے کہا تھا کہ شانجہ کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ابو مغیو نے جواب دیا۔ "جناب! شانجہ میدانِ جنگ میں تو کہیں نظر نہیں آیا۔ کہیں اور تو نہیں ہو گا۔"

المنصور کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ المنصور نے اس کی بھی مرہم پٹی کروا دی تھی۔

المنصور نے پوچھا۔ "تو نے مجھ سے دھوکا کیوں کیا؟"

شانجہ نے جواب دیا۔ "نہیں جناب! دھوکا تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ مکمل موافقت میں شریک رہا اور میں نے آپ کی ہر حکم عدولی سے فائدہ اٹھایا اور رات کے اندھیرے میں واپس پہنچا تو میرے باپ نے مجھے قید کی کال کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ صبح تک اس نے میری کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔"

المنصور نے کہا۔ "تو یہ کہتا ہے کہ اگر یہ جنگ تیرے باپ کی مرضی سے ہوئی ہے تو اس میں کہیں نہ کہیں موجود ہونا

المنصور نے غصے سے کہا۔ "میرے آدمیوں نے اس کو لاشوں میں تلاش کیا اور اس کو بھاگنے والوں میں اکھٹا گروہ کہیں نہیں ملا۔"

المنصور نے پوچھا۔ "میرے باپ غریسہ کو آپ کے کتنے آدمی

المنصور نے اپنے آدمیوں سے پوچھ گچھ کی تو کوئی بھی

المنصور نے پوچھا۔ "اب کوئی میرے باپ کو پہچانتا ہی نہیں تو

شانجہ نے جواب دیا۔ "تجھ میں تیرے باپ کی شباہت تو

المنصور نے انتہائی غصہ میں کہا۔ "مبارک ہو کہ مسلمانوں

المنصور حیران ہوا۔ ابو مغیو کو بھی حیرت تھی۔ دوسرے

المنصور نے پوچھا۔ "ان قیدیوں میں تیرا باپ کون ہے؟"

شانجہ نے جواب دیا۔ "اس وقت میری حیثیت حضرت مسیح کے اس حواری جیسی ہے جس نے ان کی شناخت کی تھی اور ان کو گرفتار کروا دیا تھا۔"

المنصور نے رسیوں سے بندھے ہوئے عیسائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو تانا ان میں تیرا باپ کون ہے؟"

سارے زخمی قیدی یہ باتیں سن رہے تھے اور شانجہ کو دیکھ دیکھ کر اپنے ایک ساتھی زخمی قیدی کو بھی دیکھنے لگتے تھے۔ یہ قیدی سب سے زیادہ زخمی تھا۔

شانجہ نے اسی زخمی قیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ جوان سب میں سب سے زیادہ زخمی ہے، وہی میرا باپ غریسہ ہے۔"

المنصور فوراً تخت سے نیچے آ گیا اور غریسہ کو خود آزاد کیا۔ اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور اپنے تخت تک لے جانے کی کوشش کی مگر اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔

ابو مغیو نے سہارا دینا چاہا تو المنصور نے اس کو پیچھے ہٹا دیا اور غریسہ کو اپنے تخت تک لے گیا۔

اس کے جسم سے خون جاری تھا۔ یہ خون المنصور کے کپڑوں میں بھی لگ گیا۔

المنصور نے غریسہ کو تخت پر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ شانجہ اب بھی تخت کے سامنے کھڑا باپ کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

المنصور نے غریسہ سے پوچھا۔ "تو نے یہ بے مقصد جنگ کیوں کی؟"

غریسہ نے جواب دیا۔ "میں نے یہ بے مقصد سمجھ کر جنگ نہیں کی۔ تیرا بیٹا عبدالملہ تیرے خلاف ہوا اور میری پناہ میں آ گیا مگر تو نے اس کا مطالبہ کیا اور یہ وعدہ کیا کہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مگر اس کے ساتھ تو نے جو سلوک کیا، وہ تیری شایانِ شان نہیں تھا۔"

المنصور نے ذرا خشک لہجہ اختیار کیا۔ "وہ میرا بیٹا نہیں تھا۔ اگر میں نے اپنے بیٹے کے سلسلے میں کوئی وعدہ کیا ہوتا تو ضرور پورا کرتا۔"

غریسہ نے کہا۔ "لیکن میں نے اسے تیرا بیٹا ہونے کی وجہ سے پناہ دی تھی اور جب تو نے عہد و پیمان کے بعد اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تو میں نے اس کو تیرا بیٹا سمجھ کر ہی واپس کیا تھا اور تو پابند ہو گیا تھا کہ اپنے وعدے کے مطابق اس سے اچھی طرح پیش آتا۔ اب بتا کہ عبداللہ کہاں ہے؟"

المنصور نے حقارت سے جواب دیا۔ "اس کا سر تو میں کہیں لشکر میں موجود ہو گا۔ رہ گیا دھڑ تو اسے میرے آدمیوں نے دریا کے اس پار درندوں اور جنگل کوؤں کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے اس کی ہڈیاں اور اس کا شہر ابھی وہاں موجود ہو۔"

غریسہ نے کہا۔ "تو نے اس پر بڑا ظلم کیا اور مجھ سے دھوکا کیا۔

میرے بیٹے شانجہ کو میرے خلاف ورغلایا اور اس نے مجھے حکومت سے بے دخل کردیا۔ تو نے مجھے بزدل کہا اور میں نے قلعے سے نکل کر تیرا مقابلہ کیا اور زخمی حالت میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تو جھوٹا اور پرلے درجے کا پیمان شکن ہے جبکہ میں بزدل نہیں ہوں۔"

المنصور نہایت تحمل سے غریسہ کی باتیں سنتا رہا اور پھر ابو مغیرہ سے کہا۔ "یہ بہت زخمی ہے۔ شاید یہ ہذیانی کیفیت میں یہ بکواس کررہا ہے۔"

شانجہ نے درخواست کی۔ "جناب! میرا باپ ہذیانی کیفیت میں اتنی سمجھ داری کی باتیں نہیں کرسکتا اس لئے اس کو مذموم طعنہ نہ دیں۔"

المنصور نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "زخمی غریسہ کو میرے خیمے میں پہنچایا جائے۔" اور ابو مغیرہ کو حکم دیا۔ "میرے خاص جراحوں سے اس کے زخموں کا علاج کروایا جائے۔"

شانجہ کو اپنے باپ کی عزت افزائی پر حیرت ہورہی تھی۔

غریسہ کو المنصور کے خیمے میں پہنچادیا گیا اور المنصور کے خاص جراحوں نے اس کا علاج شروع کردیا۔

شانجہ کو بھی اجازت دی گئی کہ وہ چاہے تو باپ کے پاس رہے یا قلعے میں واپس چلا جائے کیونکہ قلعے میں اس کی عدم موجودگی سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

شانجہ کچھ دیر باپ کے پاس رہا۔ اس کے بعد قلعے میں واپس چلا گیا۔ وہاں مسلمان پہلے سے موجود تھے۔

خیمے میں غریسہ کا علاج جاری تھا اور پورے لشکر میں صاعد کا ذکر ہورہا تھا۔ یہ مسئلہ زیرِ غور تھا کہ صاعد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ولی بھی ہے جس نے ایک دن پہلے ایک بڑھئی کو رسی سے باندھ کر غریسہ کی حیثیت سے المنصور کی خدمت میں پیش کردیا تھا اور اپنے اشعار میں اس نے کہا تھا کہ وہ اس طرح شاہ غریسہ کی گرفتاری کا شگون دے رہا ہے۔

اور اب شاہ غریسہ زخمی حالت میں المنصور کے خیمے میں ایک قیدی کی حیثیت سے زیرِ علاج تھا۔

غریسہ کی حالت نازک تھی اور جراحوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کردیا تھا کہ غریسہ زندہ نہیں بچے گا۔

غریسہ نے جو خود پر المنصور کی اتنی نوازشیں دیکھیں تو کہا۔ "مجھے بھی کہیں دریا کے کنارے پھنکوا دے۔ آخر مجھ پر اتنی توجہ کیوں ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "تو قشتالہ کا بادشاہ تھا اور تو نے قلعے سے باہر نکل کر میرا مقابلہ کیا اس لئے میں تیری عزت کرتا ہوں۔"

غریسہ نے کہا۔ "عزت و ذلت دینا ہم انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ تو نے عبداللہ کا سر اپنے پاس رکھ لیا اور اس کا دھڑ دریا کے اس پار پڑا رہنے دیا کہ درندے اور چیل کوے کھا جائیں مگر خدا نے اس مظلوم پر یہ کرم کیا کہ اس کا دھڑ اس کا ماموں منذر قرطبہ اٹھا لے گیا اور اب وہ قرطبہ میں دفن کردیا گیا ہوگا۔"

المنصور کو منذر پر بے حد غصہ آیا۔ اس نے غریسہ سے پوچھا۔ "تجھے یہ بات کس نے بتائی؟"

غریسہ نے جواب دیا۔ "اس فوجی دستے کے کچھ لوگوں نے جو عبداللہ کو تیرے آدمیوں کے سپرد کرنے گئے تھے۔"

المنصور نے شعلہ کو آواز دی۔ "سعد کو بلا۔ اسے یہ خبر اب تک کیوں نہیں ہوئی کہ منذر اپنے بھانجے کی لاش لے کر قرطبہ چلا گیا۔"

کچھ دیر بعد شعلہ سعد کو بلا لایا۔ المنصور نے اسے کئی ہاتھ رسید کردیے اور پوچھا۔ "عبداللہ کا دھڑ کہاں ہے؟"

سعد گھبرا گیا اور اپنا گال سہلانے لگا' جواب دیا۔ "میں تو اسے دریا کے اس پار چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ درندے اور چیل کوے اس کو کھا گئے ہوں گے البتہ پنجر وہیں کہیں پڑا ہوگا۔"

المنصور نے چیخ کر کہا۔ "تو جھوٹا ہے' تجھ سے زیادہ باخبر قریب المرگ غریسہ ہے۔ عبداللہ کے دھڑ کو اس کا ماموں منذر قرطبہ لے گیا۔ میرا خیال ہے کہ عبداللہ کا سر بھی منذر لے گیا ہوگا۔"

المنصور کے کہنے پر عبداللہ کے سر کو تلاش کیا گیا تو وہ بھی نہیں ملا اور تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ چیل کوے سر کے لئے تو المنصور نے یہ حکم دیا تھا کہ اسے مقتول کے ماموں منذر کے حوالے کردیا جائے۔

المنصور نے محسوس کیا کہ اس کی فوج میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ہمدردیاں اس کے مقتول بیٹے عبداللہ کے لئے تھیں اور اگر عبداللہ زندہ ہوتا تو اس کے یہ ہمدرد لوگ کسی بھی وقت المنصور سے دغا کرتے اور عبداللہ کا ساتھ دیتے۔

المنصور نے کئی بار یہ اعلان فوج میں مقتول عبداللہ کے حامیوں کا پتا چلایا جائے۔ اپنی اس کوشش کا ذکر اس نے اپنے مشیر ابو مغیرہ سے بھی کیا لیکن ابو مغیرہ نے مشورہ دیا کہ ان حامیوں کو اس لئے نظرانداز کردیا جائے کہ ان کی حمایت سے مقتول کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اب وہ المنصور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

المنصور نے بھی ابو مغیرہ کے مشورے کو پسند کیا۔

غریسہ کا علاج المنصور کے جراح کرتے رہے مگر اس کی حالت بگڑتی رہی۔ اب اگر المنصور تشتالہ کے قلعے کے سامنے ٹھہرا ہوا تھا تو صرف غریسہ کے علاج کی غرض سے حالانکہ طبیبوں اور جراحوں نے مایوسی ظاہر کردی تھی مگر المنصور مایوس نہیں ہوا تھا۔

رات کے پچھلے پہر المنصور کو بیدار کرکے اطلاع دی گئی کہ غریسہ کا انتقال ہوگیا۔

المنصور فوراً اٹھ کر غریسہ کے خیمے میں پہنچا اور غریسہ کے

دائیں جانب کھڑے ہو کر اس کی صورت دیکھتا رہا اور آہستہ سے کہا۔ "عبداللہ کو پناہ دینے والا اور تیری پناہ حاصل کرنے والا دونوں ہی آگے پیچھے عالمِ بالا کو سدھار گئے اور دونوں ہی تلواروں کے گھاؤ سے جاں بحق ہوئے۔ اب مجھے نہ تو عبداللہ سے کوئی شکایت ہے اور نہ غریسہ سے۔"

المنصور کے حکم سے شاہ غریسہ کے لئے ایک شاندار تابوت تیار کروایا گیا اور اس قیمتی تابوت پر سرخ قیمتی ریشمی چادر ڈال دی گئی۔

تشتالہ میں شانجہ کو مطلع کردیا گیا کہ اس کے باپ غریسہ کا انتقال ہوچکا ہے اور اس کی میت کو کسی عیسائی بادشاہ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

المنصور کا یہ فیصلہ شانجہ کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ غریسہ کی لاش اس کے بیٹے کے بجائے کسی غیر عیسائی بادشاہ کو بھیج دی جائے گی۔

دوپہر سے ذرا پہلے شانجہ کی طرف سے ایک وفد المنصور سے ملا۔ یہ المنصور کے لئے قیمتی تحائف لے کر پہنچا تھا اور اپنے ساتھ یہ لوگ نقد رقم بھی لائے تھے۔ اس وفد نے درخواست کی کہ غریسہ کی لاش ان کے حوالے کی جائے۔

المنصور نے وفد سے کہا۔ "میں نے غریسہ کی لاش تشتالہ نہ بھیجنے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ زندہ بادشاہ کی تشتالہ میں موجودگی شانجہ کے لئے اتنی خطرناک نہیں ہوسکتی تھی جتنا خطرناک غریسہ کا تابوت ہوسکتا ہے۔"

وفد نے اصرار کیا کہ شانجہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے' وہ اپنے باپ کا تابوت کسی دوسرے ملک یا کسی دوسرے بادشاہ کے قبرستان میں دفن ہونے کی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا۔

المنصور نے غریسہ کا تابوت شانجہ کے وفد کے حوالے کردیا اور تحفے بھی نہیں لئے۔ وفد کو ہدایت کی کہ وہ شانجہ کو بتادے کہ وہ خراج باقاعدگی سے ادا کرتا رہے۔

اب تشتالہ کی مہم اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ یہ لوگ قرطبہ واپس ہوئے۔

اس وقت بھی المنصور کے دل میں ایک کانٹا چبھ رہا تھا اور اس کانٹے کا تعلق اموی شہزادے والی طلیطلہ عبداللہ سنگدل سے تھا جو ریاست لیون کے حکمران بردمند کے پاس پناہ لئے ہوئے تھا۔

قرطبہ میں المنصور کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ شہر میں چراغاں کیا گیا لیکن اس کے اپنے قصر میں ایک ایسا حصہ بھی تھا جو ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ یہاں عبداللہ کی ماں رہتی تھی جس کے دو بیٹے المنصور کی مصلحت اور شک پر قربان کردیے گئے تھے۔

المنصور کو معلوم تھا کہ منذر نے اپنی بہن کو عبداللہ کی لاش ضرور دکھائی ہوگی جس سے محل کا ایک حصہ تاریک ہوگیا تھا۔

المنصور نے اس تاریک حصے کو روشن کرنا چاہا تو مقتول عبداللہ کی ماں نے اس کی اجازت نہیں دی اور کہا۔ "کم از کم اس چھوٹے سے حصے میں مجھ کو اپنی مرضی سے زندہ رہنے دیں۔"

المنصور نے کہا۔ "اس دنیا میں اپنی مرضی کہاں چلتی ہے۔ خلیفہ ہشام' ملکہ صبح اور خود میں کوئی بھی اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار رہا ہے۔ تیرا بیٹا باغی تھا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیوں سے مل گیا اور مرتد کی موت مارا گیا۔"

عبداللہ کی ماں نے کہا۔ "تم اس پر مرتد ہونے کی تہمت لگا رہے ہو۔ اس نے وہاں پناہ لی تھی۔ کیا تمہاری پناہ میں آنے والا کوئی عیسائی مسلمان ہوجاتا ہے؟"

المنصور نے کہا۔ "میں تیرے دکھ کو سمجھتا ہوں مگر تیری دلیل کا قائل نہیں ہوں۔ اپنے اس حصے کو چراغاں کرنے دے اور تو کچھ دنوں کے لئے اپنے بھائی منذر کے پاس چلی جا۔"

عبداللہ کی ماں نے اپنے بھائی کے پاس جانے سے انکار کیا اور اپنے کمرے کے ایک گوشے میں لے جا کر ایک قبر دکھائی اور کہا۔ "میرا بیٹا یہاں آسودۂ خاک ہے اس لئے اب میں یہاں سے نہ تو کہیں جاؤں گی اور نہ یہاں چراغاں ہونے دوں گی۔"

اب المنصور لاجواب ہوچکا تھا لیکن منذر کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوگیا۔

وہ ملکہ صبح سے بھی ملاقات کرنے گیا مگر ملکہ نے اس سے ملاقات نہیں کی۔ اس نے خلیفہ ہشام سے ملاقات کی تو یہاں اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خلیفہ نے بھی زنانہ لباس پہن رکھا تھا۔

خلیفہ کو چند لڑکیاں اور پیش کردی گئیں۔ یہاں سے نکل کر المنصور نے زیادہ جرأت سے کام لیا۔ جملہ فرامین پر خلیفہ کے دستخط ضروری قرار نہیں دیے گئے اور اس نے اپنے نام کے ساتھ الملک' الملک الکریم' المؤید اور السید کا اضافہ کردیا۔

جمعہ کے خطبات میں خلیفہ کے نام کے ساتھ اپنے نام کا بھی اضافہ کیا۔ اگر کوئی ضرورت مند خلیفہ سے درخواست کرتا تو محروم رہتا اور اگر المنصور سے درخواست کی جاتی تو پوری ہوجاتی۔

اس خوشی کے موقع پر دور دراز ملکوں اور علاقوں کے تاجر اپنا سامان لے کر آئے ہوئے تھے اور المنصور کو فروخت کے لئے دکھا رہے تھے۔ المنصور نے بڑی خریداریاں کیں۔ ان میں ایک عدن کا تاجر بھی تھا جو قیمتی موتیوں کے ہار اور ہیرے جواہرات اور کچھ لعل بھی لایا تھا۔ المنصور نے اس سے خاصی خریداری کی اور یہ ہار اور لعل اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو دے دیے لیکن منذر کی بہن کو نظرانداز کردیا۔

اس نے اپنی بیٹیوں کو جو قیمتی چیزیں خرید کر دی تھیں ان میں اس کے اپنے کفن کا کپڑا بھی تھا۔

بیٹیوں کو کفن کا کپڑا دیکھ کر وحشت ہوئی اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "یہ کس کے لئے ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "میرے لئے۔"

لڑکیاں دم بخود تھیں۔ وہ اپنے باپ سے یہ نہیں پوچھ سکتی تھیں کہ آپ تو زندہ ہیں اور کفن مردوں کے لئے ہوتا ہے۔ المنصور نے چبتے ہوئے کہا۔ "بیٹیو! مت پریشان ہو۔ یہ کفن میں نے اپنی آبائی زمین طرش کی آمدنی سے خریدا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ اندر کہیں سے ایک چھوٹی سی پوٹلی اور قرآن پاک کا نسخہ اٹھا لایا۔

پوٹلی کو بیٹیوں کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "جانتی ہو اس پوٹلی میں کیا ہے؟"

ایک بیٹی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "نہیں.... ہمیں کیا پتا کہ اس میں کیا ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "خدا جھوٹ سے محفوظ رکھے۔ اب تک میں نے عیسائیوں کے خلاف پچاس سے زائد جنگیں لڑی ہیں اور ان سب میں کامیاب رہا۔ جنگ کے دوران میں میرے کپڑوں پر جو گرد آجاتی تھی.... اسے آدمی میرے حکم سے جمع کرتے رہے۔ اس پوٹلی میں دورانِ جہاد میں کپڑوں پر جمع ہو جانے والی مٹی ہے جسے میں نے اس لئے جمع کروایا ہے کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے اکل حلال کے اس کفن میں دفن کیا جائے اور جہاد کی یہ مٹی میرے کفن پر چھڑک دی جائے تاکہ اللہ مجھے بخش دے۔"

ان بیٹیوں کو معلوم تھا کہ بھائی عبداللہ باپ کے حکم سے قتل کیے گئے اور ان کا ایک بھائی عدالت کی قربان گاہ کی نذر ہو گیا۔ اس قسم کی کتنی ہی شکایتیں ان کے باپ کے خلاف مشہور تھیں۔ کیا اکل حلال کی کمائی سے تیار کیا جانے والا کفن اور جہاد کے میدانوں سے اٹھنے والے گرد و غبار کی مٹی کفن پر چھڑک دینے سے یہ سارے گناہ معاف کئے جاسکتے ہیں۔

المنصور نے اپنی ایک بیٹی کو سوچ میں زیادہ ڈوبا ہوا دیکھا تو پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹی! کیا سوچ رہی ہے؟"

بیٹی نے جواب دیا۔ "دنیا میں حقوق العباد اور حقوق اللہ کا انسانوں سے زیادہ واسطہ رہتا ہے۔ اللہ کے حقوق جو انسانوں پر ہیں تو وہ یوم آخرت میں اللہ کے اختیار میں ہوں گے۔ وہ جسے چاہے معاف کردے لیکن جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے تو وہ ہم انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر یہاں کسی سے زیادتی کی گئی ہے تو بندہ تو معاف نہیں کرے گا پھر اللہ کس طرح معاف کردے گا۔ وہاں تو کسی کی سفارش بھی نہیں چلے گی۔"

المنصور لاجواب تو ہو گیا مگر اپنی بات پر قائم رہا کہنے لگا۔ "میرے معاملات اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا اس کے بندوں سے، تم تو صرف یہ یاد رکھو کہ مجھ پر تمہارے یہ حقوق واجب تھے اور جنہیں میں اپنے فرائض سمجھتا تھا وہ میں نے ادا کئے یا نہیں۔"

لڑکیوں نے اقرار کیا۔ "بحیثیت باپ آپ نے اپنے سارے فرائض ادا کردیے۔"

المنصور نے کہا۔ "تب پھر تم پر میرا یہ حق ہے کہ تم سے اپنا کفن سلواؤں اور تمہارا یہ فرض ہے کہ تم میرا حکم مانو۔ باقی دنیا کی تم فکر چھوڑ دو۔"

لڑکیاں خاموش ہو گئیں۔ المنصور نے ان کو تاکید کی۔ "دیکھو! تم محلاتی سازشوں سے دور رہو۔ میں نے تو رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیا ہے۔ اب اگر کچھ کے ساتھ ناانصافی میں کچھ زیادتیاں بھی ہو گئی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے معاف فرما دے گا۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ مجھے اس پر ناز ہے۔"

محل سے نکلنے کے بعد اس کی طبیعت میں بڑا تکدر تھا۔ وہ سیدھا منذر کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ منذر کہیں گیا ہوا ہے اور شام تک واپس ہوگی۔

المنصور یہاں سے اپنی ممانی کے گھر پہنچا۔

ممانی گھر میں تنہا تھیں۔ وہ دونوں خادماؤں کے سامنے چپ چاپ بیٹھا رہا اور پھر ممانی سے پوچھا۔ "کیا منذر یہاں آیا تھا؟"

ممانی نے جواب دیا۔ "ہاں آیا تھا، وہ بہت غمزدہ ہے۔ اسے اپنے بھانجے کی موت کا غم ہے۔"

المنصور نے عبداللہ کی شکایت کی۔ "اس نے مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیوں کا ساتھ دیا۔ میرا تو اپنا یہ خیال ہے کہ وہ مرتد ہو گیا تھا پھر میں نے باپ بیٹے کے رشتے کا بھی خیال نہیں کیا اور اسے قتل کروا دیا۔ اب آپ ہی بتائیں کیا اسلام میں مرتد کا قتل جائز ہے یا ناجائز؟"

ممانی نے بے بسی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم جو کر رہے ہو، سچ کہہ رہے ہو۔ اب میں تم سے کیا بحث کروں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب اس کا ذکر ہی نہ کرو۔"

وہ وہاں کچھ دیر ٹھہرا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید منذر دوبارہ آجائے لیکن وہ نہیں آیا۔ اس نے بازاروں سے گزرتے ہوئے سنا کہ کسی نے اسے پسر کش کہا لیکن کسی نے کہا، وہ شخص پہچان میں نہیں آیا۔

اس کے آس پاس جو محافظ چل رہے تھے انہوں نے پسر کش کی آواز سنی۔

اچانک سامنے سے ایک شخص روتا ہوا آیا اور المنصور کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی، کہنے لگا۔ "جناب! میں لٹ گیا، میں برباد ہو گیا۔"

المنصور نے اسے پہچان لیا۔ یہ عدن کا تاجر تھا۔ اس کے محافظوں نے تاجر کو مار کے سڑک کے کنارے کر دیا اور کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

المنصور نے حکم دیا۔ "شاید اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس سے کہو شام کو میرے محل میں آجائے۔"

لیکن تاجر سڑک کے کنارے کھڑا چیخ رہا تھا کہ اس کو کوئی محل میں گھسنے نہیں دے گا۔

المنصور نے اپنے محافظوں سے کہا۔ "اسے اچھی طرح پہچان

لو اور شام کو تم لوگ محل کے پھاٹک پر موجود رہو گے اور جیسے ہی یہ آئے، اس کو مجھ سے ملوا دو گے۔"

المنصور کو دراصل منذر کی تلاش تھی جو اسے مل نہیں رہا تھا۔

وہ تھکا ہارا اپنے محل میں پہنچا تو محل کے پھاٹک پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب فریادی ہیں۔ اس نے دربانوں کو حکم دیا۔ "جب میں انہیں طلب کروں تو انہیں باری باری میرے پاس بھیجا جائے۔"

محل میں خلافِ توقع منذر اپنی بہن کے پاس موجود تھا۔ المنصور نے منذر کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ اس کی تیوریوں پر بل تھے۔

منذر نے بھی اپنی تیوریوں پر بل ڈالے اور المنصور کے قریب اجازت لئے بغیر بیٹھ گیا۔

المنصور اس کی جسارت پر حیران ہوا، پوچھا۔ "آج کہاں غائب تھا؟"

منذر نے جواب دیا۔ "میں ان راستوں میں گھوم پھر رہا تھا جن راستوں سے مجھے مگدھے پر بٹھا کر پھرایا جائے گا اور میں نے لوگوں کو بھی بتا دیا ہے کہ انہیں عنقریب ایک تماشا دیکھنے کو ملے گا۔"

المنصور نے کہا۔ "مجھے تشنگاله سے میری اجازت کے بغیر نہیں آنا چاہیے تھا؟"

منذر نے جواب دیا۔ "ہاں یہ درست ہے مگر مجبوری یہ تھی کہ اگر میں اجازت کے انتظار میں رہتا تو عبداللہ کی لاش درندوں اور چیل کوؤں کی نذر ہو جاتی کیونکہ آپ نے اسے اسی مقصد کے لئے دریا کے کنارے پڑا رہنے دیا تھا۔"

المنصور نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔ "بہت زیادہ خودسری آگئی ہے۔ میں تیرے احسانوں کے پیشِ نظر خاموش ہوں۔"

منذر نے جواب دیا۔ "آپ ان کا بالکل خیال نہ کریں اور وہی کریں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ابھی کچھ وقت ہے۔ تجھے نہیں معلوم کہ میں تیرے معاملے میں اب تک خاموش کیوں رہا۔"

منذر نے کہا۔ "میں کچھ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا۔"

المنصور نے شکایت کی۔ "تو نے عبداللہ کی قبر میرے محل میں بنوادی۔ تو اپنی جارحانہ کارروائیوں سے باز نہیں آئے گا۔"

یہ کرارگری جاری تھی کہ المنصور کو بتایا گیا کہ کوئی مجذوب قصر کے باہر کھڑا چیخ رہا ہے اور اس قصر اور مدینتہ الزہرہ کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے۔

المنصور نے منذر سے کہا۔ "میرے ساتھ باہر چل۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کون پاگل ہے جو میرے قصر اور میرے شہر کے بارے میں بکواس کر رہا ہے۔"

منذر اور المنصور قصر کے باہر پہنچے تو وہاں ایک ستر پچہتر سالہ گنجے ہوئے جسم کا سرخ و سفید رحمت والا مجذوب لوگوں میں گھرا کھڑا تھا اور قصر کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہا تھا۔ "اے قصر! تجھ میں قرطبہ کا بہت بڑا حصہ شامل ہے اور اے مدینتہ الزہرا! تجھ میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پنہاں ہے۔"

المنصور ڈر گیا اور اس مجذوب کو خوشامد درآمد کرکے محل کے اندر لے گیا کیونکہ اس مجذوب سے بعید نہ تھا کہ کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے المنصور کے بارے میں لوگوں کی رائے خراب ہو جائے۔

المنصور نے اس مجذوب کی خاطر مدارات کرنا چاہی تو اس مست قلندر نے کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ "تیرے اس محل میں شہر قرطبہ کا بہت کچھ ہے اور اس قصر کا سب کچھ قرطبہ کے لئے ہے۔ اس مدینتہ الزہرہ میں جو کچھ ہے، قرطبہ کا ہے اور مدینتہ الزہرہ کی ہر چیز قرطبہ بھر کے لئے ہے۔"

المنصور نے پوچھا۔ "حضرت! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "میں کوئی بات نہیں کر رہا ہوں، امرِ ربی بیان کر رہا ہوں۔ تیرے قصر اور تیرے شہر کی تقدیر بتا رہا ہوں۔ تقدیر جانتا ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا۔ آپ ہی بتائیں کہ آپ کس تقدیر کی بات کر رہے ہیں؟"

مجذوب نے دیوار کی ایک اینٹ پر انگلی رکھی اور پوچھا۔ "یہ اینٹ یہاں لگنے سے پہلے کہاں تھی؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہ پہلے کہاں تھی؟"

مجذوب نے ایک کھڑکی پر انگلی رکھ دی۔ "یہاں لگنے سے پہلے یہ کہاں تھی؟"

المنصور نے پھر وہی جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ پہلے یہ کہاں تھی؟"

اس بار مجذوب نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اور یہ دروازہ پہلے کہاں تھا؟"

المنصور نے پھر وہی جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ پہلے یہ کہاں تھا؟"

مجذوب کو غصہ آگیا۔ "تو کچھ نہیں جانتا پھر تو کیا جانتا ہے۔ تو یہ جانتا ہے کہ فلاں بیٹا میرا نہیں ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ فلاں بیٹا تھا کس کا۔ تو شک پر فیصلے کرتا ہے۔ تو نام و نمود اور نمائش کا بندہ ہے۔"

المنصور نے عاجز آکے پوچھا۔ "آخر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "مجھے تو تیرے شہر اور قصر کے سامنے

بھیجا گیا تھا مگر قصر کے اندر تو لے آیا۔ اب یہ تو بتا کہ تو قصر کے اندر مجھے کیوں لایا ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "قصر کے باہر آپ کے شایانِ شان جگہ نہیں تھی اس لئے میں آپ کو اندر لے آیا۔"

مجذوب نے جھٹلایا۔ "جھوٹ' بالکل جھوٹ۔ میری سچی باتیں دوسرے نہ سن لیں' اس خوف سے تو مجھے اندر لے آیا۔"

المنصور نے پوچھا۔ "آپ کا قیام کہاں ہے؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "اللہ کی زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے۔"

المنصور نے عاجزی سے کہا۔ "وہ تو ہم سبھی اللہ کی زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے رہتے ہیں مگر اس کے اوپر اور آسمان کے نیچے بہت سے ملک اور شہر آباد ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں لوگوں کے رہنے کے گھر اور ٹھکانے ہیں۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "میرا گھر وہیں ہوتا ہے جہاں میں ٹھہر جاتا ہوں۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے اور میں لنگڑا نہیں ہوں۔ چلتا رہتا ہوں' جہاں چاہتا ہوں پڑ رہتا ہوں۔ پس جہاں پڑ جاتا ہوں وہی اپنا ٹھکانا اور اپنا گھر ہوتا ہے۔"

المنصور نے کہا۔ "باتیں تو آپ بڑی ہوش مندی کی کرتے ہیں مگر کہلواتے مجذوب ہیں۔"

مجذوب نے تردید کی۔ "میں تو خود کو مجذوب نہیں سمجھتا اور نہ مجذوب کہلوانا چاہتا ہوں۔ تم لوگ کہتے ہو' پاگل کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے کچھ نہ کہو۔"

المنصور نے خوشامدانہ رویہ اختیار کیا اور کہا۔ "آپ حضرت یہ بتا دیں کہ اس محل میں اور میرے اس شہر میں جو کچھ ہے' قرطبہ کا ہے اور اس شہر کا اور محل کا سب کچھ قرطبہ کے لئے ہے۔ آپ جو کہتے ہیں' میں اس کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں۔"

مجذوب نے کہا۔ "یہاں محل ہو یا شہر' اس میں جو کچھ ہے قرطبہ کے ہر گھر کے لئے ہے۔ مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ اے شہر اور اے محل! تجھ میں ہر گھر کا حصہ ہے۔"

المنصور مجذوب کی باتوں سے تنگ آگیا تھا اور اس کے لئے یہ مجذوب ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

اس مجذوب نے اچانک دریافت کیا۔ "تو نے قرآن پاک پڑھا ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "خوب پڑھا ہے' بار بار پڑھا ہے' بہت زیادہ پڑھا ہے۔ بس حفظ نہیں کر سکا مگر قرآن پاک کا ایک بڑا حصہ زبانی یاد ہے۔"

مجذوب نے کہا۔ "واہ وا' سبحان اللہ تو نے تو کلام پاک لکھا بھی ہے۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "ہاں۔ میں نے لکھا بھی ہے۔"

مجذوب نے کہا۔ "تو نے قرآن پاک میں نہیں پڑھا۔ ایک آیت کا ترجمہ ہے کہ... ہر شے اپنی اصل کی طرف جاتی ہے۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "ہاں۔ میں نے یہ آیت پڑھی ہے اور یہ بار بار نظروں سے گزری ہے۔"

مجذوب نے کہا۔ "بس اسی آیت میں میری باتوں کا مفہوم موجود ہے۔"

اس وقت المنصور بے حد خوفزدہ نظر آرہا تھا۔ مجذوب نے یکایک منذر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "وہ معصوم کہاں ہے؟ اسے کہاں دفن کر دیا؟ چلو اس کے لئے دعا کریں۔"

مجذوب نے کسی کا نام نہیں لیا تھا مگر ہر کوئی سمجھ گیا کہ مجذوب عبداللہ کی قبر پر جانا چاہتا ہے۔ منذر نے کھڑے ہو کر مجذوب کا ہاتھ پکڑا اور اس کو عبداللہ کی قبر پر لے گیا۔

ان دونوں کے پیچھے پیچھے المنصور بھی بیٹے کی قبر پر پہنچا۔ سامنے سے المنصور کے دونوں بیٹے عبدالملک اور عبدالرحمٰن آرہے تھے۔

مجذوب نے ان دونوں کو بھی اشارے سے بلایا اور کہا۔ "چلو اپنے بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھو۔"

المنصور نے اپنے دونوں بیٹوں کو اشارے سے قریب بلایا اور دونوں کے کانوں میں کہا۔ "اس کا کہنا مان لو۔ بڑے کام کا آدمی ہے۔"

یہ پانچوں عبداللہ کی قبر پر گئے' فاتحہ پڑھی۔ مجذوب نے عبداللہ کے حق میں دعائیں کیں اور کچھ دیر قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر یا مقسط یا مقسط کا ورد جاری رکھا۔

یا مقسط کے ورد کے بعد اس مجذوب نے عبدالملک المظفر سے پوچھا۔ "نوجوان! تمہیں عبداللہ کی جگہ تو مل گئی مگر اس کی بنیاد میں ظلم ہے۔ اس لئے اس کی پائیداری معلوم....."

المنصور نے مجذوب سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ "بہت باتیں کر لیں اب کچھ دیر خاموش بھی رہیں۔"

مجذوب نے خاموش رہنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ "تو چپ رہنے کو کہتا ہے لیکن قضا و قدر کے کارکن تو چپ نہیں رہیں گے۔ وہ کام کر رہے ہیں۔ تجھے کچھ پتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟"

المنصور نے کہا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں' وہ ظاہر ہوتا رہتا ہے اور میں چاہتا بھی نہیں کہ سب کچھ مجھے قبل از وقت معلوم ہو جائے۔"

مجذوب نے عبدالملک کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "سیب کھانا مگر اپنے اس بھائی عبدالرحمٰن کا دیا ہوا سیب مت کھانا۔ یہ چھری یا خنجر سے کاٹ کر سیب دے گا اور تیرا جگر کٹ جائے گا۔ کچھ سمجھا یا نہیں سمجھا؟"

المنصور نے اپنے دونوں بیٹوں کے بارے میں اجازت چاہی۔ "حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ان دونوں بیٹوں کو چلا جانے دوں۔"

مجذوب نے المنصور کی اس بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا مگر

المنصور سے پوچھا۔ "تو خلیفہ بننا چاہتا ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "نہیں۔ میں خلیفہ نہیں بننا چاہتا۔ خلیفہ تو میرا تابعِ فرمان ہے۔ میں جس مقام پر فائز ہوں اس کا کوئی نام تو نہیں ہے مگر یہ مقام خلیفہ سے اعلیٰ و ارفع ہے۔"

مجذوب نے عبدالرحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیرا یہ بیٹا کاغذی خلیفہ ہے۔ موعودہ امیرالمومنین۔ جو باپ نہیں بن سکا وہ یہ تیرا بیٹا بن جائے گا مگر کاغذی حد تک۔ خلافت مفلوس ہے۔"

المنصور نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا۔ "اب تم دونوں جاؤ۔"

لیکن مجذوب نے عبدالرحمٰن کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ "وہ کیا کہتے ہیں حتی علی الفلاح اور حتی علی الصلوٰۃ۔"

المنصور نے اپنے دونوں بیٹوں کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھا چھڑائیں اور جائیں۔

لیکن مجذوب کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ عبدالرحمٰن مجذوب سے اپنا بازو نہیں چھڑا سکا۔ مجذوب مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ "مؤذن تو نماز کی طرف بلائے گا لیکن تیرا یہ بیٹا عبدالرحمٰن پکارے گا۔ حتی علی الخیر یعنی لوگو! شراب کی طرف آؤ۔"

المنصور اس وقت ذہنی طور پر بہت پریشان تھا کہ اس نے کس مصیبت کو مول بلوا لیا جب کہ قصر کے باہر دوسرے بہت سے لوگ بھی آئے ہوئے تھے اور ان میں سے چند کو وہ فارغ بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجذوب سے پوچھا۔ "اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔"

مجذوب نے منذر سے کہا۔ "میں تیرے ساتھ چلوں گا۔ یہ محل کوئی رہنے کی جگہ ہے۔"

المنصور نے بھی مجذوب کو نہیں روکا اور منذر سے کہا۔ "نہیں تو اپنے ساتھ لے جا اور اگر ہو سکے تو ان سے معلوم کرنا کہ سیب، گاندی، خلافت اور غمر والی باتوں کا مطلب کیا ہے۔"

جب مجذوب جانے لگا تو المنصور نے کہا۔ "میری تو یہی خواہش تھی کہ آپ اسی قصر میں رہیں لیکن آپ نہیں رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو مجبور بھی نہیں کروں گا۔"

مجذوب نے منذر کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "تو گدھے پر نہیں بیٹھے گا لیکن بے گھر ضرور ہوگا۔"

المنصور نے مجذوب کو پھاٹک تک پہنچایا اور پھر قصر میں واپس چلا گیا۔

مجذوب نے پیچھے مڑ کے جاتے ہوئے المنصور کو دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "دیکھو وہ جا رہا ہے بسر کش، محسن کش پتا نہیں کیا کیا کش۔ خلیفہ بنے گا۔ بڑا آیا خلیفہ بننے والا۔"

باہر فریادیوں کا ہجوم تھا۔ اچانک ہجوم میں سے ایک عورت روتی ہوئی مجذوب کی طرف بڑھی اور مجذوب کا دامن پکڑ لیا۔ مجذوب نے منذر سے کہا۔ "یہ کون ہے؟ اور مجھے کیوں پکڑ رہی ہے؟"

منذر نے عورت سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ ان کا دامن چھوڑ دے۔"

کچھ لوگوں نے منذر سے کہا۔ "تم تو المنصور کے برادرِ نسبتی ہو۔ یہ عورت قرطبہ کے ایک نامی گرامی ڈاکو کی ماں ہے۔ اس کا بیٹا گرفتار کر لیا گیا اور یہ اس کی جان کی امان چاہتی ہے۔ تم اپنے بہنوئی سے کہو کہ وہ اس کے بیٹے کو معاف نہ کرے۔"

مجذوب نے عورت سے کہا۔ "جا میں نے تیرے بیٹے کو چھوڑ دیا۔"

انہی میں عدن کا تاجر بھی موجود تھا۔ جب اسے منذر کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ یہ المنصور کا برادرِ نسبتی ہے تو اس نے منذر کو روکا اور کہا۔ "مجھے وزیر نے بلایا تھا۔ براہِ کرم ان کو اطلاع کر دو کہ میں آگیا ہوں۔"

مجذوب نے منذر سے کہا۔ "تو چل۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ وزیر کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔ وہ تو بس المنصور ہے، المؤید ہے، السید ہے، الملک الکریم ہے۔"

منذر نے مجذوب کو اپنے گھر میں ٹھہرایا لیکن یہ شخص دو گھنٹے بعد غائب ہو گیا اور جاتے جاتے کہتا گیا۔ "یہ گھر نہیں ہے۔ یہ خدوں کا گھونسلا ہے۔ رات بسر کر لے۔ کل کوئی دوسرا آ جائے گا۔ یہاں تو محسن کش کا حکم چلتا ہے۔"

○☆○

مجذوب کے جانے کے بعد المنصور خاصا پریشان رہا۔ اس کی باتیں دل و دماغ میں گونجتی رہیں۔ وہ اس وقت کسی بھی فریادی سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ مجذوب کی باتوں نے اس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

پھاٹک سے دربان المنصور سے بار بار پوچھ رہے تھے کہ پھاٹک پر جمع ہونے والے فریادیوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المنصور نے حکم دیا۔ "فریادیوں کی ایک فہرست تیار کی جائے۔ ان کے ناموں کے آگے فریاد کی نوعیت کو تفصیل سے لکھی جائے اور فی الحال اس فہرست میں صرف وہی فریادی ہونے چاہئیں۔"

محل کے داروغہ نے فریادیوں کی جو فہرست تیار کی ان میں پہلا نام عدن کے تاجر کا تھا اور آخری دسواں نام اس قاتل اور ڈاکو... کی ماں کا تھا جس کا بیٹا قید خانے میں پڑا ہوا اپنی سزائے موت کا انتظار کر رہا تھا۔

جب یہ دس آدمیوں کی فہرست المنصور کو پیش کی گئی اس وقت وہ اپنے دونوں بیٹوں سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ عبدالملک کو ہدایت کر رہا تھا کہ سیب کا واقعہ عبدالملک کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے جب بھی سیب سامنے آئے، وہ مجذوب کی باتیں یاد رکھے اور ان پر عمل کرے۔

اپنے دوسرے بیٹے عبدالرحمٰن سے پوچھا۔ "کیا تو خلیفہ بننا چاہتا ہے؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "ہاں۔ کیا آپ اس وقت خلیفہ نہیں ہیں۔ آپ کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ آپ مختار کل ہیں۔ جو چاہیں کریں، کوئی آپ کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا پھر پتا نہیں کیوں آپ وزارت پر قناعت کئے ہوئے ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

عبدالملک نے دونوں کی گفتگو میں دخل دیا اور کہا۔ "مجھے صاحبِ بنا دیا گیا ہے، تجھ کو سپہ سالار اور والد کو المؤید، المنصور، السید اور الملک الکریم کے مناصب مل ہی چکے ہیں۔ اس طرح خلیفہ بھی ہمارا تابعِ فرمان ہے۔ اب اس کے بعد ہمیں اور کیا چاہیے۔"

المنصور نے کہا۔ "اچھا! اب تم دونوں جاؤ اور آرام کرو۔ مجھے فریادیوں سے نمٹنے دو۔"

دونوں بھائی چلے گئے۔ المنصور نے فریادیوں کی فہرست اپنے سامنے رکھ کر غور کرنا شروع کیا کہ اس کو ان میں سے کس کو آج بلوانا چاہیے اور کن کن کو کل پر ٹالنا ہوگا۔

اس نے سب سے پہلے نام پر نشان لگا دیا۔ یہ نام عدن کے تاجر کا تھا کیونکہ یہ شخص پہلے بھی مل چکا تھا اور اسے اس وقت بلایا گیا تھا۔

بقیہ نو نام وہ بار بار دیکھتا اور پڑھتا رہا — اس وقت وہ کسی ایسے مقدمے کو زیرِ غور نہیں لانا چاہتا تھا جس میں اس کا زیادہ وقت خرچ ہوتا۔

اس جستجو میں اس کی نظر فہرست کے دسویں نام پر گئی۔ یہ قاتل اور ڈاکو کی ماں کا نام تھا اور اس قاتل اور ڈاکو کو اتنی بری شہرت حاصل تھی کہ اس کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ڈاکو کی ماں کی ماما پر غصہ آیا کہ یہ کیسی بے حس، بے شعور اور بے وقوف عورت ہے جو اپنے بدترین ظالم اور قاتل بیٹے کی معافی اور رہائی کی درخواست لے کر آئی ہے۔ اس نے محل کے داروغہ کو حکم دیا کہ پہلا اور دسواں مقدمہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

عورت عدن کے تاجر سے جھگڑنے لگی کہ اسے اپنی درخواست پہلے پیش کرنے دے لیکن المنصور نے عورت کو ڈانٹا۔ "تو خاموش بیٹھ جا۔" اور عدن کے تاجر سے کہا۔ "ہاں تو بتا کہ تجھ پر کیا ظلم ہوا اور کس نے ظلم کیا؟"

عدن کے تاجر نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور پھر اس نے کہا۔ "جنابِ! میں تو برباد ہو گیا۔ میرا سب کچھ چھن گیا۔ میں نے آپ سے جو کچھ کمایا تھا وہ رقم بھی گئی اور جو ہیرے جواہرات باقی بچے تھے وہ بھی گئے۔"

المنصور نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں حکم دیا۔ "میں خود بھی بہت پریشان ہوں، مجھے تنگ نہ کر اور اپنا معاملہ نقطوں میں مت بیان کر۔ مختصراً بتا دے کہ تجھ سے یہ تیرا سب کچھ کس نے، کہاں، کب اور کس طرح چھین لیا؟"

عدن کے تاجر نے اپنی داستان بیان کرنا شروع کر دی۔ "جنابِ! میں آپ کے پاس سے فارغ ہونے کے بعد دریائے کبیر کے کنارے پہنچا۔ اس وقت ساحل پر سناٹا تھا۔ میں نے سکوں اور ہیرے جواہرات کی تھیلی کپڑوں کے ساتھ ساحل پر رکھ دی اور نہانے کے لئے دریا میں اتر گیا۔ حالانکہ اتنی قیمتی چیزیں میں عام حالات میں دریا کے کنارے نہیں رکھ سکتا تھا لیکن وہاں دور دور تک کسی آدمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔"

المنصور نے تنگ آئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو جنتجس کو طول کیوں دے رہا ہے۔ میں نے کہا تو ہے کہ اگر یہ کوئی پیچیدہ اور لمبی داستان ہے تو اس وقت رہنے دے۔ کل صبح دوبارہ آ جانا پھر میں تیری یہ داستان غور سے سنوں گا اور تیرے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔"

عدن کا تاجر رونے لگا۔ "جنابِ! کل تک تو یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ میرے اس مقدمے کا تعلق کسی انسان سے نہیں ہے۔ مجھ پر تو ایک عقاب نے یہ ظلم کیا ہے۔"

المنصور نے حیرت سے پوچھا۔ "عقاب نے تجھے لوٹ لیا، وہ کس طرح؟"

تاجر نے کہا۔ "تھیلی کا رنگ سرخ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عقاب نے اوپر سے غوطہ لگایا۔ وہ سیدھا میری تھیلی کو پنجوں میں لے کر ایک طرف پرواز کرنے لگا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ میرے جسم پر ایک پاجامے کے سوا کوئی کپڑا نہ تھا۔ میں نے پتھر اٹھا اٹھا کر عقاب کو مارے مگر وہ اتنی بلندی پر تھا کہ میرے پتھر عقاب تک نہیں پہنچے۔ جنابِ! پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تلملا کر گیا۔ میں کیسے کا نہ رہا۔ میں برباد ہو گیا۔"

المنصور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ عجیب مقدمہ ہے کہ جس کا مدعا علیہ عقاب ہے۔ اس عقاب کو کہاں تلاش کیا جائے اور اس سے تھیلی کس طرح حاصل کی جائے۔ عدن کا تاجر المنصور کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد المنصور نے تاجر سے کہا۔ "تیرا مقدمہ کسی آدمی سے متعلق ہوتا تو میں کوئی کارروائی کرتا مگر میں اس عقاب کو کہاں تلاش کروں۔ پتا نہیں وہ تیری تھیلی کہاں لے گیا۔"

تاجر روئے جا رہا تھا، کہنے لگا۔ "جنابِ! کچھ بھی کریں، میں تو برباد ہو گیا۔ میں تو وطن بھی واپس نہیں جا سکتا۔"

ڈاکو کی ماں پریشان ہو رہی تھی کہ عدن کے تاجر نے یہ اپنا کیسا مقدمہ پیش کر دیا ہے جس کا فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس نے المنصور سے درخواست کی۔ "جنابِ! ان کو تو رخصت کریں اور کل بلائیں اور میرے مقدمے پر غور فرمائیں۔"

المنصور نے بھی تاجر سے یہی کہا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دے

کیونکہ تیرا مقدمہ بہت پیچیدہ ہے۔ میں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

محل کے داروغہ کو حکم دیا۔ "اس کو مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے کیونکہ یہ غریب سرائے میں بھی نہیں رہ سکتا۔"

داروغہ نے اس کو مہمان خانے میں پہنچادیا۔

المنصور نے عورت کو قریب بلایا اور کہا۔ "تو کتنی بڑی بے وقوف عورت ہے کہ اپنے قاتل اور ڈاکو بیٹے کی رہائی چاہتی ہے۔ تو دو دن ٹھہر جا تاکہ تیرے سامنے ان ورثا کو بھی بلوا لوں جن کے عزیزوں کو تیرے بیٹے نے قتل کیا اور انہیں لوٹ لیا۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ تیرے بیٹے کو رہا کردیا جائے یا سزا دی جائے۔"

عورت زار و قطار رونے لگی اور کہا۔ "مجھے کسی سے غرض نہیں۔ میں تو اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے تو اپنا بیٹا چاہیے۔ اس نے کتنے قتل کئے اور کس کس کو لوٹا' میں نہیں جانتی۔ اب آپ اس کو ایک بار رہا کردیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ وہ آئندہ یہ کام نہیں کرے گا۔"

المنصور نے غصے میں کہا۔ "عجیب پاگل عورت ہے' میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

عورت نے اپنی رحم کی درخواست المنصور کے سامنے رکھ دی۔

عورت کی ضد جاری رہی۔ "میں اسے رہا کروا کے رہوں گی۔"

المنصور نے عورت کے ہاتھ سے درخواست لے لی اور اسے پڑھنے لگا۔

درخواست میں عورت نے خود کو بیوہ لکھا تھا جس کا صرف یہی ایک بیٹا تھا۔ معاشی حالات کی خرابیوں نے بیٹے کو بچپن ہی سے بگاڑ دیا۔ پہلے وہ چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ڈاکے مارنے لگا اور ڈاکا زنی کے دوران میں جنہوں نے مزاحمت کی' انہیں مجبوراً قتل کردیا۔ اس عورت نے اپنی درخواست میں اپنی معاشی بدحالیوں کو بیٹے کے جرائم کا ذمے دار ٹھہرایا تھا۔

المنصور نے عورت سے پوچھا۔ "تو وعدہ کرتی ہے کہ اگر تیرے بیٹے کو معاف کردیا گیا تو وہ نیک بن جائے گا اور ڈاکا زنی اور قتل و غارت گری سے باز آجائے گا۔ اب مجھے یہ بتا کہ وہ کون سا ایسا شریفانہ پیشہ اختیار کرے گا جس سے تیرے اور تیرے بیٹے کی معاشی حالت سدھر جائے گی؟"

عورت نے جواب دیا۔ "اس کو آپ اپنی فوج میں ملازم رکھ لیں تاکہ جب وہ کسی علاقے پر حملہ آور ہو تو اس کا لوٹ مار کا مشغلہ بھی جاری رہے اور قتل و غارت گری کا شوق بھی پورا ہوتا رہے۔"

المنصور کو عورت کی بے باکی بہت بری لگی۔ "تو ہمارے جہاد کو قتل و غارت گری اور لوٹ مار کہہ رہی ہے۔ میں تو تیرے ڈاکو بیٹے کو کبھی بھی اپنی فوج میں ملازمت نہیں دوں گا۔ افسوس کہ میں تیری کسی دلیل سے بھی نہ تو متاثر ہوا اور نہ مطمئن۔ تیرے بیٹے کو رہا نہیں کیا جاسکتا۔"

عورت نے خوشامد درآمد تو بند کردی۔ بس بیٹھ کر زار و قطار روتی رہی۔

المنصور نے درخواست کے نیچے اپنا فیصلہ لکھ دیا اور کہا۔ "اسے قید خانے کے حاکم کو پہنچادیں۔"

المنصور کو ان کئی واقعوں نے بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔ عدن کا تاجر اپنے پیچیدہ مقدمے کا فیصلہ سننے کے لئے بے قرار تھا۔ وہ تاجر سے کہہ سکتا تھا کہ عقاب کو دعا علیہ بنا کے بلوایا نہیں جاسکتا اور نہ ہی نامعلوم پتے کے حامل پرندے کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس مقدمے کو فوراً مسترد کر سکتا تھا مگر اس نے عدن کے تاجر کو اپنے مہمان خانے میں جگہ دے دی تھی اور مقدمے کو قبول بھی کرلیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ زبیدہ کے پاس گیا اور دل بہلانے کی کوشش کی۔ زبیدہ نے اداس اور افسردہ المنصور کو خوش کرنے کی کوشش کی مگر اس وقت اس میں بھی وہ شگفتگی اور شوخی نہیں پائی جاتی تھی جو اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ اسے اچانک اپنے مشیر ابو منیو کا خیال آیا۔

المنصور نے اچانک اپنے خادم خاص مسعود کو آواز دی۔ جب وہ آگیا تو اس سے پوچھا۔ "تجھے کچھ پتا ہے کہ ان دنوں ابو منیو کہاں ہوگا؟"

وہ بات تو شعلہ سے کررہا تھا لیکن کن انکھیوں سے دیکھ زبیدہ کو رہا تھا۔

ابو منیو کے ذکر نے زبیدہ میں جان ڈال دی اور وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آنے لگی۔

شعلہ نے پوچھا۔ "کیا ابو منیو کو بلوایا جائے؟"

المنصور نے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب تک اپنے آس پاس اپنے مشیر و وزیر' ہمدرد اور ہم صحبت کو موجود نہ ہوں' سازو آواز میں مزہ نہیں آتا۔ ابو منیو کو فوراً بلواؤ۔"

شعلہ واپس چلا گیا اور زبیدہ میں اچانک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوگئی۔ اب وہ بہت ہشاش بشاش' شوخ و طرار نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک ایسا طربیہ کلام سنایا کہ المنصور کو بے حد مزہ آیا۔

جب وہ کلام سنا چکی تو المنصور نے اسے اپنے قریب بلایا اور سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "زبیدہ تجھے کچھ معلوم ہے کہ میں تجھے کس قدر چاہتا ہوں؟"

زبیدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جانتی ہوں اور مجھے اس پر ناز بھی ہے کہ خلافتِ بنو امیہ کا سب سے بڑا آدمی مجھے پسند کرتا ہے۔"

المنصور نے جھنجلا کر اس کی تردید کی۔ "پسند کرتا ہے' یہ تو نے

کیا کہہ دیا۔ میں تجھے بے حد چاہتا ہوں' تجھ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"

زبیدہ نے بھی جواباً کہا۔ "مجھے بھی آپ سے محبت ہے۔"

لیکن المنصور کو زبیدہ کے لہجے اور آواز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ زبیدہ نے جو کچھ کہا وہ رسماً ہے۔ دل اس میں شامل نہیں ہے۔

زبیدہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ مزید سنائے لیکن المنصور کو معلوم تھا کہ اس کے گیت میں اس کا دل شامل نہیں ہے اس لئے زبیدہ کے گانے میں وہ لطف و کیف شامل نہیں ہوگا جس کی وہ ضرورت محسوس کررہا ہے۔

زبیدہ کھڑی ہوگئی اور پوچھا۔ "آپ کو کچھ سناؤں؟"

المنصور نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ "بیٹھ جا اور میری باتیں غور سے سن۔"

زبیدہ سہم گئی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کے خلاف کوئی اہم فیصلہ سنایا جانے والا ہے۔

المنصور ٹکٹکی لگائے زبیدہ کو دیکھتا رہا اور پھر دریافت کیا۔ "کیا تو میرے ماضی سے واقف ہے؟"

زبیدہ نے معصومیت سے جواب دیا۔ "صرف اتنا کہ آپ کا تعلق عرب سے ہے اور آپ کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا۔"

المنصور نے کہا۔ "میں تجھ سے اپنے قبیلے اور اپنے آباواجداد کے بارے میں نہیں پوچھ رہا۔ میرا سوال اپنی ذات سے متعلق ہے۔ میں جو کبھی محمد بن عبداللہ ابنِ ابی عامر تھا اور لوگوں میں صرف ابنِ ابی عامر مشہور تھا۔"

زبیدہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "میں آپ کے بارے میں صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ نے نہایت معمولی درجے سے ترقی کرکے یہ بلند و بالا مقام حاصل کیا ہے۔"

المنصور نے کہا۔ "ہاں۔ میں نہایت معمولی آدمی تھا لیکن یہ معمولی آدمی لوگوں کی نظروں میں تھا اور نہ ہی بذاتِ خود اپنے آپ کو ہمیشہ غیر معمولی آدمی سمجھتا رہا ہوں۔"

زبیدہ ساکت و صامت المنصور کی باتیں سنتی رہی اور المنصور کہتا رہا۔ "جب میں اپنے ماضی کے طویل سفر کو یاد کرتا ہوں تو پورے وجود میں جھرجھری پیدا ہوجاتی ہے۔ خلیفہ الحکم' ملکہ صبح' مصحفی' غالب اور ان جیسے بے شمار لوگوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا' انہیں اپنی راہ سے ہٹانا یا ذلیل کرکے پیچھے کردینا نہایت خطرناک اور مشکل ترین کام تھا۔ میری تمام دماغی اور جسمانی کوششوں کا ماحصل یہ تھا کہ سب کو پیچھے کردیا جائے اور جو پیچھے جانے پر آمادہ نہ ہو' اسے قتل کروا دیا جائے۔ میں کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کرسکتا جو میری مطلوبہ شے پر نظر رکھتا ہو۔ تو میری بات سمجھ رہی ہے یا مزید سمجھاؤں؟"

زبیدہ نے محسوس کیا کہ اس کا حلق خشک ہوچکا ہے۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ اس نے رک رک کر اور اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "میں آپ کی باتوں کا مطلب خوب سمجھ رہی ہوں۔"

المنصور نے کہا۔ "بہرحال صرف تیرے سمجھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو دوسروں کو بھی یہی بات سمجھا دے۔"

کافی دیر بعد ابو منیو بھی آگیا اور اس کو دیکھتے ہی المنصور نے کہا۔ "تو کہاں تھا۔ تیرے بغیر یہ محفل سونی تھی۔"

یہ کہتے ہوئے المنصور نے گردن جھکالی۔

ابو منیو نے زبیدہ کو دیکھا۔ اب زبیدہ ابو منیو سے نظریں چرا رہی تھی۔

المنصور نے زبیدہ کو حکم دیا۔ "ہاں اب شروع کر۔ شاید میری ہی طرح تجھے بھی ابو منیو کا انتظار تھا۔"

زبیدہ نے اس بار جو گیت سنایا اس میں عشق و محبت کی مجبوریاں بیان کی گئی تھیں۔ وہ گیت سنا رہی تھی اور آنسوؤں سے روتی جارہی تھی' یہاں تک کہ وہ اچانک خاموش ہوگئی اور بھرائی ہوئی آواز میں المنصور سے معذرت کرلی۔ "جناب! میں بہت تھک چکی ہوں۔ مجھے کچھ دیر ستانے کی اجازت دیں۔"

المنصور نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کمرے میں آنکھیں بند کرکے لیٹ جا اور کوشش کر کہ اس وقت تو جس کشمکش میں مبتلا ہے اس سے تجھے نجات مل جائے۔"

زبیدہ ملحقہ کمرے میں چلی گئی تو المنصور نے ابو منیو سے کہا۔ "تیرے آنے سے پہلے میں نے زبیدہ کو اپنے بارے میں بتایا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔"

ابو منیو کی بھی حالت غیر ہونے لگی کہ پتا نہیں اس کی عدم موجودگی میں المنصور نے زبیدہ سے کس قسم کی باتیں کی ہیں کہ وہ ابو منیو کے آتے ہی ملحقہ کمرے میں اس سے منہ چھپا کر چپ چاپ پڑ رہی۔

المنصور نے محسوس کرلیا کہ ابو منیو اس وقت کہیں اور ہے۔ وہ خود بھی کچھ دیر خاموش رہا اور انتظار کرتا رہا کہ ابو منیو کی اندرونی کشمکش سے کس قسم کا ردِعمل ظاہر ہوتا ہے لیکن ابو منیو از خود کسی قسم کی بات کرنے سے قاصر رہا۔

المنصور نے اچانک سوال کیا۔ "کیا بات ہے ابو منیو! کن خیالوں میں گم ہو؟"

المنصور نے ابو منیو سے کیا پوچھا تھا' ابو منیو یہ بھی نہ سن سکا تو المنصور کہنے لگا۔ "میں نے زبیدہ کو بتایا کہ زندگی بھر میرا یہ نصب العین رہا ہے کہ میں اپنے کسی ساتھی کو اپنے سے آگے نہ دیکھوں۔"

ابو منیو نے بے خیالی میں کہا۔ "یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔"

المنصور نے کہا۔ "مجھے جب بھی کوئی شے پسند آئی تو میں نے

اسے کسی نہ کسی طرح حاصل ضرور کرلیا۔ میں نے خلیفہ اور ملکہ صبح کو محل میں قید کردیا ہے اور خود المنصور بن گیا۔ میں نے پچاس سے زیادہ جہازوں میں حصہ لیا اور ہمیشہ کامیاب رہا۔ تم سب جانتے ہو کہ میں نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کس قسم کا سلوک کیا۔ وہ حاجب بننا چاہتا تھا' وہ سپہ سالار بننے کی فکر میں تھا جب کہ میں اس کو اپنا بیٹا تک ماننے کو تیار نہ تھا پھر کیا ہوا۔ اب وہ کہاں ہے؟ میرا تو ایک اصول ہے کہ میں اپنی مرضی پر کسی دوسرے کی مرضی کو مسلط ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ آج میں نے زبیدہ پر واضح کردیا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس نے بھی رسماً مجھے یہی جواب دیا کہ وہ بھی مجھے بہت چاہتی ہے لیکن کیا میں نے اس کی بات پر یقین کرلیا' ہرگز نہیں۔"

ابو منیرہ سمجھ رہا تھا کہ المنصور یہ ساری باتیں کیوں کررہا ہے۔

المنصور کہتا رہا۔ "عبدالرحمٰن بن مطرف سرتسلط کا حکمران تھا مگر اس نے میرے بیٹے عبداللہ سے مل کر میرے خلاف سازش کی۔"

وہ بولتے بولتے ایک دم رک گیا اور اسے احساس ہوا کہ وہ بے خیالی میں کوئی غلط بات کہہ گیا ہے۔ اس نے فوراً اصلاح کی اور کہا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ عبدالرحمٰن بن مطرف نے میرے بیٹے سے مل کر میرے خلاف سازش کی حالانکہ عبداللہ میرا بیٹا نہیں تھا لیکن وہ اسی حیثیت سے عبدالرحمٰن بن مطرف سے ملا تھا اور عبدالرحمٰن بن مطرف اس کو میرا بیٹا سمجھ کر اس کے ساتھ مل کر سازش کرتا رہا۔"

ابو منیرہ کو المنصور کی باتوں سے الجھن ہورہی تھی مگر وہ المنصور کو منع نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اپنی ان فضول باتوں سے ابو منیرہ کو خوفزدہ نہ کرے۔

المنصور نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ "عبدالرحمٰن بن مطرف بھی مارا گیا اور عبداللہ بھی اس محل کے ایک گوشے میں دائمی نیند سو رہا ہے۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب بھی جشن طرب ہوگا' میں اپنی تلوار اپنے پاس رکھ کے لطف اندوز ہوا کروں گا۔"

ابو منیرہ نے اس دھمکی کا بھی مفہوم پالیا۔ یعنی اس طرح المنصور ابو منیرہ کو بتا رہا تھا کہ جس دن بھی اس کو زبیدہ اور ابو منیرہ کے عشق و محبت کا یقین ہوگیا تو وہ ان دونوں کو جشنِ طرب میں ہی قتل کردے گا۔

ابو منیرہ نے موضوع بدلنا چاہا اور عبداللہ سنگدل کا ذکر چھیڑ دیا۔ "آپ لیون کے حکمران برومند کے خلاف کب فوج کشی کریں گے۔ سنا ہے کہ اس عیسائی ریاست نے خراج دینا بھی بند کردیا ہے چونکہ افریقہ میں زیری بن عطیہ نے جمعہ کے خطبہ سے آپ کا اور خلیفہ کا نام نکال دیا ہے اس لئے لیون کا عیسائی برومند اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ آپ بیک وقت دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتے اور آپ پہلے زیری بن عطیہ کے خلاف فوجی کارروائی کریں گے۔ اس کی ریاست لیون کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں ہوگی اسی لئے اس نے خراج دینا بند کردیا ہے۔"

المنصور نے پوچھا۔ "یہ ساری باتیں تجھے کس طرح معلوم ہوئیں؟"

ابو منیرہ نے جواب دیا۔ "آپ ہی کے ذریعے۔ اس وقت آپ کسی اور فکر میں ہیں ورنہ مجھے اس یاددہانی کی ضرورت نہ پیش آتی۔"

المنصور نے بیوہ کی درخواست کا ذکر کیا اور عدن کے تاجر کی روداد ابو منیرہ کو بتائی اور کہا۔ "میں نے بیوہ کی درخواست تو نمٹادی مگر عدن کے تاجر کا مقدمہ اس لئے التوا میں پڑ گیا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ عقاب کے خلاف کس طرح کارروائی کی جائے۔"

ابو منیرہ نے پوچھا۔ "کیا بیوہ عورت کے بیٹے کو پھانسی دے دی گئی ہوگی؟"

المنصور کچھ دیر صرف عدن کے تاجر کے بارے میں سوچتا رہا اور ابو منیرہ سے پوچھا۔ "کیا اس عقاب کے بارے میں یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ تھیلی لے کر کس طرف گیا تھا؟"

ابو منیرہ نے جواب دیا۔ "اگر عدن کے تاجر نے اس کا پیچھا کیا تھا تو اسے ضرور معلوم ہوگا کہ عقاب کس سمت کو اڑا تھا۔"

المنصور نے اسی وقت عدن کے تاجر کو طلب کرلیا اور اس سے عقاب کی پرواز کی سمت کے بارے میں معلوم کیا۔

عدن کے تاجر نے اس سمت کی نشاندہی کردی تو المنصور نے ابو منیرہ سے کہا۔ "اب تم عامل شہر سے ملو اور اس سے کہو کہ وہ اس سمت میں آباد لوگوں کی خفیہ تحقیقات کرے اور یہ معلوم کرے کہ اس علاقے کے کس خاندان یا کس گھر میں اچانک خوشحالی آئی ہے۔ یہ کام نہایت ہوشیاری اور رازداری سے ہونا چاہیے۔ اللہ نے چاہا تو اگر عقاب کا پتا نہ چلا تو عدن کے تاجر کی تھیلی کا پتا ضرور چل جائے گا۔"

ابو منیرہ یہ ہدایت لے کر عامل شہر کے پاس چلا گیا۔

المنصور نے زبیدہ کو جاتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ المنصور نے اس کے قریب کھڑے ہوکر پوچھا۔ "طبیعت سنبھلی؟"

زبیدہ نے اٹھنا چاہا تو المنصور نے اسے اٹھنے نہیں دیا اور کہا۔ "ابو منیرہ تو چلا گیا۔ کچھ دیر میں بھی آرام کروں گا' تو بھی آرام کرلے۔"

المنصور مستورات میں چلا گیا اور اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کی ماں کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کیں اور اسے بتایا۔ "تیرے بیٹے کے بارے میں آج ایک مجذوب نے کچھ عجیب و غریب باتیں بتائیں اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تو نے عبدالرحمٰن کو اسلام سے دور کردیا ہے۔"

عبدالرحمٰن کی ماں نے جواب دیا۔ "آپ تہمت نہ لگائیں۔

میں نے اپنے بیٹے کو اسلام کے خلاف ہرگز برگشتہ نہیں کیا۔ دینی نکتہ نظر ہی سے البتہ محفوظ رکھا ہے۔"

المنصور نے اسے بتایا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے کہ عبدالرحمٰن الملت الکفیہ کا ایک رکن ہے اور الملت الکفیہ نامی جماعت کے ارکان ادیان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب جھوٹے ہیں کیونکہ کسی دین کے پاس اس کے سچے ہونے کا قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ تیرا بیٹا عبدالرحمٰن اسلام کا نہیں بے دینی کا پیرو ہے۔"

عبدالرحمٰن کی ماں نے جواب دیا۔ "وہ عیسائیت کی بھی مخالفت کرتا ہوگا کیونکہ میں نے تو شادی سے پہلے ہی یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ ہم دونوں اپنے بیٹے کو کسی خاص دین کا پیرو نہیں بنائیں گے اور اسے آزاد چھوڑ دیں گے کہ وہ جس دین پر چاہے عمل پیرا ہوجائے۔"

المنصور نے کہا۔ "تو اب تو وہ کسی دین کا بھی پیرو نہیں ہے۔ میں تیرے بیٹے کو سپہ سالار بنانا چاہتا ہوں۔ اگر وہ بے دین رہا تو مسلمان اسے اپنا سپہ سالار نہیں مانیں گے۔"

عبدالرحمٰن کی ماں نے نرمی سے کہا۔ "میں اس کو سمجھا دوں گی اور چاہے نمائشی ہی ہو' وہ مسلمانوں کو مسلمان ہی نظر آئے گا۔"

المنصور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا اور پھر اٹھ کر عبدالملک کی ماں کے پاس گیا۔ اس سے یہ خوشخبری سنائی کہ اس کا بیٹا عنقریب خلافت بنوامیہ کا حاجب مقرر کردیا جائے گا حالانکہ یہ منصب ابھی تک خود اس کے پاس رہا ہے۔

عبدالملک کی ماں نے پوچھا۔ "اگر میرا بیٹا حاجب بن گیا تو آپ کیا رہ جائیں گے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "میں المنصور ہوں' السید ہوں' الملک الکریم ہوں' المؤید ہوں۔ بس خلیفہ نہیں ہوں۔ باقی سب کچھ ہوں۔"

عبدالملک کی ماں اس خوشخبری سے بے حد مسرور نظر آرہی تھی کہ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا عبدالملک حاجب ہوجائے گا۔

○☆○

قید خانے کا حاکم پریشان حال المنصور سے ملنے آیا اور بیوہ عورت کی درخواست اس کے سامنے رکھ دی اور کہا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل تو کروں گا مگر اس سے انصاف کا خون ہوگا۔"

المنصور نے زبانی دریافت کیا۔ "آخر کس طرح؟ میں نے تو اس کی سزائے موت بحال رکھی ہے۔ کیا اس کو موت کی سزا دے دی گئی؟"

قید خانے کے حاکم نے جواب دیا۔ "جناب! آپ نے تو یہ لکھ دیا ہے کہ اسے فوراً رہا کردیا جائے۔"

المنصور نے وہ کاغذ مانگا۔

حاکم نے وہ درخواست المنصور کے سامنے رکھ دی۔

المنصور اپنی تحریر پہچانتا تھا' دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔ "میں نے یہ کیا لکھ دیا؟ حیرت ہے کہ میں نے تو اس سلسلے میں اس کی ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تیرے بیٹے کو سزائے موت دی جائے گی مگر فرمان میں رہائی کا حکم دے دیا۔ یہ مجھ سے کیسی غلطی ہوگئی ہے۔"

المنصور اٹھ کر گیا اور اپنے پچھلے فرمان کو کاٹ دیا اور پھر وہی سب کچھ لکھ دیا کہ اسے فوراً رہا کردیا جائے اور اس فرمان کو بند کرکے حاکم کے حوالے کردیا اور کہا۔ "اس کی لاش اس کی ماں کے حوالے کردی جائے۔"

حاکمِ قید خانہ نے یہ فرمان قید خانے میں جاکر کھولا تو حیران رہ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ المنصور کو کیا ہوگیا۔ کیا واقعی المنصور یہی چاہتا ہے کہ اس قاتل اور ڈاکو کو رہا کردیا جائے۔ اس نے قید خانے کے داروغہ سے پوچھا۔ "کیا اس کو رہا کردیا جائے؟"

داروغہ نے پوچھا۔ "جب تم نے المنصور سے پوچھا تھا کہ آپ نے قاتل اور ڈاکو کو رہا کردینے کا جو فرمان جاری کیا ہے' اس پر عمل کیا جائے یا ایسا سوا ہوا ہے تو المنصور نے کیا جواب دیا تھا؟"

حاکم نے بتایا۔ "رہائی کا فرمان سوا لکھا گیا تھا۔"

بیوہ عورت ان سب سے بےخبر تھی کہ جب المنصور نے دوسری بار بھی رہائی کا فرمان جاری کیا ہے تو اس کے بیٹے کو رہا کیوں نہیں کیا جاتا۔

حاکم نے بیوہ عورت کو ڈانٹ دیا اور دھمکی دی۔ "تو چپ رہ اور عدالتی معاملات میں دخل نہ دے ورنہ تجھے بھی تیرے بیٹے کے ساتھ بند کردیا جائے گا۔"

بیوہ عورت نے شور کیا۔ "ظالمو! اللہ کے غضب سے ڈرو۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے جو مجھے بھی بند کردو گے۔"

حاکم نے کہا۔ "اچھا اب تو اپنے گھر جا۔ میں تیرے بیٹے کی لاش کل تک تیرے پاس بھجوا دوں گا۔"

بیوہ نے ہنگامہ کھڑا کردیا۔ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتا رہی تھی کہ جب اس کے بیٹے کو دوبارہ رہا کردینے کا حکم دے دیا گیا ہے تو یہ قید خانے والے اپنی مرضی کیوں چلا رہے ہیں۔"

قید خانے کے داروغہ نے بیوہ عورت کو چپکے سے بتایا۔ "میری ماں! تو شور نہ کر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حاکم مقتولوں کے ورثا کو المنصور کے پاس پہنچا دے اور وہ سب رو رو کر تیرے بیٹے کے خلاف درخواست کریں کہ اسے سزائے موت دی جائے اور اگر اس طرح بات بگڑ گئی تو یہ حاکم واقعی تیرے بیٹے کی لاش تیرے گھر بھجوا دے گا۔"

بیوہ عورت نے داروغہ سے پوچھا۔ "کیا میں المنصور سے دوبارہ ملوں؟"

داروغہ نے منع کیا اور کہا۔ "تو چپ ہو کر بیٹھ جا۔ ہو سکتا ہے کہ حاکم اب تیسری بار المنصور کے پاس نہ جائے اور تیرا بیٹا رہا کر دیا جائے۔ تیرے جانے سے ہو سکتا ہے کہ المنصور اپنے اس فرمان کو واپس منگوائے اور کاٹ کر سزائے موت کا حکم دے دے۔ اگر تو اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو دو چار دن خاموش رہ کیونکہ مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ حاکم تیسری بار المنصور کے پاس جانے کی ہمت کرے گا۔"

المنصور نے اسی دوران میں برومند پر حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا اور فوج روانگی کی تیاری کرنے لگی مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری فوج بھی افریقہ کے لئے تیار کی گئی۔ اس فوج کو واضح نائی سپہ سالار کی سرکردگی میں دے دیا گیا۔ یہ فوج زیری بن عطیہ کی سرکوبی کے لئے بھیجی جا رہی تھی اور المنصور ریاست لیون کے حکمران برومند کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ المنصور بیک وقت دو محاذوں پر لڑ سکتا ہے۔

اس دوران میں المنصور کو اطلاع ملی کہ ملکہ صبح سخت بیمار ہے۔

یہ خبر اس کے اپنے قصر میں بھی مشہور ہو گئی اور مرحوم سپہ سالار غالب کی بیٹی اسمائے المنصور کو پہلی بار مجبور کیا... کہ وہ ملکہ صبح کی عیادت کو جائے۔

المنصور نے اسما کو بتایا۔ "ملکہ میرے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتی ہے اس لئے اب میرا اس قصر میں جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

اسمائے کہا۔ "آپ چند دنوں بعد لیون کے محاذ پر چلے جائیں گے اس لئے آپ ملکہ کی عیادت کو ضرور جائیں کیونکہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں۔"

دل نہ چاہنے کے باوجود المنصور مدینۃ الزہرہ کے قصرِ خلافت میں پہنچا اور یہاں اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ محل کی نگرانی اس کا اپنا بھتیجا یعنی عستی لیو کا بیٹا کر رہا تھا۔

المنصور نے بھتیجے سے پوچھا۔ "یہاں تم کو کس نے تعینات کیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "عم محترم! یہاں آپ کے سوا بھی کوئی تعینات کر سکتا ہے؟"

المنصور کو حیرت تھی کہ اس نے اپنے بھتیجے کو یہاں تعینات کیا اور اسے یاد نہیں آ رہا کہ ایسا کب ہوا۔

اسی موقع پر اسے قاتل اور ڈاکو سے متعلقہ اپنا فرمان یاد آیا جس میں اس نے دوبارہ سوا فرمانِ رہائی جاری کر دیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے سوچا کہ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اس کے حواس جواب دے رہے ہیں اور وہ ان پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر حواس جواب دیتے رہے اور غلطیاں ہوتی رہیں تو کوئی چالاک آدمی ان غلطیوں سے کسی وقت بھی کوئی بڑا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس کا برسوں کی محنت سے حاصل کیا ہوا اثر و اقتدار خاک میں مل سکتا ہے۔

جب وہ ملکہ صبح سے ملنے گیا تو وہ کئی قسم کے احساسات میں مبتلا تھا۔ جب ملکہ صبح کو بتایا گیا کہ المنصور اس کی عیادت کو آیا ہے تو ملکہ کو ایک جھٹکا سا لگا اور خواجہ سرا شاہد نے کہا۔ "اس سے کہہ دو اب میں ٹھیک ہوں۔"

خواجہ سرا شاہد نے المنصور کو بتایا۔ "ملکۂ عالیہ فرماری ہیں کہ اب وہ ٹھیک ہیں، آپ فکرمند نہ ہوں۔"

المنصور نے کہا۔ "ملکہ سے کہو کہ یہ جو چند الفاظ تو نے ادا کئے ہیں میں انہیں ملکۂ عالیہ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

خواجہ سرا شاہد نے ملکہ کو بتایا۔ "ملکۂ عالیہ! وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ آپ کی مزاج پرسی آپ سے براہِ راست کریں گے۔"

ملکہ صبح نے کہا۔ "تو اسے بتا دے کہ میں سو رہی ہوں، جب جاگوں گی تو بلوا لوں گی۔"

خواجہ سرا شاہد نے کہا۔ "ملکۂ عالیہ! یہ بات میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ جب آپ جاگیں گی تو بلوا لیں گی۔ المنصور کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ آپ بیدار ہیں۔"

ملکہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی، بات تو بہت دور کی ہوگی۔"

آخر کچھ ردوقدح کے بعد المنصور کو ملکہ سے ملوا دیا گیا لیکن اس وقت ملکہ نے اپنے جسم پر ایک شال ڈال رکھی تھی اور اس کا منہ دوسری طرف تھا۔

المنصور نے آتے ہی سلام کیا جس کا ملکہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

المنصور نے پوچھا۔ "اب آپ کیسی ہیں؟"

ملکہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش لیٹی رہی۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے وہ سو رہی ہو۔

المنصور نے کہا۔ "ملکۂ عالیہ! میں ریاست لیون کی مہم پر نکل رہا ہوں۔ سنا کہ آپ بیمار ہیں، میں آپ کی مزاج پرسی کو آیا ہوں۔"

ملکہ نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ المنصور نے اس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی تو ملکہ صبح اٹھ کے بیٹھ گئی، تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "فاصلہ رکھو۔"

المنصور نے طنزاً کہا۔ "میں نے زیری بن عطیہ کے خلاف مہم روانہ کر دی ہے کیونکہ اس نے جمعہ کے خطبے سے خلیفہ کا نام نکال دیا ہے۔"

ملکہ نے کہا۔ "خلیفہ کا نہیں، تیرا نام نکال دیا ہے جسے تو نے

اپنی ذاتی اغلال کر دار رکھا تھا۔"

المنصور نے کہا۔ "آپ نے زیری بن عطیہ کو ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوائی تھیں، وہ بیکار گئیں اور وہ باغی بھی ہو گیا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

ملکہ صبح نے جواب دیا۔ "یہی سوال میں تجھ سے کر سکتی ہوں کہ یہ تو سن مانیاں کرتا چلا جا رہا ہے، کیوں اور اس سے تو حاصل کیا کرنا چاہتا ہے؟"

المنصور نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔ "ملکۂ عالیہ! حکمرانی نہایت مشکل کام ہے۔ میں نے آپ کو اور آپ کے بیٹے ہشام کو حکومت کی دوسری سے نجات دلا دی ہے اور خلافت اور حکومت کا بار بھی میں نے اٹھا لیا ہے۔ آپ دونوں کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

ملکہ صبح نے کہا۔ "اگر بات اتنی ہوتی کہ میرا بیٹا ہشام ہاالختیار خلیفہ ہوتا اور اس کی ماں کی حیثیت سے مجھے بھی اختیارات حاصل ہوتے تو میں واقعی تیری شکر گزار ہوتی مگر تو نے ہم دونوں کو قصرِ خلافت میں قید کر دیا اور خود اپنے تعمیر کردہ شہر مدینۃ الزہرہ سے حکومت کرنے لگا۔"

المنصور نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ملکۂ عالیہ! میں آپ سے معاملاتِ خلافت پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ کی عیادت کو آیا ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟"

ملکہ صبح نے جواب دیا۔ "اگر ہم بااختیار ہوتے تو ہر روز قصرِ خلافت سے میری بیماری کی تفصیلات اور خبریں جاری ہوتی رہتیں اور یہ تفصیلات تیرے لئے جاری کی جاتیں۔ اس وقت جس طرح تو میری خیریت معلوم کر رہا ہے اس وقت مجھے اتنی زحمت نہ کرنی پڑتی اور مجھے اپنے قیدی ہونے کا احساس نہ ہوتا۔"

المنصور نے کہا۔ "دیکھیے ملکۂ عالیہ! میں صرف آپ کی مزاج پرسی کو آیا ہوں مگر آپ شکوہ و شکایت اور فضول موضوعات لے کر بیٹھ گئی ہیں۔ چلیں میں مستعفی ہوا جاتا ہوں۔ آپ میری جگہ زیری بن عطیہ کو دے دیں اور مجھے قتل کروا دیں۔ کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ زیری بن عطیہ آپ دونوں کا تابعدار بن کر رہے گا۔ وہ آپ دونوں سے مجھ سے زیادہ برا سلوک کرے گا کیونکہ آپ عورت ہیں اور ایک حد تک حکم چلا سکتی ہیں۔ خلیفہ نے زنانے کپڑے پہن لئے ہیں اور وہ جنت ارضی کی حوروں میں مزے کر رہا ہے۔ اس لئے آپ کو میرا یہ مشورہ ہے کہ حالات سے سمجھوتا کر لیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی اور آپ کی مثالی عبادت گاہوں کے بتوں جیسی ہوگی کہ لوگ آئیں، عقیدت کے نذرانے پیش کریں، آپ کا احترام کرتے رہیں اور کسی چھیڑ چھاڑ کے بغیر واپس چلے جائیں۔ نہ کوئی آپ کو نقصان پہنچائے گا اور نہ آپ کسی کو نقصان پہنچا سکیں گی۔ آپ کا کوئی عقیدت مند یا کوئی پرستار کیا کر رہا ہے، آپ یہ فکر نہ رکھیں کیونکہ آپ کا اپنے کسی عقیدت مند یا پرستار پر کوئی اختیار نہیں ہے۔"

ملکہ صبح کے لئے یہ باتیں ناقابلِ برداشت ہو گئیں اور اس نے چیخ کر حکم دیا۔ "دفع ہو جا یہاں سے، ارے کوئی ہے، اس کو یہاں سے لے جاؤ۔"

وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ المنصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "افسوس! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اختلال کی بھی مریضہ ہیں۔ میں نے اپنا قیمتی وقت یہاں بلاوجہ ضائع کر دیا۔"

قصر سے نکلتے ہوئے اس نے بھتیجے کو حکم دیا۔ "ملکۂ عالیہ خللِ دماغ کی مریضہ ہیں۔ شاہی طبیبوں سے کہنا کہ وہ ان کے علاج پر خاص توجہ دیں۔"

بظاہر تو المنصور مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا مگر ملکہ صبح اس سے جس طرح پیش آئی تھی وہ نہایت اہانت آمیز تھا۔ اسے غصے کے ساتھ ملکہ صبح پر رحم بھی آیا جو المنصور کے خلاف انتہائی غم و غصہ رکھنے کے باوجود اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔

اس نے دیکھا قصر کے پھاٹک پر قید خانے کا حاکم اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔

المنصور گھوڑے سے اترا اور گھوڑے کی راس سائیس کو تھما دی اور حاکم کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے، کوئی نئی بات؟"

حاکم نے المنصور کا دوسرا فرمان سامنے کر دیا اور کہا۔ "جناب! آپ کیا اس قاتل اور ڈاکو کو واقعی رہا کرنا چاہتے ہیں؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "نہیں۔ میں اس قاتل درندے کو معاف نہیں کر سکتا۔"

حاکم نے کہا۔ "تو پھر آپ اپنے اس دوسرے فرمان کو بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں آپ نے دوبارہ رہائی کا حکم صادر فرمایا ہے۔"

المنصور نے اپنے اس دوسرے حکم کو بار بار پڑھا اور بے حد حیران ہوا کہ یہ اس سے دوسری غلطی کس طرح ہوئی۔

اسی دوران میں ابو منیہ اور عاصل شہر بھی آ گئے۔

عاصل شہر نے ایک ایسے شخص کا پتا لگا لیا تھا جو اچانک صاحبِ حیثیت ہو گیا تھا۔ یہ ایک باغ کا رکھوالا یا مالی تھا جس کے کنبے کی گزر بسر بمشکل ہوتی تھی مگر اب اس نے اپنے گھر کے جملہ افراد کو نئے کپڑے بنوا دیے تھے۔ پہلے یہ لوگ پیدل سفر کرتے تھے، اب گھر کے ہر فرد کے پاس ایک ایک گدھا بھی تھا۔ ننگے پاؤں رہنے والوں کو جوتے میسر آ گئے تھے۔ المنصور نے غصے میں پوچھا۔ "اس کو پکڑ کے لائے کیوں نہیں؟"

عاصل شہر نے جواب دیا۔ "اس کو ہم اپنے ساتھ لائے ہیں۔ آپ عدن کے تاجر کو بلوا لیں تاکہ ساری باتیں اس کے سامنے ہو جائیں۔"

اس وقت المنصور کئی الجھنوں کا شکار تھا۔ لیون پہنچنے کی

عجلت، ملکہ صبح سے تلخ و ترش باتیں اور ان کے دل و دماغ پر اثرات، قاتل اور ڈاکو کے غلط فرمانِ رہائی کی جھنجلاہٹ اور انہی پریشانیوں میں مالی یا باغبان کا یہ مسئلہ کہ وہ اچانک امیر کس طرح ہوگیا؟

وہ ان سب کو اپنے قصر کے اس حصے میں لے گیا جہاں بیٹھ کر وہ مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ یہیں جب باغ کے رکھوالے کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس رکھوالے کے قیمتی لباس اور وضع قطع کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے چپکے سے ابو مغیرہ کو حکم دیا۔ "عدن کے تاجر کو بھی بلوا لے۔"

اچانک المنصور کی نظریں قید خانے کے حاکم پر پڑیں تو وہ کچھ بے چین نظر آیا جیسے کہہ رہا ہو۔ "جناب۔ مجھے تو فارغ کردیں۔ یہ دوسرے معاملات کچھ زیادہ وقت لے لیں گے۔"

المنصور نے پچھلے فرمان پھاڑ کر پھینک دیے اور بعجلت لکھا۔ "بیوہ میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا معاشی بدحالیوں کی وجہ سے ناکارہ نکل گیا اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع کردی۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے بیٹے کو معاف کردیا جائے تو وہ اپنے بیٹے کو سدھار لے گی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جس کی عادتیں پختہ ہوگئی ہوں، اسے ایک کمزور عورت اپنی کوششوں سے بدل دے گی۔ جو عادتیں فطرتِ ثانیہ بن جائیں انہیں بدلا نہیں جاسکتا۔ اس لئے اس قاتل اور ڈاکو کو فوراً رہا کردیا جائے تاکہ ہم بھی دیکھیں کہ یہ کمزور عورت اپنے بیٹے کی فطرت ثانیہ کو کس طرح بدلتی ہے۔"

یہ لکھ کر فرمان کو ایک تھیلی میں رکھ کر اسے بند کردیا اور اس پر اپنی مہر لگا دی اور کہا۔ "اب چوتھی بار یہاں مت آنا۔ قاتل اور ڈاکو کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اسے فوراً قتل کردیا جائے۔"

قید خانے کے حاکم نے خوشی خوشی یہ فرمان لیا اور المنصور کے زبانی حکم کو غنیمت جانا کہ اس بار المنصور نے غلطی نہیں کی ہوگی اور قتل کا واضح حکم دے دیا ہوگا۔

اب وہ باغ کے رکھوالے سے مخاطب ہوا اور کسی تمہید کے بغیر نہایت درشت لہجے میں دریافت کیا۔ "وہ ہیرے جواہرات والی سرخ تھیلی کہاں ہے؟ اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا؟"

باغ کے رکھوالے نے المنصور کے آدمیوں کی نگرانی میں اپنے گھر جاکر سرخ تھیلی لی اور المنصور کے پاس آگیا۔

تھیلی سے زر و جواہر نکالے گئے اور عدن کے تاجر سے کہا گیا کہ وہ انہیں دیکھ کر بتائے کہ اس میں کتنی کمی ہوئی ہے۔

عدن کے تاجر نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ دس دینار کی مالیت کا سونا کم ہے۔

المنصور نے باغ کے رکھوالے سے پوچھا۔ "یہ سونا کہاں گیا؟"

باغ کے رکھوالے نے جواب دیا۔ "جناب! اسے میں نے خرچ کرڈالا۔"

المنصور نے غصے میں کہا۔ "تو نے اسے کیوں خرچ کرڈالا۔ یہ تیرے باپ کا مال تھا جو خرچ کردیا۔"

باغ کا رکھوالا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ عدن کے تاجر نے اپنا مال مل جانے کی خوشی میں اعلان کیا۔ "میں اس کم سونے کی مالیت کا خسارہ اس باغ کے رکھوالے کو معاف کرتا ہوں۔"

المنصور نے عدن کے تاجر کو بھی ڈانٹ دیا۔ "تیرا مقدمہ میری عدالت میں پیش ہے اس لئے اس کو معاف کرنے یا نہ کرنے کا اختیار مجھے حاصل ہے۔ تو کس طرح معاف کرسکتا ہے۔"

عدن کا تاجر خاموش ہوگیا۔ وہ بھی المنصور کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا تھا۔

المنصور نے باغ کے رکھوالے سے کہا۔ "یہ تھیلی عقاب کے پنجے سے چھوٹ کر گری تھی اور تو نے اسے پالیا تھا اس لئے تیرا فرض تھا کہ تو یہ تھیلی میرے پاس لاتا اور مجھے حقائق سے آگاہ کرتا مگر تو نے بددیانتی دکھائی اور اسے اپنی مرضی سے خرچ بھی کرنے لگا۔ تو کسی انعام کا بھی مستحق نہیں ہے۔"

اپنے مشیر ابو مغیرہ سے کہا۔ "میرے خزانچی کو بلواؤ۔"

اور جب خزانچی آگیا تو المنصور نے اسے حکم دیا۔ "دس دینار عدن کے تاجر کو دیے جائیں اور دس دینار باغ کے رکھوالے کو۔ ... یہ دس دینار باغ کے رکھوالے کو اس لئے دیے جارہے ہیں کہ اس نے یہ تھیلی چوری طلبی پر بلاعذر پیش کردی۔"

عدن کا تاجر خوشی سے رو رہا تھا، کہنے لگا۔ "جب عقاب میری تھیلی لے کر گیا تو میں دریا کے کنارے سے بازار تک روتا ہوا آیا اور لوگوں کو اپنے لٹ جانے کا حال سنایا۔ پر لوگوں نے مشورہ دیا کہ اپنا مقدمہ المنصور کے پاس لے جاؤ۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا فیصلہ فرما دیں گے کہ تیری تھیلی مل جائے گی۔ اس وقت مجھے لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ ایسا ممکن ہی نہیں۔ بھلا عقاب سے تھیلی کس طرح واپس لی جائے گی۔ میں بدرجۂ مجبوری یہاں آتو گیا تھا مگر یہ یقین نہیں تھا کہ یہاں سے میری تھیلی مجھے واپس مل جائے گی۔ اس وقت یہاں جو بھی موجود ہے، وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ مجھے میری تھیلی مل گئی اور یہ تھیلی مجھے کس طرح ملی، حاضرین نے یہ بھی دیکھ لیا۔ میں یہاں سے جہاں جہاں بھی جاؤں گا، یہ مشہور کرتا جاؤں گا کہ المنصور ایک ایسا عادل و منصف حکمران ہے جسے انسانوں کے علاوہ چرندوں اور پرندوں پر بھی اقتدار حاصل ہے۔"

المنصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جو تیرے جی میں آئے، کہتا رہ مگر آئندہ دریا میں نہانے سے پہلے اپنے سامان اور کپڑوں کو کہیں حفاظت سے رکھ دینا۔"

ابو مغیرہ بھی بے حد حیران تھا کہ المنصور کتنا اقبال مند شخص ہے کہ اسے کہیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔

اب ریاست لیون جانے کا قطعی فیصلہ ہوچکا تھا۔ فوج تیار تھی

اور المنصور جانے سے پہلے چند دن خوشگوار کیفیت میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک شب طرب منانے کا اہتمام کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اس تقریب میں صرف زبیدہ گائے گی۔

ابو منیو کو حکم دیا گیا کہ وہ اس محفل کا قصر نما لمحقہ باغ میں اہتمام کرے۔

جس طرح ابو منیو سے اہتمام کروایا جارہا تھا اس سے ابو منیو کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آرہی تھی کیونکہ وہ زبیدہ سے بے حد محبت کرتا تھا اور زبیدہ اسے چاہتی تھی۔

المنصور کو بھی دونوں پر شبہ تھا اور لیون جانے سے پہلے اس خاص محفل طرب کو شاید اسی لئے منعقد کیا تھا کہ وہ ان دونوں کو پکڑنا چاہتا تھا۔

دونوں نے شام کو مغرب کی نماز ایک ساتھ ادا کی اور المنصور ابو منیو کے ساتھ محفل کے انتظام کا جائزہ لینے باغ پہنچا۔ اس وقت ابر چھایا ہوا تھا اور پھوار پڑ رہی تھی۔

عشا کے وقت تک جن دوستوں اور حمید یاروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی وہ پہنچنا شروع ہوگئے لیکن کسی عالم یا فقیہ کو یہاں نہیں بلایا گیا تھا۔ اوپر نہایت باریک کپڑے کا شامیانہ تھا جس سے چھن چھن کر پانی نیچے آرہا تھا۔ فرش پر جگہ جگہ شراب کے خم اور پیالے رکھ دیے گئے۔ چند دوسری گانے والیاں بھی بلوائی گئی تھیں مگر اس محفل طرب کی خاص مغنیہ زبیدہ تھی۔

ابو منیو کا خوف سے بہت برا حال تھا۔ وہ عشا کی نماز کا انتظار کررہا تھا۔

عشا کی نماز اسی باغ کے ایک گوشے میں ادا کی گئی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ابو منیو نے المنصور کو بتایا۔ "مغرب سے پہلے مدینۃ الزہرہ کے قصر سے آپ کے بھتیجے کا پیغام آیا تھا کہ ملکہ کی حالت نازک ہے اس لئے کسی خاص وزیر یا مشیر کا قصر میں موجود رہنا ضروری ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں چلا جاؤں۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "قصر میں ملکہ صبح کو تیری ضرورت نہیں ہوسکتی۔ اس محفل میں تیری موجودگی بہت ضروری ہے کیونکہ تیرے چلے جانے سے یہ محفل پھیکی پڑ جائے گی۔ زبیدہ تیری موجودگی میں خوب گاتی ہے اور تیرے جاتے ہی سست پڑ جاتی ہے۔"

ابو منیو نے کہا۔ "آپ کو شبہ ہوا ہوگا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

المنصور نے کہا۔ "اے ابو منیو! تو کیا مجھ سے اتنا بھی واقف نہیں کہ میں انسان تو انسان قوموں کے مزاج کو سمجھتا ہوں اور میرے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ میں اپنے کسی بھی معاملے میں شراکت کا قائل نہیں۔"

ابو منیو نے ناسازی طبع کا بہانہ کیا۔ "میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ دیر جاگ نہیں سکتا اس لئے مجھے ملکہ صبح کے پاس بھیج دیا جائے۔ وہاں کچھ سونے کا وقت مل جائے گا اور میری طبیعت بھی سنبھل جائے گی۔"

المنصور نے بے رخی سے خشک لہجے میں کہا۔ "دیکھ ابو منیو! جب میں نے تجھے یہ کہہ دیا کہ اس محفل میں تیری موجودگی بہت ضروری ہے تو تجھے خاموش ہو جانا چاہیے۔"

محفل طرب کا آغاز ہوا اور دوسری عام گانے والیوں نے گانا سنایا تو محفل کا رنگ نہیں جما۔ شراب کا دور چلا تو المنصور نے بھی خوب پی۔ بظاہر ہر سب کو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ المنصور بہت زیادہ پی رہا ہے لیکن وہ بہت کم پی رہا تھا اور اس وقت اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ ابو منیو نے برائے نام پی۔ اس پر زبیدہ کے گیت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ زبیدہ بھی اس غلط فہمی میں تھی کہ المنصور زیادہ نشے میں ہے اور وہ دونوں کو شک و شبے کی نظروں سے نہیں دیکھ رہا ہے۔

دوسرے شرکائے محفل زبیدہ اور ابو منیو کے اشاروں کنایوں کو نہیں سمجھ سکے۔

لیکن جیسے ہی یہ اعلان ہوا کہ اب زبیدہ اپنی آواز کا جادو جگائے گی تو ابو منیو کو جھرجھری سی آگئی اور المنصور نے پہلو میں رکھی ہوئی برہنہ تلوار کے دستے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

المنصور نے نشے کی جھونک میں زبیدہ کی تعریفیں کیں اور کہا۔ "آج اس کا آخری گیت ہوگا۔ اس کی حسین اور دلکش شکل نے مجھ پر پوری طرح قبضہ پالیا ہے اور میں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ اس تقریب کے بعد اس سے شادی کروں گا اور یہ میری بیوی بن جائے گی۔"

کسی نے دبے لفظوں میں المنصور کو یاد دلایا۔ "قصر میں آپ کی چار بیویاں پہلے ہی موجود ہیں پھر آپ اسے پانچویں بیوی کی حیثیت سے کس طرح رکھیں گے؟"

المنصور نے پوچھا۔ "یہ کس نے مجھ سے وضاحت چاہی' ذرا کھڑا ہو جائے تاکہ میں اس کے شایانِ شان جواب دوں۔"

لیکن کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا۔ المنصور نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ سوال کسی نے خود نہیں کیا بلکہ اس سے کروایا گیا ہوگا۔ بہرحال سبھی میرا جواب سن لیں۔ زبیدہ مجھے تحفے میں پیش کی گئی ہے۔ خریدی ہوئی یا تحفے میں ملی ہوئی عورت بیوی تو نہیں بن سکتی مگر بیوی سے زیادہ اچھی رکھی جاسکتی ہے۔"

زبیدہ کو المنصور نے حکم دیا کہ وہ گانا شروع کرے۔

زبیدہ نے ابو منیو کی طرف دیکھا تو ابو منیو نے سر کے ہلکے سے اشارے سے اجازت دے دی کہ وہ گانا شروع کرسکتی ہے۔

یہ اشاروں کی باتیں المنصور بھی دیکھ رہا تھا' کہنے لگا۔ "میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اپنے کسی معاملے میں شراکت پسند نہیں کرتا۔"

کئی دوسرے لوگوں نے بھی یہ محسوس کرلیا کہ ابو منیو اور

زبیدہ میں کوئی تعلق موجود ہے۔ اگر یہ تعلق موجود ہے تو اس محفل میں یا تو یہ دونوں قتل کردیے جائیں گے یا پھر صرف ابو منیو کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

المنصور نے زبیدہ سے کہا۔ "میں اس وقت بے حد خوش ہوں کہ عنقریب لیون کی ریاست کا بھی خاتمہ ہوجائے گا اور عبداللہ الدلل میری قید میں ہوگا۔ آج تو میری مذکورہ کامیابیوں کی پیشگی خوشی میں کچھ ایسا کلام سنا کہ میری خوشیوں میں اضافہ ہوجائے۔"

زبیدہ نے ایک جھرجھری لی' ابو منیو کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "میں نے اب تک انتہائی ضبط و احتیاط سے کام لیا جو اب فضول لگ رہے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ضبط و احتیاط سے ہیرا دم گھٹ جائے گا۔ یا تو میں خود مرجاؤں گی یا مار دی جاؤں گی۔ اب مجھے اپنے ضبط و احتیاط سے نائب ہو جانا چاہیے۔ موت دونوں ہی صورتوں میں مقدر ہے تو اب میں اپنے دل کا کہا کروں گی' کسی خوف و دہشت کے بغیر۔"

المنصور نے زبیدہ سے اس تمہید کا پس منظر پوچھا تو اس نے کہا۔ "اب جو کچھ میں آپ کو سناؤں گی وہ میرے اشعار ہیں اور ان میں میرے دل کی باتوں کا پس منظر بیان کردیا ہے۔"

المنصور کا ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ اس نے ابو منیو کی طرف دیکھا اور اس بار بہت غور سے دیکھا کہ وہ کسی تکلف اور خوف کے بغیر بس زبیدہ کو دیکھے جارہا تھا۔ المنصور نے ابو منیو کو اپنے قریب بلایا اور کچھ اس طرح اپنے کندھے ہلائے بتایا کہ اب وہ ابو منیو کی ایک ایک حرکت دیکھ بھی سکتا ہے اور سمجھ بھی سکتا ہے۔

ابو منیو بھی کسی جھجک' خوف اور تکلف کے بغیر المنصور کے ہاتھ کسی قدر داہنی طرف ہٹ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اب یہاں سے بھی زبیدہ کو دیکھے جارہا تھا۔ المنصور نے زبیدہ سے کہا۔ "وقت ضائع نہ کر اور جو کچھ سنانا ہے' فوراً سنا دے۔"

زبیدہ نے خلاف توقع ابو منیو سے اجازت لی۔ "کیا میں شروع کرسکتی ہوں؟"

ابو منیو نے اجازت دے دی۔ زبیدہ نے گانا شروع کردیا۔

"رات شروع ہوچکی ہے اور نصف دائرے والا ماہتاب آسمان پر کچھ اس طرح ظاہر ہوا ہے کہ کبھی ابر کے ٹکڑے اسے چھپا لیتے ہیں اور کبھی نمودار کردیتے ہیں۔

شام جب آفتاب غروب ہو رہا تھا تو اس کی کمزور کرنیں کسی معشوق کے عارضِ گلگوں کی طرح روشن تھیں۔

میرے ہاتھ میں ساغر کا جو شیشہ ہے وہ برف کی طرح شفاف ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں پڑی ہوئی شراب برف کی ہی طرح سرد ہوگی لیکن میں نے جیسے ہی اسے ہونٹ سے لگایا تو شرابِ آتشِ رقیق کی طرح میرے پورے وجود میں دوڑنے لگی۔

میری آنکھیں' اللہ مجھے معاف کرے' ایسے ایسے گناہ کرچکی ہیں جو معاف ہونے کے قابل نہیں ہیں۔

لوگو! افسوس کہ میں ایک ایسے نوجوان سے محبت کرتی ہوں جو مجھے اپنے عشق سے دور رکھنا چاہتا ہے حالانکہ وہ میرے قریب ہے۔ اے کاش! میں اس سے وصل ہو جاتی اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا لیتا۔"

المنصور جو پہلے ہی بہت کچھ سمجھ چکا تھا' اب ان اشعار سے معاملات اور عیاں ہوگئے تھے۔ اسے اس وقت ابو منیو پر حیرت تھی کہ وہ زبیدہ کو ٹکٹکی لگائے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ المنصور نے زبیدہ سے پوچھا۔ "اے بیاک مغنیہ' تو کسے سینے سے لگا لینا چاہتی ہے؟"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "کوئی ہے۔"

المنصور نے کہا۔ "میں اس کو نہیں جانتا ہوں۔"

اس کے بعد ابو منیو سے کہا۔ "تو بھی تو شاعر ہے۔ تجھے گانا تو نہیں آتا بس ذرا اپنے حسبِ حال چند اشعار ہم سب کو سنا تاکہ زبیدہ کے کلام کا مزہ دوبالا ہو جائے۔"

ابو منیو نے کہا۔ "واقعی گھٹ گھٹ کر جینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب میں بھی دل کی دل میں نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے بھی گانا آتا ہے لیکن میرے منصب نے مجھے کبھی گانے نہیں دیا۔ آج میں اس محفل میں شاید پہلی اور آخری بار کچھ گاؤں گا۔"

زبیدہ ابو منیو کے مقابل بیٹھ گئی۔ وہ نہایت حسرت سے ابو منیو کو دیکھ رہی تھی۔

المنصور نے شرکائے محفل سے کہا۔ "آپ لوگ ابو منیو کا گیت بھی سن لیں اور اس کے بعد یہاں سے چلے جائیں کیونکہ ان دونوں کو ان کے گیتوں کا جو انعام دیا جائے گا وہ آپ سب کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔"

المنصور کا خیال تھا کہ اس کے دھمکی آمیز کلمات زبیدہ اور ابو منیو کو خوفزدہ کردیں گے مگر دونوں میں سے کوئی بھی پریشان نہ تھا۔

ابو منیو نے نہایت پُردرد آواز میں گانا شروع کردیا۔ "میں اس حسین عورت تک کس طرح پہنچ سکتا ہوں جس کے چاروں طرف تلواریں اور برچھیاں پہرا دے رہی ہیں۔

افسوس! اگر میرے دل کو یہ یقین ہو جائے کہ میرے ساتھ تیری محبت سچی ہے تو میں تیرے لئے اپنی جان کھو سکتا ہوں۔

اے میری محبوبہ! جو شریف دل اپنی منزلِ مقصود کو پہنچنا چاہتا ہے اسے کوئی خطرہ نہیں روک سکتا۔"

المنصور نے تلوار اٹھالی اور حاضرین سے کہا۔ "اب تم لوگ جاسکتے ہو۔"

ذرا سی دیر میں اس پُرلطف محفل میں المنصور' ابو منیو اور زبیدہ کے سوا کوئی موجود نہ رہا۔

المنصور نے تلوار کی نوک زبیدہ کی ناف پر رکھ دی اور نہایت مہیب آواز میں پوچھا۔ "سچ بتا! ابھی جو اشعار تو نے گا کر سنائے ہیں کیا ان میں تیری مراد ابو منیو سے تھی؟"

زبیدہ نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر جواب دیا۔ "شاید جھوٹ بولنے سے میری جان بچ جائے لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ ابو مغیرہ کی نظر میرے دل سے پار ہو چکی ہے اور یہ عشق ہی ہے جو مجھے ایسی بات برملا کہلوا رہا ہے جسے میں عام حالات میں کبھی بھی زبان پر نہ لاتی۔"

المنصور نے پوچھا۔ "تو نے ابھی ابھی اپنے اشعار میں اقرار کیا ہے کہ تیری آنکھیں ایسے ایسے گناہ کر چکی ہیں جو معاف ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اب یہ اور بتا دے کہ گناہ آنکھوں نے کیا ہے یا جسم نے؟"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "ابو مغیرہ کے بقول میرے چاروں طرف تلواروں اور برچھیوں کا پہرا رہتا ہے پھر جسم کا گناہ کس طرح ممکن ہے۔ بیباک نظروں کو البتہ تلواریں اور برچھیاں بھی نہیں روک سکتیں۔"

زبیدہ کو اپنی ناف پر تلوار کی نوک چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

المنصور نے پوچھا۔ "تجھے اور کچھ کہنا ہے یا بس؟"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "میں آپ کے قبضے میں جتنے دن رہی ہوں' میں نے آپ کو اتنا ضرور جان لیا ہے کہ آپ دریا دل ہیں اور قصور کے اقرار پر معاف کر دیتے ہیں۔"

المنصور نے تلوار کی نوک اس کی ناف پر سے ہٹالی۔ زبیدہ زار و قطار رو رہی تھی۔

اب المنصور ابو مغیرہ سے مخاطب ہوا۔ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور طبیعت کی بے چینی سے یہی لگ رہا تھا کہ اس وقت کسی نہ کسی کی جان ضرور جائے گی۔

المنصور نے ابو مغیرہ کو بہت زیادہ برا بھلا کہا۔ "کیا میں نے تجھ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اپنے کسی بھی معاملے میں شراکت کو بالکل پسند نہیں کرتا اور تو زبیدہ میں میرا حصے دار بن گیا۔ آخر پہلے تو نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ تیرا زبیدہ سے عشق مجھ پر جب بھی ظاہر ہو گا تو میرے ہاتھ سے قتل کر دیا جائے گا۔"

ابو مغیرہ خاموشی سے ساری باتیں سنتا رہا لیکن المنصور کو حیرت تھی کہ خوف یہاں بھی نہیں تھا۔ ابو مغیرہ بھی بالکل مطمئن اور پُرسکون تھا۔ جب المنصور چپ ہو گیا تو ابو مغیرہ نے بولنا شروع کیا۔ "اے میرے آقا! میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی خطا اور بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ انسان تقدیر کے آگے بے بس ہے' کیا آپ اپنی تقدیر خود مقرر کر سکتے ہیں؟ میرے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ ایک تقدیری عمل ہے۔ تقدیر کے قاضی نے میرے لئے یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ مجھے اس سے عشق ہو جس سے عشق نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

المنصور کا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ابو مغیرہ کو یاد دلایا۔ "کیا میں نے تجھ کو بار بار باور نہیں کرایا کہ میں اپنے کسی بھی معاملے میں کسی کی شراکت داری گوارا نہیں کر سکتا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں زبیدہ سے بے حد محبت کرتا ہوں' اس میں حصے دار بن گیا اور اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔"

ابو مغیرہ نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگایا بلکہ عشق اور میری تقدیر نے مجھے داؤ پر لگا دیا ہے۔"

المنصور تلوار کو ہاتھ میں لیے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

محفل سنسان ہو چکی تھی۔ شراب کے مٹکے اٹے سیدھے پڑے تھے۔ پیالوں میں بھی کوئی ترتیب نہیں پائی جاتی تھی۔ کچھ سیدھے رکھے تھے' کچھ اوندھا دیے گئے تھے۔ کسی نے پیالے میں کچھ شراب چھوڑ دی تھی اور کسی نے ایک قطرہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کسی سے بے احتیاطی اور بدمستی میں شراب چھلک کر فرش پر گر گئی تھی۔

المنصور نے اس پورے ماحول کا جائزہ لیا تو اس کا خیال بٹ گیا اور اس کے غصے میں کمی آ گئی۔ اس نے اپنی تلوار گاؤ تکیے کے پیچھے رکھ دی۔ اس وقت وہ بھی آبدیدہ تھا۔ اس نے زبیدہ اور ابو مغیرہ کو قریب بلایا اور کہا۔ "واقعی تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ تم دونوں میری اس محبت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو مجھے زبیدہ سے ہے۔ موت سے کسے ڈر نہیں لگتا اور زندگی سے کسے پیار نہیں ہے مگر جنہیں تقدیر موت کی طرف دھکے دے رہی ہو' ان پر رحم آیا ہا فطری ہے۔ تم دونوں کی مثال ان ڈوبنے والوں جیسی ہے جنہیں تقدیر الٰہی نے دریا میں گرا دیا ہو اور وہ بدمستی سے نکلنے کی کوشش بھی نہیں کرتا ہو۔ ایسے میں دور سے دیکھنے والوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان ناگہانی ڈوبنے والوں کو امواج بلا کت سے نکالیں اور یہ سوچیں سوچیں کہ ان کا ڈوب جانا تقدیر الٰہی سے ہے۔ اگر ان کی موت تقدیر الٰہی سے وابستہ ہے تو انہیں کسی طرح بچایا نہیں جا سکتا۔ اگر ان کی موت ڈوب کے مرجانے سے مرقوم ہے تو انہیں بچایا نہیں جا سکتا اور اگر ان کی زندگی باقی ہے تو انہیں بچا لیا جائے گا۔ اس وقت میں اضطراری اور اضطرابی حالت میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم دونوں کی موت کیا میرے ذریعے مقدر کر دی گئی ہے تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں تم دونوں کو قتل بھی کر سکتا ہوں اور معاف بھی کر سکتا ہوں۔ یہ میرا اختیاری معاملہ ہے۔ میں نے تجھے' اے ابو مغیرہ! تجھے زبیدہ کے معاملے میں اپنا شراکت دار سمجھ بیٹھا۔ یہ میری سمجھ کا فتور بھی تھا اور قصور بھی کیونکہ زبیدہ کو تجھ سے محبت ہے اور تجھے زبیدہ سے۔ میں اس محبت میں نادانستگی میں شراکت دار بن بیٹھا۔ مجھے اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے اور میں تیرے حق میں زبیدہ سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

زبیدہ آنسوؤں سے روتے روتے سسکیوں سے رونے لگی اور اپنا سر المنصور کے قدموں میں رکھ دیا اور کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ جب ہم نے قصور کا اعتراف کر لیا ہے تو آپ ہمیں ضرور معاف کر دیں گے۔"

المنصور نے زبیدہ کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔ "نادان لڑکی! شاید تو نے میری باتیں غور سے نہیں سنیں۔ تو نے اپنا قصور کہہ رہی ہے' میں اسے تم دونوں کے لئے تقدیر الٰہی قرار دے رہا ہوں۔ کمزور اور فانی انسان تقدیر الٰہی سے نہیں لڑ سکتا۔ جاؤ' اب تم دونوں پیار و محبت سے ایک ساتھ رہو۔"

ابو مغیرہ اور زبیدہ اسی وقت باغ سے نکل گئے۔ المنصور وہ رات انتہائی بے چینی اور اضطراب میں گزاری۔ اسے زبیدہ سے عشق تھا مگر وہ یک طرفہ عشق کا قائل نہیں تھا۔

صبح فجر کی نماز ادا کی اور ان تمام واقعات پر غور کرتا رہا جو اس سے سرزد ہو چکے تھے۔ اقتدار کی راہ میں حائل ہونے والوں کا مختلف طریقوں سے صفایا' اس کی مرضی اور حکم سے اس کے دو بیٹوں کی موت' ملک سے بے وفائی اور نوجوان خلیفہ ہشام کو خلاف اس طرح محروم کر دینا کہ وہ عقبیٰ کی فکر کرے اور عورتوں میں مشغول رہے۔ وہ اپنے ان سارے اعمال اور اقدام پر غور کرتا رہا جو ظلم اور جرائم کی فہرست میں رکھے جا سکتے تھے۔ وہ ان سب پر تقدیر الٰہی کے حوالے سے غور کرتا رہا۔ کیا اس سے جو کچھ سرزد ہوا' اس کا تعلق تقدیر الٰہی سے تھا؟ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس سب کا تعلق تقدیر الٰہی سے نہیں رکھتے تھے تو اسے اس وقت اس طرح سوچنے کی صلاحیت سے محروم کیوں رکھا گیا۔

بالکل اس وقت' جب وہ کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہتا تھا' اسے خبر دی گئی کہ قاتل اور ڈاکو قید خانے کا حاکم بھاگ کے باہر کھڑی شور کر رہی ہے کہ اس کے بیٹے قید خانے کا حاکم المنصور کے تحریری حکم کے خلاف قتل کر دینا چاہتا ہے۔

المنصور نے پوچھا۔ "وہ بیوہ عورت تمہا آئی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

دربان نے بتایا۔ "قید خانے کا حاکم بھی اس کے ساتھ آیا ہے۔"

المنصور نے حکم دیا۔ "دونوں کو حاضر کیا جائے۔"

دونوں کو المنصور کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

جب یہ دونوں المنصور کے سامنے پہنچے تو وہ بیوہ عورت پر برس پڑا۔ "تیرا بیٹا قاتل اور ڈاکو ہے اور تو یہ نہیں سوچتی کہ اس نے جن ماؤں کے بیٹے قتل کر دیے اگر وہ بھی تیری طرح میرے پاس فریاد لائیں اور کہیں کہ ان کے بیٹوں کے قاتل کو سزائے موت دی جائے تو ان کئی ماؤں کے مقابلے میں تیری اپنے بیٹے کے لئے رحم اور معافی کی درخواست بے اثر ہو جائے گی۔"

بیوہ عورت نے کہا۔ "جناب! اس وقت میں اپنے بیٹے کے لئے رحم اور معافی کی درخواست نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ نے جو فرمان جاری کیا ہے' اس پر عمل کیا جائے۔"

اب المنصور قید خانے کے حاکم پر برس پڑا۔ "جب میں نے تجھے لکھ کر بھی دے دیا اور زبانی بھی کہہ دیا کہ اس قاتل اور ڈاکو کو قتل کرا دیا جائے تو تو تذبذب کا شکار کیوں ہے؟"

قید خانے کے حاکم نے کہا۔ "جناب! آپ کے تحریری حکم اور زبانی فرمان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں اس پر کس طرح عمل کروں۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "میرا تحریری حکم کہاں ہے' اسے دکھا۔"

حاکم نے تحریری حکم المنصور کے سامنے رکھ دیا جس میں تیسری بار بھی قاتل اور ڈاکو... کی رہائی کا حکم دیا گیا تھا۔

المنصور کبھی تو اپنے تیسرے فرمان کو دیکھتا' کبھی حاکم کو دیکھنے لگتا اور کبھی بیوہ عورت کو گھورتا۔

بیوہ عورت نے پھر شور کیا۔ "میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اللہ نے آپ کے قلم سے تین بار جو فیصلہ لکھوایا ہے اس پر عمل کیا جائے۔"

المنصور نے بیوہ عورت سے پوچھا۔ "کیا تو یہ چاہتی ہے کہ ایک قاتل اور ڈاکو کی جاں بخشی کی جائے؟"

بیوہ عورت نے جواب دیا۔ "میں یہ نہیں چاہتی لیکن میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ تقدیر الٰہی سے جنگ نہ کریں۔ میرے بیٹے کو اللہ کیوں معاف کر رہا ہے' میں نہیں جانتی مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ میرے بیٹے کی موت آپ کے فرمان کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔"

رات زبیدہ اور ابو مغیرہ کے معاملے میں تقدیر الٰہی کے موضوع پر خاصی باتیں ہو چکی تھیں۔ اس بیوہ عورت کی باتوں سے وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

قید خانے کے حاکم نے کہا۔ "آپ نے زبانی حکم دیا تھا کہ اس قاتل اور ڈاکو کو سزائے موت دی جائے' اب آپ اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنے جو تھے فرمان میں لکھ دیں کہ میں اس قاتل اور ڈاکو کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔"

المنصور نے قلم دوات طلب کیے اور تیسرے فرمان کے نیچے لکھ دیا۔ "میں اس قاتل اور ڈاکو کی زندگی کو تقدیر الٰہی سمجھتے ہوئے معاف کرتا ہوں کیونکہ مجھ سے تین بار مشیت ایزدی نے یہ لکھوایا کہ اسے معاف کر دیا جائے اور اسے رہا کر دیا جائے۔ اس لئے میں اپنے تین فرمانوں کو چوتھے ایک فرمان کے ذریعے مسترد نہیں کر سکتا۔ اگر معدلت کا کوئی ایسا میزان میرے پاس ہوتا جو تین فرمانوں کو ایک طرف رکھتا اور چوتھے فرمان کو دوسری طرف تو یقیناً تین فرمانوں کا وزن زیادہ نکلتا اور چوتھے تنہا فرمان کا وزن کم..... اس لئے میں اپنے چوتھے فرمان کے ذریعے تین فرمانوں کو بحال کرتا ہوں اور اس بیوہ کے قاتل اور ڈاکو بیٹے کو رہا کرتا ہوں۔ اسے معاف کر دیا گیا ہے اس لئے اسے رہا کر دیا جائے۔"

○☆○

اب المنصور کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کہ وہ لیون کے

حکمران برومند کی گستاخیاں برداشت کرتا رہتا۔ اس نے عبداللہ سنڈل کو پناہ دی تھی اور عبداللہ سنڈل ہی کے ذریعے لیون کے برومند کو معلوم ہوا کہ المنصور زیری بن عطیہ کے خلاف ایک لشکر افریقہ روانہ کررہا ہے۔ اس لئے المنصور کے لئے دوسرا بڑا لشکر تیار کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب المنصور بیک وقت دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتا۔

برومند نے عبداللہ سنڈل کو پناہ تو دی ہی تھی۔ اب اس نے خراج دینا بھی بند کردیا اور لیون کے قریب ایسے علاقوں کو جن پر مسلمان قابض تھے' واپس لینے کا منصوبہ بنایا اور چھوٹی چھوٹی جنگیں شروع ہوگئیں۔

المنصور کو یہ ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ لیون کی بربادی کا پورا پورا ارادہ رکھتا تھا۔ کئی عیسائی ریاستیں قرطبہ کی باج گزار تھیں اور وہ المنصور کی مدد کرنے کی پابند تھیں۔ اس نے ان عیسائی ریاستوں کو لیون کے خلاف طلب کرلیا۔

یہ ریاست لیون صوبہ جلیقہ کا ایک حصہ تھی اور جلیقہ اندلس کا شمالی مغربی حصہ تھا۔

جب المنصور نے ریاست لیون پر فوج کشی کی تو برومند اس کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لاسکا اور پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ جب لیون کا اشتورقہ نامی اہم شہر بھی المنصور نے فتح کرلیا تو برومند نے المنصور سے امان طلب کرلی اور المنصور کو بتایا کہ یہاں سے جنوب مشرق میں کاریون نامی جو علاقہ ہے اور جہاں کئی عیسائی قومس (رئیس) حکومت کرتے ہیں' انہی کے مشورے پر قرطبہ کا خراج بند کیا گیا اور عبداللہ سنڈل کو پناہ دی گئی۔

المنصور نے جواب میں کہلوایا۔ "خراج تو نے بند کیا اور عبداللہ سنڈل کو تو نے پناہ دی اس لئے میں تجھ سے جواب طلب کرتا ہوں کہ تو نے دو سروں کے ورغلانے پر اتنی بڑی سرتابی کیوں کی۔ تجھے اسی صورت میں معاف کیا جاسکتا ہے جب تو خراج دینا شروع کردے اور جو خراج روک رکھا ہے' اسے فوراً دے دے۔ عبداللہ سنڈل کو فوراً میرے حوالے کیا جائے اور یہ اموی شہزادہ مجھے زندہ چاہیے۔"

برومند نے رکا ہوا خراج فوراً ادا کردیا اور وعدہ کیا کہ ریاست لیون اپنا خراج اب باقاعدگی سے ادا کرتی رہے گی۔ رہ گیا عبداللہ سنڈل تو اسے زندہ سلامت المنصور کے حوالے کردیا جائے گا۔

عبداللہ سنڈل کو جب اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ بہت گھبرایا۔ اس نے برومند سے درخواست کی۔ "مجھے المنصور کے حوالے نہ کیا جائے کیونکہ وہ مجھے قتل کردے گا۔"

برومند نے کہا۔ "میں نے اب تک تیرے کئی مشوروں پر عمل کیا اور گھاٹے میں رہا۔ تو اموی شہزادہ ہے اور طلیطلہ پر کچھ عرصہ حکومت بھی کرچکا ہے۔ تو نے المنصور کے ساتھ مل کر عیسائیوں سے کئی جنگیں بھی لڑی ہیں اور مجبور اور بے بس عیسائیوں کو اذ سفاکی سے قتل کیا ہے کہ تجھے سنڈل کا لقب دیا گیا۔ تو نے مجھے یہ تھا کہ سرقسطہ کا حکمران عبدالرحمن بن مطرف اور عبداللہ عامر قرطبہ کے خلاف فوج کشی کرنے والے ہیں۔ تو ان دونوں کا تیر فریق ہے پھر تو مجھ سے پناہ کا طلبگار ہوا اور مجھے بتایا کہ المنصور کے خلاف اس کا بیٹا کوئی سازش کررہا ہے اور المنصور کو اقتدار سے فارغ کردیا جائے گا مگر جو کچھ تو نے بتایا تھا وہ کچھ نہیں ہوا۔ آخر میں تو نے مجھے یہ یقین دلایا کہ المنصور زیری بن عطیہ کے خلاف ایک بڑی فوج روانہ کررہا ہے اس لئے فی الحال وہ اس لائق نہیں ہے کہ لیون پر فوج کشی کرے۔ تیرے کہنے سے میں نے قرطبہ کا خراج بند کردیا اور تیرے ہی مشورے سے میں نے چھوٹے چھوٹے عیسائیوں کے پیچھے ہوئے علاقے مسلمانوں سے لینا شروع کردیے مگر تیری ساری باتیں اور سارے اندازے غلط ہوتے رہے۔ اب میں تیرے غلط مشوروں کی پاداش میں تجھے المنصور کے حوالے کرکے امان حاصل کرسکتا ہوں۔"

عبداللہ سنڈل کو ایک چھوٹے سے فوجی دستے کی نگرانی میں المنصور کے پاس بھیج دیا گیا اور المنصور سے درخواست کی گئی کہ وہ کاریون کے عیسائی رئیسوں کی سرکوبی ضرور کرے کیونکہ ان رئیسوں نے برومند کو بہت ستایا ہے اور اب بھی برومند پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے کہ اب قرطبہ کا خراج بند کیا جائے۔

المنصور نے برومند کو پابند کیا کہ وہ المنصور کی مدد کرے اور یہ ساری باتیں زبانی کہے۔ برومند کو شبہ گزرا کہ شاید المنصور کی نیت میں کھوٹ ہے اور وہ اسے ... گرفتار کرنا چاہتا ہے چنانچہ اس نے وقتی امن کو اپنے لئے غنیمت جانا اور شمر کو میسٹیلا کا رخ کیا۔ یہ شہر شنت یاقب بھی کہلاتا ہے۔ گویا اس کا پورا نام کومیسٹیلا والے یعقوب شہید تھا مگر اسے مختصراً شنت یاقب کہنے لگے جو سینٹ یعقوب کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ شہر دشوار گزار پہاڑیوں کے دوسری طرف تھا اور فی الحقیقت نکال میں واقع ہے۔ اس مقام کو بالکل مسلمانوں کے کہہ مطلب کیسی عرصہ حاصل رہی ہے اور اب تک کسی بھی مسلمان حکمران کی اس پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ عام عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ یہ بزرگ شہید اندلس کے عیسائیوں کی مدد کرتا رہتا ہے اور برومند نے بھی اسی خیال سے یہاں پناہ لی تھی کہ المنصور یہاں تک نہیں پہنچ سکے گا اور سینٹ یعقوب اس کی مدد کرے گا۔

لیون کا فوجی دستہ عبداللہ سنڈل کو لے کر المنصور کے پاس پہنچ گیا اور برومند کے بارے میں بتایا کہ وہ خود بھی کسی دن حاضری دے گا اور زبانی عفو تقصیر چاہے گا۔

جس وقت عبداللہ سنڈل کو المنصور کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ آزاد تھا یعنی اس کو کسی رسی یا زنجیر سے باندھا نہیں گیا تھا۔ المنصور نے اس کو دیکھتے ہی حکم دیا۔ "اسے زنجیروں سے جکڑ دیا

جائے۔" اور برومند کے آدمیوں سے پوچھا۔ "اسے کسی رسی یا زنجیر سے باندھ کر قیدی کی طرح کیوں نہیں بھیجا گیا؟"

فوجی دستے کے سردار نے جواب دیا۔ "ہمارے آقا برومند کا کہنا ہے کہ یہ شخص ان کا مہمان تھا جب کہ یہ آپ کا خطاکار اور گناہگار ہے۔ میزبان اپنے مہمان کو رسیوں اور زنجیروں سے باندھ کر آپ کے حوالے نہیں کرسکتا۔ اب آپ اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کریں۔"

المنصور نے اس کی یہ معذرت اور دلیل قبول کرلی۔

عبداللہ سنڈل نے المنصور سے کوئی بات کہنا چاہی تو المنصور نے کہہ کر سامنے سے ہٹ گیا۔ "تجھ سے بات قرطبہ میں ہوگی۔"

المنصور نے وقت ضائع کئے بغیر کاریون پر فوج کشی کردی اور اس پورے علاقے کو آناً فاناً فتح کرلیا۔

یہ واقعات شوال ۳۸۶ھ (نومبر ۹۹۶ء) میں پیش آئے۔

کاریون کی فتح کے بعد ہی اسے ایک مفتوح رئیس نے یہ بتایا کہ برومند نے اب اس جگہ پناہ لی ہے جہاں تک کسی مسلمان کی آج تک رسائی نہیں ہوسکی۔

المنصور کو سینٹ یعقوب کے بارے میں دو سروں سے بھی بہت سن رکھا تھا۔ جب اسے دوسروں کے عیسائی رئیس نے یہ بتایا کہ وہاں تک کوئی مسلمان حکمران آج تک نہ پہنچا ہے اور نہ آئندہ پہنچ سکے گا تو المنصور کو بڑی جیرت ہوئی اور عیسائی رئیس سے پوچھا۔ "یہ تو کیسی بکواس کررہا ہے کہ وہاں تک کوئی مسلمان فاتح نہیں پہنچ سکتا؟"

عیسائی رئیس نے المنصور کو بتایا۔ "جناب! یہ جو اندلس میں ہم عیسائیوں کو کبھی کبھی فتوحات حاصل ہوجاتی ہیں ان میں سینٹ یعقوب کی دعائیں اور برکتیں شامل ہوتی ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں برومند کا کومپوسٹیلا تک پیچھا کروں گا اور دیکھوں گا کہ سینٹ یعقوب اس کو کس طرح بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ میں کومپوسٹیلا کو بھی برباد کردوں گا۔ سینٹ یعقوب سے جاکر کہہ دو کہ المنصور اس کے شہر میں آرہا ہے۔ اگر وہ اپنے شہر کو بچا سکے تو بچائے۔ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔"

عیسائی رئیس نے نہایت رعونت سے کہا۔ "آپ ادھر کا قصد بھی نہ کریں اور یہ جو آپ میں کومپوسٹیلا کی بربادی کا زعم پیدا ہوگیا ہے تو اسے اپنے دل ودماغ سے نکال دیں۔ آپ کو یہاں جو کچھ مل گیا ہے' اس پر قناعت کرلیں۔"

المنصور نے کہا۔ "ہوگا! تم اس عیسائی رئیس کی خوش فہمیاں سن رہے ہو۔ فی الحال تو ہمیں قرطبہ واپس جانا ہے لیکن فوراً ہی کومپوسٹیلا کے ولی یعقوب کی کرشمہ سازیاں دیکھنا ہیں۔"

عیسائی رئیس المنصور کی باتوں کو مذاق سمجھ رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کومپوسٹیلا تک پہنچنا ہی دشوار مرحلہ ہے نہ کہ وہاں پہنچ کے جنگ لڑنا اور اسے فتح کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادینا۔ وہ ان باتوں کو المنصور کی شیخی کی طرح کیوں نہیں سمجھ رہا تھا۔

المنصور نے قرطبہ واپسی سے پہلے اپنے عیسائی حلیفوں سے پوچھا۔ "یہ کومپوسٹیلا والے یعقوب شہید ولی کا کیا معاملہ ہے اور اسے ہم کیوں فتح نہیں کرسکتے؟"

حلیفوں نے المنصور کو بتایا۔ "جناب! وہاں تک پہنچنے کے لئے آپ کو کئی بڑے بڑے دریا عبور کرنا پڑیں گے۔ پہاڑی سلسلے بھی مزاحم ہوں گے اور عیسائی قوتیں بھی آپ کے مقابلے پر آجائیں گی۔ شہید یعقوب ولی کی برکتیں بھی آپ کا مقابلہ کرنے والی مسیحی قوتوں کا ساتھ دیں گی۔"

المنصور نے پوچھا۔ "تم لوگ ہمارے حلیف ہو' اب تم یہ بتاؤ کہ اس مہم میں تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟"

ولی یعقوب شہید کے شہر کومپوسٹیلا کے خلاف فوجی کارروائی میں مسلمانوں کا ساتھ دینا عیسائی حلیف ریاستوں کے لئے لمحہ فکریہ تھا مگر قرطبہ کے خلاف بنوامیہ کا نظم ونسق جب سے ابن ابی عامر المنصور کے ہاتھ میں آیا تھا' عیسائی قوتیں اس سے لرزہ براندام رہتی تھیں۔ چنانچہ جب المنصور نے اپنے عیسائی حلیفوں سے کومپوسٹیلا کے خلاف کارروائی کرنے میں ان سے تعاون چاہا تو کوئی ایک بھی حلیف عیسائی ریاست انکار نہ کرسکی اور سبھی نے ہامی بھر لی کہ وہ المنصور کا ساتھ دیں گے۔

المنصور نے انگلیوں کی پوروں پر حساب لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ نومبر کا مہینہ ہے۔ میں جنوری میں کاریون واپس آجاؤں گا۔ تم لوگ چالیس پینتالیس دنوں میں اپنی فوجیں تیار کرلو کیونکہ میں جنوری میں واپس آجاؤں گا اور اس وقت تمہارا کوئی عذر قابلِ سماعت نہیں ہوگا۔"

عیسائی حلیفوں نے جنوری تک تیار رہنے کا وعدہ کرلیا اور المنصور قرطبہ واپس ہوا۔

قیدی عبداللہ سنڈل فولادی زنجیروں سے جکڑے جانے کی وجہ سے بڑی اذیت اور کرب میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی المنصور سے بات کروادی جائے تاکہ وہ المنصور سے براہ راست نرمی اور رحم کی درخواست کرے لیکن المنصور نے عبداللہ سنڈل کی شکل تک دیکھنے سے انکار کیا۔

جن لوگوں نے المنصور کے بیٹے کے آخری لمحات دیکھے تھے وہ عبداللہ سنڈل کا اس سے موازنہ کرکے اعتراف کررہے تھے کہ المنصور کا بیٹا عبداللہ اس اموی شہزادے عبداللہ سنڈل کے مقابلے میں زیادہ بہادر' حوصلہ مند اور باکردار تھا کیونکہ اس نے قتل ہونے سے پہلے کسی سے بھی یہ درخواست نہیں کی تھی کہ اس کو اس کے باپ سے ملوادیا جائے۔

قرطبہ میں داخل ہونے سے پہلے المنصور نے عبداللہ سنڈل پر متعین عملے کو طلب کیا اور انہیں ہدایت کردی کہ عبداللہ سنڈل کو

براہِ راست قید خانے میں نہیں پہنچایا جائے گا۔

قرطبہ ابھی تیس میل دور تھا اور یہ اسلامی فوج کا آخری پڑاؤ تھا۔

لوگوں کا فاتحانہ واپسی سے جذباتی دباؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر کوئی اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں میں پہنچنے کے لئے بے قرار تھا۔

لیکن جس فوجی دستے کے سپرد عبداللہ سنگدل کو کیا گیا تھا وہ قرطبہ میں داخل ہونے کے بعد اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں سے فوراً ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔

چند مناد مقرر کر دیے گئے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے عبداللہ سنگدل کے اونٹ کے آگے آگے اعلان کریں۔ "دیکھو! یہ عبداللہ بن عبدالعزیز ہے جو دشمنانِ اسلام سے مل کر تارکِ اسلام ہو گیا تھا۔"

قرطبہ میں داخل ہونے سے پہلے زنجیروں میں جکڑے ہوئے عبداللہ سنگدل کو اونٹ پر سوار کروایا گیا اور اسے قرطبہ کے بازاروں سے گزارے جانے کی کارروائی شروع ہو گئی۔

اونٹ کے آگے ایک مناد چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا تھا۔ "دیکھو! یہ عبداللہ بن عبدالعزیز ہے جو دشمنانِ اسلام سے مل کر تارکِ اسلام ہو گیا تھا۔"

بازار کے لوگ یہ عبرتناک تماشا دیکھ رہے تھے کہ اچانک عبداللہ سنگدل نے چیخ کر مناد کو جھٹلایا۔ "تو جھوٹا ہے' تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ لوگو! اس آدمی کو دیکھو شے المنصور کے خوف نے بھگا دیا تھا۔ اس کو دعویٰ خلافت ضرور تھا مگر نہ تو یہ مشرک تھا نہ مرتد۔"

مناد تو کہتی تھے کہ جب ایک تھک جاتا تو دوسرا شروع ہو جاتا مگر عبداللہ سنگدل اپنی صفائی تنہا خود پیش کر رہا تھا اور اسے قرطبہ کے بازاروں میں اتنی بار مناد کی تردید کرنا پڑی کہ اس کا گلا بیٹھ گیا اور آواز اتنی کمزور ہو گئی کہ بہت سے بازاری اس کی تردید نہیں سن سکے۔

شام کو اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا تو اب مناد نے عبداللہ سنگدل سے کہا۔ "آپ بنی امیہ خاندان کے شہزادے ہیں۔ آپ کو تو نہایت حوصلہ مند اور باہمت ہونا چاہیے تھا لیکن ابھی تک آپ کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ہم آپ کو ایک حوصلہ مند اموی شہزادہ کہہ سکتے۔"

عبداللہ سنگدل نے جواب دیا۔ "تم سب دیکھ رہے ہو کہ مجھے کتنی ذلت سے یہاں لایا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ المنصور مجھے کچھ دن قید خانے میں رکھے گا اور اس کے بعد قتل کروا دے گا جبکہ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس موت سے نفرت ہے جو مرنے کے بعد کسی کو حوصلہ مندی اور بہادری کی سند دے کیونکہ مرنے کے بعد مرنے والے کے لئے یہ ساری عزت و تکریم کی باتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ مجھے زندگی مل جائے' چاہے لوگ مجھے بزدل اور بے غیرت ہی کیوں نہ کہیں۔ زندہ رہوں گا تو اپنے دامن پر لگے ہوئے یہ بدنما داغ کسی بھی وقت دھو ڈالوں گا۔"

چنانچہ عبداللہ سنگدل نے قید خانے سے المنصور کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا۔ اس قصیدے میں اس نے المنصور کے اشرف بنی نوعِ انسان کے خطاب سے مخاطب کیا اور اپنی غلطیوں کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ دوسروں کے بہکانے میں آ گیا اور فراست سے نہ سمجھ سکا کہ المنصور کے مطیع و فرمانبردار کو دنیا کی کوئی بھی طاقت پناہ دینے کی قوت نہیں رکھتی۔

اپنے اس قصیدے کے آخر میں عبداللہ سنگدل نے لکھا تھا۔ "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بدنصیب نے آپ سے رحم کی درخواست کی ہو اور وہ منظور نہ ہوئی ہو' آپ کی فیاضی اور رحم دلی آسمان سے بارانِ رحمت کی طرح برستی ہے۔"

المنصور نے اس کا یہ قصیدہ جو درخواست بھی تھا' پڑھا اور اس کو پھاڑ کر پیچھے پھینک دیا اور کہا۔ "بارانِ رحمت بھی گناہگاروں اور مجرموں کو اداروں سے عاری رہتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ اس کی ذلتیں تقدیرِ الٰہی کی طرف سے ہیں اس لئے میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔"

○

المنصور نے اپنے حلیف عیسائی ریاستوں کی تیاری کا بہت کم وقت دیا تھا جبکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اتنی بڑی مہم کی تیاری کے لئے کافی وقت درکار ہو گا۔ فوج کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے کشتیاں اور بحری جہاز بھی درکار ہوں گے۔ اس نے عیسائی رئیسوں کو حکم بھیجا کہ دریائے ڈوورو کو عبور کرنے کے لئے جہازوں اور کشتیوں کا انتظام کیا جائے۔

رسمًا اپنی لیون اور کاریون کی کارروائیوں کی تفصیلات کو بتانے کے لئے وہ خلیفہ ہشام کے پاس پہنچ گیا۔

خلیفہ ہشام آزمانے لباس میں کورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب اسے بتایا گیا کہ حاجب المنصور خلیفہ کو اپنی کارگزاریوں کی روداد سنانے آیا ہے تو وہ بے حد سرشوں کے جھرمٹ سے نکل کر المنصور سے ملا اور المنصور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ "جب میں نے تم کو امورِ خلافت کے سیاہ و سفید کے اختیارات دے دیے تو تو مجھے پریشان کرنے کیوں آ جاتا ہے۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "جناب! یہ ضابطے کی کارروائی ہے اور میں اپنا فرض انجام دینے پر مجبور ہوں اس لئے جب بھی میں آؤں' آپ مجھے تھوڑا سا وقت ضرور دیں گے۔"

ہشام نے اپنا والدہ کا ذکر کیا۔ "اپنی وہ روداد جو تم مجھے سنانا چاہتے ہو وہ میری ماں کو بھی سنا سکتے ہو۔"

المنصور نے کہا۔ "جناب! خلیفہ آپ ہیں اس لئے میں آپ

کے پاس حاضریاں دینے اور روداد سنانے کا پابند ہوں۔ آپ والدہ اپنی ماں کے پاس نہ بھیجیں۔ اب تو وہ بھی بہت زیادہ بیمار اور کمزور ہو گئی ہیں اس لئے میں انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

خلیفہ بے دلی سے اس کی روداد سنتا رہا لیکن اس کے کان جو کچھ سن رہے تھے وہ دل و دماغ تک اس لئے نہیں پہنچ رہا تھا کہ یہ دونوں معشوقوں کے جھرمٹ میں تھے۔ ساری روداد سننے کے بعد اس نے پوچھا۔ "سب کچھ کہہ چکے یا ابھی کچھ باقی ہے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "اب مجھے ولی یعقوب شہید کے سر کو سٹیلا پر لٹکر کشی کرنا ہے کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ جب وہ مسلمانوں سے لڑتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کا ولی یعقوب شہید بھی جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔"

ہشام نے حیرت سے کہا۔ "عیسائیوں کا یہ ولی یعقوب اگر ہمارے مقابلے پر آئے تو اسے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرنا کہ اسے میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

المنصور نے دل ہی دل میں خلیفہ ہشام کی فہم و فراست پر داد دی۔ اسے ہنسی آ رہی تھی مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور خلیفہ کو بتایا۔ "جناب والا! ولی یعقوب تو کب کا شہید ہو چکا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس کی روح ان کی مدد کرتی ہے۔"

خلیفہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا عیسائیوں میں بھی شہید ہوتے ہیں؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "شہید اور شہادت کا عقیدہ تو ہم مسلمانوں میں پایا جاتا ہے مگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ عیسائیوں نے بھی اپنا لیا اور اب وہ بھی اپنے مذہب کی راہ میں مرنے والوں کو شہید کہنے لگے ہیں۔"

المنصور نے لیون اور کاریون کی روداد یہاں بھی سنائی اور ملکہ کو بتایا۔ "اب میں عیسائیوں کے بہت بڑے غرور کو توڑنے کے لئے کوہ سٹیلا جا رہا ہوں۔"

ملکہ نے کہا۔ "وہاں تو ولی یعقوب شہید کا مزار ہے اور مزار والے کر جا کو بہت بڑی عزت حاصل ہے۔ کیا وہاں کے عیسائی تمہیں راستے میں ہی نہیں روک دیں گے؟"

المنصور کو معمولی سی حیرت ہوئی کہ ملکہ کو اس ولی یعقوب شہید کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اس نے ملکہ کو بتایا۔ "آپ یہ سن کر حیرت کریں گی کہ اس خطرناک مہم میں ہماری حلیف عیسائی ریاستیں بھی ہماری مدد کر رہی ہیں۔"

ملکہ نے برا سا منہ بنایا۔ "ضمیر فروش ہر ملت میں ملیں گے حالانکہ عیسائی ریاستوں کو اس مہم میں تمہاری مدد نہیں کرنا چاہیے۔"

المنصور نے درخواست کی۔ "آپ نماز پڑھنے کے بعد میری کامیابی کے لئے دعا ضرور کیجئے گا۔"

ملکہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے دعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تیری اب تک کی کامیابیاں دعاؤں کی مرہونِ منت نہیں ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "ملکۂ عالیہ! آپ میری ان خدمات کو نظرانداز کرتی ہیں جن سے خلافت بنو امیہ مضبوط اور توانا ہو گئی۔ آج پورا اندلس آپ کے سامنے سرنگوں ہے۔ میں نے کم و بیش چون جنگیں لڑیں اور ان سب میں کامیاب رہا۔ کیا آپ میری ان خدمات کو نظرانداز کر سکتی ہیں۔"

ملکہ صبح نے کہا۔ "تو نے جتنی بھی جنگیں لڑیں' خلافت بنو امیہ کے پرچم کے زیرِ سایہ اور اسلام کے نام پر اپنی ذات کے لئے۔ تو ہر فیصلہ خود کرتا ہے اور ہم دونوں تیرے قیدی بن گئے۔ تو تو ہمیں اپنے کسی معاملے میں شریک بھی نہیں کرتا۔ اللہ ہماری نیتوں سے واقف ہے۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ تجھے اور تیری نسل کو تیری مخلصانہ خدمات کا صلہ ملنا چاہیے یا مجرمانہ کارروائیوں کی عبرتناک سزائیں۔"

المنصور نے محسوس کیا کہ ملکہ صبح اسے اور اس کی نسل کو بددعا دے رہی ہے اور یہ بددعا اس کے دل سے نکل رہی تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کے پاس دعاؤں کے لئے آیا ہوں مگر آپ مجھے بددعائیں دے رہی ہیں اس لئے میں جا رہا ہوں۔"

ملکہ نے کہا۔ "تو جا سکتا ہے کیونکہ میری بددعاؤں کے لئے تیری موجودگی ضروری نہیں ہے۔ وہ تیری عدم موجودگی میں بھی دل سے نکلتی رہتی ہیں۔"

المنصور نے عاجزانہ برہمی سے کہا۔ "ملکۂ عالیہ! آپ مجھ پر ظلم کر رہی ہیں۔ آپ سوچیں کہ میں یہاں تک کس طرح پہنچا۔ آپ ہی کے طفیل اور آپ ہی کے ذریعے۔ میں نے حکومت کی

ساری دردسری اپنے ذمے لے لی اور آپ دونوں کو سکون سے زندہ رہنے اور عبادت میں گزر کرنے کے لئے بالکل فارغ کردیا۔ آپ دونوں کے ساتھ میں نے کبھی کوئی زیادتی بھی نہیں کی۔ اتنے اختیار رکھنے کے باوجود میں جب چاہوں آپ دونوں کو اپنے راستے سے ہٹا دوں۔ میں نے آپ دونوں کو گوارا کیا ہوا ہے۔ آپ سمجھیں گی نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ جتنی بھی میری جگہ لائیں گی وہ پہلا کام یہی کرے گا کہ آپ دونوں کو اپنے راستے سے ہٹا دے گا اس لئے آپ مجھے غنیمت جانیں۔ میرے اور میری نسل کے لئے دعائیں کریں تاکہ خلافت آپ کے خاندان میں موجود رہے۔ میں تو چلا۔ خدا حافظ۔"

المنصور نے سناکہ ملکہ بڑبڑا رہی ہے۔ "یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے لیکن میری بددعائیں تیرا اور تیری نسل کا تعاقب جاری رکھیں گی۔"

ایسی ہی کچھ باتیں کچھ عرصہ قبل ایک مجذوب کرگیا تھا۔

وہ اپنے قصر میں پہنچ کے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا اور آہستہ سے کہا۔ "اے میرے حسین قصر! کیا تو برباد ہوجائے گا اور تیرے مکین نابود ہوجائیں گے۔"

اندر سے اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اسے اسی عالم میں مدینۃ الزاہرہ کا خیال آیا۔ وہ زار و قطار رونے لگا اور بڑبڑانے لگا۔ "اے میرے شہر! تجھ کو میں نے اتنی محنت اور جانفشانی سے بنایا ہے۔ اے کاش! میں اس شخص سے واقف ہوجاتا جو تجھے برباد کردے گا۔"

قصر کے کچھ لوگوں نے اسے روتے اور یہ کہتے ہوئے سن لیا۔ وہ حیران تھے کہ آخر وہ کون شخص ہے جو مدینۃ الزاہرہ جیسے حسین شہر کو برباد کردے گا۔

اسے ولی یعقوب شہید کے شہر کو میسولیا روانہ ہونے میں کئی ماہ کی تاخیر ہوگئی۔ اسے جنوری ۹۹۷ء کو روانہ ہوجانا تھا مگر مکمل تیاری میں جون بھی گزر گیا اور ۳ جولائی ۹۹۷ء (۲۳ جمادی الاخر ۳۸۷ھ) ہفتے کے دن المنصور اپنی فوج کے ساتھ قرطبہ سے روانہ ہوگیا۔

وہ پرتگال کے علاقے قوریہ سے گزر کر بازیرہ میں داخل ہوگیا۔ یہاں اس کے عیسائی حلیف اس کا انتظار کررہے تھے۔ یہیں قریب ہی سمندر سے تین میل دور پرتگال نامی شہر دریائے ڈورو کے کنارے آباد تھا۔ یہ پرتگال شہر اندلس کی مغربی بڑی ریاست پرتگال کا مشہور شہر تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے جہازوں اور کشتیوں کا سہارا لیا گیا تھا۔

اگر خشکی کے راستے ولی یعقوب شہید کے شہر کو میسولیا پہنچنے کی کوشش کی جاتی تو پیدل فوج کو بڑی دشواریاں پیش آتیں۔ المنصور نے اپنی پیدل فوج کو سمندر کے کنارے پہنچا دیا۔ اب ان کے سامنے بحرالظلمات تھا۔ یہ وہی سمندر ہے جسے عرب بحر ظلمات کہتے تھے اور اسی سمندر میں مغربی افریقہ کے ساحلی شہر طنجہ، عقبہ بن نافع نے اپنا گھوڑا یہ کہتے ہوئے ڈال دیا تھا کہ اے ا خشکی تو ختم ہوگئی اب میں حق کی اشاعت کے لئے کہاں جاؤں؟

بحر ظلمات پرتگال کے سامنے بھی تھا۔ المنصور کی پیادہ فو جہازوں پر بیٹھ گئی اور یہ جہاز آگے پیچھے شہر پرتگال کی طرف بڑھے۔ یہاں تک کہ وہ دریائے ڈورو کے دہانے میں داخل ہوگئے پہلے جو سفر سمندر میں جاری تھا اب وہ دریائے ڈورو میں شروع ہوچکا تھا۔ شہر پرتگال سمندر سے تین میل دور واقع تھا اور دریا ڈورو کے جنوبی ساحل پر آباد تھا۔ المنصور کے جہاز آگے پیچھے ایک ترتیب میں سفر کرتے ہوئے پرتگال پہنچے تو وہاں انہیں دریا کے عرض میں ترتیب سے کھڑا کردیا گیا۔ یہاں اس کی سوار فوج پہلے پہنچ چکی تھی۔

اب یہ جہاز پل کا کام دے رہے تھے۔ پہلے پیدل فوج کنارے اتر گئی اس کے بعد سوار فوج اپنے گھوڑوں سمیت دوسرے کنارے پہنچ گئی۔ اب یہ جس خشکی حصے میں اترے تھے "یہ دو دریاؤں کا دوآبہ تھا۔ دریائے ڈورو اور دریائے بینا کا درمیانی علاقہ۔ اس وسیع زمین پر جن عیسائی سرداروں کی حکومت تھی وہ قرطبہ کی حکومت کے دوست اور باج گزار تھے۔

یہاں کے عیسائی سرداروں نے اپنی فوجوں کے ساتھ المنصور سے ملاقات کی۔ انہوں نے مسلمانوں کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ بیش بہا نذرانے پیش کئے۔ وہ زادِ راہ لے کر یہ لوگ اپنے حلیفوں کے ساتھ آگے روانہ ہوگئے۔ ہموار قابلِ عبور اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے ایک مشکل پہاڑی سلسلے کے سامنے پہنچ گئے۔

عیسائی سرداروں نے المنصور کو بتایا کہ اس پہاڑی سلسلے کو کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی پہاڑی سے گزر کے دوسری طرف پہنچا جاسکتا تھا۔

المنصور پہلے تو خود اس پہاڑی کا جائزہ لیتا رہا اس کے بعد اپنی فوج کے ماہرین کو بلوا کے پہاڑی دکھائی اور ان سے کہا۔ "اب تم لوگ یہاں ایک ایسی سڑک تیار کرو کہ ہم سب اس سڑک کے ذریعے دوسری طرف پہنچ جائیں۔"

سفر بینا کے سڑکیں اور راستے بنانے والے اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔ ان کی کارکردگی دیکھ کر عیسائی سرداروں کو بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا یہ سفر یہیں ختم ہوجائے گا اور مسلمان اس مہم سے باز آجائیں گے مگر مسلمانوں نے سرنگیں کھود کر سڑکیں بنا ڈالیں۔ اب اس سڑک کے ذریعے یہ سب پہاڑی کے دوسری طرف پہنچ گئے۔

عیسائیوں کے چہروں کی افسردگی نمایاں تھی اور مسلمان سراپا خوشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

جب ساری فوج پہاڑی کے اس پار پہنچ گئی تو حلیف سرداروں نے بتایا کہ آگے دریائے بینا ہے اور اسے بھی عبور کرنا پڑے گا۔

نے جواب دیا۔ "میں جس مقصد سے نکلا ہوں اسے پورا کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

ان کا سردار بظاہر تو المنصور کے ساتھ تھے مگر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان میں لیون کے سردار بھی تھے اور گریس بھی نظر آرہے تھے۔

یہ تمام کے تمام عیسائیوں کا خائنانہ نظروں سے جائزہ لے رہے تھے اور اسے غیر پہنچا رہے تھے کہ جیسے جیسے کو میسولیا قریب آتا جائے ویسے ویسے عیسائی سرداروں کے مزاجوں میں تبدیلیاں رونما ہوں۔

تمام مسلمان سرداروں نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں اپنے یہ ساتھی کہیں کھسک نہ جائیں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہاں سے واپسی کی واپسی ناممکن ہوجائے گی۔

المنصور نے اپنے سرداروں کو اطمینان دلایا کہ وہ فکرمند نہ ہوں۔ عیسائی سرداروں پر نظر رکھیں اور جہاں کوئی خاص بات نظر آئے اس سے فوراً اسے مطلع کردیا جائے۔

عیسائیوں میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ ایک سابق حکمران بروسند کی مذمت کی کہ اسے یہاں پناہ نہیں لینا چاہیے تھی کیونکہ آج اسی کی وجہ سے ہمارا بھی المنصور کی ماتحتی میں عیسائیوں کے اس مقدس شہر پر حملہ کرنا پڑ رہا تھا۔

لیون کا ایک سردار چوہل سے بروسند کا حامی تھا، کہنے لگا۔ "المنصور نے بروسند کو تو بہانہ بنایا ہے ورنہ وہ تو ولی یعقوب شہید کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جس کے بارے میں مشہور کردیا گیا ہے کہ عیسائیوں کی مدد کرتا ہے۔ اس نے عیسائیوں کے اسی عقیدے کو ختم کرنے کے لئے کو میسولیا کی بربادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

کاریون کے سردار نے پوچھا۔ "کیا ہم اس مقدس ولی کے شہر کی حفاظت میں اپنی تلواریں بلند کرسکیں گے؟"

ایک لیونی سردار نے کہا۔ "یہ تو ہمیں روانگی سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب تو ہم اس مقدس شہر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

کاریون کے ایک سردار نے اپنی پیشانی پکڑلی اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "یہ عربوں اور بربریوں کی کیسی مصیبت اندلس میں نازل ہوئی کہ ہم ہندو ریچ ان کے غلام بنتے چلے جارہے ہیں۔"

ایک لیونی سردار نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "احتیاط۔ کہیں یہ غیر المنصور تک نہ پہنچ جائیں۔"

ایک مقامی سردار نے کہا۔ "ہم سب یہاں سکیلا ہونے کے بجائے اپنے ارادوں اور دلوں سے متفق ہیں۔ اگر ہم متحد ہوکر المنصور کے خلاف جنگ شروع کردیں تو مسلمانوں کو قرطبہ تک واپس جانے کا راستہ نہیں ملے گا۔"

کاریون کے رئیس نے کہا۔ "کیسی بات کرتے ہو۔ یہ ظالم پہاڑیوں میں سرنگیں کھود کر راستہ بنا لیتے ہیں۔ سخت پتھروں کو اپنی راہ سے ہٹا دینے والے یہ مسلمان جب واپسی کا راستہ نہیں پائیں گے تو ہم سب کو قتل کردیں گے۔"

لیون کے کئی سردار کسی دوسرے عیسائی سردار کی کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھے اور بضد تھے کہ کوئی ایسی تجویز سوچی جائے کہ یہ مقدس شہر بربادی سے بچ جائے۔

کاریون کے کئی رئیسوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اپنے کچھ آدمی کو میسولیا بھیج دیے جائیں جو بروسند کو راضی کرکے یہاں لے آئیں اور اسے المنصور کے حوالے کرکے درخواست کی جائے کہ اب مسلمانوں کو کو میسولیا نہیں جانا چاہیے۔

لیکن اس تجویز پر فوراً عمل کرنا ناممکن تھا اور کو میسولیا کوئی وفد المنصور کی مرضی اور اجازت کے بغیر نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ جس بروسند کو سزا دینے کے لئے یہ مشکل ترین مہم اختیار کی گئی تھی اب وہ بروسند کی حوالگی سے نہیں روکی جاسکتی تھی۔ جس شہر اور حکومت نے باغی بروسند کو پناہ دی تھی اس کو بھی سزا دینا اس کا بنیادی مقصد تھا اس لئے لیون کے سرداروں کی تجویز سے کسی نے اتفاق نہیں کیا اور بات وہیں پر آکر رک گئی کہ المنصور کے حلیف عیسائی سرداروں کو ولی یعقوب شہید کے شہر کی بربادی میں اس کا حصے دار نہیں بننا چاہیے۔

اس قومی اور مذہبی مسئلے پر کافی بحث و مباحثہ ہوا لیکن لیون کے سرداروں کے علاوہ دوسرے عیسائی سرداروں کا یہ کہنا تھا کہ اب انہیں المنصور اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ساری باتیں بہت پہلے سوچنا چاہیے تھیں۔

لیون کے سرداروں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے بہت سے ہم مذہب سرداران کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کرتے تو انہوں نے نہایت پُرجوش لہجے میں کہا۔ "بہرحال آپ لوگ ہم سے اتفاق کریں یا نہ کریں مگر ہم اپنے اس مقدس شہر کی بربادی میں مسلمانوں کے مددگار نہیں بنیں گے۔"

مقامی سرداروں نے پوچھا۔ "اگر تم مسلمانوں کے مددگار اور شریک کار نہیں ہوگے تو کیا کرو گے۔ اپنے اس مقدس شہر کو کس طرح بچاؤ گے اور ان سے کس طرح علیحدگی اختیار کروگے؟"

لیون کے ایک سردار نے جواب دیا۔ "ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس میں تم سب کا تعاون درکار ہے کیونکہ ہم لیون کے سردار تنہا کچھ نہیں کرسکتے۔ فی الحال ہم اپنا یہ چھوٹا سا منصوبہ تمہارے علم میں لاتے ہیں۔ اس پر خوب غور کرکے ہمیں بتاؤ کہ اس میں کامیابی کے امکانات کس حد تک ہیں۔"

دوسرے عیسائی سردار لیون کے سرداروں سے بالکل متفق نہیں تھے اور ان کے اس منصوبے کو سانپ کے نکل جانے کے بعد اس کی لکیر پیٹنے کا مترادف قرار دے رہے تھے۔

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

لیون کے سردار نے کہا۔ "ہم کو میسوسٹیلا کی حکومت کو لکھتے ہیں کہ وہ حملہ آور مسلمانوں سے بالکل نہ ڈریں اور اپنی صف بندی کچھ اس طرح کریں کہ جدھر عیسائی افواج ہوں' ادھر زیادہ توجہ نہ دیں اور اس حصے کو اپنا حامی اور مددگار سمجھیں۔ لڑائی براہِ راست مسلمانوں سے شروع ہونا چاہیے۔ پوری قوت سے ان وحشی مسلمانوں کے خلاف جنگ کی جائے۔ المنصور کی حلیف عیسائی فوجیں اس جنگ میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائیں گی اور جب جنگ اپنے شباب پر ہوگی تو مسلمانوں کے عقب سے ان کی حلیف عیسائی فوجیں بھی ان پر حملہ آور ہو جائیں گی اور اس اچانک نئی اور غیر متوقع صورتِ حال کا مسلمان مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور پھر ایک بھی مسلمان یہاں سے واپس نہیں جا سکے گا۔ یہ تجویز ولی یعقوب شہید نے ہمارے دلوں پر القا کردی ہے اور یہ سمجھ لو کہ یہ ولی اس جنگ میں ہماری اسی طرح مدد کرے گا اور حملہ آور مسلمان ایسے برباد ہوں گے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں اپنے اس قومی اور مذہبی نقصان پر آنسو بہاتی رہیں گی۔"

کاریون کے ایک سردار نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اسے بہت خطرناک قرار دیا اور پوچھا کہ ان کا یہ خط لے کر کو میسوسٹیلا کی حکومت کے پاس کون جائے گا کیونکہ مسلمان کسی بھی مشتبہ عیسائی کو اس مقدس شہر کی طرف نہیں جانے دیں گے۔

لیون کے سرگرم سازشی سردار نے کہا۔ "اس کی تم فکر ہی نہ کرو۔ ولی یعقوب شہید کا ہاتھ ہماری پشت پر ہے اس لئے ہمارا یہ خط اس مقدس شہر کی حکومت کے پاس ضرور پہنچے گا۔"

ایک دوسرا لیونی سردار اٹھا اور باہر چلا گیا۔ جب کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ مقامی آبادی کا ایک بوڑھا بھی تھا۔

لیونی سردار نے اس بوڑھے کو سب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا مذکورہ خط یہ بوڑھا کو میسوسٹیلا کی حکومت کو پہنچائے گا۔"

دو آدمیوں کے ایک مقامی سردار نے اپنے ہم وطن بوڑھے سے پوچھا۔ "تو کیا کرتا ہے؟"

بوڑھے نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں لکڑہارا ہوں اور روز جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہوں اور مقامی آبادی میں بیچ کر گزر بسر کرلیتا ہوں۔"

مقامی سردار نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "کام بہت خطرناک ہے۔ اس میں تیری اور کئی سرداروں کی جانیں بھی جا سکتی ہیں۔"

لکڑہارے نے جواب دیا۔ "میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور یوں بھی اب زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔ اگر اس مذہبی خدمت میں میری جان بھی چلی جائے تو اس پر کسی کو افسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

کاریون کے کسی سردار نے پوچھا۔ "اس خط پر متحد کس کے ہوں گے؟"

لیون کے پُرجوش سازشی سردار نے کہا۔ "اس پر دستخط تو ہم سب کے ہونے چاہئیں مگر کوئی اگر نہ کرنا چاہے تو اسے مجبور بھی نہ کیا جائے کیونکہ ہم سب کو اس منصوبے میں دِل سے عملاً شریک ہونا چاہیے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔"

دو آدمیوں کے مقامی سرداروں نے سکوت اختیار کر رکھا تھا۔ لیون کے سردار نے ان سے پوچھا۔ "تم لوگ بالکل خاموش ہو۔ کیا تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟"

ایک مقامی سردار نے جواب دیا۔ "ساتھ تو اس وقت دیا جائے گا جب تم اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن یہ جو کچھ اب ہو رہا ہے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔"

اسی وقت ایک مضمون تیار کیا گیا۔

"کو میسوسٹیلا کی حکومت جتنی شدت اور قوت سے مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے، کرے اور اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حملہ آور وحشی مسلمانوں کے مقابلے میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی فوج کا وہ حصہ سب سے زیادہ کمزور ہوگا جہاں ہم عیسائیوں کو رکھا جائے گا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے کو میسوسٹیلا کے عیسائی بھائی اپنی فوجی ترتیب اس طرح کردیں گے کہ فوج کا طاقتور ترین حصہ مسلمانوں کے مقابلے پر رہے اور پھر اس طرح مقابلہ کرے کہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہو۔ المنصور کے ہم عیسائی حلیف بے دلی سے اس جنگ میں حصہ لیں گے اور پھر جب مسلمان بے جگری سے ان کا مقابلہ کر رہے ہوں گے' ان پر پیچھے سے ہم بھی حملہ آور ہو جائیں گے اور پھر مسلمانوں کو قرطبہ واپس جانے کا راستہ بھی نہیں ملے گا اور شاید ایک مسلمان بھی واپس نہ جا سکے۔ ہم المنصور کو زندہ گرفتار کریں گے اور اس پر ولی یعقوب شہید کے مزار کے سامنے دشمنِ مسیحیت کی حیثیت سے مقدمہ چلائیں گے۔ اس کو قتل کر کے اس کا سر قرطبہ کے خلیفہ کو بھیج دیں گے کہ وہ المنصور کے حشر سے سبق حاصل کرے اور عیسائیوں کی دشمنی سے باز آجائے۔"

اس خط پر لیون کے جملہ سرداروں نے دستخط کردیے تاکہ اس عظیم الشان کامیابی میں بیشتر ان سرداروں کا نام لیا جائے۔

یہ خط اسی وقت بوڑھے لکڑہارے کے حوالے کردیا گیا۔

لکڑہارے نے پہلے سینے پر صلیب کا نشان بنایا پھر یہی نشان اپنی پیشانی پر بنایا اور خط کو جیب میں رکھ لیا۔

○☆○

اس روز دن بھر بارش ہوتی رہی۔ شام کو برف باری بھی شروع ہوگئی۔ موسم نے پورے ماحول کو دھندلکے کے رکھ دیا تھا۔

المنصور دن بھر اپنے گھوڑے پر سوار ان تمام راستوں کا جائزہ لیتا رہا جو مقدس شہر کو میسوسٹیلا کو جاتے تھے۔ انہی راستوں میں سے ایک راستہ درۂ طلیارش سے گزرتا تھا اور یہی سب سے

اچھا راستہ تھا۔ راستے کے دونوں طرف جنگلات تھے اور یہ سلسلہ کئی میل شہر تک پھیلا ہوا تھا۔ راستے میں کئی گاؤں اور قصبے بھی آتے تھے۔ یہ گاؤں اور قصبے درختوں کو کاٹ کر بسائے گئے تھے۔

المنصور اس درے میں دور تک گیا اور اس راستے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد واپس آگیا۔

اسی راستے سے اس کے فوجی دستوں کو گزرنا چاہیے تھا مگر اس نے اپنے لئے اس درے کو پسند نہیں کیا اور ان راستوں کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جو دشوار گزار تو تھے مگر اس کی فوج اپنے رفتار اور طولی حجم کے ساتھ گزر سکتی تھی اور اپنے چاروں طرف سے آگاہ بھی رہ سکتی تھی۔

شام کو اس نے اپنے خیمے میں سعد کو طلب کیا اور پوچھا۔ "باہر موسم کیسا ہے؟"

سعد حیران تھا کہ اس خطرناک سرد موسم میں گھٹنوں گھوم پھر کر واپس آنے کے بعد المنصور اس سے باہر کے موسم کا حال پوچھ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ المنصور کے سوال کے جواب سے کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اگر وہ موسم کو خوشگوار کہہ کر اپنے حوصلے اور ہمت کو المنصور کے سامنے ثابت کرنا چاہتا تو المنصور اسے جھوٹا کہہ سکتا تھا اور اس جھوٹ کی اسے سزا بھی مل سکتی تھی۔ اس جھوٹے جواب کے برعکس اگر وہ سچ بول دیتا کہ بارش اور برف باری نے موسم کو بہت خطرناک بنا دیا ہے تو اس اعتراف سے المنصور اسے کم ہمت اور آسائش پسند کہہ سکتا تھا۔

المنصور نے کچھ دیر جواب نہ پا کر سعد سے پوچھا۔ "سعد تو نے بتایا نہیں باہر کا موسم کیسا ہے؟"

سعد نے جواب دیا۔ "جناب! آپ تو خود بھی باہر کے موسم کا جائزہ لے چکے ہیں۔ دن بھر تو بارش ہوتی رہی اور شام سے پہلے ہی برف باری بھی شروع ہوگئی۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب مسلسل بارش میں برف باری بھی شامل ہو جائے تو موسم کیسا ہو جائے گا؟"

المنصور نے "ہوں" کہا اور خیالوں میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد کہا۔ "میں آج رات درۂ طلیارش کی نگرانی کروانا چاہتا ہوں لیکن وہاں کسی فوجی دستے کو خیمے لگوا کے نہیں ٹھہرانا چاہتا بلکہ چاہتا ہوں کہ اس درے کی نگرانی تم کرو' تنہا' اکیلے تم۔ تمہیں وہاں کے لئے کوئی ساتھی بھی نہیں دیا جائے گا اور تمہیں جو گھوڑا ملے گا' تم اسے بھی کہیں چھپا کے باندھ دو گے اور پھر اس درے کی تم چھپ کر پوری رات اس طرح نگرانی کرو گے کہ تم دوسروں کو دیکھ لو مگر کوئی دوسرا تمہیں نہ دیکھ سکے پھر جس پہلے شخص کو بھی تم اس درے سے گزرتے ہوئے دیکھو گے' اس کو پکڑ کے میرے پاس لے آؤ گے۔"

اتنا بتا کے المنصور چپ ہوگیا۔ سعد کو اس خطرناک منصوبے کی ذمے داری سے خوف محسوس ہونے لگا' پوچھا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ دو آدمی کردیے جائیں کیونکہ میں تنہا اس درے کی کس طرح نگرانی کروں گا۔"

المنصور نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا۔ "نہیں۔ وہاں کسی دوسرے آدمی کا کوئی کام نہیں۔ کیا تم میرے منصوبے کو ناکام کرنا چاہتے ہو۔ تنہا تم اس درے کی نگرانی کرو گے اور جو پہلا شخص اس درے سے گزرنا چاہے' اس کو تم میرے پاس لے آؤ گے۔"

سعد بحث نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور پوچھا۔ "کیا مجھے ابھی اسی وقت درۂ طلیارش پہنچ جانا چاہیے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "نہیں' کچھ اور اندھیرا ہو جانے دو پھر تم کچھ اس طرح جاؤ گے کہ ہمارے لشکری بھی تمہارے وہاں جانے سے آگاہ نہ ہو سکیں۔"

سعد نے المنصور کا مطلب سمجھ لیا تھا کہ وہ یعنی المنصور درۂ طلیارش کی خفیہ نگرانی کروانا چاہتا تھا۔

المنصور نے سعد کو اپنے خیمے میں ہی روک رکھا اور جب ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو المنصور نے خیمے سے نکل کر باہر کا جائزہ لیا۔ برف باری نے رات کی سیاہی کو کچھ زیادہ ہی گہرا کردیا تھا۔ یوں بھی آسمان پر چاند اور ستارے مفقود تھے۔

خیمے میں واپس آکے المنصور نے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو لیکن جانے سے پہلے تم میری چند ضروری باتیں درے کی نگرانی اور پہرے داری کے دوران میں یاد رکھو گے۔ اوّل تو یہ کہ درے کی نگرانی اتنی خفیہ ہونی چاہیے کہ کسی کو وہاں تمہاری موجودگی کا شبہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ جو بھی پہلا شخص درے سے گزرنا چاہے' تم اس کو روک کر میرے پاس لاؤ گے اور اگر تم یہ دیکھو کہ درے سے گزرنے والے کئی لوگ ہیں تو تم اس کی ہمیں فوراً خبر کرو گے۔"

سعد نے المنصور کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ باہر نکل کر اپنے چتکبرے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی اور اچھل کر گھوڑے پر بیٹھ گیا پھر یہ گھوڑا آہستہ آہستہ بارش اور برف باری کے ماحول میں درۂ طلیارش کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستہ بالکل سنسان تھا اور اس ہو کے عالم میں سوائے آہٹیں سننے کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

سعد درۂ طلیارش پہنچنے کے بعد کچھ دیر تو اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا کہ وہ کس طرح اندھیرے میں اس درے کی نگرانی کرے گا کیونکہ درے میں داخل ہونے کے بعد جنگلات نے اندھیرے میں بہت زیادہ اضافہ کردیا تھا مگر درے کے دہانے سے گھوم پھر کر وہ سامنے سے آنے والوں کو اگر دیکھ نہیں سکتا تھا تو ان کی آہٹ ضرور محسوس کر سکتا تھا یعنی اس تکلیف دہ ماحول میں اسے اپنی آنکھوں سے کام لینے کے علاوہ کانوں سے بھی کام لینا تھا۔ ساری رات پوری ہوش مندی سے جاگ کر پہرے داری کرنا نہایت مشکل کام تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ المنصور نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے اس کی نگرانی پر بھی کئی آدمی لگا دیے ہوں گے یا پھر یہ کہ یہی کام کئی الگ الگ آدمیوں سے لیا جا رہا ہوگا اور کسی کو کسی دوسرے کا علم

نہ ہوگا۔

اس نے اپنے گھوڑے کو درخت کے نیچے باندھ دیا اور اس پر بھاری کپڑے ڈال دیے تاکہ وہ درخت کے نیچے اور بھاری کپڑوں میں برف باری سے محفوظ رہے۔ اس نے خود کو بھی اسی طرح کپڑوں میں چھپا لیا لیکن برف باری' نیند' آرام کرنے کی خواہش اسے مسلسل پریشان کرتی رہی۔ اس کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور آنکھیں اندھیرے میں بھی کسی کو تلاش کررہی تھیں۔

جنگل میں جانور بھی دبک کر سہمے ہوئے آرام کررہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

دور میدانوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی فوجیں خیموں میں آرام کررہی تھیں۔ ان میدانوں سے ہٹ کر جہاں جہاں عیسائی آبادیاں تھیں وہاں اگر گھروں کے اندر چراغ جل بھی رہے ہوں گے تو ان کی روشنی اول تو باہر نہیں آرہی تھی اور اگر کسی روزن' کسی کھڑکی یا کسی جھری سے روشنی باہر آبھی رہی تھی تو اسے برف باری نے روک کر محدود کردیا تھا۔ نگرانی اور پہرے داری کے شدید احساس نے اسے تکلیف دہ ماحول اور وقت کو گوارا کردیا تھا۔ وہ صبح تک اسے برداشت کرتا رہا۔

صبح ہوئی تو دھند نے نمودار ہونا شروع کردیا اور راستے کچھ کچھ نظر آنے لگے۔ جب کچھ زیادہ سپیدی جو دھند آلود تھی' پیدا ہوئی تو اس نے کسی قدر فاصلے پر ایک گدھے کو درختوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

سعد درختوں کی آڑ میں ہوگیا اور اپنے گھوڑے کی پشت پر سے بھاری لبادہ اتار دیا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ گدھا تنہا نہ ہو۔ اس کے پیچھے کچھ اور گدھے بھی ہوں لیکن درے کے قریب آجانے کے بعد اس کے پیچھے کوئی دوسرا گدھا نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے گھوڑے کو کسی کے تعاقب کے لئے تیار رکھنا چاہتا تھا۔

سعد اس وقت تک روپوش رہا جب تک یہ گدھا درے میں داخل نہیں ہوگیا۔ گدھے پر بوڑھا لکڑہارا لیٹا زیرلب کچھ دعائیں پڑھ رہا تھا کہ اچانک سعد نے نمودار ہوکر اسے روک لیا۔

بوڑھا لکڑہارا اپنے سامنے اچانک ایک مسلمان کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ سعد نے پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

لکڑہارے نے جواب دیا۔ "ایک غریب عیسائی لکڑہارا۔ کیا تم یہ کلہاڑی نہیں دیکھ رہے ہو؟"

سعد نے دیکھا گدھے کی پشت پر ایک کلہاڑی اور رسیوں کے چند لچھے رکھے ہوئے تھے۔

سعد نے پوچھا۔ "تو کہاں جارہا ہے؟"

لکڑہارا ہنسنے لگا۔ "عجیب سوال کیا تم نے۔ اس کلہاڑی اور ان رسیوں کے ساتھ میں صبح صبح کہاں جاؤں گا۔ یہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں لکڑہارا ہوں۔"

سعد نے رسیاں اٹھالیں اور انہیں دیکھ کر واپس کردیا اور پھر کلہاڑی کے دستے کو اس کے پھل سے نکال کر تلاشی لی تو وہاں سے بھی کچھ نہیں نکلا۔ بوڑھے لکڑہارے نے پوچھا۔ "اے مسلمان بھائی! تم کیا تلاش کررہے ہو' تم کو کیا چاہیے؟"

سعد نے جواب دیا۔ "میں تجھے کیا بتاؤں کہ مجھے کیا چاہیے۔ کیا اس بڑھاپے میں تیرا آرام کرنے کو جی نہیں چاہتا جو برف باری کی اس خوفناک صبح تو تنہا گھر سے نکل کھڑا ہوا؟"

بوڑھے لکڑہارے نے جواب دیا۔ "جب سے تم مسلمان یہاں آئے ہو' قدرت نے بھی ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی شروع کردی ہے۔ بارش اور برف باری نے گھروں میں چولھے ٹھنڈے کردیے ہیں۔ وہ تو خیریت یہ گزری کہ تم لوگوں نے مقامی عیسائیوں سے برا سلوک نہیں کیا اور لوٹ مار نہیں کی ورنہ ہم سب مارے گئے ہوتے۔"

سعد نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "بڈھے کھوسٹ! زیادہ باتیں نہ بنا اور سچ سچ بتا کہ اس وقت تو کہاں جارہا ہے اور کیوں جارہا ہے؟"

بوڑھے لکڑہارے نے جواب دیا۔ "بیوی بچوں کی روزی کے لئے گھر سے نکلا ہوں۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤں گا۔ انہیں بیچوں گا اور پھر اس رقم سے کھانے پینے کا بندوبست کروں گا۔ اپنی اولادِ نرینہ تو کوئی ہے نہیں جو اس بڑھاپے میں کام آتی۔"

یہ کہتے کہتے بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سعد نے سوچا یہ بوڑھا تو واقعی بہت دکھی معلوم ہوتا ہے۔ المنصور کا اس سے کیا کام ہوسکتا ہے۔

بوڑھا کچھ دیر کھڑا سعد کی صورت دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ "اب میں جاؤں؟"

سعد نے جواب دیا۔ "جا اور بچوں کے لئے لکڑیاں کاٹ' اللہ تیری مشکل آسان کرے۔"

بوڑھے لکڑہارے نے گدھے کی پالان درست کی اور گدھے پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

سعد اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس وقت وہ اچانک المنصور کے حکم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے تو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس کی پہرے داری کے دوران میں جو پہلا شخص درۂ طلیارش سے گزرنے کی کوشش کرے اس کو گرفتار کرکے المنصور کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

المنصور نے اپنے اس حکم میں عمر' معاشرتی حیثیت اور مذہبی درجے کی کوئی تخصیص نہیں رکھی تھی۔ اگر یہ غریب لکڑہارا بوڑھا ہے اور بیوی بچوں کی روزی کے لئے لکڑیاں کاٹنے جنگل جارہا ہے تو اسے مستثنیٰ کیوں کیا جائے۔ سعد یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کہیں المنصور کا کوئی دوسرا آدمی پہرا نہ دے رہا ہو' وہ اس لکڑہارے کو پکڑ کر المنصور کی خدمت میں پیش کردے۔ سعد سے بوڑھے کو رعایت

دینے کا جواب طلب کرلیا جائے اور پھر اسے حکم عدولی یا غفلت کی سزا دی جائے۔

وہ نہایت پھرتی سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور اس پر سوار ہو کر بوڑھے لکڑہارے کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

سعد حیران تھا کہ بوڑھا لکڑہارا اپنے آس پاس کے جنگلی درختوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا جارہا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ بوڑھے نے اپنے گدھے کی رفتار بھی تیز کردی تھی۔

سعد نے بھی اپنے گھوڑے کو دوڑایا اور جلد از جلد لکڑہارے کو پکڑنے کی کوشش کی۔

لکڑہارے نے اپنے پیچھے سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی تو پلٹ کے پیچھے دیکھا۔ دھند کی وجہ سے وہ سعد کو نہیں دیکھ سکا مگر جب سعد اس کے سر پر پہنچ گیا تو بوڑھے نے اپنا گدھا روک لیا اور خود اتر کر نیچے کھڑا ہوگیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

سعد اس کا سوال نہیں سن سکا۔ گھوڑے سے اترا اور لکڑہارے سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، تم ابھی تک سفر کررہے ہو! لکڑیاں کیوں نہیں کاٹتے؟"

بوڑھے لکڑہارے نے جواب دیا۔ "جناب! میں جنگل کے جس حصے سے لکڑیاں کاٹتا ہوں وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے اور اس حصے کے درختوں کی کافی لکڑیاں کاٹی جاچکی ہیں اس لئے میں وہیں پہنچ کے لکڑیاں کاٹوں گا۔"

سعد نے حکم دیا۔ "اچھا اب تم اپنے گدھے پر بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ المنصور کے پاس چلو۔"

لکڑہارے نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ مجھے تنگ نہ کرو۔"

سعد نے کہا۔ "میں تجھ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا لیکن میں المنصور کے حکم سے مجبور ہوں۔"

لکڑہارا بڑبڑاتا ہوا گدھے پر بیٹھ گیا اور کہا۔ "تم لوگ بہت تنگ کرتے ہو۔ میں کوئی فوجی نہیں ایک عام شہری ہوں اس لئے مجھ سے مسلمانوں کو کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔"

سعد نے جواب دیا۔ "یہاں، میری ہی طرح کم از کم پانچ پہرے دار موجود ہیں اس لئے تیری اسی میں بہتری ہے کہ تو میرے ساتھ المنصور کے پاس چل۔"

بوڑھا لکڑہارا شاید کوئی اور ہی منصوبہ بنا رہا تھا مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پانچ پہرے دار اور موجود ہیں تو وہ بہت گھبرایا اور چپ چاپ گدھے پر سوار ہو کر سعد کے آگے آگے چلنے لگا۔

راستے میں چلتے چلتے سعد نے پوچھا۔ "تمہارے سردار کو مجھ پر کس قسم کا شبہ ہوسکتا ہے؟"

سعد نے جواب دیا۔ "پتا نہیں۔ یہ تو وہیں چل کر معلوم ہوگا لیکن تم کو ستایا نہیں جائے گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

لکڑہارا خاموش تو ہوگیا مگر وہ بہت پریشان تھا۔

دونوں المنصور کے پاس پہنچے اور اسے بتایا کہ سعد ایک بوڑھے لکڑہارے کو اپنے ساتھ لایا ہے تو اس نے دونوں کو فوراً طلب کرلیا۔ لکڑہارے کو دیکھتے ہی اس نے سعد سے پوچھا۔ "اس کے پاس سے کچھ نکلا؟"

سعد نے جواب دیا۔ "میں نے اس کی خوب تلاشی لی مگر کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جس سے کسی شک کی تقویت ہو۔"

المنصور نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اس کی دوبارہ تلاشی لی جائے۔"

ذرا سی دیر میں المنصور کے دو آدمیوں نے تلاشی لی اور جب کچھ نہیں ملا تو انہوں نے المنصور سے پوچھا۔ "اس کے پاس تو کوئی مشتبہ چیز نہیں ہے۔ کیا اسے جانے دیا جائے؟"

المنصور نے تلاشی لینے والوں کو جھڑک دیا۔ "کیوں کچھ نہیں نکلا۔ اچھی طرح تلاشی لو۔ اس کے پاس سے ضرور کچھ نہ کچھ نکلے گا۔"

لکڑہارے نے غصے میں کہا۔ "مجھے ننگا کردو پھر بھی کچھ نہیں نکلے گا۔"

المنصور نے سعد سے پوچھا۔ "تو نے اس کے گدھے کے پالان کی تلاشی لی تھی؟"

سعد نے جواب دیا۔ "کیا جانور کی بھی تلاشی لینی ہوتی ہے؟"

المنصور نے غصے میں کہا۔ "کیا اس کا گدھا اور اس کا پالان اس سے الگ ہیں؟ پالان کی تلاشی لو!"

سعد نے پالان کی تلاشی لینے میں پہل کردی اور اس کی تہ کے اندر سے ایک کاغذ برآمد کرلیا۔ اس نے فوراً المنصور کی خدمت میں پیش کردیا۔

المنصور نے لکڑہارے سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟ اسے پڑھ کے ہمیں اس کے مضمون کا مفہوم بتا۔"

چونکہ یہ تحریر علاقائی اور مقامی زبان میں تھی اس لئے المنصور اسے خود نہیں پڑھ سکتا تھا۔

لکڑہارے نے پڑھنے سے انکار کیا اور کہا۔ "میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔"

المنصور نے حکم دیا۔ "لکڑہارے کو قید کیا جائے اور جب تک یہ تحریر پڑھ نہ لی جائے، یہ قیدی رہے گا۔"

دو آدمی کے ایک عیسائی کو بلوا کے المنصور نے یہ خط پڑھوایا اور کاریون کے سرداروں کو طلب کرلیا کہ ان سے المنصور کو کسی معاملے میں مشورہ کرنا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی اس نے اپنے ایک فوجی دستے کو حکم دیا کہ وہ لیون کے سرداروں کو نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے اس طرح اپنے محاصرے میں رکھیں کہ انہیں اپنے محاصرے میں ہونے کا احساس نہ ہو۔

اب المنصور دوسرے عیسائی سرداروں پر بھی بھروسا نہیں کرسکتا تھا اور فی الحال یہاں سے کوچ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

لیون اور کاریون کے سردار آگئے تو المنصور نے ان سے پوچھا۔ "موسم بہار شوں اور برف باریوں کا ہے۔ ہم یہاں کب تک پڑے رہیں گے؟"

لیون کے سرداروں نے ایک ہی مشورہ دیا۔ "کم از کم ہفتہ دس دن یہاں قیام کرنا چاہیے۔"

المنصور نے لیون کے سرداروں سے کہا۔ "بروموند نے عبداللہ الکدل کو پناہ دی اور خراج دینا بھی بند کردیا اور مزید زیادتی یہ کی کہ اسلامی علاقوں پر حملے شروع کردیے۔ میں نے یہ ساری زیادتیاں برداشت کیں مگر جب سارے معاملے طے ہوگئے تو وہ بھاگ کے دلی یعقوب شہید کے مقدس شہر میں روپوش ہوگیا۔ اب میں اس کو پکڑنے کے لئے کوسپوسٹیلا جارہا ہوں تو یہ سننے میں آیا ہے کہ لیون کے بعض سردار میری اس مہم کی مخالفت کررہے ہیں۔ شاید وہ اس حملے میں میرے شریک ہو کر اپنے عیسائی بھائیوں سے جنگ نہیں لڑنا چاہتے۔"

لیون کے ایک سردار نے کہا۔ "آپ نے سچی بات کہہ دی۔ جناب! آپ کو بروموند چاہیے تو ہم اسے آپ کے حوالے کروادیں گے مگر اس مقدس شہر کے خلاف فوج کشی دل سے پسند نہیں کرتے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔"

المنصور نے کہا۔ "مگر ہم نے جو یہ مہم شروع کی ہے تو اسے ادھورا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

دونوں میں کچھ دیر یونہی بے ربط اور غیر ضروری باتیں ہوتی رہیں۔ لیون کے سردار نہیں سمجھ سکے کہ المنصور ان سے کیوں الجھا ہوا ہے۔

المنصور نے ان سب کو اچھی طرح محاصرے میں لینے کے بعد انہیں بتایا۔ "دوستو! آج صبح میرے ایک پہرے دار نے دورۂ طلیہ ارش میں ایک لکڑہارے کو پکڑ لیا۔ اس کی تلاشی لی تو اس کے پالان سے ہمیں یہ خط ملا۔ یہ خط مقامی زبان میں ہے۔ آپ لوگ چونکہ انہی علاقوں کے رہنے والے ہیں اس لئے اس زبان سے بھی واقف ہوں گے اس لئے ذرا اسے پڑھ کر اس کا مطلب سمجھائیں۔"

لیون کے ایک سردار نے یہ خط ہاتھ بڑھا کے لے لیا مگر اب ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن میں خوف پایا جاتا تھا۔ کاریون کے ایک سردار نے اعلان کیا۔ "جناب! اس خط کی عبارت سے ہمیں لاتعلق سمجھا جائے۔"

المنصور نے لیون کے سردار کو حکم دیا۔ "تو خط پڑھ اور اس کا مفہوم سمجھا۔"

سردار نے یہ خط پڑھ کے اس کا مفہوم بھی گوش گزار کردیا اور اپنے بارے میں کہا۔ "میں خود اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔"

المنصور نے ان سرداروں سے ہمدردی کی اور کہا۔ "اگر تم لوگ یہ فیصلہ لیون ہی میں کرلیتے تو بہتر ہوتا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہ لاتا۔ اب جب کہ تم سب میرے مددگار بن گئے ہو تو مجھے دھوکا نہ دو۔ میرے ساتھ اپنے مقدس شہر تک چلو اور علی الاعلان کومپوسٹیلا کی فوج میں شامل ہوجاؤ۔ ہم سے جنگ کرو تاکہ میں یہ نہ کہوں کہ تم مکار مسیحی ہو۔"

ان سرداروں نے معذرت کی اور ایک دوسرے کو اس سازش کا ذمے دار قرار دینے لگے۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ ان کے علاقے میں المنصور مصلحت اندیشی سے کام لے گا اور سب کو معاف کردے گا لیکن کاریون کے چند سرداروں کو یقین نہیں تھا کہ المنصور ان غداروں کو معاف کرے گا۔ اگر معاف نہیں کرے گا تو کم از کم اس خطرناک علاقے میں انہیں سزا بھی نہیں دے سکے گا۔

المنصور نے ایسا نرم رویہ اختیار کیا کہ کسی کو اب یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ المنصور لیون کے سرداروں کے خلاف کتنی سفاکانہ سزا تجویز کرچکا ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے کاریون کے سرداروں کو تو رخصت کردیا مگر لیون کے سرداروں کو روک لیا اور کہا۔ "اب مجھ کو تم سے اس لکڑہارے کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے کیوں کہ وہ غریب تو بلاوجہ تمہارا آلۂ کار بن گیا۔"

ان سرداروں کو ایک بڑے خیمے میں اس منصوبہ بندی کے ساتھ ایک ایک کرکے لے جایا گیا کہ اس بڑے خیمے کے اندر جلاد بٹھادیے گئے تھے اور ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ جیسے ہی لیون کا کوئی سردار اندر داخل ہو، اسے قتل کردیا جائے اور اس کی لاش سامنے کے آخری کنارے پر رکھی جائے تاکہ ہر آنے والا پہلے اپنے ساتھی کا سر دیکھے اور دہشت زدہ ہوجائے۔

یہ سردار باری باری مقتل میں پہنچتے رہے اور قتل ہوتے رہے۔ ذرا سی دیر میں ان سب کا صفایا ہوگیا۔

لکڑہارے کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی پالان سے پکڑے جانے والے خط کے نتیجے میں المنصور نے کیا کارروائی کی ہے۔ جب یہ سب سردار مارے جاچکے تو المنصور نے ایک بار پھر لکڑہارے کو طلب کیا اور پوچھا۔ "سچ بتا کہ تجھ کو یہ خط کس نے دیا اور تو اس کو کہاں لے جارہا تھا؟"

لکڑہارے نے کہا۔ "میں ان پڑھ ہوں اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ گدھے کی پالان میں کس نے یہ خط رکھ دیا تھا۔"

المنصور نے پوچھا۔ "تو واقعی لکڑہارا ہے یا لکڑہارے کے بھیس میں یہ خط لے جارہا تھا؟"

لکڑہارے نے روتے ہوئے کہا۔ "جناب! اگر آج میں نے

لکڑیاں نہ کاٹیں تو میرا کنبہ فاقہ کرے گا۔ آپ لوگ یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں لکڑہارا ہوں۔"

المنصور نے کہا۔ "لیکن لیون کے ایک سردار نے تیرے بارے میں یہ بتایا کہ تو اس چھوٹے سے علاقے کا پادری ہے۔"

اب تو لکڑہارا ڈھیلا پڑ گیا اور کہا۔ "مجھے اس سردار سے ملوائیں تو سہی جس نے مجھ پر اتنا بڑا جھوٹا الزام لگایا ہے۔"

المنصور نے سعد سے کہا۔ "اس کو لیون کے اس سردار کے پاس لے جاؤ اسے لکڑہارا نہیں پادری کہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بے قصور کو قتل کر دیا جائے۔"

سعد نے لکڑہارے کو ساتھ لیا اور راستے میں کہا۔ "تو تو انتہائی خطرناک آدمی نکلا۔ میں نے تو تیرے بڑھاپے اور تیری غریبی پر رحم کھا کے چلا جانے دیا تھا۔ سوچ تو ذرا کہ اگر کوئی آگے دو سرا پہرے دار پکڑ لیتا تو تیرے ساتھ میرے چلنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں کہیں ہوتا' تو کہیں ہوتا اور ہم دونوں آگے پیچھے قتل کر دیے جاتے۔"

لکڑہارے نے رحم طلب نظروں سے سعد کو دیکھا اور دریافت کیا۔ "اب میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟"

سعد نے جواب دیا۔ "تیرا حشر تو لیون کے سردار کے بیان پر منحصر ہے۔ آخر اس نے تجھ کو پادری کیوں کہا؟"

دونوں باتیں کرتے ہوئے منقل تک پہنچ گئے۔

خیمے کا پردہ اٹھا کے سعد اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے لکڑہارا بھی اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس کی نظر لاشوں کے انبار پر پڑی اور لکڑہارے کی حالت اتنی غیر ہوئی کہ اس سے کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا۔

سعد نے لاشوں کے ڈھیر کے پاس کھڑے ہو کر لکڑہارے سے کہا۔ "میں ان لاشوں کو الٹتا پلٹتا ہوں' ان میں لیون کا سردار بھی ہوگا میں اسے پہچانتا ہوں۔"

لکڑہارے نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "یہ سب تو مارے گئے' میرے سلسلے میں گواہی کون دے گا؟"

سعد نے بڑے شاعرانہ انداز میں جلاد سے..... لکڑہارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رہروانِ عدم کے قافلے کا آخری مسافر ہے۔ اسے بھی ان سب کے پاس پہنچا دے۔ یہ اکیلا رہے گا تو بھٹکے گا۔"

جلاد نے ایک ہی وار میں لکڑہارے کو بھی ملکِ عدم بھیج دیا اور اس کی لاش بھی ساتھیوں اور غداروں کے ڈھیر میں ڈال دی گئی کیونکہ اب المنصور کو ایک نئی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اس کو شبہ تھا کہ شاید دوسرے عیسائی سرداروں کو لیون کے سرداروں کا قتل کیا جانا گراں گزرے اور وہ بھی اس جنگ میں ساتھ دینے سے گریز کریں۔

اپنے اس اندیشے کے پیشِ نظر اس نے لیون اور دو آبے کے سرداروں کو جمع کر لیا اور انہیں لیون کے سرداروں کی غداری کا حال بتایا۔ انہیں اس غداری کی جو سزا دی گئی تھی' اس سے بھی آگاہ کیا اور پوچھا "اب تم سب یہ بتاؤ کہ مجھے ولی یعقوب شہید کے شہر جانا چاہیے یا نہیں؟"

کارین کے کئی سردار مقتول مسیحی سرداروں کی سازش سے واقف تھے مگر المنصور پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ انہیں بھی اس سازش کا علم تھا۔ ان سب نے خوشامدانہ روش اختیار کی اور مشورہ دیا۔ "جس مہم کے لئے اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اس کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

المنصور نے کہا۔ "دو سو! لیون کے سرداروں کی طرح اے دینی مسئلہ نہ بناؤ۔ میں بدمعاش کا پیچھا کر رہا ہوں اور بدمعاش نے تم لوگوں سے بھی وفا نہیں کی۔ اس بے وفا کو کومپوسٹیلا نے پناہ دے دی۔ اب میں اس کو تم سب کی مدد سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میری کومپوسٹیلا سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کومپوسٹیلا کے ولی یعقوب شہید کی دعاؤں اور برکتوں سے عیسائی مسلمانوں پر فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ اب تم لوگ میرے ساتھ ہو۔ اگر اس بزرگ کی رحمتیں اور برکتیں عیسائیوں کے ساتھ ہوں گی تو عیسائی جیت جائیں گے اور میں ہار جاؤں گا۔ بس حق و باطل کا اس شہر میں امتحان ہو جائے گا۔"

تمام عیسائی سرداروں نے اعلان کر دیا کہ وہ ہر حال میں المنصور کا ساتھ دیں گے اور اس مقدس شہر کی عظمت کا قائل ہیں۔ بغیر برومند کو پکڑ کے المنصور کے حوالے کریں گے۔

○☆○

چند دن موسم کی شدت میں کمی آنے کا انتظار کیا گیا اور جب موسم کسی قدر خوشگوار ہو گیا تو المنصور کو کوچ کا حکم دیا۔ اسے کومپوسٹیلا تک پہنچنے کے لئے کئی چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دریاؤں کو عبور کرنا تھا۔ سامنے قریب ہی دو جزیرے تھے جن کے لئے مشہور تھا کہ شہروں کی پریشانیاں اٹھانے والے محروم عموماً بھاگ کر انہی جزیروں میں پناہ لیتے ہیں اور جب حالات سازگار ہو جاتے ہیں تو یہاں سے اپنے اپنے شہروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کے دونوں جزیروں کے بارے میں اس وقت بھی یہی شہرہ تھا کہ مسلمانوں کے لشکر کے خوف سے بھاگے ہوئے انہی دونوں جزیروں میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔

ان میں جو جزیرہ قریب بھی تھا اور بڑا بھی' المنصور نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ اس جزیرے میں اتر جائیں۔

مسلمانوں کے اچانک اس جزیرے میں داخل ہو جانے سے کھلبلی مچ گئی کیونکہ جن کے خوف سے بھاگ کے یہ لوگ یہاں آئے تھے وہ مسلمان یہاں بھی اچانک داخل ہو گئے تھے۔ ہر طرف مسلمانوں کا خوف غالب نظر آنے لگا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر لئے۔ گرجوں میں گھنٹے بجنے لگے اور پادریوں نے المنصور کے حلیف عیسائی سرداروں کے خلاف بددعائیں کیں۔

المنصور نے جزیرے کے پادریوں کو بلوایا اور ان کو اطمینان دلایا کہ یہ جزیرہ اس کی فوج کی گزرگاہ ہے اس لئے اس جزیرے والوں کو مسلمانوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے ایک اونچی جگہ پر اپنا ایک چھوٹا سا پرچم لہرا دیا اور جزیرے کے معززین سے بھی ملاقاتیں کیں۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

المنصور کی یہ حکمتِ عملی اس لئے تھی کہ وہ اپنے پیچھے راستہ روکنے والے عیسائیوں کو اس طرح باز رکھنا چاہتا تھا کیونکہ لیون کے سازشی سرداروں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ عیسائیوں پر زیادہ بھروسہ نہ کیا جائے اور مصلحتاً انہیں راضی رکھنے کے عارضی طور طریقے اپنائے جائیں۔

جزیرے کے پُرجوش عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مہم ان کے مقدس شہر کے خلاف ہے اور شاید مسلمان ولی یعقوب شہید کے مقدس شہر کو برباد کر دینا چاہتے ہیں تو ان میں بھی باغیانہ جذبہ پیدا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دو آبے کے عیسائی سردار ان کا ساتھ دے دیں تو المنصور کو اس کے مقدس شہر کی بربادی سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

چنانچہ دو آبے کے بعض سرداروں سے اس موضوع پر بات کی گئی تو ان حلیف سرداروں نے ان کو بتایا کہ المنصور کس قسم کا آدمی ہے اور وہ اگر ان کی سوچ اور ارادے سے آگاہ ہو گیا تو اس جزیرے کا نام و نشان مٹا دے گا۔

جزیرے کے انتہا پسند عیسائی المنصور کے خلاف کوئی منصوبہ بندی تو نہیں کر سکے مگر انہیں المنصور کے حلیف عیسائی سرداروں پر بے حد غصہ آیا اور وہ دل ہی دل میں کھولتے رہے۔

جزیرے سے نکلنے کے بعد مسلمان اپنا پرچم نیلے پر بھول آئے۔ المنصور مقدس شہر کی طرف بڑھتا رہا۔ یہیں راستے میں وہ ایک ایسے قصبے میں پہنچا جہاں کبھی ولی یعقوب شہید کے بارے میں آگاہ کرنے والا شخص تھیوڈومیر رہا کرتا تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا تھا کہ حضرت مسیح کا ایک ولی یعقوب شہید تھا جو عرصوں گمنامی میں یہاں دفن رہا۔ بالآخر یہاں کے قصبے کے ایک پادری تھیوڈومیر کو نہایت معجزانہ انداز میں آگاہ کیا گیا کہ ولی یعقوب شہید یہاں دفن ہے۔ اس نے لوگوں کو اس ولی کی آخری آرام گاہ کی خبر دی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شناسا ریادگار پر ایک کلیسا تعمیر کر دیا گیا اور مقبولی دنیا کے زائرین یہاں حاضریاں دینے لگے۔

یہ مقدس شہر جہاں المنصور جا رہا تھا اسی ولی یعقوب شہید کی آخری آرام گاہ تھا۔

جس طرح ولی یعقوب شہید کو یہاں شہرت حاصل ہوئی اسی طرح تھیوڈومیر بھی مشہور ہوا لیکن جو شہرت کومپوسٹیلا کو حاصل ہوئی وہ تھیوڈومیر کے وطن ایرا کو حاصل نہ ہوئی۔

اس ولی یعقوب شہید کے بارے میں جو سب سے زیادہ ناقابلِ یقین بات تھی وہ اس کی جائے شہادت اور جائے تدفین کا درمیانی فاصلہ تھا۔

روم کے ہیرو ڈوشس کے حکم سے یروشلم میں یعقوب کو قتل کیا گیا مگر اس کے شاگرد اس کی لاش کو جلیقیہ میں اٹھا لائے اور کومپوسٹیلا میں دفن کر دیا۔

ایرا کے تھیوڈومیر نے اپنی زندگی ولی یعقوب کی قبر پر گزار دی۔

یہ قصبہ ایرا اس کے وطن کی حیثیت سے مشہور رہا مگر خود تھیوڈومیر یہاں واپس نہ آیا۔

لوگوں نے ایرا میں اس کی جائے پیدائش کی نشاندہی تو کی کیونکہ اس چھوٹی سی یادگار کو محفوظ رکھا گیا تھا۔ المنصور نے تھیوڈومیر کی اس یادگار کو ختم کر دینا چاہا مگر یہ سوچ کر باز رہا کہ اگر اس نے زیارت گاہوں کی بربادی کا عمل یہاں سے شروع کیا تو اپنے حلیف عیسائیوں کے دلوں میں یہیں سے عناد پنپنا شروع ہو جائے گا اور کومپوسٹیلا میں اس عناد سے اس کے لئے کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔

ایک مقامی عیسائی نے المنصور سے ملنے کی خواہش کی کیونکہ اس نے یہ نام بہت سنا تھا اور اب جو المنصور اس کے علاقے سے گزرنے لگا تو اس عیسائی نے المنصور کی ایک جھلک دیکھ لینے کی خواہش کی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ المنصور ایرا میں تھیوڈومیر کی جائے ولادت سے متعلق یادگار کو دیکھنے جائے گا تو وہ خود بھی وہاں پہنچ گیا۔

المنصور نے اس عیسائی سے تھیوڈومیر کی جائے ولادت پر ملاقات کی اور اس سے پوچھا "عیسائیوں نے تھیوڈومیر کی اس روایت پر کس طرح اعتبار کر لیا کہ ولی یعقوب شہید کو ہیرو ڈوشس نے قتل تو یروشلم میں کیا اور اس کی لاش اس کے شاگرد کومپوسٹیلا لے آئے اور یہیں دفن کر دیا۔

المنصور نے کہا۔ "یروشلم سے یہاں تک پہنچنے کے لئے کتنی مدت درکار ہے۔ تم لوگوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا۔ اس عرصے میں ولی یعقوب شہید کی لاش تو بالکل سڑ گل گئی ہوگی اس لئے جسم کے دفن کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

یہاں کی زیارت گاہ پر جو پادری بیٹھا تھا اس عیسائی نے اس کی طرف دیکھا کہ وہ المنصور کے اس سوال کا جواب دے۔ پادری نے کچھ دیر چپ رہ کے اعتراض پر غور کر کے جواب دیا۔ "روایت بھی یہی ہے کہ کومپوسٹیلا میں ولی یعقوب کا لاشہ نہیں ہڈیاں دفن ہیں۔"

المنصور نے دوسرا اعتراض کیا۔ "ولی یعقوب کے شاگردوں کو اندلس کے اس دور دراز اور دشوار گزار مقام تک ہڈیوں کو لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ علاقہ تو پرتگال کا ہے جب کہ اندلس میں سمندر کے قریب بہت سی قریبی ایسی جگہیں ہیں جہاں

مفروضہ ولی یعقوب کی ہڈیاں دفن کی جاسکتی تھیں۔"

پادری کے پاس المنصور کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا۔ المنصور نے کہا۔ "تم پادری لوگ عام عیسائیوں کی خوش عقیدگی سے خوب فائدہ اٹھاتے ہو اور جانتے ہو کہ تم ان سے جو بھی کہو گے، یہ سیدھے سادے لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے۔"

پادری نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "تم کو سپوسٹیلا کو فتح کرنے نکلے ہو، اسے فتح کرو اور قرطبہ واپس جاؤ۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "پادری! تجھے یہ غلط فہمی ہے کہ میں کو سپوسٹیلا کو فتح کرنے نکلا ہوں۔ میں تو یہاں ہمدرد مند کی تلاش اور تعاقب میں آیا ہوں۔ تم لوگ جو یہ کہتے ہو کہ ولی یعقوب شہید مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیوں کو برکت اور مدد دیتا ہے اب میں اس کے خاص شہر میں داخل ہونے اور فتح کرنے جارہا ہوں۔ وہاں میں دیکھوں گا کہ یعقوب ولی عیسائیوں کی کتنی مدد کرتا ہے۔"

پادری نے المنصور کی اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ المنصور کو ایک نظر دیکھ لینے کا خواہش مند عیسائی المنصور سے ملا اور اپنے شوق کا بھی ذکر کیا تو المنصور نے اسے قرطبہ چلنے کی دعوت دی۔

اس عیسائی نے فرط عقیدت میں ان سازشی عیسائیوں کا ذکر کردیا جو المنصور کو یہاں دھوکے سے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ المنصور نے ان سب کو گرفتار کرلیا اور انہیں قیدی بنا کر ساتھ رکھا۔

آگے ایلا نامی ایک دریا تھا اور دریا کے اس پار کو سپوسٹیلا تھا۔ یہاں دریا کو عبور کرنے سے پہلے وہ اپنے عیسائی حلیفوں کی اندرونی کیفیات کا ان کے چہروں سے اندازہ لگا رہا۔ اس کے منجنر بھی عیسائی سرداروں کے بارے میں وہ خبریں دے رہے تھے ان کے مطابق کوئی ایک بھی عیسائی سردار المنصور کے خلاف نہیں تھا۔

دریا کے اس پار اسے کوئی فوج بھی نظر نہیں آئی اور نہ ہی کو سپوسٹیلا کی شہری نظر آرہے تھے جس سے اسے شبہ ہوا کہ کو سپوسٹیلا کی فوج کہیں چھپی ہوئی اس کا انتظار نہ کررہی ہو۔

اس نے اپنے حلیف عیسائی سرداروں کو حکم دیا کہ پہلے وہ دریائے ایلا کو عبور کریں اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر ساحل پر اچھی طرح قابض ہوجائیں۔

ان عیسائیوں کے ساتھ کچھ مسلمان بھی کردیے گئے اور انہیں رازداری سے ہدایت کردی گئی کہ دریا کے دوسرے کنارے پر اترنے کے بعد وہاں دشمن کی فوج کو تلاش کریں اور جیسے ہی ان کے آثار ملیں، وہ دریا کے کنارے نفی میں اپنے ہاتھ ہلانا شروع کردیں جس سے المنصور کو معلوم ہوجائے گا کہ وہاں کہیں عیسائی فوج موجود ہے۔

حلیف عیسائی فوج دریائے ایلا کو عبور کرگئی اور اس کے ساتھ کچھ مسلمان بھی دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

کئی گھنٹے بعد چند مسلمان واپس آئے اور انہوں نے المنصور کو بتایا کہ کو سپوسٹیلا میں فوج تو کیا ایک سپاہی بھی موجود نہیں ہے۔ مکانات بھی بالکل خالی پڑے ہیں۔ شاید آبادی بھی شہر خالی کرگئی۔

المنصور نے دریا کو عبور کیا اور دوسرے کنارے پر اترتے ہی اپنے کئی سو سپاہی پورے شہر میں پھیلا دیے کہ وہ کو سپوسٹیلا کی شہری آبادی اور فوج کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا کریں۔

وہ خود تقریباً پانچ سو سرفروشوں کو لے کر ولی یعقوب کے مزار اور گرجے کا جائزہ لینے پہنچ گیا۔

یہ شاندار گرجا بھی بالکل خالی تھا۔ بس یہاں ولی یعقوب کی قبر پر ایک پادری بیٹھا نظر آیا۔

وہ اس پادری سے ملا اور پوچھا۔ "یہاں کی فوج اور شہری کہاں چلے گئے؟"

پادری نے جواب دیا۔ "تو نے قرطبہ میں بیٹھ کے جب اس شہر کو برباد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو مجھ کو خواب میں یہ ہدایت کی گئی کہ میں یہاں کی فوج اور شہریوں کو بتادوں کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس لئے وہ جہاں مناسب سمجھیں، چلے جائیں۔ چنانچہ شہری آبادی تو آس پاس کی آبادیوں میں چلی گئی اور فوج نے کہاں پناہ لی، مجھے نہیں معلوم۔"

المنصور نے پوچھا۔ "تو یہاں بیٹھا کیا کررہا ہے؟"

پادری نے جواب دیا۔ "میں یہاں گرجے اور مزار کی دیکھ بھال بھی کرتا ہوں اور عبادت میں بھی مشغول رہتا ہوں۔"

المنصور نے پادری کے ساتھ گرجے کے اندر گھوم پھر کے دیکھا اور کچھ دیر ولی یعقوب کے مزار کے سامنے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

پادری نے کہا۔ "یہ ہماری مقدس ہے کہ جس ولی کو یروشلم میں شہید کیا گیا تھا، اس کی ہڈیاں یہاں دفن ہیں اور ہمیں اس کی زیارت کے لئے یروشلم نہیں جانا پڑتا۔"

المنصور نے کہا۔ "جس طرح تمہیں بتایا گیا تھا کہ ولی یعقوب کی ہڈیاں یہاں دفن ہیں، وہ خوش عقیدگی کے سوا کچھ نہیں۔ مذکورہ ولی اپنے لاشے اور ہڈیوں کے اعتبار سے بدقسمت تھا کہ پتا نہیں بیروذوس نے اس کو قتل کردینے کے بعد اس کی لاش کہاں پھنکوا دی ہو۔ یہاں یہ مزار جس روایت پر تعمیر کیا گیا وہ بالکل غیر مصدقہ ہے۔ پہلے اس مزار کی جگہ جھاڑی تھی۔ ایرا کے تھیوڈومیر نے اس جھاڑی سے روشنی نمودار ہوتی دیکھی اور اس کو خواب میں بتا دیا گیا کہ اس جھاڑی کے نیچے ولی یعقوب کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اس نے عام عیسائیوں کو بتایا اور پھر سب نے اس کے خواب اور بیان کو کسی جرح اور بحث کے بغیر قبول کرلیا۔ اس طرح ولی یعقوب اپنے نام سے خوش قسمت تھا کہ اس جگہ اس کا نام دفن ہے۔"

پادری نے کہا۔ "تھیوڈومیر جھوٹا نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ

بتایا، اس پر ہمارا ایمان ہے۔"

المنصور نے پوچھا۔ "تیرا شہر تو بالکل ویران ہے اور فوج نے بھی مقابلہ کئے بغیر ہی راہِ فرار اختیار کی جب کہ ہم مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ ولی یعقوب مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیوں کی مدد کرتا ہے۔ اب تم یہ کہتے ہو کہ ولی یعقوب نے فوج اور شہریوں کو پہلے ہی سے خبردار کردیا تھا کہ انہیں شکست ہوجائے گی اور مسلمان آجائیں گے تو تمہارے ولی نے اس موقع پر تمہاری مدد کیوں نہیں کی؟"

پادری نے جواب دیا۔ "جناب! میں سیدھا سچا ایماندار مسیحی ہوں۔ جب مجھے عالم رویا میں ولی یعقوب نے یہ ہدایت کی کہ مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیا جائے اور فوجی اور شہری یہاں سے کہیں اور چلے جائیں تو میں ولی یعقوب سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ ہماری مدد کرنے کے بجائے پیچھے ہٹ جانے کی بات کیوں کررہے ہیں۔"

المنصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو بہت چالاک ہے۔ مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو گرجے اور مزار کی دیکھ بھال کرتا رہ۔ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

پادری نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، چاہے مسلمان مجھ کو قتل کیوں نہ کردیں مگر ایک آپ کے زبانی امان دینے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کے دوسرے سپاہی مجھے قتل بھی کرسکتے ہیں۔"

المنصور نے پادری کو اطمینان دلایا۔ "فضول باتیں نہ کر۔ عجب میں نے تجھ کو امان دے دی تو میں تیری اور اس گرجے کی حفاظت کے لئے مسلمان سپاہیوں کا ایک دستہ بھی بٹھادوں گا۔"

پادری نے المنصور کا شکریہ ادا کیا۔ المنصور نے اسی وقت ہیں مسلمان سپاہیوں پر مشتمل محافظ کھڑے کردیے کہ کوئی فوجی اس مزار پر گرجے کو نقصان نہ پہنچائے۔

المنصور کو، پورے شہر کا جائزہ لینے والے مسلمان سپاہیوں نے مطلع کیا کہ شہر میں ایک مکان بھی آباد نہیں ہے۔ پوری آبادی مسلمانوں کے خوف سے دوسرے شہروں میں منتقل ہوگئی ہے۔

اس کے عیسائی حلیف سرداروں اور ان کی فوج کو خالی شہر اور فوج کی عدم موجودگی سے یہ خوشی حاصل ہوئی کہ انہیں اپنے بھائیوں سے جنگ نہیں کرنا پڑی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ المنصور نے ولی یعقوب کے مزار پر حاضری دی اور مزار، گرجے اور پادری کی حفاظت کے لئے مسلمان سپاہیوں کا ایک دستہ بٹھادیا ہے تو انہیں بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

المنصور نے خالی گھروں سے بہت سا سامان اور قیمتی چیزیں حاصل کیں اور انہیں فوج میں پہنچادیا گیا۔

المنصور نے اپنے مشیروں اور حلیف عیسائی سرداروں کو اپنے سامنے بٹھایا اور ایک چھوٹی سی تقریر کے بعد ان سب سے پوچھا۔ "دوستو! تمہیں معلوم ہے کہ یہاں تک پہنچنا کتنا دشوار تھا۔ مجھ سے پہلے کسی مسلمان حکمران نے یہاں تک پہنچنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا لیکن میں یہاں تک پہنچ گیا اور میرا کسی نے مقابلہ بھی نہیں کیا۔ مجھے یہاں کے خالی مکانوں سے قیمتی سامان بھی ملا۔ میری فوج کے محرر اور مؤرخ یہ ساری تفصیلات لکھ رہے ہوں گے اور تاریخ میں یہ پڑھا جائے گا کہ المنصور نے کو سپوسٹیلا کو فتح کرلیا تھا اور لوگ شہر کو خالی کرگئے تھے۔ یہ سیدھی سادی تحریریں پڑھ کے مستقبل کی نسلیں یہ یقین کرلیں گی کہ کو سپوسٹیلا کو میں نے فتح کرلیا مگر میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد اس شہر کے نئے آباد ہونے والوں اور ان علاقے کے دوسرے بسنے والوں کو... کس طرح یقین دلایا جائے گا کہ میں نے کو سپوسٹیلا کو فتح کرلیا ہے میری فتح مندی کے آثار انہیں کہیں نہیں ملیں گے جب کہ میں یہ آثار چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہوں۔"

ایک دو آبے کے عیسائی سردار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو جناب! اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہاں کی فوج کو تلاش کریں اور اس کو آپ کے مقابلے پر لائیں۔ جب جنگ ہو، کچھ ہمارے آدمی کام آئیں اور کچھ ان کے آدمی قتل کئے جائیں اور پھر شکست اٹھا کے وہ راہِ فرار اختیار کریں اور مؤرخ اس جنگ کا حال تحریر کرے کہ اس طرح دونوں طرف کی اتنی اتنی تعداد میں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں، دونوں طرف کی صف بندی کا تفصیلی حال لکھا جائے۔ جنگ کے شروع ہونے کا وقت بھی بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ جنگ اتنی دیر جاری رہی۔ حملہ آوروں کے اتنے آدمی مارے گئے اور مدافعت کرنے والوں کا کس طرح صفایا کردیا گیا، کتنوں نے راہِ فرار اختیار کی اور دوران تعاقب میں کتنوں کو ہلاک اور کتنوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ بس اسی طرح اس مہم کو تاریخ میں تفصیل کے ساتھ محفوظ کیا جاسکتا ہے۔"

لوگوں کو اس خیالی تجویز سے لطف تو حاصل ہوا مگر المنصور کو یہ تجویز بہت بری لگی، کہنے لگا۔ "اچھا اب بکواس بند کر۔ کیا تو اپنی اس تجویز کے مطابق عیسائیوں کی بھگوڑی فوج کو میرے مقابلے پر واپس لاسکتا ہے؟"

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ "یہ تجویز ناقابلِ عمل ہے، اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔"

المنصور نے پوچھا۔ "کوئی دوسری قابلِ عمل تجویز ہے کہ جنگ میں جنگ کی تباہ کاریوں کے آثار چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہوں؟"

ایک مسلمان سردار نے مشورہ دیا۔ "یہاں ایک مسجد تعمیر کردی جائے اور کچھ مسلمان آباد کردیے جائیں یا پھر یہاں قرطبہ کی طرف سے ایک مسلمان حاکم مقرر کردیا جائے۔"

المنصور نے کہا۔ "یہ بھی فضول تجویز ہے کیونکہ قرطبہ کی فوج یہاں دوبارہ نہیں آئے گی اور یہ طے ہے کہ اگر ہم یہاں کوئی مسلمان حاکم مقرر کریں گے تو یہ مسلمان حاکم ہمارے جاتے ہی مارا دیا جائے گا اور اس کی حکومت ختم ہوجائے گی۔"

سبھی نے خاموشی اختیار کی کیونکہ فتح مندی کے ایسے اثرات چھوڑ جاتا کہ ملاتے کو ان کی یاد آتی رہے اور لوگ اگر بھلانا بھی چاہیں تو نہ بھلا سکیں، بہت مشکل تھا۔

آخر المنصور نے اپنا منصوبہ بیان کردیا۔ "میں موجودہ کو میوسٹیلا کو برباد کردینا چاہتا ہوں۔ مکانات اور بڑی بڑی عمارتوں کو اس طرح مٹا دینا چاہتا ہوں کہ جب لوگ یہاں واپس آئیں تو انہیں یہاں ایک میدان ملے اور کسی کو بھی اپنے مکان کی اصل جگہ کا پتا نہ چلے پھر لوگ آہستہ آہستہ اپنے مکانات بنوائیں اور یہ شہر نئے سرے سے تعمیر اور آباد کیا جائے۔ اس طرح قرب وجوار کی آبادیوں کو معلوم ہوگا اور وہ یاد رکھیں گی کہ یہاں المنصور کی تمد سے پہلے ایک شہر ہوا کرتا تھا یعنی پرانا کو میوسٹیلا پھر جب سو پچاس سال بعد یہاں دوسرا شہر آباد ہوگا تو لوگ اسے نیا کو میوسٹیلا کہیں گے۔ اس طرح ہماری فتح مندی کے اثرات ہمیشہ کے لئے مرتسم ہوجائیں گے اور ہمیں یہاں کے مقامی لوگ بھی یاد رکھیں گے۔"

یہ المنصور کی تجویز نہیں، فرمان مطلق تھا، جس پر فوراً عمل ہونے لگا۔ مکانات مسمار کردیئے گئے۔ بڑی بڑی عمارتیں گرادی گئیں اور ان کے ملبے کو بہت دور پھکوا دیا گیا۔

چند دنوں کے بعد ہی گرجے اور ولی یعقوب کے مزار کے حوالے سے شہر کو میوسٹیلا کے جائے وقوع کو پہچانا جاسکتا تھا۔ اگر اس گرجے کو بھی تڑوا جاتا اور ولی یعقوب کے مزار کو توڑ پھوڑ کے برباد کردیا جاتا تو کو میوسٹیلا اور ولی یعقوب کے مزار کا تاریخ میں صرف ذکر ملتا مگر اس جگہ کو تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا۔

عیسائی سرداروں کو اندیشہ تھا کہ کہیں گرجے اور مزار کو بھی نہ تڑوا دیا جائے لیکن المنصور نے ان دونوں کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔

المنصور قرطبہ سے کو میوسٹیلا گیارہ اگست ۹۹۷ء میں پہنچا تھا اور جب کو میوسٹیلا کو ہموار میدان میں تبدیل کرکے وہ قرطبہ واپس جارہا تھا تو تاریخ ۱۸ ستمبر ۹۹۷ء تھی یعنی اس نے ایک مہینہ آٹھ دن میں سفر بھی کیا تھا، راستے کی مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو بھی عبور کیا تھا۔ پورے کو میوسٹیلا کو برباد بھی کیا، اس کے ملبے کو کہیں دور پھکوا بھی دیا تاکہ جب یہاں نیا شہر بسایا جائے تو لوگ اس کا نام "نیا کو میوسٹیلا" رکھیں اور نئے پرانے شہروں کا تعارف المنصور کے حوالے سے ہو۔

اس نے واپسی سے پہلے گرجا کے پادری سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا۔ "یہاں گرجے اور مزار کو کسی نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

پادری نے جواب دیا۔ "نہیں۔ پورے شہر کے ملیامیٹ ہوجانے کے باوجود ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

المنصور نے کہا۔ "افسوس کہ میری یہ رحم دلی اور مہربانی جس کا تعلق تجھ سے، گرجا سے اور مزار سے ہے، اسے کوئی یاد نہیں رکھے گا مگر شہر کی بربادی کے حوالے سے میرا ذکر ضرور کیا جائے گا۔"

پادری نے کہا۔ "اس ذکر میں جھوٹ شامل نہیں ہوگا کیونکہ آج میں خود دیکھ رہا ہوں کہ کو میوسٹیلا خواب وخیال بن چکا ہے اور آنکھوں کو یقین نہیں آتا کہ اس طویل وعریض میدان پر چند دنوں پہلے ایک شہر آباد تھا۔"

المنصور نے کہا۔ "اس شہر کے باشندے اپنے شہر سے مخلص نہیں تھے اور انہیں اپنے ولی یعقوب کی مدد اور برکت پر بھی بھروسا نہیں تھا۔ جن مکانوں کو انہوں نے اپنی مرضی سے خالی کردیا تھا، میرے خیال میں اب اس کے شہریوں کو ان مکانات میں دوبارہ آباد ہونے کا حق حاصل نہیں رہا تھا۔ مکان، شہر اور ملک اپنے رہنے والوں سے قربانیاں چاہتے ہیں۔"

پادری نے کہا۔ "دوبارہ یہ شہر آباد تو ہوجائے گا مگر میرا دل اس پرانے شہر کے لئے ہمیشہ روتا رہے گا۔ اس سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "اب میں چاہتا ہوں کہ تو ہمیں اپنے قلم سے ایک تحریر دے کہ المنصور نے دوبارہ ایلا کو یار کرکے جب اس شہر میں قدم رکھا تو یہاں کے شہری اور فوجی اپنے گھروں کے آنے سے پہلے ہی شہر خالی کرگئے تھے اور مسلمانوں نے قتل شہر کسی آدمی کو بھی قتل نہیں کیا پھر المنصور نے اپنی فتح مندی کی یادگار قائم کرنے کے لئے کو میوسٹیلا کو برباد کردیا۔ شہر کا نام ونشان مٹا دیا۔ پرانا کو میوسٹیلا نابود ہوگیا اور اس کی جگہ ایک میدان وجود میں آگیا۔ اب یہاں ایک نیا کو میوسٹیلا آباد ہوگا اور پرانے اور نئے کو میوسٹیلا کو المنصور کے حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔ میں تحریری، اپنے ذاتی خط اور دستخط سے اقرار کرتا ہوں کہ المنصور اور مسلمانوں نے مجھے، گرجا کو اور مزار کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ مسلمانوں نے ہماری حفاظت کی۔ جب تک وہ یہاں رہے، مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ ہماری حفاظت کرتا رہا۔ میں یہ مختصر روداد بہ شکل فتح نامہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آنے والی نسلوں کو حقائق کا علم ہو اور وہ تعصب اور طبیعتوں کی مبالغہ پسندی کی وجہ سے المنصور پر ظلم وزیادتی کی تہمتیں نہ لگائیں۔"

عبارت کے ختم ہونے کے بعد نیچے پادری نے اپنے دستخط کردیئے اور اپنی مذہبی حیثیت بھی لکھ دی۔

جب یہ تحریر المنصور لکھوا رہا تھا تو اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے مستقبل کے لئے کس طرح محفوظ رکھا جائے گا اور جب دنیا سمٹ کر مختصر ہوجائے گی اور قومیں مذاہب کے حوالے سے حساب کتاب کریں گی کہ کس نے کس پر کتنا ظلم کیا اور کس نے کس کے ساتھ فراخدلانہ سلوک کیا تو اس وقت تک امتداد زمانہ سے یہ پادری کی تحریر محفوظ بھی رہے گی یا نہیں، چنانچہ تاریخ میں اس قسم کا کوئی خط یا تحریر تو موجود نہیں مگر اس کی جگہ عیسائی مؤرخین نے ضرور لکھا ہے کہ گرجے کو زمین بوس کروا دیا گیا اور اس کی لڑکیاں اور دروازے عیسائی قیدیوں کے سروں پر رکھوا کے قرطبہ لے جایا گیا اور انہیں جامع قرطبہ میں لگوایا گیا۔ گرجے کے بڑے بڑے گھنٹوں اور گھنٹیوں کو شمع دان کے طور پر استعمال کیا گیا اور انہیں بھی مسجد میں لگوا دیا گیا۔

انہی عیسائی مؤرخین کے بقول جب یہ قیدی عیسائی اپنے سروں اور کاندھوں پر مندم گرجے کے دروازوں، کھڑکیوں، گھنٹوں اور گھنٹیوں سے لدے ہوئے قرطبہ میں داخل ہوئے تو مسلمان شہریوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور المنصور اور اس کی فوج کو کامیاب عیسائیت دشمنی کے صلے میں نعرہائے تحسین پیش کئے گئے۔

○☆○

المنصور نے کو میوسٹیلا سے واپسی کے دوران میں کئی عیسائی شہروں کو برباد کیا، آبادی قتل کی گئی یا لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا لیکن لیقیہ ناری قرطبہ داخل ہونے کے بعد المنصور نے اعلان کیا کہ یہاں کسی قسم کی لوٹ مار ہوگی نہ قتل عام آبادی کو قتل کیا جائے گا۔

شہر کے جس وسیع میدان میں مسلمانوں نے خیمے لگوائے انہی کے قریب عیسائی حلیفوں نے بھی اپنے خیمے نصب کئے۔

یہاں المنصور بڑے خوشگوار انداز میں حرکت میں رہا۔ وہ دیر تک عیسائیوں سے چھینے ہوئے سامان کا جائزہ لیتا رہا۔ خاص کر کپڑوں کے تھانوں کا اس نے اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ کئی قسم کے کپڑے تھے۔ اس نے یہاں ابو مغیثہ سے یہ کام لیا کہ عیسائی سرداروں اور فوجیوں کی تعداد معلوم کی۔ ان کی حیثیتیں متعین کروائیں اور یہ فیصلہ کیا کہ کس کو کیا ملنا چاہیے۔

ایک وسیع شامیانے کے نیچے المنصور نے عیسائی سرداروں کو معزز شریک کار کی حیثیت سے اپنے سامنے بٹھایا۔

اس کے سامنے جن سرداروں کی فہرست تھی ان کے ناموں کے سامنے یہ لکھ دیا گیا تھا کہ اس کو تحفے میں کیا دیا جائے گا۔

ایک طرف مختلف اقسام کے کپڑوں کے تھانوں کا ڈھیر تھا۔ ان میں الحبر اور حمیرین اور دیباج رومی کے بھی تھان تھے۔ ریشمی کپڑوں کے دو ہزار دو سو پچاس تھان تھے۔ سقلا طون کے گیارہ کپڑے اور مرثا کے پندرہ کپڑے ان کے علاوہ تھے۔ یہ کپڑے عیسائیوں کے انتہائی معزز سرداروں کے لئے مختص تھے۔

المنصور نے پہلے تو اپنے عیسائی حلیفوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ابو مغیثہ کو سرداروں کی مذکورہ فہرست دے دی گئی کہ وہ ترتیب وار سرداروں کے نام لے۔ وہ المنصور کے پاس آئیں، اس سے مصافحہ کریں اور اپنے قیمتی تحائف کو اٹھوا لے جائیں۔

یہ عیسائی حلیف سردار المنصور کے پاس پہنچتے رہے۔ مصافحہ کرتے رہے اور اپنے تحائف اٹھوا کر لے جاتے رہے۔ جن چند معزز سرداروں کو ان کے لباس کے لئے قیمتی کپڑا الگ سے دیا گیا تھا، انہیں اپنا یہ مخصوص قیمتی تحفہ خود اپنے ہاتھ سے وصول کرنا اور اٹھانا پڑا۔ ابو مغیثہ کسی ایک سردار کا نام پکارتا، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کے المنصور کے پاس پہنچتا اور المنصور مصافحے کے بعد قیمتی کپڑے کے تہ کئے ہوئے ٹکڑے پر ہاتھ رکھ دیتا۔ سردار اسے اٹھا کے پیشانی سے لگاتا اور اس کو پورے کپڑے کو اپنے ساتھ لے جاتا۔

ان تحائف کے علاوہ انہیں زر وجواہر بھی دیئے گئے اور اجازت دی گئی کہ اب وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں۔

یہ سردار بہت خوش تھے مگر انہیں جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ اب المنصور کو ان کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ سب اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں گے تو ان کا اندرونی خلق ان کے چہروں سے ظاہر ہونے لگا۔

واپسی میں کسی نے المنصور کو یہ بتایا کہ المنصور نے کو میوسٹیلا کی طرف جاتے ہوئے جزیرے کے ایک ٹیلے پر اپنا جو پرچم نصب کیا تھا اور جسے وہ وہاں بھول آیا تھا وہ پرچم ابھی تک اس ٹیلے پر لہرا رہا ہے۔ جزیرے کے لوگوں نے اس کو اس لئے ہاتھ نہ لگایا کہ کہیں ان کے ہاتھ لگانے سے المنصور ناراض... ہوجائے اور جزیرے کو تباہ وبرباد کردے۔

یہ پرچم اس ٹیلے پر مدتوں لہراتا رہا۔

قرطبہ تک پہنچتے پہنچتے المنصور کے حملوں کے کئی عیسائی شہر شکار ہوئے۔ اس بار اس کے کپڑوں سے خاصی گرد اکٹھا کی گئی تھی اور یہ گرد ایک پوٹلی میں رکھ دی گئی۔ یہ گرد سالہا سال پہلے سے جمع کی جارہی تھی۔

قرطبہ میں جب المنصور فاتحانہ شان سے داخل ہوا تو شہریوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ جب ان کے سامنے سے عیسائی قیدی گزارے گئے تو مسلمانوں نے نہایت جوش وخروش سے خوشی کے نعرے لگائے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی یہ خوشیاں عارضی ہیں اور آنے والے دنوں میں ان دونوں قوموں اور مذہبوں کے مقامات بدل جائیں گے اور عیسائی مسلمانوں کی جگہ لے لیں گے۔

شہر میں المنصور کو پہلی یہ خبر دی گئی کہ ملکہ صبح کا انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ افسردہ اور ملول تو ہوا مگر شہروں کا پرجوش استقبال اور نعروں میں اس کی یہ افسردگی دب گئی۔

وہ نہایت خاموشی سے اپنے قصر میں داخل ہوا اور سب سے پہلے دو مقتول بیٹوں کی ماں سے ملاقات کی۔ یہ منذر کی بہن اور اس کی بیوی تھی۔

کچھ دیر اس کے پاس رہا اور منذر کے بارے میں معلوم کیا کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں کتنی بار اس کے پاس آیا؟

سوگوار بیوی نے جواب دیا۔ "صرف ایک بار کیونکہ اب وہ یہاں آنے میں تکلف محسوس کرنے لگا ہے۔"

المنصور نے پوچھا۔ "کیا وہ اب بھی مجھ سے ناراض ہے؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "اب بھی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آپ نے اس دوران میں ہمارے دلوں پر لگائے گئے چرکوں پر تلافی کا کوئی مرہم، کوئی پھایا رکھا ہے۔"

المنصور نے آہستہ سے کہا۔ "تو گویا اس کے دل میں میرے خلاف اب بھی بغض و عناد موجود ہے۔ مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں جن کا حافظہ غیر معمولی ہو اور اپنے سینے کو کینے سے معمور رکھتے ہوں۔"

بیوی نے اپنے بھائی کی طرف داری کی۔ "میں خود بھی اپنے بھائی منذر کی طرح کسی کے ظلم و جور کو بھولتی نہیں۔ میری امید کی انتہا یہ ہے کہ میں ہر وقت موت کی امید پر رہتی ہوں۔ اب آپ میری ناامیدیوں کا اندازہ لگائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ ہم دونوں، بہن بھائی کو کسی طرح بھی خوش نہیں کر سکتے۔"

المنصور نے کہا۔ "میرے ذمے منذر کا ایک قرض زمانہ..."

طالب علمی سے چلا آ رہا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں مرنے سے پہلے اس کا یہ قرض اتار دینا چاہتا ہوں کیونکہ یہی مذہبی حکم بھی ہے کہ اپنا قرض مرنے سے پہلے اتار دو۔"

بیوی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ جس قرض کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ کس نوعیت کا قرض ہے۔ میرے خیال میں وہ قرض نہیں ایک وعدہ ہے جو زمانہ... طالبعلمی میں آپ نے بھائی منذر کے ایما پر ان سے کیا تھا۔ اس نے ظفر ایک خواہش کی تھی اور آپ نے ایک وعدہ کیا تھا کہ آپ اقتدار میں آنے کے بعد بھائی منذر کی خواہش پوری کر دیں گے یعنی آپ بھائی منذر کو برسنہ کروا کے پہلے ان کے جسم پر شہد ملوائیں گے اور پھر منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا بٹھائیں گے اور پورے شہر میں گشت کروا کر ان کو رسوا کریں گے۔"

المنصور نے کہا۔ "وعدہ بھی ایک قسم کا قرض ہوتا ہے۔ جب تک اس کا ایفاء نہ ہو جائے، قرض کی طرح واجب الادا رہتا ہے۔"

المنصور اس وقت بہت افسردہ تھا۔ اس نے اپنی دوسری بیوی سے سرسری ملاقات کی مگر بیٹیوں سے بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اپنے قصر میں کچھ وقت گزار کر وہ خلیفہ ہشام سے ملنے چلا گیا۔

خلیفہ نے اپنی روداد فوج کشی اور ظفرمندی پہلے ہی لکھ کر خلیفہ کو بھیج دی تھی مگر خلیفہ اسے ابھی تک نہیں پڑھ سکا تھا۔ وہ اسے پڑھے بغیر ہی المنصور کی تعریفیں کرتا رہا۔

المنصور نے خلیفہ سے کہا۔ "اس وقت میں آپ سے اپنے کارناموں کی تعریف و تحسین سننے نہیں آیا۔ مجھے شہر میں داخل ہوتے ہی یہ پہلی جاں گداز خبر دی گئی کہ ملکۂ عالیہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اس وقت میں تعزیت کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

خلیفہ نے کہا۔ "دکھ تو مجھے بھی بہت ہوا مگر تمہارے دکھ کا مجھے اظہار نہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری راہ کا سب سے بھاری پتھر دور ہو گیا۔ دل و دماغ میں چبھنے والا کانٹا خود بخود نکل گیا۔"

المنصور کو خلیفہ کے اس ردِ عمل پر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے اچانک خلیفہ کا بااختیار لہجہ اختیار کر لیا تھا اور بات صاف صاف کر رہا تھا۔

المنصور نے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے دکھ کیوں نہیں ہوگا۔ میں آج جو کچھ ہوں، وہ ملکہ مرحومہ کے طفیل ہوں۔ ہم نے ایک ساتھ بڑا وقت گزارا تھا۔ آج وہ وقت یاد آ رہا ہے۔"

خلیفہ ہشام نے کہا۔ "اب ایسی باتیں نہ کرو جن سے مجھے تکلیف ہو۔ تم نے جن حوالوں سے میری ماں کو یہ عزت بخشی ہے کہ اپنی ساری ترقیوں کو میری ماں کے طفیل قرار دے رہے ہو، اب ان کا حوالہ عوام الناس میں ذلت کا سبب بنا ہوا ہے۔"

المنصور نے خلیفہ کو جھڑکی دی۔ "آپ نے درست فرمایا۔ یہ لفظ طفیل بھی خوب ہے کہ یہ بیک وقت ترقی اور تنزلی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے فلاں کو فلاں کے طفیل عروج حاصل ہوا اور فلاں کو فلاں کے طفیل تنزلی سے دوچار ہونا پڑا۔ ملکہ مرحومہ کے طفیل مجھے عروج حاصل ہوا اور میرے طفیل بہنوں کو تنزلی سے دوچار ہونا پڑا اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ میرے طفیل مزید کن لوگوں کو تنزلی کا منہ دیکھنا پڑے۔"

ہشام نے پوچھا۔ "تعزیت کرنا ہی تھا یا کچھ کہنا باقی ہے؟"

المنصور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اب آپ اپنی مت میں جائیں جو آپ کو بیتے جی میسر آ گئی ہے اور مجھے اپنے کام کرنے دیں۔"

وہ یہاں سے اٹھ کے ملکہ کی قبر پر گیا اور ملکہ سے شکایت کی۔ "آج آپ کے بیٹے نے مجھ سے خلیفہ کے انداز میں بات کی ہے، جو اس کے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔ میں ذرا ذرا سی باتوں کا حساب رکھنے والا انسان ہوں۔ خلیفہ کا یہ حساب بھی بہت جلد چکتا کر دوں گا۔"

وہ کچھ دیر ملکہ کی قبر پر موجود رہا اور یہیں سے اسے اچانک اپنے اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ سی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ یہیں اسے اچانک وہ مجذوب یاد آیا جس نے ایک پُرمعنی بات کہی تھی کہ اے المنصور کے قصر اور مدینۃ الزہرا! تم دونوں میں قرطبہ کے ہر گھر کا حصہ ہے۔ اسی قبر کے سرہانے اسے اپنی زندگی بھر کی کمائی ہوئی عزت، حیثیت اور حاصل کا خیال آیا اور اپنے دونوں بیٹے بھی حافظے میں ابھرے جو اس کی عزت، حیثیت اور حاصل کے وارث تھے۔ وہ ان کے بازوؤں کی قوت کا اندازہ لگا رہا تھا اور خود سے پوچھ رہا تھا کیا یہ دونوں بیٹے مل کے بھی اس کی عزت، حیثیت اور حاصل کے بوجھ کو اٹھا سکیں گے؟

اس کے اس سوال کا خود اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا کیونکہ اس کے گرد و پیش جو لائق، موقع کی تلاش میں رہنے

والے معاصر امراؤ زرا اور مشیر تھے وہ سب المنصور کی کامیابیوں کے راز سے واقف تھے۔ انہیں المنصور کے اقتدار کی اعلیٰ منزل تک پہنچانے والے دستور العمل کے اس بنیادی نکتے کا علم تھا کہ اقتدار کی راہ میں حائل ہونے والوں کو مکر، جبر، سیاست اور تشدد کے ہر حربے سے کام لے کر اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔ یہاں عفو، رحم اور ہمدردی کا بالکل گزر نہیں ہونا چاہیے لیکن زندگی کے بقیہ معاملات میں رحم و مروّت اور انصاف سے کام لینا چاہیے تاکہ حوصلہ مندوں کے تو حوصلے پست رہیں اور وہ خوفزدہ بھی رہیں۔ دوسری طرف کم حوصلہ رکھنے والے لوگ اس کی بخشش، اس کے جود و کرم اور انصاف کے گن گاتے رہیں۔ وہ خود سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا تیرے دونوں بیٹے تیرے اردگرد موجود موقع کے جویا اور حوصلہ مند شاطروں کا مقابلہ کر سکیں گے؟" اسے اس کا جواب نفی میں مل رہا تھا۔

وہ اس وقت جس مایوسی اور افسردگی کا شکار تھا، جب اس نے اس کا سبب معلوم کرنا چاہا تو اسے یہی جواب ملا کہ قبرستان کے اس ماحول اور افسردہ ہوا کی وجہ سے اس پر یہ قنوطی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

وہ فوراً قبرستان سے باہر آیا اور قصر میں اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ دونوں بھائی مل جل کر کام کرنے کی عادت ڈالیں۔

محل میں اس کے سابق عبداللہ سنڈمل کی رحم کی درخواست پیش کی گئی مگر المنصور نے اسے پڑھے بغیر ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔

انہی افسردگی کے دنوں میں اسے افریقہ سے یہ خبر ملی کہ زیری بن عطیہ نے اس کے بھیجے ہوئے سپہ سالار واضح کو شکست دے دی اور اب وہ طنجہ میں المنصور کی مدد کا منتظر ہے۔

اس نے فوراً عبدالملک کو طلب کیا اور کہا۔ "تمک کی فوج لے کر فوراً طنجہ پہنچو اور واضح کی مدد کرو۔ زیری بن عطیہ کا زور توڑ دینے ملکہ صبح جاتے جاتے ہمارے پیچھے لگا گئی ہے۔"

اس فوج کے بھیجنے کا خیال اس کے دل و دماغ پر اس حد تک طاری تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ جزیرۃ الخضرہ تک گیا۔ درمیان میں سمندر کی چند میلوں کی ایک پٹی تھی جسے عبور کر کے یہ فوج طنجہ میں داخل ہو جاتی۔

عبدالملک اور فوج کے چلے جانے کے بعد المنصور اپنے چھوٹے سے آبائی قلعے میں گیا۔ یہاں اب بھی اس کے خاندان کے لوگ آباد تھے۔ یہاں اس کی تھوڑی سی آبائی زمین اب بھی موجود تھی جس کی آمدنی سے اس نے اپنا کفن تیار کروایا تھا۔

وہ اس علاقے میں کئی دن موجود رہا اور بچپنے کی یادگاریں دیکھتا رہا۔ یہاں اسے اپنی زندگی کے پورے سفر پر نظریں ڈالنا پڑیں جو نہایت بھیانک، خونخوار، پُرمصیبت اور مسلسل جدوجہد سے عبارت تھا۔ اب جو اس نے خیالوں میں سالوں کا یہ طویل سفر لمحوں میں طے کیا تو اسے تکان محسوس ہونے لگی۔ وہ خود کو تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا اور اسے ایسا لگا جیسے ملکہ صبح اسے آوازیں دے رہی ہو کہ اے ابن ابی عامر! تم بہت تھک چکے ہو، اب تم بھی میری طرح آرام کرو۔

ایک بار پھر اس کے دل و دماغ پر یہ سوال مسلط ہو گیا کہ کیا اس کے دونوں بیٹے مل کے اس کا یہ بوجھ اٹھا سکیں گے۔

اس کا جواب بالکل صاف لفظی میں تھا یا مذبذب اور غیر واضح۔

وہ قرطبہ واپس گیا کیونکہ جزیرۃ الخضرہ میں اسے ماریطانیہ کا شہزادہ ابن اقتون اور بھائی عسنتی بجہ اچانک یاد آنے لگے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا تھا وہ بھی یاد آیا اور اسے ایسا لگا جیسے ان دونوں کی روحیں اس کے آس پاس کہیں موجود ہیں اور اس کا مذاق اڑا رہی ہیں، اس سے پوچھ رہی ہیں کہ "اے ابن ابی عامر! سچ سچ بتاؤ کہ ہم دونوں کے بعد تم پر کیا بیتی اور اب جب تم ہمارے پاس آ جاؤ گے تو تمہاری اولاد پر کیا بیتے گی؟"

اس سوال میں بھی دونوں بیٹوں کا ذکر موجود تھا اور دونوں کے مشکوک اور مشتبہ مستقبل کے اندیشے تھے۔

اسے اپنے قصر میں بھی سکون نہیں ملا اور اس نے منذر کو طلب کر لیا۔ اب وہ منذر سے اچھی طرح پیش آنا چاہتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اب منذر اس سے خوش نہیں تھا اور المنصور کا کوئی احسان لینے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔

منذر اس کے طلب کرنے پر قصر میں پہنچا تو ضرور مگر پہلے وہ اپنی بہن کے پاس گیا اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیں۔

جب یہ بات المنصور کے علم میں آئی کہ منذر اپنی بہن کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے تو وہ غصے میں اٹھ کر خود وہاں پہنچا اور حقارت سے منذر کو مخاطب کیا۔ "او نابکار! تجھ کو میں نے بلایا تھا، تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟"

منذر نے جواب دیا۔ "میرا اپنی بہن سے خونی رشتہ ہے اور اس محل میں میری آمد و رفت اسی رشتے کے حوالے سے ہے اسی لئے میں اس رشتے کا آپ سے زیادہ احترام کرتا ہوں۔"

المنصور نے کہا۔ "بکواس کرنا یا کچھ باقی ہے؟"

منذر نے جواب دیا۔ "واقعے کو آپ بکواس کہہ رہے ہیں۔ بتائیں کہ آپ نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟"

المنصور نے کہا۔ "مجھ پر اپنے وعدے کا ایفا لازم ہے اس لئے میں نے تجھے بلوایا تھا کہ بتا تو اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہے؟"

منذر نے جواب دیا۔ "میں سالوں سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ جب چاہیں، میری خواہش پوری کر دیں۔"

المنصور نے کہا۔ "اگر اب بھی تیری وہی خواہش ہے تو میں مجبور ہوں لیکن سردست مجبوری یہ پیش آ گئی ہے کہ تو نے قرطبہ والوں کو پہلے ہی یہ بتا دیا ہے کہ میں تیرے ساتھ ایسا سلوک کرنے والا ہوں۔"

منذر نے کہا۔ "تو کیا ہوا! جس تماشے کا لوگ ایک عرصے سے انتظار کر رہے ہیں' اب وہ دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔"

المنصور نے کہا۔ "لیکن میں کوئی ایسا تماشا کسی کو کیوں دکھاؤں گا جس کا انہیں پہلے سے علم ہو۔"

منذر نے کہا۔ "خیر جو کچھ آپ کو کرنا ہے' فوراً کریں تاکہ میں بھی اذیت سے چھوٹوں۔"

المنصور کا خیال تھا کہ منذر اس سے رحم اور عفو کی درخواست کرے گا مگر منذر نے بڑی بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیا۔ اب اس کے دل و دماغ منذر کے لئے کسی ایسی سزا کے بارے میں سوچ رہے تھے جو دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا سبب بن جائے۔

منذر نے پوچھا۔ "کیا میں جا سکتا ہوں؟"

المنصور نے کہا۔ "ہاں' اب تو جا سکتا ہے۔"

منذر اٹھا اور المنصور کی طرف دیکھے بغیر ہی قصر سے نکل گیا۔

المنصور نے منذر کے چلے جانے کے بعد بیوی سے کہا۔ "تو اپنے بھائی کو سمجھا کہ وہ پاگل نہ بنے۔ مجھ سے رحم کی درخواست کرے تو شاید میں اسے معاف کر دوں۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "میں بھائی منذر کے معاملے میں نہیں پڑوں گی۔ وہ زندگی سے بیزار ہیں اس لئے انہیں اپنی ذلت کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بھائی بہن ہو اور مزاج بھی ایک جیسا رکھتے ہو۔ اب تم دیکھنا میں اس کی کیا گت بناتا ہوں۔"

اسے خلیفہ ہشام پر بھی غصہ تھا کیونکہ منذر کی طرح وہ بھی المنصور سے بری طرح پیش آیا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا وقت اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ پہلے کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی تھی اور اس طرح بات کرنا تو کجا کسی میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ سر اٹھا کے جرأت سے دیکھنے کی ہمت ہی کر لیتا۔

اسی کشمکش اور الجھن میں اس نے منذر کے خلاف فرمان جاری کیا۔ "منذر نے تشدد کے محاذ سے اجازت کے بغیر قرطبہ واپسی اختیار کی تھی اور بعد میں اس نے اس کا کوئی معقول عذر بھی پیش نہیں کیا اس لئے فوجی تنظیم اور سخت قانون کے پیش نظر منذر کے خلاف یہ تادیبی کارروائی کی جا رہی ہے کہ بحیثیت حکومت منذر کی ساری جائیداد ضبط کر لی جائے۔ یہاں تک کہ اس کا مکان بھی ضبط کر لیا جائے اور قرطبہ کے ہر خاص و عام کو آگاہ کر دیا جائے کہ حکومت کے اس معتوب کو کوئی پناہ نہ دے اور نہ اسے کوئی ملازمت دی جائے۔ یہ اپنا کوئی کاروبار بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کنگال کے پاس کاروبار کے لئے کچھ ہوگا ہی نہیں اور کوئی دوسرا شخص اس کی مدد بھی نہیں کرے گا۔ یہ سخت سزا اس لئے تجویز کی گئی ہے کہ کسی دوسرے فوجی کو ایسی غلطی یا کوتاہی اختیار کرنے کی ہمت نہ پڑے۔"

یہ فرمان المنصور نے اپنے خاص دفتر سے جاری کیا جہاں اس کے کئی محافظ اپنے جسم پر اسلحہ سجائے پہرا دے رہے تھے۔ انہیں پہرا دینے کے دوران میں اپنے ہتھیاروں کو نکالنے اور ان کی نمائش کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

المنصور منذر کے لئے یہ عتابی فرمان لکھوا رہا تھا اور اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پہرے دار آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ ایک پہرے دار کے پاس کہیں سے دمشقی تلوار آ گئی تھی اور وہ بار بار اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ اس کی کاٹ زبردست ہے۔

اس کے ساتھی پہرے دار اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور مصر تھے کہ تلوار انہیں بھی دکھائی جائے۔

پہرے دار نے کہا۔ "یہاں میں تلوار کو نیام سے باہر نہیں نکال سکتا کیونکہ یہ فوجی اور درباری ادب اور قانون کے خلاف ہے۔"

لیکن جب ساتھیوں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے اپنی دمشقی تلوار نیام سے نکال لی اور مذاقاً اپنے ایک ساتھی پر جھوٹا حملہ کیا۔

المنصور نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا اور پہرے دار سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

دمشقی تلوار والے پہرے دار نے کھسیائے لہجے میں کہا۔ "یہ لوگ یہ تلوار دیکھنا چاہتے تھے۔"

المنصور نے حکم دیا۔ "اپنی تلوار کو نیام میں رکھ لو۔"

پہرے دار نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی۔ المنصور نے دوسرے پہرے داروں کو حکم دیا۔ "اسے گرفتار کیا جائے اور اس سے اس کی تلوار لے لی جائے۔"

پہرے دار گرفتار کر لیا گیا اور اس سے اس کی دمشقی تلوار چھین لی گئی۔ المنصور نے قیدی پہرے دار سے پوچھا۔ "تو کب سے پہرے داری کا فرض انجام دے رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک سال سے۔"

المنصور نے غصے میں کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ پہرا دینے کے دوران میں تلوار نیام میں رکھی جاتی ہے۔"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "معلوم ہے کہ پہرا دینے کے دوران میں جملہ پہرے داروں کی تلواریں ان کی نیاموں میں رہتی ہیں۔"

المنصور نے کہا۔ "جب مجھے یہ بات معلوم تھی تو تو نے اپنی تلوار نیام سے کیوں نکالی؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "جناب! میں نے عرض تو کر دیا کہ میری یہ دمشقی تلوار میرے یہ ساتھی دیکھنا چاہتے تھے۔"

المنصور کا غصہ عروج پر تھا۔ اس نے پہرے دار کو تھپڑ رسید کیا اور کہا۔ "تو نے اپنے ساتھی پر حملہ کیا تھا پھر تو یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ میں فوجی اور درباری ادب اور قانون کی خلاف ورزی قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔"

معتوب پہرے دار نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ ان سے پوچھ لیں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

المنصور نے کہا۔ "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ میں تو درباری ادب اور قانون کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی پہرے دار سنجیدگی یا مذاق سے' محافظت کے فریضے کی انجام دہی کے دوران میں اپنی تلوار نیام سے نہیں نکال سکتا۔ تو نے بدترین جرم کا ارتکاب کیا ہے اس لئے تجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس سنگین جرم کی سزا میں تیرے قتل کا فرمان دیتا ہوں۔"

پہرے دار رحم کی درخواست کرتا ہی رہا اور المنصور نے اس کو اسی وقت قتل کروا دیا۔ جن لوگوں کو منذر کے نام عتاب نامے کا فرمان دیا گیا تھا ان کو حکم دیا گیا کہ وہ پہرے دار کے اس واقعے کا ذکر منذر سے کر دیں اور اس کو بتائیں کہ وہ قوانین اور آداب کی خلاف ورزیاں کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

منذر کو المنصور کے فیصلے سے نہ صرف مطلع کیا گیا بلکہ اسے اس کے مکان سے بھی نکال باہر کیا گیا۔ پورے قرطبہ میں اس سزا کی تشہیر کی گئی۔ منذر کو اس کے پہنے ہوئے لباس میں اس کے اپنے مکان سے نکال باہر کیا گیا۔

اب وہ قرطبہ میں کہیں پناہ بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے بھی کچھ نہ تھا اور نہ کوئی اسے کھانا دے سکتا تھا۔

پریشان حال منذر [illegible] تو المنصور کے قصر گیا اور المنصور سے مل کے کچھ رعایت کی درخواست کرنا چاہی مگر المنصور نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس کو ایک ایسا در یاد آیا جہاں اس کو رہنے کی جگہ بھی مل سکتی تھی اور دو وقت کا کھانا بھی۔ یہ گھر المنصور کی ممانی کا تھا۔ وہ یہاں پہلے بھی رہ چکا تھا۔

وہ قصر سے سیدھا ممانی کے گھر گیا اور ممانی کو ساری تفصیل بتا کر پوچھا۔ "کیا آپ مجھے پناہ دے سکتی ہیں؟"

ممانی نے فراخدلی سے جواب دیا۔ "ہاں' میں اپنے بھانجے ابن ابی عامر سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جب تک تیرا جی چاہے' یہاں رہ۔ میں اپنے سگے بھانجے سے نمٹ لوں گی۔"

المنصور کے آدمی منذر کا پیچھا کر رہے تھے۔ انہی میں سے کسی نے المنصور کو یہ خبر پہنچا دی۔ المنصور نہایت برہم' ممانی کے گھر پہنچا۔ اس نے یہاں منذر کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہاں تو کیا کر رہا ہے؟"

ممانی نے آگے بڑھ کے منذر کو اپنے پیچھے کر لیا اور کہا۔ "اسے میں نے پناہ دی ہے اور جب تک اس کا جی چاہے گا' میرے پاس رہے گا۔"

المنصور نے تیوری چڑھائی اور کہا۔ "یہ معتوب ہے اور آپ اسے پناہ نہیں دے سکتیں۔"

ممانی نے کہا۔ "میں نے تو اس کو پناہ دے دی۔ اب اگر تو نے اس کو نکالا تو میں بھی اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

المنصور نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر آپ اس کے ساتھ جانا چاہتی ہیں تو ضرور جائیں۔ میں قانون کی خلاف ورزی برداشت نہیں کر سکتا۔"

منذر نے جب یہ دیکھا کہ بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ المنصور ممانی کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہے اور ممانی بھی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہیں تو اس نے دونوں کو کچھ بتائے بغیر چپکے سے گھر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کسی نے منذر کو کہیں نہیں دیکھا۔ کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں اتنا بتایا کہ اسے افریقہ جانے والے ایک تجارتی قافلے میں دیکھا گیا تھا اور کچھ نے اسے جزیرۃ الخضرہ میں دیکھا تھا۔

ممانی نے منذر کے چلے جانے کا اتنا دکھ محسوس کیا کہ انہوں نے المنصور سے کہہ دیا کہ اب وہ اس کے گھر کبھی نہیں آئیں گی اور نہ المنصور کو اپنے گھر آنے دیں گی۔ ممانی نے المنصور کی مسہری کمرے سے نکال دی اور اس کی تمام یادگار چیزوں کو آگ لگا دی۔

المنصور نے اپنی عمر رسیدہ ممانی کو اتنا دکھ پہنچایا تھا کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں۔ ایک رات وہ ایسی سوئیں کہ ہمیشہ کے لئے سو گئیں۔

ان کی موت کی خبر المنصور کو پہنچائی گئی۔ محلے کے بزرگوں نے اس کو یہ بھی بتایا کہ ممانی نے مرنے سے پہلے ان بزرگوں سے کہہ دیا تھا کہ المنصور کو ان کی میت کو کاندھا نہ دینے دیا جائے کیونکہ اس نے المنصور کو معاف نہیں کیا تھا۔

المنصور نے میت کی تکفین اور تدفین پر کچھ خرچ کرنا چاہا تو اسے اس سے بھی روک دیا گیا کیونکہ ممانی نے اپنے کفن کا انتظام کر دیا تھا اور وہ آخری رسوم کا خرچ بھی نقدی کی شکل میں محلے کے بزرگوں کو دے گئی تھیں۔

المنصور جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا اور تدفین کے بعد ممانی کے گھر واپس آیا۔

اس نے ممانی کو دو خادمائیں دے رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ گھر میں موجود نہیں تھیں۔ محلے والوں نے بتایا کہ جس دن منذر کا واقعہ پیش آیا تھا اسی دن ممانی نے دونوں کنیزوں کو رخصت کر دیا تھا اور اب وہ تنہا رہی تھیں۔ اب المنصور اپنے بچپن کے یادگار کمرے میں گیا تو اب وہاں اس کے بچپنے کی یادگار کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔

محلے کی ایک بڑی بی نے یہ بھی بتا دیا کہ اس کی مسہری' اس کا بستر' تکیہ اور دوسری کئی چیزیں صحن میں رکھ کر جلا دی گئیں۔ دیوار گیر الماری توڑ دی گئی۔ غرض کہ اب یہ مکان آسیب زدہ ہو رہا تھا۔

یہیں اپنے یادگار کمرے میں کھڑا وہ سوچتا رہا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی ماضی کی تمام چیزوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور لوگ شاید اس کو اب پسند نہیں کرتے۔ اس نے پچاس سے زیادہ جنگیں عیسائیوں سے لڑیں اور بہت سا مال و زر خزانے میں داخل کیا' اسلام کا سکہ بٹھایا' عیسائیوں کو ذلیل کیا اور ان کے بے شمار قیدیوں کو فروخت بھی کیا۔ غلاموں سے خدمت بھی لی اور ان سے عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ عیسائی دنیا اس کے نام سے کانپتی تھی

مگر قرطبہ کے مسلمان اور شاطر امرا اس کی موت کے منتظر تھے کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ سب بے بس تھے۔ اس کی موت کے بعد اس کے دونوں بیٹوں کو راہ سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں میں اتنی اہلیت اور لیاقت نہیں پا رہا تھا۔ وہ دونوں شاطروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اسے اپنے بعد اپنے پسماندگان کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا اور یہ دکھ ایسا تھا جو اسے آہستہ آہستہ ختم کررہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ کس طرح اپنے دونوں بیٹوں کو معجزاتی طور پر اس لائق کردے کہ وہ اس کی طرح سب کو قابو میں رکھ سکیں۔

اسی دوران میں افریقہ سے یہ خوش خبری سننے کو ملی کہ اس کے بیٹے عبدالملک المظفر سے مقابلہ کرتے ہوئے زیری بن عطیہ نے اتفاقیہ شکست کھائی، زخمی ہوا اور انتقال کرگیا۔ یہ ایک اچھی خبر تھی جو اس کے بیٹے عبدالملک کی کامیابی سے تعلق رکھتی تھی۔

پھر اچانک اسے اندر سے صحت کی خرابی کا احساس ہونے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔ شاید اس گھلنے کی بیماری کے پیچھے اس کے بیٹوں کے لئے اندیشے اور فکریں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ اچانک اسے معلوم ہوا کہ قشالہ نے پھر سرکشی اختیار کی ہے۔ شاید قشالہ کو المنصور کی خرابیِ صحت کا علم ہوگیا تھا اسی لئے اس نے سرکشی اختیار کی تھی۔

چونکہ عبدالملک المظفر نے افریقہ میں اپنی فوج کی بہترین قیادت کی تھی اور زیری بن عطیہ کو شکست دے دی تھی اس لئے اسے فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور قشالہ کو سبق سکھانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو بھی اپنے ساتھ رکھا جو ہمیشہ اس مہم میں حسبِ روایت سب سے آگے رہا۔ گویا زندگی کی آخری جنگ بھی وہ اپنی قیادت میں لڑنا چاہتا تھا۔

پہلے وہ طلیطلہ میں داخل ہوا اور یہاں سے مدینہ سالم پہنچا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں غالب اپنی فوجیں رکھتا تھا اور خود بھی اسی شہر سے شمالی عیسائی ریاستوں کی نگرانی کرتا رہتا تھا۔ المنصور نے بھی یہاں اپنے لئے ایک قصر تعمیر کروایا تھا۔ اب اس نے قشالہ جاتے ہوئے اسی قصر میں قیام کیا۔ ابو مغیرہ اس کے ساتھ تھا اور شعلہ نامی خدمت گار بھی اس کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ المنصور کی گرتی ہوئی صحت کا جتنا اندازہ شعلہ کو تھا اتنا کسی اور کو نہیں تھا۔ اس نے مدینہ سالم کے قصر میں المنصور کو آگے جانے سے روکا اور کہا۔ "آپ دونوں صاحبزادگان کو اس مہم کی قیادت کرنے دیں۔ خود اس قصر میں آرام کریں اور طبیبوں سے اپنا علاج کروائیں۔"

المنصور نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میرے اطبا ابھی تک میرے مرض ہی کا پتا نہیں لگا سکے۔ جب تک تشخیص نہ ہو وہ علاج کس طرح کریں گے۔"

شعلہ نے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ دنوں بعد اپنے گھوڑے پر بھی سفر نہیں کرسکیں گے پھر آپ اپنی فوج کی قیادت کس طرح کریں گے؟"

المنصور نے جواب دیا۔ "مجھ سے فضول باتیں نہ کر۔ میں فوج کی قیادت کے لئے صرف گھوڑے پر انحصار نہیں کرتا۔ اوّل تو ابھی میں گھوڑے پر سفر کرسکتا ہوں۔ جب نہیں کرسکوں گا تو گھوڑے کا متبادل دوسری سواری بھی موجود ہے۔"

شعلہ نے محسوس کیا کہ المنصور کی آواز ڈوبتی چلی جارہی ہے۔

پُرپیچ اونچے نیچے پہاڑی راستوں کو عبور کرتا ہوا وہ سوریہ نامی مقام پر خیمہ زن ہوا۔

یہاں وہ دو چار دن آرام کرنا چاہتا تھا مگر اس جنگ میں بہت جلد فتح حاصل کرنا تھی اس لئے وہ آگے روانہ ہوگیا۔ ابو مغیرہ نے بھی محسوس کیا کہ المنصور اندر سے گھلتا پگھلتا جارہا ہے۔ اطبا ہر وقت اس کے آس پاس موجود رہتے تھے۔ وہ پریشان تھے کہ المنصور نے دوائیں پینا بند کردی تھیں۔ اطبا اسے کھانے اور پینے کے لئے جو دوائیں دیتے تھے وہ انہیں اطبا کے سامنے ہی پھینک دیتا تھا۔

یہ منظر اطبا بھی دیکھتے تھے اور اس کے دونوں بیٹے بھی دیکھتے۔ ابو مغیرہ اور شعلہ بھی دیکھتے تھے مگر ان میں سے کسی میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ المنصور سے پوچھتا کہ آپ دوائیں کھاتے پیتے کیوں نہیں، پھینک کیوں دیتے ہیں۔

اطبا نے بڑے بیٹے عبدالملک المظفر سے کہا۔ "آپ اپنے والد کو دوائیں کیوں نہیں کھلاتے پلاتے؟"

عبدالملک المظفر نے جواب دیا۔ "میں باپ سے درخواست ہی کرسکتا ہوں کہ وہ دوائیں کھائیں اور پئیں، جبر سے کام نہیں لے سکتا۔ ہاں تم اطبا اپنے مریض پر البتہ دباؤ ڈال سکتے ہو مگر پتا نہیں تم لوگ والد صاحب کے سامنے کیوں خاموش رہتے ہو۔"

اطبا نے شکایت کی "المنصور بہت زیادہ چڑچڑے ہورہے ہیں اسی لئے ہم لوگ انہیں پریشان نہیں کرتے۔"

لیکن جب دونوں بیٹوں اور کئی فوجی سرداروں نے طبیبوں کو مجبور کردیا کہ وہ المنصور کو دوائیں کھانے اور پینے پر مجبور کریں تو المنصور پر طبیبوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ انہوں نے المنصور کو بتایا۔ "آپ پر مرض اور اس سے پیدا ہونے والی کمزوری، یہ دونوں غلبہ پاتے جارہے ہیں۔ آپ ہماری مجوزہ دوائیں نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں جو آپ کے لئے خطرناک بات ہے۔"

المنصور نے ہر طبیب کو باری باری غور سے دیکھا اور ان سب سے ایک ہی سوال کیا۔ "تم سب نے میرا مرض تو تشخیص کرلیا ہوگا؟"

کئی نے شکی اور متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں مرض کی تشخیص ہوگئی ہے۔"

المنصور نے خاموش رہنے والے طبیبوں سے پوچھا۔ "میں کس مرض میں مبتلا ہوں، اس کا کوئی نام تو ہوگا؟"

ان طبیبوں نے صاف صاف بتادیا۔ "افسوس کہ ہم ابھی تک مرض کی تشخیص سے قاصر ہیں۔"

المنصور کی گرج دار آواز گونجی۔ "جب تم لوگ تشخیص ہی نہیں کرسکتے کہ میں کس مرض میں مبتلا ہوں تو تم مجھے کس مرض کی دوائیں کھلانا اور پلانا چاہتے ہو۔"

کچھ دیر کے لئے ماحول پر سکوت طاری ہوگیا۔ طبیبوں کے سر شرمندگی سے جھک گئے کیونکہ المنصور نے ان کی کمزوری پکڑلی تھی اور انہیں لاجواب کردیا تھا۔

المنصور نے اور زیادہ سخت لہجہ اختیار کیا۔ "تب پھر تم مجھے کس مرض کی دوائیں کھلانا اور پلانا چاہتے ہو؟"

اب سارے طبیب لاجواب ہوچکے تھے۔ متصل اور ملحقہ خیمے میں المنصور کے دونوں بیٹے اور فوجی سردار، المنصور اور طبیبوں کے مکالمات سن رہے تھے۔ اچانک المنصور کی گرج دار آواز سنائی دی۔ "تم سب دفع ہوجاؤ۔ میں تمہاری فضول دوائیں کھا اور پی کر نہیں مرنا چاہتا کیونکہ میں اپنی زندگی کے لئے تو تمہارا زیربار احسان ہوسکتا ہوں لیکن اپنی موت کے لئے تمہارا احسان نہیں لوں گا۔ تم لوگ غلط سلط دوائیں کھلا اور پلا کر مجھے مار دینا چاہتے ہو۔ دور ہوجاؤ میری نظروں سے، اب میں کسی سے بھی اپنا علاج نہیں کرواؤں گا۔"

اب سبھی کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ المنصور دوائیں کھانے اور پینے سے کیوں گریزاں ہے۔

دریائے ڈورو کے دونوں کناروں پر مسلمان قابض ہوچکے تھے۔ گویا اب یہ جنگ عیسائیوں سے دریا کے دونوں کناروں پر بپا ہونے والی تھی۔

عیسائیوں نے بھی اپنی فوجیں دریا کے دونوں کناروں پر مسلمانوں کے مقابل پہنچادیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی ایک محاذ پر تھک جانے والے مسلمانوں کو دریا کے دوسرے کنارے سے کمک پہنچ جائے۔ یہ شہر جہاں جنگ چھڑی ہوئی تھی، عیسائیوں کے ولی ایلیمان کا شہر تھا اور یہاں اس کا شاہدار گرجا موجود تھا۔ اس ولی کے بارے میں بھی یہ مشہور تھا کہ یہ اس سوریہ نامی شہر میں اس لئے آرام کررہا ہے کہ وہ یہاں سے تشالہ کے قلعوں کی حفاظت کرتا رہے۔ المنصور عیسائیوں کے اس عقیدے کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنے برسرِ حالت سے فرمان جاری کیا کہ سوریہ شہر برباد کردیا جائے اور ولی ایلیمان کے مزار کو گرجا سمیت نیست و نابود کردیا جائے۔

بیمیں، حالتِ علالت میں اس کے بیٹے عبدالملک المظفر نے ابراہیم بن ادریس الحمنی نامی شاعر کو اپنے باپ کے سامنے پیش کیا اور کہا۔ "آپ تو قرطبہ کے اس شاعر سے واقف ہوں گے؟"

المنصور نے شاعر ابراہیم کو بیزار نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "ہاں میں اس سے واقف ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اس کے بعض اشعار قرطبہ والوں میں بہت مقبول ہیں مگر وہ اشعار میں نے ابھی تک نہیں سنے۔"

شاعر ابراہیم نے کہا۔ "اس وقت میں آپ کو اپنے وہی اشعار سنانا چاہتا ہوں۔ قرطبہ کے لوگوں کو تو میرے یہ اشعار بہت پسند آئے۔ امید ہے کہ انہیں آپ بھی پسند کریں گے۔"

المنصور نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "بیٹے! تو میرے پاس بیٹھ جا۔ شاعر کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس کے جو اشعار قرطبہ کے لوگوں میں مقبول ہوئے ہیں، وہ مجھے بھی بہت پسند آئیں گے۔ اس کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہوگی کیونکہ بیک وقت روشنی اور تاریکی یکجا نہیں ہوسکتیں پھر قرطبہ کے لوگوں کی پسند اور میری پسند ایک کس طرح ہوسکتی ہے۔ میں نے اس کے مذکورہ مشہور اشعار ابھی تک نہیں سنے مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جن اشعار نے قرطبہ والوں کو خوش کیا ہے وہ مجھے بھی خوش کردیں گے۔ اس کے اشعار میں قرطبہ والوں کے لئے یقیناً کوئی خوش خبری موجود ہوگی اور اسی میں میرے لئے بد خبری ہوگی۔"

عبدالملک المظفر نے شاعر سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

شاعر کا چہرہ فق ہوگیا اور جواب دیا۔ "پتا نہیں کہ میرے ان اشعار میں ایسا کچھ ہے۔ مجھے تو آپ کے والد کی علالت کا دکھ ہے اور ایسا لگتا ہے کہ بیمار جسم کے دل و دماغ بھی بیمار ہیں جو مجھے اپنے بارے میں ایسی بات سننا پڑ رہی ہے کہ میں۔۔۔"

المنصور نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور شاعر کو حکم دیا۔ "اپنے اشعار سنا۔"

شاعر ابراہیم نے اپنے اشعار سنانے شروع کردیئے۔

"اے بنو عامر! آسمان اور زمین تمہاری حکومت میں
اسی طرح خوش ہو رہے ہیں جس طرح
چودھویں رات کا چاند انہیں منور کردیتا ہے
لیکن تمہارے عروج کا زمانہ ختم ہوگیا اور اب زوال ہے
بے شک مجھے خوف ہے کہ جس وقت
تمہارے چاند کی شعاعوں کو گہن لگ رہا ہے
کم نہ ہوگا اور بالکل تاریکی پھیل جائے گی
تمہارا ستارہ جو کبھی بلندی پر چمک رہا تھا
غروب ہو رہا ہے اور اے بنو عامر!
قسمت نے اب تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے"

المنصور نے شاعر ابراہیم سے پوچھا۔ "اے بدبخت انسان! کیا تو ولی ہے؟"

شاعر ابراہیم نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ولی نہیں ہوں۔ میں صرف شاعر ہوں اور شاعری بھی پیغمبری کا ایک جزو ہوتی ہے۔ میری کسی خاص حس نے مجھے بتایا کہ بنو عامر کی سلطنت کے لئے کوئی خرابی واقع ہونے والی ہے اور میں نے اپنی اس حس کے اشارے کو اپنے ان اشعار میں محفوظ کردیا ہے۔"

المنصور نے اپنے بیٹے عبدالملک المظفر کو حکم دیا۔ "شاعر کو اپنی تحویل میں رکھ اور قرطبہ پہنچ کر اسے شہر بدر کردینا کیونکہ یہ منحوس شاعر اپنے ان اشعار کے ذریعے میری موت اور میرے

طابداران کی بربادی کی پیش گوئی کررہا ہے۔"

شاعر ابراہیم نے پوچھا۔ "مگر میرے اشعار میں تو بنو عامر کا ذکر ہے۔ آپ کا یا آپ کے خاندان کا تو میں نے کہیں نام ہی نہیں لیا پھر آپ مجھے قرطبہ سے جلاوطن کیوں کررہے ہیں؟"

المنصور نے غصے سے کہا۔ "اے منحوس شاعر! جس بنو عامر کی حکومت کا تو نے اپنے ان اشعار میں ذکر کیا ہے، وہ حکومت میں ہوں۔ میرا خاندان میرے ساتھ ستونوں کی طرح کھڑا ہوا ہے اور ان ستونوں پر بنو عامر کی حکومت قائم ہے۔ اگر بنو عامر کی حکومتی عمارت کے نیچے سے یہ ستون توڑ پھوڑ کر نکال دیئے جائیں تو بنو عامر کی اقتداری عمارت لامحالہ زمین بوس ہوجائے گی۔"

شاعر ابراہیم نے المنصور کی باتیں غور سے سنیں اور ان پر خود بھی غور کرتا رہا پھر بے اختیار المنصور کو داد دی۔ "بے شک! آپ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ اپنی مخصوص حس کے اشاروں اور اپنے اشعار کے مفاہیم کو میں نے بھی اتنا نہیں سمجھا تھا جتنا آپ نے چند ثانیوں میں سمجھ لیا۔ سبحان اللہ، آپ کو اللہ نے کیسا رسا الفہم بنایا ہے۔"

المنصور نے اپنے بیٹے عبدالملک سے کہا۔ "بیٹے! شاعر کے اس خوشامدی قصیدے کو ہرگز متاثر نہ ہونا اور اسے قرطبہ سے جلاوطن کردینا۔"

عبدالملک نے باپ سے کہا۔ "لیکن آپ تو موجود ہیں اور آپ ہی اس کو جلاوطنی کی سزا دیں گے۔"

شاعر ابراہیم بہت خوش تھا، کہنے لگا۔ "بہت خوب۔ تمہارے باپ نے بنو عامر کے اقتدار سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ گویا اب قرطبہ میں تمہارے باپ کا نہیں تمہارا حکم چلے گا اور تمہارے باپ کی نئی کس طرح ہوگی، یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو تمہاری میں اپنے باپ سے پوچھ لینا۔"

عبدالملک المظفر نے شاعر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو شاعر جاتے جاتے رک گیا اور المنصور سے کہا۔ "جناب! آپ کی عدالت سے انصاف نہیں ملا۔ آپ میرے ساتھ ناانصافی فرما رہے ہیں۔"

المنصور نے اسے روک کے پوچھا۔ "ہاں بتا! میں نے تیرے ساتھ کون سی ناانصافی کی ہے؟"

شاعر ابراہیم نے جواب دیا۔ "جناب! آپ کے درباری شاعر الحسن صاعد نے تشالہ کے اسی محاذ پر اس کے بادشاہ غرسیہ کے بارے میں ایک پیش گوئی کی تھی جو بعد میں پوری ہوئی اور آپ نے اس شاعر کو ولی جیسی عزت دی اور اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ اب آپ اسی تشالہ کے محاذ پر مجھ جیسے شاعر کو میری حقیقی پیش گوئی کا انعام قرطبہ سے جلاوطنی کے فرمان کی صورت میں دے رہے ہیں حالانکہ صاعد ہی کی طرح میں بھی انعام و اکرام کا مستحق ہوں۔"

مگر شاعر کو قید کردیا گیا۔ سوریہ کی خوفناک جنگ میں فتح حاصل کرنے سے پہلے ہی المنصور نے دیکھا کہ شہر سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔

ابھی وہ گھڑسواری کرسکتا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا شہر کے قریب گیا اور اپنی فوج کے ایک سردار سے پوچھا۔ "کیا شہر فتح کرلیا گیا؟"

سردار نے جواب دیا۔ "نہیں لیکن دو تین دن میں اسے فتح کرلیا جائے گا۔"

المنصور نے شہر سے اٹھنے والے شعلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر سوریہ شہر کو آگ کس نے لگادی؟"

سردار نے جواب دیا۔ "خود سوریہ والوں نے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے شہر کو آپ سے نہیں بچاسکتے۔ اسی لئے انہوں نے خود اپنے شہر کو جلا دیا تاکہ فتح مندی کے بعد آپ کو وہاں سے کچھ بھی نہ ملے۔"

المنصور نے حکم دیا۔ "جب انہیں خود یہ یقین ہے کہ ہم اس شہر کو فتح کرلیں گے تو تم لوگ دور سے یہ تماشا کیوں دیکھ رہے ہو۔ آگے بڑھو اور اس شہر کو فتح کرلو۔"

تین دن کے خوفناک مقابلے کے بعد یہ شہر فتح کرلیا گیا لیکن اب المنصور اپنے گھوڑے پر خود سفر نہیں کرسکتا تھا۔

اس نے اپنے لیے ایک تخت رواں تیار کروایا جس پر وہ بیٹھ بھی سکتا تھا اور لیٹ بھی سکتا تھا۔ اس تخت رواں کو بارہ طاقتور انسان اپنے کاندھوں پر لے کر متحرک ہوگئے۔ یہ المنصور کے احکامات کے پابند تھے۔

شہر کو فتح کرنے کے بعد دیکھا گیا کہ وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا لیکن اس بستے ہوئے ویران شہر میں ولی ایلیمان کا گرجا بالکل صحیح سلامت تھا اور اس کی سونے کی صلیب اب بھی دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔

تختِ رواں ایک نسبتاً بلند سطح پر رکھ دیا گیا۔ المنصور نے فوجی سرداروں سے پوچھا۔ "اس پورے شہر کو ان کے مکینوں نے خود ہی جلا کے راکھ کردیا ہے تو اب یہ یتیم و یسیر گرجا کس لئے موجود ہے، اب یہاں کون آئے گا؟ اسے بھی شہریوں کے دکھ درد میں شریک ہوجانا چاہیے۔"

اس گفتگو میں المنصور کا جو فرمان موجود تھا اس پر فوری عمل کیا گیا۔ گرجے کو بھی آگ لگادی گئی اور اسے بچے کھچے اس طرح مسمار کیا گیا کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

المنصور ان علاقوں میں پندرہ دن تک اپنے تختِ رواں پر کبھی بیٹھ کر، کبھی لیٹ کر سفر کرتا رہا۔ جب سولھویں دن وہ اپنے خیمے میں بستر پر گیا تو اپنے بیٹے عبدالملک کو بلوا کے پوچھا۔ "یہاں سے مدینہ سالم کتنی دور ہے؟"

عبدالملک نے باپ کی شکل دیکھی تو وہ بہت پریشان ہوا کہ اب المنصور پچھتاتا بھی نہیں جارہا تھا۔

عبدالملک نے جواب دیا۔ "یہاں سے مدینہ سالم ساٹھ میل دور ہے۔"

المنصور نے حکم دیا۔ "مجھے وہیں لے چلو۔ میں اپنے قصر میں کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

عبدالملک نے پوچھا۔ "آپ بہت تکلیف میں ہیں۔ کچھ بتائیں تو سہی کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

المنصور نے کراہتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! میرے اندازے کے مطابق اس وقت میرے ساتھ بیس ہزار جنگجو اور بہادر سپاہی ہم سفر ہیں۔ ان میں کئی بہت زیادہ زخمی بھی ہوں گے لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ جس اذیت اور تکلیف سے میں دوچار ہوں وہ تکلیف اور اذیت کسی کو بھی نہیں ہوگی۔"

رات کو المنصور نے اپنے سرداروں کو اپنے خیمے میں طلب کیا لیکن حاضری دینے والے سرداروں میں چند موجود نہیں تھے۔

عبدالرحمٰن نے باپ کو بتایا۔ "جو سردار نہیں آئے وہ جنگ میں شہید ہوگئے اس لئے آپ ان کا انتظار نہ کریں۔"

المنصور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "مدینہ سالم واپس چلو۔ میں کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ لوگ نہایت تیزی سے مدینہ سالم روانہ ہوگئے۔

المنصور کو مدینہ سالم پہنچنے کے بعد جب اس کے قصر میں اتارا گیا تو وہ بالکل پہچانا نہیں جارہا تھا۔ یہاں اس نے خاموشی سے عبدالملک کو طلب کیا اور کہا۔ "تم فوج کی کمان اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن کو دے دو اور خود قرطبہ چلے جاؤ۔ خلیفہ کو میری بیماری کی خبر پہنچا کر میری جگہ تم سنبھال لو۔ خلیفہ سے کہنا کہ یہ میرے باپ المنصور کا حکم ہے کہ تو میری نیابت نہیں، وراثی حکومت کی حیثیت سے حکومت کرے۔"

عبدالملک سمجھ چکا تھا کہ اب اس کے باپ کا بچنا محال ہے۔ وہ جانے لگا تو المنصور نے اسے پھر بلوایا اور کہا۔ "فوج میری عدم موجودگی میں سر اٹھائیں گے۔ تم سرکشوں سے کوئی رعایت نہیں کروگے۔ انہیں سختی سے کچل دینا۔"

عبدالملک رونے لگا تو المنصور نے اس کو رونے سے منع کیا۔ "مت رو۔ رونا بزدلی اور کمزوری کی علامت ہے۔"

عبدالملک نے آنسو پونچھے اور دوبارہ باہر جانے لگا تو المنصور نے اسے پھر بلایا اور کہا۔ "شاعر کی پیش گوئی پوری ہوتی نظر آرہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اگر پیش گوئی کی صداقت ثابت ہوجائے تو اسے انعام واکرام ضرور دیا جائے۔"

عبدالملک نے پوچھا۔ "کیا میں ابراہیم شاعر کو قرطبہ سے بلا وطن نہ کروں؟"

المنصور نے کہا۔ "تو میری بات کیوں نہیں سمجھتا۔ جب شاعر ابراہیم کی پیش گوئی سچ ثابت ہوجائے گی تو اس کی پیش گوئی کے مطابق اپنا خاندان نیست و نابود ہوچکا ہوگا۔ اب تو مجھے بتا کہ نیست و نابود ہوجانے والے لوگ شاعر ابراہیم کو انعام واکرام کس طرح دیں گے۔"

عبدالملک اپنے بار بار بلائے جانے پر یہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا باپ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کچھ کہنے کے لئے المنصور کے پاس وقت نہیں رہا۔ وہ وہاں سے فوراً ہٹ گیا۔ حالانکہ اس کے کانوں میں باپ کے بلانے کی آوازیں پہنچتی رہیں۔

عبدالملک نے فوج کی کمان عبدالرحمٰن کے حوالے کردی اور خود قرطبہ روانہ ہوگیا۔

اب عبدالرحمٰن نے اپنے باپ کی خدمت میں حاضری دی۔ یہاں دوسرے فوجی سردار بھی موجود تھے۔ المنصور نے عبدالرحمٰن کو دیکھتے ہی اشارے سے اس کو پاس بلایا اور اپنے کان پر ہاتھ رکھ کے اشارے سے کہا کہ اپنا کان اس کے منہ کے پاس لائے۔

عبدالرحمٰن نے اپنا کان باپ کے منہ کے پاس کردیا۔ المنصور نے کہا۔ "بڑے بھائی کی ہمیشہ اطاعت کرنا۔ کبھی اس سے جھگڑنا مت اور اپنے ہاتھ سے چھری سے کٹا ہوا سیب اپنے بڑے بھائی عبدالملک کو مت کھلانا۔"

عبدالرحمٰن نے وعدہ کیا کہ وہ باپ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔

المنصور نے کہا۔ "میرے سرہانے خاک کی ایک پوٹلی سفید کپڑے کے بیچ میں رکھی ہوئی ہے۔ یہ کپڑا میری حلال کی کمائی سے خریدا ہوا کفن ہے اور پوٹلی میں جہاد کی گرد ہے۔ میں مرجاؤں تو اسی کفن میں میری تجہیز و تدفین ہو اور میرے کفن پر جہاد کی گرد چھڑک دی جائے۔"

عبدالرحمٰن بھی رونے لگا اور کہا۔ "آپ کو ہم [illegible] جائیں گے۔"

المنصور نے ہاتھ کے اشارے سے بھی اور زبان سے بھی منع کیا۔ "نہیں مجھے قرطبہ مت لے جانا۔ میری ہڈیوں کے اس پنجر کو اسی قصر کے کسی گوشے میں دفن کردینا۔"

پھر اچانک اس کی قوتِ گویائی بھی چھن گئی۔ اس نے کئی سرداروں کو اشاروں سے اپنے پاس بلایا اور ان سب نے باری باری اپنے اپنے کان المنصور کے لب ہلتے اور قریب کھڑے ہونے والوں نے دیکھا کہ المنصور کے ہونٹ ہل رہے ہیں مگر اس کے منہ کے قریب جن کے کان گئے، انہوں نے کہا کہ کوئی آواز نہیں سنائی دی۔

پھر یہ ہلتے ہوئے ہونٹ بھی ساکت ہوگئے۔ آنکھیں بھی بند ہوگئیں اور چہرہ ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہاں موجود دیکھنے اور سمجھنے والوں کی آوازیں گونجیں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

اسی قصر کے ایک گوشے میں المنصور کی قبر کھودی گئی۔

عبدالرحمٰن نے باپ کو غسل دیا اور اس کی حلال کی رقم سے خریدے ہوئے کفن میں کفنایا اور قبر میں اتارنے کے بعد اس کے کفن پر جہاد کے گرد و غبار کی مٹھی چھڑک دی گئی اور قبر کا منہ بند کردیا گیا۔

چھپانے اپنا کپکپاتا ہوا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سا ابال اٹھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر دبانے کی کوشش کررہی تھی۔ ایک اذیت تھی جو اس کے رگ و پے میں گھل رہی تھی۔ یہ شاید اس کی سوچوں کی اذیت تھی۔ شاید وہ آج اپنی زندگی پر کچھ زیادہ ہی غور و خوض کررہی تھی۔ سماج میں اس کا کیا مقام تھا اور زندگی میں تنہائی و بے کیفی اس کا مقدر کیوں تھی؟ شاید آج اس قسم کے سوالوں پر وہ کچھ زیادہ ہی سوچ رہی تھی۔

اس کا تعلق اس چھوٹی سی غربت زدہ بستی سے تھا جو نہ جانے کس زمانے سے معزز برہمنوں اور مہاجنوں کے اس گاؤں کے قریب واقع تھا۔ اس بستی کی عورتیں کسی زمانے میں طوائفیں اور گنیاں کہلاتی تھیں۔ مذہبی ہوئیں انہوں نے باقاعدہ طور پر پیشہ چھوڑ دیا تھا اور برہمنوں کے گھروں میں ملازماؤں وغیرہ کے طور پر کام کرنے لگی تھیں۔ کچھ اپنے طور پر بھی محنت مزدوری کرتی تھیں لیکن اس تبدیلی سے گویا ان کی سماجی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

انہوں نے گو کہ بازاری انداز میں ہر ایک کے لئے بکاؤ مال بننا تو چھوڑ دیا تھا لیکن معزز برہمن اب بھی انہی کی بستی سے اپنے لئے داشتائیں منتخب کرتے تھے۔ ڈھکے چھپے انداز میں وہ اب بھی کچھ مخصوص لوگوں کی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ تھیں۔ ان میں سے جو گھروں میں کام کرتی تھیں ان سے بھی گھر کے مالکان تعلقات قائم کرلیتے تھے۔ ان عورتوں کو اپنے اس مقام پر بھی کوئی دکھ نہیں تھا۔ وہ اس سماجی حیثیت کے ساتھ بھی سکون، اطمینان اور مسرو

جرأت مندوں اور بے عزت لوگوں کے مابین طے ہونے والے تلخ معاملات

معزز اور محترم سمجھے جانے والے افراد کو اگر اپنی عزت اور احترام کی حفاظت کا سلیقہ منہ ہو تو انہیں رسوا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے قدرت کے... دیا پھر اُن نے حیثیت اور پے توقیر لوگوں کے جنہیں معاشرے میں عزت کے قابل نہیں سمجھا جاتا

وصلہ

این سندر/ نجمہ مودی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کہانی کے تاریخی پس منظر کے ماخذ

فتح الطیب | تمدن عرب | خلافت اندلس | عبث نامہ اندلس | دولت ہسپانیہ عرب | اندلس تاریخی جغرافیہ

علامہ مقری | سید علی بلگرامی | نواب ذوی القدر جنگ | ڈوزی | کاندے | مولوی عنایت اللہ خان

قناعت سے زندگی گزارتی تھیں۔ اب تو شاید کسی کو صحیح طور پر یاد بھی نہیں رہا تھا کہ یہ سلسلہ کب اور کیونکر شروع ہوا تھا۔ چمپا کے خیال میں تو اس کی ماں 'دادی' 'نانی' پرنانی کے زمانے سے..... بلکہ شاید اس سے بھی پہلے سے سب کچھ اسی طرح چلا آرہا تھا۔ شاید یہ اس وقت سے ہی ایسا تھا جب سے شد کی مکھیوں نے ملکہ مکھی کے لئے شہد جمع کرنا شروع کیا تھا۔

چمپا اور رگھوناتھ کی شناسائی بھی کوئی کل کی بات نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ ساتھ پلے بڑھے تھے۔ ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ چمپا کا تعلق اس بستی سے تھا جہاں وہ مخصوص ہی عورتیں رہتی تھیں اور رگھوناتھ ایک معزز برہمن گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ جس زمانے میں چمپا کی ماں بوقتِ ضرورت رگھو کے باپ کی خلوتیں آباد کیا کرتی تھی اس وقت چمپا رگھو کے ساتھ بانٹوں اور میدانوں میں دوڑی پھرا کرتی تھی یا دونوں مل کر پودوں سے رنگا رنگ پھول توڑا کرتے تھے۔ جوان ہونے پر رگھو اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر چلا گیا تھا۔ چھٹیوں میں وہ گھر آیا کرتا تھا لیکن جن باتوں کے بارے میں چمپا سوچ رہی تھی وہ اس وقت شروع نہیں ہوئی تھیں۔ وہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب رگھو تعلیم مکمل کر کے شہر سے گاؤں واپس آگیا تھا اور مستقل وہیں رہنے لگا تھا۔ وہ دن اس کی بے کیف اور بے کشش یادوں کی دنیا میں سورج کی طرح دمکتا تھا جب رگھو نے اس سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ وہ کیف و مسرت کی ان بلندیوں پر پرواز کرنے لگی تھی جن تک رسائی کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مرتے دم تک اس دن کی خوشی اور کیف و سرور کو فراموش نہیں کر پائے گی۔

..... لیکن چند ماہ سے زندگی پر ایک عجیب سی بے کیفی اور افسردگی طاری تھی۔ کچھ تفکرات اور سوالات کن کھجوروں کی طرح اس کے ذہن کو ڈستے رہتے تھے۔ مستی و سرخوشی کی وہ کیفیت نہیں رہی تھی جو کچھ عرصے پہلے تک ہوا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے گھر کے پچھلے صحن میں آم کے درخت کی ایک ٹہنی شاخ کا سہارا لیے کھڑی کچھ ایسی ہی سوچوں میں گھری ہوئی تھی جب عقب سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے تیزی سے گھوم کر دیکھا اور مسرت بھرے انداز میں تیزی سرگوشی کی "رگھو! تم آگئے؟ پورے گھومکی ماہ سے شہر گیا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر چمپا کی ساری اداسی اور بے کیفی دور ہو گئی۔ اس کی نس نس میں ایک عجیب سی سرشاری دوڑ گئی۔ فرطِ جذبات سے اس کا بدن کانپنے لگا۔

"ہاں..... میں آگیا..." رگھو مسکراتے ہوئے بولا "سامان گھر پر رکھتے ہی میں سیدھا تم سے ملنے آیا ہوں..." پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "مجھے تمہاری ماتا جی کے مرنے کا پتا چلا تھا..... بہت افسوس ہوا تھا جان کر۔"

چمپا کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے منہ پھیر لیا۔

سے بولا "ارے..... دیکھو..... اب اس وقت رونا شروع نہ کر دینا۔"

اس نے اسے اپنی طرف گھماتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا "رونے کی اب کوئی ضرورت نہیں..... دیکھو نا... میں جو آگیا ہوں..." پھر اس نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا "تم تو پہلے سے زیادہ کھلی کھلی اور بھرپور دکھائی دے رہی ہو۔"

چمپا یکدم جیسے اپنے سارے دکھ' اپنی زندگی کی ساری افسردگی' بے کیفی اور کھوکھلے پن کو بھول گئی۔ رگھو کی قربت اور اس کے الفاظ اس کے لئے اسی طرح جادو اثر ثابت ہوا کرتے تھے۔ پھر اس نے اپنی دانست میں رگھو کو وہ خوشی کی خبر سنائی مگر اس خبر کو سن کر رگھو کا چہرہ کچھ پھیکا پڑ گیا۔

"کیا واقعی..... تم سچ کہہ رہی ہو؟" وہ گھنی گھنی سی آواز میں بولا۔

ایک انجانی حیا کے بوجھ سے چمپا کا سر جھک گیا۔ رخسار تمتمانے لگے اور وہ مدھم آواز میں بولی "جھوٹ کی اس میں کیا بات ہے؟ آخر اتنے عرصے تک..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں چمپا..... نہیں...!" رگھو عجیب دہشت زدہ سے لہجے میں بولا "کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے..... تم ماں بننے والی نہیں ہو..."

"تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو گئے ہو رگھو؟" چمپا بہ مشکل سر اٹھاتے ہوئے بولی "کیا تمہیں اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی؟"

"خوشی..... کیسی خوشی.....؟" رگھو پہلے سے بھی زیادہ دہشت زدہ لہجے میں بولا۔

"تم تو کہا کرتے تھے کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔ اب یہ وقت نبھانے کا وقت آگیا ہے۔" چمپا نے اسے یاد دلایا۔

"شادی..... تم سے.....؟ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے"

رگھو خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"کیوں ناممکن ہے؟" چمپا نے لرزتے ہوئے انسان کی سی گھبراہٹ سے اس کا بازو تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

رگھو کے جواب دینے سے پہلے ہی حقیقت گویا ایک تیز دھار تلوار کی طرح اس کے دل کو کاٹتی ہوئی گزر گئی اور وہ بے اختیار تقریباً چلا اٹھی "واقعی.....! میں کیسی نادان تھی..... اتنی بڑی حقیقت کو بھول گئی تھی کہ میں تو ایک طوائف زادی ہوں..... گو کہ میں نے زندگی میں تمہارے سوا کسی کو آج تک اپنے نزدیک نہیں آنے دیا لیکن یہ جو کلنک کا ٹیکہ میرے ماتھے پر لگا ہوا ہے یہ کبھی نہیں مٹ سکتا.....!"

وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ رگھو نے جھجکتی سے اپنے آپ کو چھڑایا اور رخصت ہو گیا۔ چمپا کو امید تھی کہ وہ بہرحال واپس آئے گا۔ اس کے لئے نہ سہی' اپنے ہونے والے بچے کے لئے ہی سہی۔

اس کا یہ انتظار فضول رہا۔ اس دن کے بعد رگھو پلٹ کر نہیں آیا۔

○☆○

اس روز صبح ہی سے وہ درد محسوس کر رہی تھی۔ شاید وہ بچہ دنیا میں آنے کے لئے بے تاب تھا جس کے آنے کی کسی کو خوشی نہیں تھی۔ اس کی آمد کا کسی کو انتظار نہیں تھا۔ اسے خوش آمدید کہنے والا کوئی نہیں تھا۔ چمپا بسترِ زچگی پر جسمانی اور روحانی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ اس اثنا میں رگھو کا باپ کمرے میں داخل ہوا اور ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کے قریب آبیٹھا۔ اس کے چہرے سے فکرمندی عیاں تھی۔

"کیا بات ہے کاکی!" چمپا نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

رگھو کے بوڑھے باپ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی تھکن زدہ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ قابلِ رحم سی آواز میں بولا "میں لٹ گیا چمپا! میں برباد ہو گیا۔ میری بیٹی نے ہمارے خاندان کے منہ پر کالک مل دی ہے۔"

چمپا اپنی اذیت کو بھول کر خالص نسوانی تجسس سے بولی "روپا کو کیا ہوا کاکی؟ اس نے ایسا کیا کر دیا؟"

"ہوں..... ہماری قسمت ہی خراب تھی" برہمن رو دینے والے انداز میں بولا "تمہیں معلوم ہے تین ماہ بعد روپا کی شادی ہونے والی ہے۔ تاریخ طے ہو چکی تھی۔ چند مہینے پہلے میں نے اسے خط لکھا تھا کہ وہ گھر آجائے..."

روپا شہر میں کالج میں پڑھتی تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ روپا اور رگھو کا باپ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مگر وہ نہیں آئی۔ میں اسے لینے خود شہر گیا تو میں نے دیکھا وہ امید سے تھی۔ اس کا پاؤں بھاری تھا" اس یاد سے خوف زدہ ہو کر برہمن نے کرسی کے ہتھے پکڑ لئے۔

"کیا.....؟ روپا کا پاؤں بھاری تھا؟" چمپا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ہاں....." روپا کے باپ کے لہجے میں غصہ تھا "چھ ماہ سے وہ تو کالج ہی نہیں جا رہی تھی اور کسی نے مجھے خبر بھی نہیں دی۔ کاش مجھے کچھ پہلے پتا چل جاتا۔ کل میں اسے رات کے اندھیرے میں' چار میں چھپا کر گاؤں لے کر آیا ہوں..... اور اب اسے درد اٹھ رہے ہیں..... تین مہینے اس کی شادی میں باقی ہیں۔ اگر لڑکے والوں کو پتا چل گیا تو میں کس منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا" اس کے لہجے سے ہی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"لیکن کاکی..... میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں؟ آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" چمپا حیرت سے بولی۔

"دیکھو..... میری پگی.....! میری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو" پربھوناتھ کے لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں۔

"میں.....؟ میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" چمپا کی حیرت دوچند ہو گئی۔

"روپا کی شادی میں تین مہینے رہ گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے بھائی رگھو کی شادی بھی ہونی ہے۔ اگر یہ بات کھل گئی تو دونوں ہی کی شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔ تم بس اتنا کرو کہ روپا کے بچے کو اپنے بچے کے طور پر قبول کر لو..." پربھوناتھ کی پیشانی پسینے کی بوندیں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔

"کیا آپ دیکھ نہیں رہے میں تو خود ماں بننے والی ہوں" چمپا ایک عجیب سے کرب کے عالم میں تقریباً چلا اٹھی۔

"عورت کے ہاں جڑواں بچے بھی تو ہو جاتے ہیں..." پربھوناتھ گویا پہلے ہی جواب سوچے بیٹھا تھا "تم یہی مشہور کر دیں گے..... چمپا! میری پگی.....! ہماری عزت رکھ لو..." وہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

چمپا چند لمحے استعجائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ سفید بالوں والے پربھوناتھ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور منت سماجت کرنے لگا۔ آخر چمپا نرم پڑ گئی۔ وہ شکست خوردہ سے لہجے میں بولی "اچھا..... ٹھیک ہے..... میں جڑواں بچوں کی ماں بن جاؤں گی۔ اگر اس طرح آپ کی عزت بچ سکتی ہے تو اسی طرح سہی۔"

پربھوناتھ نے گویا سکھ کی سانس لیتے ہوئے اس کے پاؤں چھوڑ کر نہایت محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "مجھے تم سے یہی امید تھی میری بچی! تم انسان نہیں اوتار ہو..... دیوی ہو....."

"خدا کے لئے بس کیجئے کاکی!" چمپا بے اختیار کراہ اٹھی۔ "مجھے اوتار اور دیوی مت بنائیے..... اتنے اونچے سنگھاسن پر مت بٹھائیے..... میں تو بس ایک طوائف زادی ہوں..... ویشیا ہوں..... کسبی کی اولاد ہوں..."

○☆○

تقریباً چار ماہ بعد کی بات ہے..... موسمِ بہار کی ایک خوشگوار شام کو رگھوناتھ اپنی بیوی کے ساتھ چمل قدمی کے لئے گاؤں کے نواح میں جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بہن روپا اور اس کا شوہر بھی تھا۔ وہ باغ کے ساتھ والی سڑک پر جا رہے تھے۔ اچانک رگھو کی بیوی گردن گھماتے ہوئے انگلی سے سڑک کے دوسری طرف کچھ دور اشارہ کرتے ہوئے بولی "ارے..... ذرا دیکھو تو..... ایک عورت بالکل ایک جتنے دو بچے اٹھائے کھڑی ہے....."

رگھو نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا مگر گھبرائے ہوئے انداز میں جلدی سے منہ پھیر لیا۔ وہ چمپا تھی جو دونوں بازوؤں پر دو بچوں کو سینے سے چمٹائے کھڑی تھی۔ اس کی ساڑی میلی' بال بکھرے ہوئے اور چہرہ زرد تھا۔ پھٹی پھٹی سی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی اور دہشت تھی۔

"بچے تو پیارے ہیں" روپا کے شوہر نے تبصرہ کیا۔

روپا اسے کہنی مارتے ہوئے اور نگاہیں زمین پر گاڑتے ہوئے تیز سی سرگوشی میں بولی "چھوڑیئے جی.....! ادھر مت دیکھیے..... وہ ایک طوائف زادی ہے۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

اُردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا طویل ترین سلسلہ

دو سو چھیاسٹھ واں مہینہ۔ مارچ ۱۹۹۹ء

ہنگامہ ہوا رنگینیوں اور تحیر کے اُس بے تاج بادشاہ کی سحر انگیز کہانی جس نے اپنی بھرپور زندگی میں کبھی شکست کا ذائقہ نہیں چکھا۔ وہ جب اور جس کے ذہن میں چاہتا، جہاں تک لیتا اور یہی اُس کا مُہلک ترین ہتھیار تھا۔ دونوں پر محیط وہ طلسم ہوش رُبا جسے قارئین کی دوسری نسل بھی بہت شوق سے پڑھ رہی ہے۔ اپنے اور مُلک و قوم کے دشمنوں کو خیال خوانی کے نرم و نازک ہتھیار سے خاک و خون میں نہلا دینے والے فرہاد علی تیمور کی لازوال اور بے مثال داستانِ عبرت جس میں وہ لہو کے سارے رشتوں کے ساتھ حریفوں سے برسرِ پیکار رہے۔

فرہاد علی تیمور

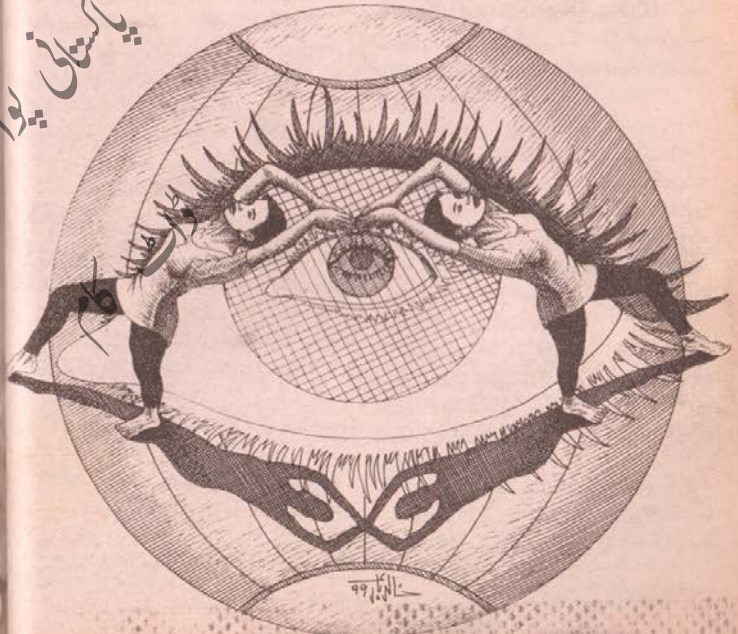

گزشتہ قسط کا خلاصہ

میرے دشمن نہیں جانتے تھے کہ میں روسی زبان سے واقف ہوں۔ میں نے ایمون زونا کے ری پروسیسنگ پلانٹ کو تباہ کرنے کے بعد اسے ہلاک کردیا۔ بابا صاحب کے ادارے کی طرف سے میرے زندہ ہونے کا اعلان میرے قتل کی منصوبہ بندی کرنے والے ممالک کے لیے دھماکا ثابت ہوا۔ علی نے تمام اہم ممالک سے رابطہ کرکے میرے قتل کا ٹھیکا لینے والے تین پراسرار مجرموں کی حوالگی کا مطالبہ کردیا۔ یہ راز اب کھل گیا تھا کہ پارس کے ساتھ رہنے والی نامعلوم میں نیلماں کی آتما سمائی ہوئی ہے۔ ایک موقع پر نیلماں نے پورس کو نقصان پہنچانا چاہا تو ٹائنی نے اس کی مدد کی۔ پورس ہمارے مطلوبہ مجرموں میں سے ایک کو پارس کے حوالے کرکے اس احسان کا بدلہ چکادیا۔ ایک مجرم پہلے ہی علی کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ تیسرے مجرم برین ٹوم اور الپانے ٹریپ کرلیا۔ حالات بڑی حد تک سازگار ہوچکے تھے کہ اچانک سنگریلا نامی زبردست فائٹر سے میرا سامنا ہوگیا جو مجھے مارنے کا کریڈٹ لینا تھا۔

اب آپ زیرو قدمت ملاحظہ کیجیے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں جس بات کی توقع بھی نہیں ہوتی وہی بات سامنے آجاتی ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سنگریلا یوں اچانک میرے سامنے آجائے گا۔ ایسے وقت مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ میرے چونکنے کے باعث وہ شبہ کرسکتا تھا کہ میں ہی فرہاد علی تیمور ہوں۔

غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنے چونکنے کا انداز بدل دیا۔ چونکنے کے علاوہ حیرانی سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "او گاڈ! مجھے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار اتنے دبلے پتلے شخص کو دیکھ رہا ہوں۔ میری بات کا برا نہ ماننا، تم تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا لگتے ہو۔"

میرا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ میں نے آواز اور لہجہ تبدیل کیا تھا۔ وہ مجھے پہچان نہ سکا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "سب یہی کہتے ہیں کہ ہڈیوں کے ڈھانچے پر انسانی کھال منڈھ دی گئی ہے۔ میرے جسم میں شاید ایک کلو گوشت بھی نہیں ہوگا۔" پھر اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں ایک بھی میز خالی نہیں ہے۔ تم اکیلے ہو، میں نے سوچا شاید تم مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دو۔"

میں نے کہا۔ "او شیور۔ تم یہاں بیٹھو گے تو میری تنہائی دور ہوگی۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میری ایک بری عادت ہے۔ میں مہربانی کرنے والوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔"

"بری عادت بدل سکتی ہے لیکن ہو عادت کے غلام ہوتے ہیں، وہ اپنی برائیوں کو چھوڑ نہیں پاتے۔"

وہ میز پر رکھے ہوئے مینیو پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "جو طاقتور ہوتے ہیں ان کی برائیوں کے بھی قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔"

"طاقتور کے خوف سے منہ پر قصیدے اور پیٹھ پیچھے گالیاں ہوتی ہیں۔"

"کیا تم مجھے کمزور سمجھ کر ایسا کہہ رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں ایک سیدھا سادہ سا آدمی ہوں۔ ایسا کمزور ہوں کہ مچھر کاٹ کر بھاگ جاتے ہیں اور میں انہیں مار بھی نہیں سکتا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم بہت دلچسپ باتیں کرتے ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ لوگ طاقتور ہو کر بھی مچھر کو مار نہیں پاتے مارنے سے پہلے وہ اڑ جاتے ہیں۔ میں بھی مچھر جیسا ہی ہوں۔ سے بڑا شہ زور بھی مجھے نہیں مار سکتا ہے۔"

"اپنی توہین نہ کرو۔ میٹ استعمال کیا جائے گا، گویر کے کوائل جلائے جائیں تو اس کے دھوئیں سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔"

"تمہاری باتوں میں دلچسپی ہے مگر طنز بھی ہے۔ میں مچھر ہوں مگر دھوئیں سے نہیں بھاگتا۔ دشمنوں کو دھواں دھواں کر ہوں۔"

ویٹر نے آکر سلام کیا۔ سنگریلا مجھے کھاتا ہوئے دیکھ رہا تھا اس نے اپنے کھانے کا آرڈر دیا پھر مجھ سے کہا۔ "ان کا بل میں ہی ادا کروں گا۔"

ویٹر چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ مہربانی کیوں کر رہے ہو؟"

"جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، کسی کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا لیکن مہربانی کے بدلے مہربانی ضرور کرتا ہوں۔"

میں قاہرہ کے الحدید ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں تھا۔ یہ سر بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا جانی دشمن سنگریلا بھی قاہرہ میں ہوگا ہوٹل میں اتفاقاً میرے سامنے آکر میری ہی میز پر بیٹھے گا۔

اس نے پوچھا۔ "تم کیا بزنس مین ہو؟"

"پاکستان میں ایک مل اونر ہوں۔ تفریح کی نیت سے ہوں۔ یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ میرا نام فہیم کھرانی ہے۔ تم کرتے ہو؟"

"میں کرائے کا قاتل ہوں۔ میرا نام سنگریلا ہے۔ تبت آیا ہوں۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "تم یہ بات کتنی آسانی سے کہہ ر ہو کہ کرائے کے قاتل ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ قانون کے تمہیں یہ کہتے ہوئے سن لیں گے تو گرفتار کرلیں گے؟"

"زبانی کہنے پر کوئی گرفتار نہیں کرتا۔ جب قتل کرتے ہو دیکھیں گے تو گرفتار کریں گے۔ میں اپنے خلاف کبھی کوئی ثبو نہیں چھوڑتا۔"

"لیکن یہ جو خود اپنی زبان سے اعتراف کررہے ہو؟"

"میری اس بات پر سب ہنسیں گے کہ ایک مچھر دبنگیں مار رہا ہے۔"

"واقعی تمہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ایک پھونک میں اڑ جاؤ گے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ دو ویٹر چار ٹرے اٹھائے ہوئے آئے۔ انہیں اس کے سامنے رکھنے لگے۔ ایک ٹرے میں دنبے کی بھنی ہوئی سالے دار مسلم ران تھی۔ دوسری ٹرے میں چار چرغے تھے۔ تیسری میں گرما گرم روٹیاں اور چوتھی ٹرے میں سلاد، دہی اور ہڈیوں کی ایک ڈش تھی۔ میں نے حیرانی سے دیکھا۔ میں ہی کیا، اس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ وہ دنبے کی بڑی سی ران کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس کا گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔

سونیا نے مجھ سے کہا تھا کہ بابا صاحب کے ادارے میں رہتے ہوئے بہت عرصہ گزر گیا ہے۔ بچے یہاں محفوظ ہیں اور بڑی توجہ سے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ لہٰذا وہ تفریح کے لئے ادارے سے باہر جانا چاہتے ہیں۔

بابا صاحب نے کہا۔ "بے شک ایک ہی جگہ محدود نہیں رہنا چاہیے۔ میں دو دن کے بعد آؤں گا۔ تم وہاں چلی آؤ۔"

اب سنگریلا کو دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ کسی دن یا کسی وقت اسی اپنی سلامتی کے لیے اس سے جنگ ہوسکتی ہے۔ سونیا آئے گی تو وہ اس کی جان کا بھی دشمن بن سکتا ہے۔

میں نے خیال خوانی کی پرواز کی اور سونیا کے اندر پہنچ کر مخاطب کیا۔ "سونیا! میری جان! تم فی الحال قاہرہ نہ آؤ تو بہتر ہوگا۔ تفریح کے لیے کسی دوسرے شہر چلی جاؤ۔"

اس نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ مجھے اپنے پاس آنے سے کیوں منع کررہے ہو؟"

"یہ کم بخت سنگریلا یہاں پہنچا ہوا ہے۔ اس نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا ہے۔ میری ہی میز پر سامنے بیٹھا کھانے میں مصروف ہے۔"

"اور تم میرے اندر رہ کر دیکھ رہے ہو کہ میں بھی طیارے میں سفر کے دوران میں کھانے میں مصروف ہوں۔ یہ طیارہ مجھے قاہرہ لے جانے والا ہے۔"

"یہ شیطان عجیب و غریب قسم کا فائٹر ہے۔ اپنے مقابل آنے والوں کے ہوش اڑا دیتا ہے۔"

"کیا ایسا کہہ کر تم سونیا کے ہوش اڑانے کی کوشش کررہے ہو؟"

"میری جان! تم نے بھی بڑے بڑے شہ زوروں کے ہوش اڑائے ہیں لیکن تم ایک عرصے سے ایکشن میں نہیں ہو۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں صبح و شام ہیلتھ کلب میں باڈی بلڈنگ کے علاوہ یوگا کی مشقیں کرتی رہی ہوں اور اپنے ادارے کے نمبرون کہلانے والے فائٹروں سے لڑتی رہی ہوں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ تم سنگریلا کے مقابلے پر آؤ۔"

"تم سنگریلا کو سمجھا ؤ کہ وہ میرے مقابلے پر نہ آئے۔ ویسے تم میرے طریقۂ کار کو سمجھتے ہو، کوئی مقصد حاصل کرنا ہو یا کسی سے مقابلہ کرنا ہو تو میں شارٹ کٹ اختیار کرتی ہوں۔ وقت ضائع نہیں کرتی۔ چند منٹوں میں تخت یا تختہ کردیتی ہوں۔"

"مگر سونیا! یہ ایسا خطرناک اور انوکھا فائٹر ہے کہ....."

"کہ اس کے جیسا کوئی دوسرا فائٹر نہیں ہے۔ مقابلے سے پہلے ہر فائٹر خطرناک اور انوکھے اسٹائل والا لگتا ہے۔ فرہاد! ایک مشورہ دوں؟"

"خدا تمہارے مشوروں سے بچائے۔ فرماؤ کیا فرماتی ہو۔"

"تم بوڑھے ہوگئے ہو۔ بچوں کے دادا بھی بن گئے ہو۔ اب مجھے نہیں بچوں کو ڈرا کر سلانے والی کہانیاں سنایا کرو۔"

"میں سمجھ گیا، تم ضرور آؤ گی۔"

"میرا ایک کام کرو گے؟"

"اس سے بڑا کام کیا ہوگا کہ تم تشریف لارہی ہو۔ فرماؤ کیا کروں؟"

"ٹائنی سے کہو، میرے پاس آئے۔"

"ابھی اس سے کہتا ہوں۔ وہ کسی اہم معاملے میں مصروف نہیں ہوگی تو ابھی تمہارے پاس آجائے گی۔"

میں نے ٹائنی کے پاس آکر کہا "تمہاری مما تمہیں یاد کررہی ہیں۔ اگر مصروف نہیں ہو تو چلی جاؤ۔"

"ابھی جارہی ہوں پاپا!"

میں دماغی طور پر حاضر ہوگیا۔ میرے سامنے سنگریلا بیٹھا کھا رہا تھا۔ میں سونیا کے دماغ میں جاکر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے ٹائنی کو کس مقصد کے لیے بلایا ہے۔ عین اس وقت سنگریلا نے مجھ سے کہا "تم نے کھانے کے لیے ایک ڈش منگائی۔ ایک چڑیا بھی تم سے زیادہ کھاتی ہوگی۔ کم آن میری ڈشوں سے لے کر کچھ کھاؤ۔"

میں نے کہا "معمولی بھوک تھی۔ بتنا کھالیا، وہی کافی ہے۔"

"کیا تم کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟"

"ہاں پردیس میں اور کہاں رہ سکتا ہوں۔"

"یہاں میرا ایک بنگلا ہے۔ میرے ساتھ رہو۔ ہم دونوں اکیلے ہیں پھر اکیلے نہیں رہیں گے۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا "کیا تم اسی شہر میں رہتے ہو؟ یہاں تمہارا ذاتی بنگلا ہے؟"

"میں جس ملک کے جس شہر میں جاتا ہوں، وہاں میری رہائش کے لیے آرام دہ بنگلے کا انتظام کردیا جاتا ہے۔"

"یعنی تمہارے سیکریٹری اور دوسرے ملازم پہلے سے انتظار کرتے ہیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "میں ایک نیکر اور بنیان پہن کر گھومتا

ہوں۔ مجھ جیسے آدمی کا سیکریٹری کون بننے گا؟ بھئی کسی کو قتل کرنے کے لیے جو مجھے کرائے پر حاصل کرتا ہے' وہی میرے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے انتظامات ہر ملک کے ہر شہر میں کرتا ہے۔"

"اچھا تو تم یہاں کسی کو قتل کرنے آئے ہو؟"

"یہاں نہیں' اسے تو کہیں دوسرے ملک میں قتل کرنا تھا مگر وہ میرے ہاتھ آنے سے پہلے ہی بچ نکلا۔ وہ کم بخت ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ اس نے دوسرے کو آلۂ کار بنا کر مجھے زخمی کر دیا تھا۔ میرے زخم بھرنے تک پتا چلا کہ اسے کسی نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں مایوس ہو کر یہاں آیا تو کل کے اخبار میں پڑھا کہ میرا شکار زندہ ہے۔ یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے کہ میں اس خطرناک اور چالاک باز کو اپنے ان خالی ہاتھوں سے ہلاک کروں۔ کل اس کی زندگی کا پیغام ملا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوشی کے مارے کل سے بھوک بڑھ گئی ہے۔ دیکھو کتنا کھا رہا ہوں۔"

"ابھی تم نے کہا ہے کہ تمہارا شکار خطرناک بھی ہے اور چالاک بھی لیکن مسٹر سنگریلا! ہو سکتا ہے' وہ شکار اب بھی چالاکی دکھا رہا ہو۔"

"میں اناڑی نہیں ہوں۔ اس کی چالاکیوں کو سمجھ سکتا ہوں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ تمہارے سامنے آنے سے پہلے تمہیں اپنے زندہ رہنے کی خبر سنا کر تمہیں خوشی کے مارے خوب کھانے پر مائل کر رہا ہو اور تم اپنی بھوک سے زیادہ اور پیٹ سے زیادہ کھاتے جا رہے ہو۔"

وہ لقمہ چباتے چباتے رک کر سوچنے لگا پھر پریشان ہو کر بولا۔ "وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے اور میں پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کر لیتا ہوں لیکن وہ چال باز ہے۔ کسی چالاکی سے میرے اندر موجود ہو سکتا ہے اور مجھے زیادہ سے زیادہ کھلا کر بلکہ کھانے میں زہر ملا کر دھوکے سے ہلاک کر سکتا ہے۔"

اس نے فوراً ہی منہ کے لقمے کو بھی پلیٹ میں اگل دیا پھر مجھ سے بولا "تم بہت اچھے ہو۔ تمہاری باتیں سن کر یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ ہوٹل کے ویٹروں کے دماغوں پر قبضہ جما کر کھانے میں مجھے زہر دے سکتا ہے۔"

وہ ٹشو پیپرز سے دونوں ہاتھ صاف کرنے لگا پھر ایسے چونک کر خلا میں تکنے لگا جیسے اپنے دماغ میں کسی کی بات سن رہا ہو۔ میں نے پوچھا "مسٹر سنگریلا! کیا بات ہے؟"

وہ بولا "میں شست شکار کرنے والا ہوں اس کی وائف میرے دماغ میں بول رہی ہے۔ تم ذرا خاموش رہو۔ مجھے مخاطب نہ کرو۔"

میں فوراً ہی اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ سوچ کے ذریعے پوچھ رہا تھا "تم فرہاد کی وائف سونیا نہیں ہو سکتیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سونیا ٹیلی پیتھی نہیں جانتی ہے۔"

دوسری طرف سے ٹائی نے کہا "میں نے کب کہا ہے کہ میں سونیا ہوں۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ سونیا ایک فلائٹ کے ذریعے رات کے گیارہ بجے قاہرہ پہنچ رہی ہے۔ میں نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے تمہیں تلاش کر کے سونیا کو بتایا ہے۔ اب وہ یہاں پہنچنے والی ہے۔"

"فرہاد کو آنا چاہیے تھا مگر سونیا آ رہی ہے۔ کیا فرہاد نے چوڑیاں پہن لی ہیں؟"

"نہیں تمہارا زائچہ (جنم کنڈلی) دیکھا گیا ہے۔ تمہارے مقدر میں لکھا ہے کہ تمہارے جیسا ناقابلِ شکست الو کھا فاکٹر ایک عورت کے ہاتھوں مرے گا۔"

وہ ہنسنے لگا "اچھا تو میرا زائچہ شوہر سے پہلے بیوی کو حرام موت مرنے کے لیے لا رہا ہے۔" پھر گھڑی دیکھ کر بولا "ابھی آٹھ بجے ہیں۔ وہ تین گھنٹے بعد ائرپورٹ پہنچے گی۔ میں یہاں سے ائرپورٹ پہنچوں گا۔ تم ہاہا صاحب کے ادارے میں جا کر کہہ دو کہ... وہ سونے کے کفن دفن کا انتظام کر لیں۔"

"لیکن تم سونیا کو کیسے پہچانو گے؟ وہ اصلی چہرے کے ساتھ نہیں ہوگی۔ وہ بڑی مکاری سے آنکھ مچولی کھیلتے تمہیں جہنم میں پہنچائے گی۔"

"سنا ہے' وہ اس عمر میں بھی جوان' صحت مند اور اسمارٹ ہے۔ اس طیارے میں ایسی دو چار عورتیں ہی ہوں گی۔ میں ان میں سے اسے پہچان لوں گا۔"

"تمہیں پتا ہے کہ کل سے قاہرہ ایئرپورٹ میں ریسلنگ ٹورنامنٹ شروع ہو رہا ہے۔ وہاں مردوں کے ساتھ لیڈیز ریسلنگ بھی لڑیں گی۔ اس لیے اس فلائٹ سے گیارہ جوان' صحت مند اور اسمارٹ عورتیں ریسلنگ رنگ میں لڑنے کے لیے آ رہی ہیں۔ ان گیارہ عورتوں میں سے انہیں پہچان سکو گے؟"

"کوشش کروں گا۔ اب تم میرے دماغ سے جاؤ۔ مجھے سوچنے دو کہ اس مکار عورت کو کیسے پہچانوں گا۔"

میں اس کے دماغ سے نکل آیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھا سانس روک کر ٹائی کو دماغ سے نکالنے کی جدوجہد میں لگا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "فرہاد کی وائف کیا کہہ رہی ہے؟"

"وہ سونیا نہیں ٹائی نام کی ایک عورت ہے۔ مجھے بتا رہی تھی کہ کل ریسلنگ کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے گیارہ جوان' صحت مند اور اسمارٹ عورتیں آ رہی ہیں۔ میں ان میں سے سونیا کو نہیں پہچان سکوں گا۔"

میں نے کہا "ان گیارہ عورتوں میں چینی اور جاپانی عورتیں بھی ہوں گی۔ ان کے چہرے میک اپ کے باوجود دوسری عورتوں سے الگ ہوں گے۔ تمہیں پوری گیارہ عورتوں کو پہچاننے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا "واقعی ان میں چینی اور جاپانی ریسلر زبھی ہوں گی۔ تم بڑی دانش مندی سے سوچتے ہو۔ کیا میرے ساتھ ائرپورٹ چلو گے' وہاں اس مکار عورت کو پہچاننے میں میری مدد کر سکو گے؟"

"تم مجھے اپنے ساتھ پنگلے میں رہنے کی دعوت دے چکے ہو' ہوٹل کے اخراجات بچا رہے ہو۔ اب تم جہاں کہو گے' وہاں جاؤں گا۔"

اس نے اپنے اور میرے کھانے کا بل ادا کیا پھر کاؤنٹر پر آ کر ہوٹل کے کسی سے رابطہ کر کے تیتی زبان میں کہنے لگا "گیارہ بجے آنے والی فرانس کی فلائٹ میں گیارہ لیڈیز ریسلرز آ رہی ہیں۔ تم ان گیارہ آدمیوں کو ہر لیڈی ریسلر کے پیچھے لگا دو۔ وہ ان کی ایک ایک حرکات و سکنات پر نظر رکھیں گے۔ تم اپنے چھ سات آدمیوں کے ساتھ ان لیڈی ریسلرز پر خاص نظر رکھو جو اپنے پہلوان یاروں کے ساتھ آئیں گی۔ ان میں سونیا بھی فرہاد کے ساتھ ریسلر کی حیثیت سے آ سکتی ہے۔"

اس نے اپنے خاص ماتحت کو اچھی طرح ہدایات دے کر فون بند کر دیا۔ وہ ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں اس کی ایک رینٹڈ کار تھی۔ اسے ڈرائیو کرنے کے لیے اس کا اپنا آدمی تھا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ ایسے وقت ٹائی نے میرے دماغ میں آ کر کہا۔ "ابھی جب تک سنگریلا کے دماغ میں رہی' آپ بھی رہے ہوں گے۔ اب آپ کیا کچھ سنی ہوں گی؟"

"ہاں بیٹی! میں نے تمام باتیں سنی ہیں۔ ریسلنگ کی انتظامیہ نے لیڈی ریسلرز کی رہائش کے لیے خاص انتظامات کیے ہوں گے۔ تمہاری ممبا ریسلرز ٹیم میں کتنی ہیں۔ اگر وہ ائرپورٹ میں لیڈی ریسلرز خواتین سے الگ رہیں گی تو سنگریلا انہیں آسانی سے پہچان لے گا۔"

"میں نے فرانس کی ایک لیڈی ریسلر کے تمام اہم شناختی کارڈ حاصل کر کے ممبا کو دے دیے ہیں۔ اب میں فرانس کی اس ریسلر کے کردار پر تنویمی عمل کرنے جا رہی ہوں۔ اس کے پرموٹر کو بھی بیہوش کر دیا جائے گا۔ وقت کم ہے۔ میں ان کے دماغوں میں جا رہی ہوں۔"

"تم اطمینان سے اپنا کام کرو۔ میں سنگریلا کے ساتھ ائرپورٹ کے باہر رہوں گا۔"

وہ چلی گئی۔ سنگریلا میرے ساتھ بیٹھا کھڑکی کے پار دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر کہا "ہیلو سنگریلا! کیا میری آواز اور لہجے سے مجھے پہچان رہے ہو؟"

"میں تمہیں لاکھوں اور کروڑوں کی بھیڑ میں پہچان سکتا ہوں۔"

"ابھی ٹائی نے آ کر مجھے بتایا ہے کہ میری وائف سونیا قاہرہ ائرپورٹ پر آنے والی ہے اور تم اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔"

وہ بولا "نقصان کیا چیز ہوتی ہے؟ میں تو اس کا کام تمام کرنا چاہتا ہوں۔ بیوی سے محبت ہے تو اسے بچانے کے لیے آ جاؤ۔"

میں نے اس کے پاس بیٹھے بیٹھے کہا "میں تم سے اتنی دور ہوں کہ کل تک ہی وہاں پہنچ سکوں گا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ دنیا سے دور رہو' میرے ہاتھوں سے مرنے کے لیے زندہ رہو۔ ایک عورت کے ہاتھوں سے مرو گے تو جرائم کی دنیا کے تمام شہ زور تمہاری لاش پر تھوکیں گے۔"

"ایسی باتوں سے مجھے قائل کرنا چاہتے ہو کہ مجھے تمہاری وائف کے ہاتھوں مر کر ذلت نہیں اٹھانا چاہیے۔ بے شک سونیا بہت خطرناک ہے لیکن دنیا کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں سونیا سے زیادہ خطرناک ہوں۔ تم مرد ہو کر بھی چھپے رہے اور اپنی عورت کو میرے ہاتھوں مرنے کے لیے آگے بڑھا دیا۔"

"یہ دنیا دیکھ چکی ہے کہ تم میرے ہاتھوں مار کھا کر چالیس دنوں تک اسپتال میں پڑے رہے۔ بہرحال تم اگر کل تک زندہ رہے تو میں وہاں تمہاری موت بن کر پہنچوں گا۔"

میں اس کے دماغ سے نکل آیا۔ وہ دھوکا کھا رہا تھا۔ میرے شانہ بشانہ بیٹھا ہوا یہی سمجھ رہا تھا کہ میں دور کسی ملک سے بول رہا ہوں۔ اس نے مجھے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا قاہرہ شہر دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں اس شہر کو دیکھ رہا ہوں اور اخباروں میں شائع ہونے

اللہ ان کی مدد فرماتا ہے' جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں (القرآن)

ترقی کا سیدھا راستہ منشیات سے دوری

نماز سے تربیت
نشے سے نفرت
اپنے آپ سے محبت

خصوصیات کے لحاظ سے پاکستان کا منفرد اسپتال جس میں نہ صرف یہ کہ منشیات سے چھٹکارا دلایا جاتا ہے بلکہ نشے کے عادی افراد کی ایسی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ اس لعنت سے کلی طور پر نفرت کرنے لگیں

مریض سندیافتہ ڈاکٹر سید مبین اختر
اور ان کے تجربہ کار عملے سے رجوع کریں

سستا اور آسان علاج گارنٹی کے ساتھ

کراچی منشیات ہسپتال

KAH

بس اسٹاپ نمبر 7 مین روڈ ناظم آباد نمبر 3 کراچی فون:۔ 661-2187

والی اس خبر کے متعلق سوچ رہا ہوں کہ فرہاد کا بیٹا علی تیمور ایک بہت ہی پراسرار مجرم مسٹر اَن نون کو گولیاں مار کر اس کے دونوں بازوؤں کو زخمی کر چکا ہے۔ اس کا علاج کرنے کے بعد وہ اسے ایک چھوٹے سے جزیرے میں زندہ چھوڑ دے گا۔ اس جزیرے پر اَن نون کے ساتھ اس کے بیش قیمت ہیرے جواہرات بھی ہوں گے۔ جرائم کی دنیا کا کوئی بھی مجرم وہاں جا کر اسے قید سے رہائی دلا سکتا ہے اور تمام ہیرے جواہرات لے سکتا ہے۔"

سنگیلا نے کہا "معلوم ہوتا ہے تم اَن ہیرے جواہرات کے لیے للچا رہے ہو اسی لیے اس اخباری خبر کے بارے میں سوچ رہے ہو۔"

میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ اَن نون اور ہیرے جواہرات کو جس کانچ میں رکھا جائے گا' جزیرے کے ساحل سے وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ قدم قدم پر بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ اگر اس بارودی پوشیدہ آلے پر ایک قدم بھی پڑے گا تو وہاں جانے والا ایک دھماکے سے قیمہ ہو جائے گا۔"

وہ بولا "مجھے ایسا چیلنج اچھا لگتا ہے۔ میں بارودی سرنگوں سے بچتا ہوا مسٹر اَن نون سمیت قیمتی ہیرے جواہرات لا سکتا ہوں لیکن پہلے سونیا اور فرہاد سے نمٹنا ہوگا۔ ان کا کام تمام ہونے کے بعد میں اس جزیرے میں جاؤں گا۔"

میں نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا "تم جزیرے کے ساحل سے کئی سو گز دور کانچ میں کیسے پہنچو گے؟"

"میں سرکس کے کرتب جانتا ہوں۔ ساحل کی کسی درخت سے رسا باندھ کر اس کا دوسرا سرا اپر شوٹر کے ذریعے اس کانچ تک پہنچا سکتا ہوں پھر اس رسے سے کانچ میں پہنچ کر اَن نون کو ہلاک کر کے تمام ہیرے جواہرات وہاں سے لا سکتا ہوں۔"

"تعجب ہے۔ جب تم اتنے باکمال ہو تو تمہیں پہلے اس جزیرے میں جا کر لاکھوں ڈالرز کے ہیرے جواہرات حاصل کرنا چاہئیں۔ تم وہاں سے واپس آ کر بھی فرہاد اور سونیا کو ہلاک کر سکتے ہو۔"

"ابھی سونیا میرے مقابلے پر آ رہی ہے۔ میں تمہاری طرح بزدل نہیں ہوں کہ مقابلہ چھوڑ کر ہیرے جواہرات حاصل کرنے چلا جاؤں۔"

"میں مانتا ہوں تم باکمال ہو اور میری طرح بزدل نہیں ہو مگر تمہیں دولت مند بننے کی ہوس ہے۔ ہزاروں لاکھوں ڈالرز لے کر کسی بھی بے گناہ کو قتل کر دینے ہو۔"

"ہاں مجھے مشکلات اور خطرات سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔ اس کے بعد جو دولت ملتی ہے' اس دولت مندی کا نشہ ہی کچھ اور ہے۔"

"کسی کو قتل کرنے سے پہلے خطرات اور مشکلات اس جزیرے میں ہیں۔ اس کانچ سے ہیرے جواہرات لا کر فرہاد کے بیٹے علی تیمور اور فرہاد کی تمام فیملی پر یہ ثابت کر سکو کہ تم اس کو ممکن بنا سکتے ہو۔ میری عقل کہتی ہے کہ ایسا کارنامہ دکھا کر ہیرے جواہرات حاصل کر سکتے ہو اور فرہاد پر دہشت بھی طاری کر سکتے ہو۔ تم ٹھہر ٹھہر کر فرہاد تک موت بن کر پہنچو گے تو اس کی راتوں کی نیندیں اڑ جائیں گی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو' اپنے شکار کو دن رات دہشت میں مبتلا کر کے مارنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اَن نون کو جس جزیرے پر رکھا جائے گا' اس جزیرے کا نام اور اس کی تفصیلات کل اخبارات میں شائع ہوں گی۔ انہیں پڑھنے کے بعد اور ہر جاؤں گا ابھی سونیا آ رہی ہے۔ آج اس کا کام تمام کرنے کے بعد یہاں جاؤں گا تو فرہاد مجھے تلاش کرتا رہے گا اور اس دہشت میں اندیشے میں رہے گا کہ میں کسی وقت بھی اس کی موت بن کر آ ہوں۔"

ہم ائرپورٹ پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ رہنے اور باتیں کرنے کے دوران میں' میں سونیا کے دماغ میں جا کر یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہاں پہنچ کر سنگیلا کا ارادہ کیا ہے۔ میں اس کے ساتھ رہ کر خیال خوانی کرتا' سونیا یا ٹائی سے رابطہ کرتا تو وہ شبہ کر سکتا تھا۔ ویسے یہ اطمینان تھا کہ میں سنگیلا کے ساتھ ہوں۔ بات بگڑے گی تو سونیا کی مدد کر سکوں گا۔

ائرپورٹ پر کافی بھیڑ تھی۔ ریسلنگ کے دلدادہ رکھنے والے اپنے پسندیدہ مرد اور لیڈیز ریسلرز کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ریسلنگ کی انتظامیہ کے ممبران اور عہدہ دار بھی آئے ہوئے تھے۔ سنگیلا اپنے چند خاص ماتحتوں سے ملاقات کر کے انہیں تاکید کر رہا تھا کہ وہ جہاز سے اترنے والی تمام خواتین کو توجہ سے دیکھیں۔ سونیا کسی عمر رسیدہ عورت کے بھیس میں آ سکتی ہے۔

اس کے دو ماتحت عمارت کی دوسری منزل پر تھے۔ دوربین آنکھوں سے لگائے' اس جہاز کو دیکھ رہے تھے جس کی سیڑھیوں سے مسافر اتر رہے تھے۔ ان میں جوان اور صحت مند عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک دوربین والے کی حالت بدل کر آ رہی ہے لیکن میں ایک جوان عورت کو دیکھ رہا ہوں اور شاید سونیا کو پہچان رہا ہوں۔"

دوسرے نے کہا "تمہیں جس پر شبہ ہوگا' تم اس کے تعاقب میں رہو گے۔ مجھے جس پر شبہ ہوگا' میں اس کا....."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ دوسرا تو کراہ بھی نہ سکا۔ دونوں کی کنپٹیوں میں کسی بے آواز ہتھیار سے چلائی گئی گولیاں پیوست ہو چکی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں سے دوربینیں چھوٹ کر گرنوں سے لٹک گئیں۔ وہ دونوں آگے کی طرف رینگ کر آدھے سے زیادہ جسم باہر لٹک گئے۔ پھر ایک بلندی سے گرتے ہوئے نیچے زمین پر آ کر چاروں شانے چت ہو گئے۔

ان کے اس طرح گرنے سے وہاں کھڑی ہوئی کئی خواتین اور

ہوئے عمارت کے باہر بھاگنے لگے۔ ائرپورٹ سیکیورٹی کا عملہ تعداد میں اتنا نہیں تھا کہ ہزاروں بھاگتے دوڑتے والوں کو کنٹرول کر سکتا۔

میں سنگیلا کے ساتھ دوڑتا ہوا دور ایک دیوار کے پاس آیا۔ انجان بن کر اس سے پوچھا "کیا اس ملک میں بھی دہشت گردی ہوتی ہے؟"

وہ بولا "تم نہیں سمجھ رہے ہو۔ سونیا اور فرہاد سے تعلق رکھنے والے افراد میرے خاص آدمیوں پر حملے کر رہے ہیں۔"

"وہ تمہارے خاص آدمیوں کو کیسے پہچانتے ہیں؟"

"ذرا عقل سے سوچو۔ تھوڑی دیر پہلے میں انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ دشمن میری جسامت اور حلیے سے مجھے پہچانتے ہوں گے۔ قاہرہ میں بھی یہ مشہور ہو چکا ہے کہ تبت کا ایک لانبے قد کا شخص جھاڑو کے تنکے کی طرح دبلا پتلا سا ہے۔"

میں نے کہا "جب دشمن تمہارے ذریعے تمہارے آدمیوں کو پہچان کر حملے کر رہے ہیں تو تم پر بھی کہیں سے گولی چلا سکتے ہیں۔"

"وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتے تو پہلے مجھ پر ہی گولیاں چلاتے۔"

"یہ ان کا طریقۂ کار ہوگا کہ پہلے پوری طرح افراتفری پیدا کی جائے پھر اس جھگڑ ڈمیں تم پر گولی چلا دی جائے۔ ان بھاگنے والوں میں کوئی گولی چلانے والا نظر نہیں آئے گا۔"

میری بات ختم ہوتے ہی سنگیلا کے قریب پیچھے دیوار پر ہلکی سی

چہرے کے فاضل بال
رنگیوں و بدنما داغ دھبے خواتین کیلئے
بہت ہی کم ہیں، اب پریشانی اور فکر کی
کوئی بات نہیں
گلیسی یونانی کریم
کا استعمال کیجئے ہزاروں خواتین کی آزمودہ کریم
قیمت ـــــ 105/-

موٹاپے سے نجات
بڑھے ہوئے جسم کو صرف ایک ماہ میں
۲۰ پونڈ وزن یقینی کم کرنے کے جسم کو سڈول و
اسمارٹ بنا کر پروقار شخصیت کا مالک
بنیئے اسمارٹلین غذا کا استعمال کیجئے
اسمارٹلین غذا
قیمت ـــــ 275/-

مردوں میں مقبول ترین دوا
فربہا اور طاقتور بننے کیلئے
کمزور جسم اور سوکھے پچکے گال کو طاقت پہنچا
کر جسم کو فربہا بناتا ہے چہرے پر سرخی لاتا ہے۔
جسمانی و اعصابی کمزوری دور کر کے طاقت بحال
کرتا ہے
نیچرل پاور ون (یونانی)
قیمت ـــــ 150/-

اسٹاکسٹ:
طاہر شپنگ سینٹر لیل بازار اردو کالج روڈ
علی ہومیو سٹور راولپنڈی صدر کراچی
ایس اے ہومیو اسٹور ریلوے روڈ لاہور
راہبر بکز اسٹور ریلوے روڈ لاہور
پاکستان جنرل اسٹور کچہری بازار سیالکوٹ
حکیم ہیری میڈیسن مارکیٹ شاہدرہ فیصل آباد
شاہی جنرل اسٹور کچہری بازار فیصل آباد
پنجاب جنرل اسٹور کچہری روڈ سرگودھا
فضل زیب اسٹور ہیری میڈیسن مارکیٹ شاہدرہ فیصل آباد
بزمی ہومیو سٹور آر ڈی بازار گوجرانوالہ
ڈسٹری بیوٹرز:۔ ریاض محمود ۶۹ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور ۔ بادشاہ دی مٹھی ڈھوک کھبہ راولپنڈی۔ فون:۔ ۵۰۲۹۰۳
صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان۔
گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی۔پی پارسل منگوانے کے لیے
حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دیوار میں اس جگہ سوراخ ہوگیا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا "یہاں سے نکل چلو..... دشمن اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر تم پر حملے کرتے رہیں گے۔ اگر ایک بھی گولی لگے گی تو فرہاد کو ہلاک کرنے کی حسرت تمہارے دل میں ہی رہ جائے گی۔"

وہ میرے ساتھ دوڑتے ہوئے سونیا کے بارے میں بولا "وہ کتیا بہت مکار ہے۔ اس نے مجھے اور میرے آدمیوں کو یہ موقع نہیں دیا کہ ہم اسے ائرپورٹ پر پہچان سکیں۔ اس سے پہلے ہی ہمیں یہاں سے بھاگنے پر مجبور کررہی ہے۔"

ہم دونوں بھیڑ میں دھکے کھاتے ہوئے ائرپورٹ کی عمارت کے باہر آئے تاکہ پارکنگ ایریا سے اس کی رینٹڈ کار میں بیٹھ جائیں۔ عمارت کے باہر اور زیادہ بھیڑ تھی۔ ایک تو لوگ بھاگنے کے دوران میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے پھر پارکنگ ایریا سے نکلنے والی گاڑیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے، دائیں بائیں اس طرح پھنسی ہوئی تھیں کہ پیدل بھاگنے والوں کے علاوہ ان گاڑیوں کو بھی آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

میں نے کہا "فی الحال ہم اپنی کار نہیں نکال سکیں گے۔ اسے یہیں چھوڑ کر آگے سڑک پر چلو۔ اپنی حفاظت کے لیے کسی ٹیکسی میں جانا مناسب ہوگا۔"

اس نے پارکنگ ایریا سے دور جاتے ہوئے ایک اونچی جگہ سے اپنی رینٹڈ کار کو دیکھا۔ اسی وقت اس کار میں جیسے بم کا دھماکا ہوا۔ اس کے چیتھڑے اڑنے لگے۔ آس پاس کی گاڑیوں میں آگ لگتی گئی۔ آگ کا گولہ ایسی تباہ کاری سے پھیل رہا تھا کہ دوسری گاڑیاں بھی یکے بعد دیگرے دھماکے پیدا کرتی ہوئی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا کی بلندیوں کی طرف جارہی تھیں۔ میں نے سنگریلا سے کہا۔ "ایک ملک کا سربراہ یا بادشاہ دوسرے ملک میں جاتا ہے تو ان کے استقبال کے لیے اکیس توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ یہ سونیا پتا نہیں، کتنے دھماکوں کی سلامی لیتی ہوئی مصر کی زمین پر قدم رکھ رہی ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولا "میرے سامنے اس کا نام نہ لو۔ اس نے یہاں آتے ہی پتا نہیں میرے کتنے ہی لاجواب فائٹروں کو ہلاک کیا ہے؟ میری کار تباہ کرنے کے لیے بے شمار گاڑیوں کو تباہ کررہی ہے۔ بے شک وہ بڑی کامیابی سے دہشت زدہ کررہی ہے۔ مجھ پر اپنی دھاک بٹھا رہی ہے لیکن وہ مجھے نہیں جانتی ہے۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

ہم وہاں سے دوڑتے ہوئے فٹ پاتھ پر لوگوں سے ٹکراتے ہوئے دور تک گئے پھر ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سنگریلا نے ڈرائیور سے کہا "ریسلنگ اسٹیڈیم کے دفتر لے چلو۔"

وہ راستے بھر غصے میں سونیا کی مکاری اور دہشت گردی کو کوستا رہا۔ مجھے اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے دماغی طور پر حاضر تھا اسی لیے سونیا کے دماغ میں جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی میرے دماغ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ یقیناً سونیا کی ہدایات عمل کرنے میں مسلسل مصروف ہوگی۔

ائرپورٹ کے قریبی راستوں پر پولیس اور فوج کی کئی گاڑیاں آگئی تھیں۔ وہ ان راستوں کی ناکابندی کرکے ائرپورٹ سے آنے والے پیدل افراد کو، پرائیویٹ گاڑیوں اور ٹیکسیوں کو چیک کررہے تھے۔ ہماری ٹیکسی کو بھی روکا گیا۔ ہم نے اپنے پاسپورٹ اور ضروری متعلقہ کاغذات دکھائے۔ ہم سے پوچھا گیا "قاہرہ کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا "سیاحت اور تفریح کی غرض سے آیا ہوں اور میرا قیام ہوٹل الریاض میں ہے۔"

سنگریلا نے جواب دیا "میں امریکی سفیر کا مہمان ہوں۔ قونصلر اسکوائر میں میرے لیے ایک بنگلا مخصوص کیا گیا ہے۔ سفارت خانے میں فون کرکے میری باتوں کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔"

ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے انجان بن کر حیرانی سے پوچھا "تم امریکی سفیر کے مہمان ہو اور نیکر بنیان پہن کر گھومتے ہو۔ وہ چیک کرنے والے فوجی تمہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کیا تم ہمیشہ نیکر بنیان پہنتے ہو؟"

"ہاں کم سے کم کپڑوں میں گزارہ ہوجاتا ہے۔ پھر زیادہ کپڑے پہننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"یہاں رات کو دریائے نیل سے سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ کیا تمہیں سردی نہیں لگتی؟"

"تبت میں ہر طرف برف ہی برف ہوتی ہے۔ وہاں تو بڑے بڑے مکانات بھی برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ میں وہیں پیدا ہوا اور وہیں آدھی جوانی گزاری ہے۔ مجھ جیسے برفانی علاقے میں رہنے والے کو یہاں کیا خاک سردی لگے گی۔"

ہم دو گھنٹے بعد اسٹیڈیم ریسلنگ والے دفتر کے سامنے پہنچے۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "تمہارے پاس موبائل فون ہے؟"

میں نے اسے فون دیا۔ اس نے امریکن سفیر سے رابطہ کرنے کے بعد کہا "میں سنگریلا بول رہا ہوں۔ کیا تمہیں ائرپورٹ پر تخریب کاری اور دہشت گردی کی خبر ملی ہے؟"

"ہاں ابھی پندرہ منٹ پہلے ہمارے ایک آدمی نے اطلاع دی ہے۔ انتظامیہ اب تک یہ معلوم نہ کرسکی کہ ایسی تخریب کاری کن لوگوں نے کی ہے؟"

"یہ سب کچھ فرہاد کی وائف سونیا کررہی ہے تاکہ میں اور میرے آدمی اسے ائرپورٹ پر نہ پہچان سکیں۔ اس سے پہلے کہ میں فرہاد تک پہنچوں، وہ مجھے ہلاک کرنے یہاں آئی ہے۔ ائرپورٹ پر مجھ پر حملہ کیا گیا ہے۔ میرے کئی آدمی مارے گئے ہیں۔ بم کے ذریعے میری رینٹڈ کار کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔"

"او گاڈ! مجھے وہاں کی تباہی کے بارے میں اطلاع دینے والے نے کہا ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی دشمن ملک کے بمبار طیاروں نے ائرپورٹ پر بمباری کی ہے۔ پلیز سنگریلا! بہت ہوشیار رہو۔ وہ بہت مکار ہے۔ تم ایک ناقابل شکست فائٹر اور سفاک قاتل ہو۔ وہ تمہیں اس سے مقابلہ کرنے کے لیے اسے ڈھونڈتے رہو اور وہ تمہیں اسی طرح دوڑا دے دوڑا کے ہلاک کرے گی جیسا کہ اس نے ائرپورٹ سے تمہیں بھاگنے پر مجبور کیا ہے۔"

وہ غصے سے بولا "وہ عورت ایک بار کامیاب ہوئی ہے تو تم مجھے اس سے کم تر سمجھ رہے ہو۔ میں چوبیس گھنٹے کے اندر اسے ڈھونڈ کر اس کی لاش کے ٹکڑوں کی تصویریں اتار کر تمہارے پاس بھیجوں گا۔"

"ہم نے تمہیں لاکھوں ڈالرز دیے ہیں۔ اب دعائیں بھی دے رہے ہیں کہ جیسا کہہ رہے ہو، ویسا کرسکو۔"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ریسلنگ کے دفتر کے سامنے کئی بڑی بڑی کاریں آکر رک رہی تھیں۔ ان میں کئی مرد پہلوان اور لیڈیز ریسلرز کو دیکھ کر سنگریلا نے فون بند کرکے مجھے دیا۔ وہ گاڑیوں سے پہلوان اور صحت مند پہلوان عورتوں کو توجہ سے دیکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا "تم بھی پہچاننے کی کوشش کرو، وہ دراز قد کی ایٹمی اسمارٹ عورت ہوگی۔ اس کے چلنے کا انداز شاہانہ ہوگا۔ بظاہر وہ ایسی دکھائی دے گی مگر اسے اطراف کے لوگوں سے باخبر رکھتی ہوگی۔ وہ دیکھو، وہ ایک خوبصورت سیاہ لباس میں ہے۔ مجھے اس پر شک ہورہا ہے۔ وہ دوسری جینز اور بنیان پہنے ہوئے ہے۔ کیسے غرور سے گردن تان کر چل رہی ہے۔"

اس کی باتوں کے دوران میں ثانی نے آکر کہا "پاپا! میں مما کے ساتھ بہت مصروف ہوں۔ صرف اتنا کہنے آئی ہوں کہ وہ ائرپورٹ کے ہنگاموں سے فائدہ اٹھا کر ہوٹل مقام الولید کے کمرا نمبر چار سو چار میں بالکل محفوظ ہیں۔ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ زیادہ نہیں کہہ سکوں گا۔ یہ خبیث میرے ساتھ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ مجھ پر شک کرے۔ بہرحال تم نے اور سونیا نے سنگریلا کو تو کیا پورے شہر کو دہلا دیا ہے۔ سنگریلا نے قسم کھائی ہے کہ وہ ان گھنٹوں کے اندر تمہاری مما کو ڈھونڈ کر ہلاک کردے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ آج رات نہیں سوئے گا۔ مما کی تلاش میں بھٹکے گا۔"

"میں چاہوں گا کہ تم دونوں اسے بھٹکاتے بھٹکاتے نیم مردہ کردو۔"

میں آگے نہ بول سکا۔ سنگریلا مجھے کہنی مار کر کہہ رہا تھا "وہ دیکھو، وہ جو اونچ لمبے کلر کے بلاؤز اور بلیک اسکرٹ میں ہے، سب سے زیادہ دراز قد ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں، وہی سونیا ہوگی۔"

میں نے کہا "تم اب تک تین عورتوں پر شک کرچکے ہو۔ اب تصدیق کیسے کروگے؟"

"آؤ ہم اس دفتر میں جائیں گے۔"

وہ آگے بڑھتا ہوا اس دفتر میں آیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ وہاں انتظامیہ کے عہدے دار مختلف صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بڑی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ان کا باس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا نام تھامس جیرالڈ تھا۔ وہ مختلف ممالک میں ریسلنگ کے مقابلے کرایا کرتا تھا۔ ان پہلوانوں پر ہار جیت کی بازی لگاتا تھا۔ گویا کہ پہلوانوں کے ذریعے سٹہ کھیلتا تھا۔ اس کے چند خاص ایجنٹ ہزاروں لاکھوں ڈالرز مختلف پہلوانوں پر لگا کر کہتے تھے کہ فلاں پہلوان جیتنے والا ہے۔ امیر و کبیر لوگ بھی اپنے یقین اور خواہش کے مطابق مختلف پہلوانوں پر بڑی بڑی رقمیں لگاتے تھے۔ کشتی شروع ہونے سے پہلے جس پہلوان پر زیادہ رقم لگائی جاتی تھی اس زبردست پہلوان کو ان کا باس تھامس جیرالڈ خفیہ طور سے کہلوا دیتا کہ وہ زبردست انداز میں اپنے مقابل پہلوان سے لڑتے لڑتے ہار جائے۔ اس ہارنے والے پر زیادہ رقم لگائی جاچکی ہوتی تھی۔ اس طرح لاکھوں ڈالرز لگانے والے بھی اپنی اپنی رقم ہار جاتے تھے۔

ایسی سٹے بازی کے باعث وہ اتنی دولت کما رہا تھا کہ اب دنیا کے امیر ترین لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ امریکا کے بے شمار پہلوان اس کے وفادار تھے۔ یہ پہلوان اس کے حکم کے مطابق جان بوجھ کر ہار جانے کے باوجود اس سے لاکھوں ڈالرز انعام کے طور پر حاصل کرتے تھے۔ بڑے بڑے مجرم بھی جیرالڈ کے تابع تھے کیونکہ وہ اپنی دولت کے بل پر عدالتوں کے فیصلے بدل کر انہیں سزائے موت سے بچا تا تھا۔

میں سنگریلا کے ساتھ اس آفس میں داخل ہوا تو وہ سب ائرپورٹ پر ہونے والی تخریب کاری پر باتیں کررہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر چپ ہوگئے۔ تھامس جیرالڈ نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟ کیا مسلح گارڈز نے تمہیں نہیں روکا؟"

سنگریلا نے کہا "روکا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ وہ ایک لوہے کی ریلنگ پر ایسے گرا کہ ہمیں روکنے کے لیے دوبارہ نہ اٹھ سکا۔"

سب نے مسکرا کر ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھا۔ جیرالڈ نے طنزیہ انداز میں پوچھا "اچھا۔ تم نے دو من وزنی گارڈ کو اٹھا کر پھینک دیا؟"

"ہاں۔ وہ باہر پڑا ہے۔ میں یہاں ایک پہلوان کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانے آیا ہوں۔"

یہ بات سنتے ہی سب کے سب قہقہے لگانے لگے۔ ایک عہدے دار نے کہا "ہائے مسٹر پھر پہلوان! کس سے لڑو گے؟"

"اپنے جس پہلوان سے چاہو، لڑا کر آزمالو۔"

ایک عہدے دار نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "پاگل کے بچے! ہم سب عہدے دار سابقہ پہلوان رہ چکے ہیں۔ اب ہم نے

ریسلنگ چھوڑ دی ہے اس کے باوجود ایک مچھر سے لڑنا میری توہین ہے۔ یہ بتاؤ، تم جاتے ہوئے میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا "اور تم؟ تم تو نارمل دکھائی دیتے ہو۔ اس پاگل کے ساتھ کیوں آئے ہو؟"

میں نے پیچھے ہٹ کر کہا "میں لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں ہوں مگر ابھی آفس کے باہر اس کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے واقعی تمہارے گارڈ کو اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہاں پہلوانوں سے کشتی لڑنے آیا ہے۔ میں دیکھنے آیا ہوں کہ واقعی یہ تمہارے کسی پہلوان سے لڑ سکے گا یا نہیں؟"

اس عمدے دار نے ہنستے ہوئے سنگریلا کی گردن ایک مٹھی میں جکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سنگریلا نے اس کی کلائی پکڑلی اور کہا "مجھ سے لڑنے میں اپنی توہین.... سمجھتے ہو تو نہ لڑو۔ صرف اپنی کلائی چھڑالو۔"

اس نے محسوس کیا جیسے لوہے کی جھنگری نے اس کی کلائی جکڑلی ہے۔ اس نے کلائی کو اس کی گرفت سے نکالنے کے لیے پہلے معمولی سا زور لگایا پھر پوری قوت آزمانے لگا۔ اس کی مضبوط گرفت کے باعث کلائی میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے سنگریلا کی انگلیوں کو پکڑنے اور گرفت کو ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سب ہی حیرانی سے دیکھ رہے تھے وہ سابقہ پہلوان دوسرے ہاتھ کی قوت سے بھی اپنی کلائی چھڑانے میں ناکام ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے جتنے پہلوان ائرپورٹ سے آئے تھے، وہ سب آفس کے عقبی حصے کے بڑے ہال میں بیٹھے بیئر وغیرہ پی رہے تھے۔ ان میں سے دراز قد والی لیڈی ریسلر، جیرالڈ سے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے دفتر میں آئی۔ جیرالڈ نے اسے دیکھ کر کہا "مس ولڈ کیٹ یہ تماشا دیکھو، ہمارا سابقہ ریسلر اس مچھر پہلوان سے اپنی کلائی نہیں چھڑا پا رہا ہے۔ تم اس بے چارے کو اس مچھر سے نجات دلاؤ۔"

وہ سنگریلا کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "تعجب ہے۔ یہ تو ہڈیوں کا ڈھانچا ہے اور مسٹر جان وڈ دونوں ہاتھوں کی طاقت سے بھی اپنی کلائی چھڑا نہیں پا رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے سنگریلا کی کلائی پر کراٹے کا ایک ہاتھ مارا۔ ولڈ کیٹ کی کھڑی ہتھیلی کی مار سے لکڑی کے تختے اور اینٹیں ٹوٹ جایا کرتی تھیں۔ اس سے مقابلہ کرنے والے ایسی مار کھا کر چکرا جاتے تھے لیکن کراٹے کا ہاتھ مارتے ہی ولڈ کیٹ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایسا ہی لگا جیسے اس نے سنگریلا کی کلائی پر نہیں لوہے کی سلاخ پر کھڑی ہتھیلی ماری ہو۔ اس جگہ کی ہڈیاں اتنی شدت سے دکھنے لگی تھیں جیسے وہ ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

وہ چند سیکنڈ تک تکلیف برداشت کرتی رہی پھر اس نے گھوم کر سنگریلا کے سر پر لگ ماری۔ وہ فوراً بیٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی لگ سابقہ پہلوان جان وڈ کے منہ پر لگی۔ وہ کراہتا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ایک صوفے پر گر پڑا۔ ولڈ کیٹ نے غصے اور پریشانی سے سوچا "ہم اسے مچھر سمجھ رہے ہیں اور یہ بیک وقت دو ریسلرز سے مقابلہ کر رہا ہے اور ہمارے حملوں سے بچ رہا ہے۔ کم بخت کی ہڈیاں اسٹیل راڈ کی طرح ہیں۔"

اس نے گھورتے ہوئے اچانک اچھل کر اس کے سینے پر لات مارنے کی کوشش کی۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کی لات سامنے دیوار پر لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرتی، سنگریلا نے اس کی پشت پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ چیخ مار کر نیچے گر کر تڑپنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس مچھر نے ٹھوکر نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی پر ہتھوڑا مارا ہو۔

اس کی چیخیں سن کر ہال میں بیٹھے ہوئے کئی پہلوان تیزی سے چلتے ہوئے دفتر میں آئے۔ دو پہلوان دوڑتے ہوئے ولڈ کیٹ کے پاس آکر اسے فرش سے اٹھانے لگے۔ وہ بری طرح چیخیں مارنے لگی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی شاید ٹوٹ گئی تھی یا چیخ گئی تھی۔

پہلوانوں کو مقابلے کے دوران میں اکثر زبردست چوٹیں لگتی ہیں اس لیے وہاں اسٹریچر اور فرسٹ ایڈ کا سامان رہتا ہے۔ انتظامیہ میں ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے ولڈ کیٹ کا معائنہ کیا۔ ریڑھ کی ہڈی کو ہاتھ لگاتے ہی وہ چیخنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا "اس کی بیک بون کا ایکسرے کرانا ہوگا۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا چاہیے۔"

دو پہلوان اور وہاں کے چار ملازم اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایک گاڑی میں لے گئے۔ ایک ریسلر نے پوچھا "ولڈ کیٹ کو چوٹ کیسی لگی؟"

جیرالڈ نے ریوالونگ چیئر پر گھومتے ہوئے سنگریلا کی طرف اشارہ کیا پھر کہا "ہڈیوں کے اس ڈھانچے نے مسٹر جان وڈ اور ولڈ کیٹ دونوں سے بیک وقت مقابلہ کیا۔ ایک کو بے بس اور مجبور ہونا کر یہاں بٹھا دیا اور دوسری کو اسپتال کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کیا اسے دیکھ کر یقین کر سکتے ہو کہ یہ انسانی طاقت ور اور باکمال فائٹر ہے۔"

سب اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھنے لگے۔ ایک ریسلر نے کہا "مسٹر جیرالڈ! تم ہمارے باس ہو اور ہم تمام ریسلرز تمہارے وفادار ہیں پھر تم نے ایک باہر کے آدمی سے اپنی ایک لیڈی ریسلر کو کیوں لڑایا۔ کل سے یہاں اہم مقابلے شروع ہو رہے ہیں اور تم نے مقابلے سے پہلے اپنی ایک لیڈی ریسلر کو ناکارہ بنا دیا ہے۔"

جیرالڈ نے کہا "تم سب جانتے ہو، یہ میرا بزنس ہے اور میں نہایت طاقت ور ناقابل شکست فائٹروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ آج میرے سامنے ایک ایسا زبردست فائٹر ہے جو ہاڈی بلڈر کے بجائے ہڈیوں کا ڈھانچا دکھائی دیتا ہے۔ اگر میں اس پر ایک لاکھ ڈالر کی شرط لگاؤں تو دوسرے سٹہ کھیلنے والے اسے مچھر سمجھ کر

ہیں گے اور وہ سب اس کے مقابلے پر آنے والے پہلوان پر لاکھوں ڈالرز کی بولی دیں گے۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ کل میں ریسلنگ رنگ میں پیش کر کے صرف چند گھنٹوں میں کروڑوں ڈالر کمالوں گا۔"

پھر اس نے سنگریلا سے پوچھا "کیوں مسٹر! تمہارا نام کیا ہے؟ میں تمہیں آفر دیتا ہوں۔ میری طرف سے ریسلنگ رنگ میں آؤ۔ مجھ سے معاہدہ کرو۔ تم جب بھی رنگ میں مقابلے کے لیے اترو گے، تمہیں پانچ لاکھ ڈالر ادا کیا کروں گا۔"

سنگریلا نے کہا "میں دولت حاصل کرنے کے لیے کسی کو بھی قتل کرتا ہوں۔ میرا پیشہ یہی ہے۔ میں پانچ لاکھ کی خاطر ریسلنگ کے لیے تم سے معاہدہ کر سکتا ہوں لیکن ابھی میں ایک دشمن عورت کی تلاش میں آیا ہوں۔ وہ چھپ کر مجھ پر حملے کر رہی ہے۔ ابھی ائرپورٹ پر جو کچھ بھی ہوا، وہ اسی عورت نے مجھے مار ڈالنے کے لیے کیا تھا۔"

جیرالڈ نے پوچھا "ایسی زبردست اور دہشت گرد عورت کون ہے؟"

"اس کا نام سونیا ہے۔ افتخار علی تیمور کی وائف سونیا لیڈی ریسلر کے بھیس میں یہاں آئی تھی۔"

"یہاں آئی ہے؟" جیرالڈ نے حیرانی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے پہلوانوں میں سے ایک لیڈی ریسلر کو دیکھا۔ وہ بھی ایک دوسرے کو شبے کی نظروں سے دیکھنے لگیں پھر ایک نے کہا "یہاں جتنی ہیں، انہیں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

سب یہی کہنے لگیں کہ وہ ایک دوسرے کو کئی مہینوں سے اور برسوں سے جانتی ہیں۔ سنگریلا نے کہا "تم سب ایک دوسرے کو جانتی ہو، ان کی آوازوں اور لب و لہجے سے پہچانتی ہو لیکن یہ نہیں جانتیں کہ سونیا کو میک اپ کرنے اور لب و لہجہ بدلنے میں مہارت حاصل ہے۔ اس نے تم میں سے کسی ایک کو ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کیا ہے۔ اسے مار ڈالا ہے یا کہیں قید کیا ہے پھر میک اپ کے ذریعے بالکل وہی بن گئی ہے۔ تم میں سے کوئی اسے لب و لہجے سے بھی نہیں پہچان سکے گا۔ اگر اس کا کوئی بوائے فرینڈ یا شوہر ہے تو وہ بھی اسے شناخت نہیں کر سکے گا۔"

جیرالڈ نے کہا "جب تم نے سونیا اور فرہاد کا نام لیا تھا، تب ہی میرا شک گیا تھا۔ تم تنہا ان دونوں سے ٹکرانا چاہتے ہو جبکہ میں جانتا ہوں۔ جرائم کی دنیا کے بڑے بڑے مجرم میری مٹھی میں رہتے ہیں، بڑے بڑے نامور پہلوان میرے وفادار ہیں۔ اس ادارے میں اپنی حفاظت کے لیے کبھی کوئی نشہ نہیں کرتا۔ یوگا کی مشقیں کرتا رہتا ہوں تاکہ فرہاد اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھی مجھے نقصان نہ پہنچا سکیں۔"

"یعنی تم بھی اس کے دشمن ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔ اس نے مجھے براہ راست نقصان پہنچایا نہیں ہے۔ وہ ایسے بڑے مجرموں کو افغانستان اور کرغان میں ہلاک کیا ہے، جو میرے لیے بڑی بڑی واردات کرتے تھے۔ ان کے ذریعے میں بڑی دولت کمایا کرتا تھا۔"

"جب تم بھی اس کے دشمن ہو تو میں تمہاری ریسلنگ ٹیم میں رہنا چاہوں گا لیکن یہاں سونیا آئی ہوئی ہے۔ اس نے ائرپورٹ پر مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں وہاں بھیڑ میں بچ گیا۔ اب اس سے پہلے کہ وہ پھر چھپ کر حملہ کرے، مجھے اسے ڈھونڈ کر ہلاک کر دینا چاہیے۔"

جیرالڈ نے کہا "میں پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کر کے سانس روک لیتا ہوں۔ میں ان تمام لیڈی ریسلرز کو پیچھے ہال میں لے جاتا ہوں۔ وہاں ان سے سوالات کرتا ہوں۔ میں ان تمام لیڈیز کی پوری ہسٹری جانتا ہوں۔ مجھے ان کی کچھ پرائیویٹ باتیں بھی معلوم ہیں۔ اگر یہ سب اصلی ہیں تو اپنے وہ اہم راز مجھے بتائیں گی، جنہیں میں جانتا ہوں۔ جو نہیں بتا سکے گی، وہی سازشی سونیا ہوگی۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیرالڈ نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے سونیا نے کہا "میں سونیا بول رہی ہوں۔ اپنے ٹیلی فون کا اسپیکر آن کرو تاکہ وہاں موجود تمام افراد میری باتیں سن سکیں۔"

جیرالڈ نے اسپیکر کا بٹن دباتے ہوئے سنگریلا سے کہا "فون پر سونیا بول رہی ہے۔ اس کی باتیں سنو۔"

سونیا نے کہا "تم لوگ میری تلاش میں وقت ضائع نہ کرو۔ میں نے ائرپورٹ پر اتنا بڑا ہنگامہ اس لیے کیا تھا تاکہ میں آسانی سے نکل جاؤں اور سنگریلا مجھے پہچان نہ سکے۔ اس احمق سے کہو میں نے کسی لیڈی ریسلر کا بھیس نہیں بدلا ہے بلکہ اس احمق کے اس بنگلے میں ہوں جہاں وہ امریکی سفیر کا مہمان بن کر رہتا ہے۔ یقین نہ ہو تو میں ریسیور رکھ رہی ہوں۔ سنگریلا اپنے اس بنگلے کا فون نمبر ڈائل کر کے مجھ سے بات کرے یا خود آجائے۔ یہاں ہماری ملاقات زبردست رہے گی۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ جیرالڈ نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سنگریلا کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے کہا "وہ بے شک دلیر ہے۔ خطرات سے کھیلنے کے لیے کسی بھی مخالف کے گھر میں گھس جاتی ہے۔ ابھی وہ تمہاری رہائش گاہ میں ہے یا نہیں، فون پر تصدیق کر سکتے ہو۔"

سنگریلا نے آگے بڑھ کر ریسیور لیا پھر اپنے بنگلے کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے سونیا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو! کیا تم سنگریلا ہو؟"

"ہاں۔ تم میرے بنگلے میں کیا کر رہی ہو؟"

"بنگلا اچھا ہے۔ آرام دہ ہے۔ اپنے رہائشی اخراجات بچا رہی ہوں۔ اگر تم یہاں آؤ گے تو تمہارے انتظار میں جاگنا پڑے گا۔ نہ آنے کا وعدہ کرو گے تو آرام اور اطمینان سے سو جاؤں گی۔"

"زیادہ دلیری نہ دکھاؤ۔ مرد کی بچی ہو تو انتظار کرو۔ میں آرہا ہوں۔"

"دنیا میں کوئی مرد کا بچہ یا بچی نہیں ہوتی۔ اگر تم مرد کے بچے ہو تو بتاؤ، تمہارے باپ نے تمہیں کس طرح نو ماہ تک پیٹ میں رکھا تھا؟"

"یو شٹ اپ۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

وہ ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر جانا چاہتا تھا۔ جبرالڈ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ایک بازو کو پکڑ کر کہا "جسٹ اے منٹ! ٹیشن میں نہ آؤ۔ غصہ تھوک کر مولی عقل سے سوچو، اس مکار عورت نے پہلے زبردست جال بچھایا ہے۔ اس کے بعد تمہارے بنگلے میں رہ کر تمہیں بلا رہی ہے۔ وہ اتنی دلیر ہوتی تو ائیر پورٹ پر تمہارا سامنا کرتی۔"

سنگریلا نے کہا "اس نے وہاں سامنا نہیں کیا لیکن میرے بنگلے میں مجھے بلا کر دلیری کا ثبوت دے رہی ہے۔"

"یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہاری موت کا سامان کرنے کے بعد تمہیں بلا رہی ہے۔"

"میں اتنا ناداں نہیں ہوں کہ وہاں پہنچتے ہی سیدھا بنگلے میں گھستا چلا جاؤں گا۔ میں پہلے دور ہی دور سے اس کی چال بازی کو سمجھوں گا۔"

"کیسے سمجھو گے کہ رات کے وقت اس کے کتنے آدمی تمہیں گولی مارنے کے لیے کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ جب انسانوں سے بھرے ہوئے ائیر پورٹ پر، پولیس اور سیکیورٹی گارڈز کی موجودگی میں اس کے گن مین تمہارے دو آدمیوں کو گولیاں مار سکتے ہیں، تمہارے چھ آدمیوں کو زندہ جلا سکتے ہیں، تم پر بھی فائر کر سکتے ہیں، تمہاری گاڑی کے ساتھ کئی گاڑیوں کو بم کے دھماکے سے تباہ کر سکتے ہیں تو تمہارے بنگلے کے اندر اور باہر کیا کچھ نہیں کریں گے۔ پلیز عقل سے کام لو۔ وہ تمہیں اشتعال دلا کر وہاں بلا رہی ہے۔"

وہ غصے سے ہونٹوں کو بھینچ کر سوچنے لگا پھر بولا "ہاں۔ وہ چالباز ہے۔ دلیری دکھانے کے لیے میرے بنگلے میں تنہا نہیں ہوگی۔ اپنی حفاظت کا اور میری موت کا سامان کر چکی ہوگی لیکن مجھ سے یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی ہے کہ وہ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر مجھے چیلنج کر رہی ہے۔"

"وہ تمہیں اپنی موت کی طرف آنے کے لیے بھڑکا رہی ہے۔"

وہ بولا "مسٹر جبرالڈ! میں تمہاری مخالف پارٹی کے پہلوانوں سے کل مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہوں۔ تم مجھے اس ذلت کے احساس سے نجات دلاؤ کہ وہ میرے گھر میں گھس آئی ہے اور میں کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔ تم کسی طرح اسے میرے گھر سے ابھی نکالو۔"

جبرالڈ نے اپنے پہلوانوں سے کہا "بہت رات ہو چکی ہے۔ تم سب کو کم از کم چھ گھنٹے آرام سے سونا چاہیے لہٰذا سونے کے جاؤ۔ صرف چار ریسلرز ہیری، کوئی مارکوس اور تم دونوں برادرز میاں رہو اور میری ہدایات پر عمل کرو۔"

چار پہلوان وہاں رہ گئے۔ باقی سونے کے لیے چلے گئے۔ نے کہا "تم چاروں مسٹر سنگریلا کے ساتھ جاؤ اور سنگریلا! میں ایک بہترین دوست کی حیثیت سے سمجھاتا ہوں۔ تم دور سے چاروں کو اپنا بنگلا دکھاؤ اور دور ہی رہ کر ان چاروں کی وا انتظار کرو۔"

اس نے سنگریلا کو ایک موبائل فون دیا اور کہا "خطرہ محسوس کرتے ہی تم وہاں سے اور زیادہ دور جا کر فون پر مجھ سے رابطہ کرو میں اپنے چاروں ریسلرز سے بھی رابطہ رکھوں گا۔"

سنگریلا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "میرے دوست پاس فون ہے۔ میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

ہم ان چاروں پہلوانوں کے ساتھ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر سے روانہ ہوئے۔ میں اور سنگریلا ایک گاڑی میں تھے۔ دو گاڑی میں چاروں پہلوان اپنی اپنی گن لوڈ کر کے جا رہے تھے۔ دوران میں دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر آئی تھی اور سونیا کی آ پلاننگ مجھے بتا کر چلی گئی تھی۔

سنگریلا نے اپنے بنگلے سے دور گاڑی روک دی۔ ان پہلوانوں کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ ساتھ جو بنگلہ ہے تیرا بنگلا میرا ہے۔ ہوشیاری سے جاؤ بلکہ یہ کہ میں سے کوئی سنگریلا نہیں ہے۔ تم لوگ میڈم سونیا کرنے آئے ہو۔"

وہ چاروں اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سنگریلا کے طرف گئے۔ میں سنگریلا کے ساتھ دور گاڑی میں ٹیک لگائے رہا۔ ان چاروں نے بنگلے کے گیٹ کے باہر گاڑی روکی۔ وہاں چوکی دار تھا۔ ان چاروں نے گاڑی سے اتر کر چوکی دار سے پو "اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "ہمارے صاحب مہمان سنگر صاحب رہتے ہیں۔"

"کوئی عورت بھی یہاں رہتی ہے؟"

"نہیں۔ وہ بالکل تنہا رہتے ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ ایک گھنٹہ پہلے اس بنگلے سے ایک عور نے فون پر ہم سے بات کی تھی۔"

چوکی دار نے کہا "یہ سچ ہے۔ ایک عورت کار میں آئی تھی اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے موبائل فون کی بیٹری ناکارہ ہو ہے۔ وہ ایک ضروری فون کرنا چاہتی ہے۔ میں نے انکار کیا تو نے ریوالور نکال لیا۔ میں مجبور ہو کر اس کے ساتھ بنگلے کے ا گیا۔ وہ آدھے گھنٹے تک ڈرائنگ روم میں فون کے پاس رہی کسی سے فون پر باتیں کرنے کے بعد چلی گئی۔ اس کے جانے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس نے سفیر صاحب کے سیکریٹری کو فون پر اس عورت کے بارے میں بتا دیا۔"

(پہلوان نے پوچھا "ابھی بنگلے کے اندر کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے۔"

دوسرے پہلوان نے موبائل فون کے ذریعے اپنے باس جبرالڈ کو بتایا "باس! سونیا یہاں صرف آدھے گھنٹے کے لیے آئی تھی۔ چوکی دار کو گن پوائنٹ پر رکھ کر بنگلے کے اندر جا کر آپ سے اور سنگریلا سے بات کی تھی پھر یہاں سے چلی گئی تھی۔"

جبرالڈ نے کہا "وہ صرف وہاں کو فون کر کے سنگریلا کو چیلنج کرنے نہیں آئی ہوگی۔ تم چاروں بنگلے میں جا کر اندر ایک ایک کمرے کو دیکھو۔ ہو سکتا ہے اس نے ریموٹ کنٹرولر سے بلاسٹ کرنے والا بم کہیں چھپا کر رکھا ہو۔"

"ہاں! اس طرح تو ہمارے لیے خطرہ ہے۔"

"سونیا سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ بنگلے کے اندر سنگریلا کے آنے کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کہیں چھپی ہوگی لیکن تم لوگوں کو اندر نہیں پہنچ جائے گی۔ بنگلے میں جاؤ۔ ہزول نہ ہو۔"

وہ چاروں چوکی دار کو ساتھ لے کر بنگلے کے اندر جانے لگے۔ چوکی دار کے کمپین کے پیچھے چھپی تھی۔ ان کے جاتے ہی اس نے گاڑی کے پاس آ کر پیٹرول کی ٹنکی میں اطمینان سے اتنا بڑا سوراخ کیا کہ پیٹرول تیزی سے نکلنے لگا۔ سنگریلا کے بنگلے کی طرف جانے والا راستہ ذرا اونچائی پر تھا۔ پیٹرول سڑک پر بہتا ہوا ڈھلان پر ہماری گاڑی کی طرف آنے لگا۔ اسٹریٹ لائٹ ذرا دور تھی۔ رات کے وقت سڑک پر بہنے والا پیٹرول نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ پیٹرول ہماری گاڑی کے بالکل قریب آ گیا تو سنگریلا نے سونگھتے ہوئے کہا "پیٹرول کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے تائید کی "ہاں ابھی میں کہنے ہی والا تھا۔ مجھے بھی کچھ ایسی ہی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

سنگریلا کے بنگلے کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی گاڑی کے نیچے پانی جمع ہوا ہوا۔ اس گاڑی کے اوپر نیچے اڑنے لگے لیکن وہ آگ لگے ہوئے پیٹرول کے ساتھ بھڑکتی ہوئی ہماری گاڑی کی طرف آنے لگی۔ سنگریلا پہلی گاڑی کے دھماکے کے ساتھ ہی میرا ہاتھ پکڑ کر دور بھاگنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دوڑتے ہوئے پلٹ کر دیکھا پھر اس سے کہا۔ "آگ بجھتے ہوئے پیٹرول کے ساتھ ہماری گاڑی کی طرف آ رہی ہے۔"

ہم اور تیزی سے بھاگنے لگے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی ہماری گاڑی میں بھی زوردار دھماکا ہوا۔ آس پاس کے بنگلوں سے عورتوں مردوں اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کے بنگلوں کو آگ نہیں پھیلی تھی لیکن دل ہلا دینے والے دو دھماکے ایسے تھے کہ آس پاس رہنے والے اپنے اپنے بنگلوں سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ ایک جگہ تاریکی میں سنگریلا ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گرا۔ شدید غصے سے جھنجلا کر بولا "کتے کی بچی۔ میں ازبکستان میں زخمی ہوا تھا تو فرہاد نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا مگر یہ تو آدم خور بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

میں تاریکی میں مسکرانے لگا۔ اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولا "سونیا جیسی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ محبت کرتی ہیں تو ساری زندگی اپنے محبوب کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور عداوت کرتی ہیں تو ناقابلِ نجات بلا کی طرح تعاقب کرتی رہتی ہیں۔"

○☆○

تین پراسرار اور کبھی گرفت میں نہ آنے والے مجرم اَن نون، شیڈو اور ہائیڈ اینڈ سیک اب گرفت میں آ رہے تھے۔ فہمی اور علی نے بڑی حکمتِ عملی سے اَن نون کو زخمی کر کے گرفتار کیا تھا پھر ناصرہ نے پہلی بار مجھے ٹیلی پیتھی کے ذریعے "پاپا" کہہ کر مخاطب کیا اور یہ خوش خبری سنائی کہ دوسرا پراسرار مجرم شیڈو جو منی کو بھاگ کر کولمبیا آیا تھا۔ اسے پورس، ناصرہ اور ثنا نے گرفتار کر کے ایک بنگلے میں قید کر دیا تھا۔ ناصرہ نے مجھ سے کہا کہ میں پارس کو اطلاع دوں کہ وہ اس بنگلے میں جا کر اس خطرناک مجرم کو اپنی تحویل میں لے لے۔ میں نے پارس سے کہہ دیا کہ وہ شیڈو کو اپنا قیدی بنا لے پھر اسے علی کے پاس پہنچا دے۔

میں نے ناصرہ سے کہا تھا "..... پہلی بار میرے پاس بیٹیاں بن کر آئی ہو۔ میں تمہیں ایک خوش خبری سناؤں رخصت کر رہا ہوں۔ ٹائی نے نیلما کے بارے میں بتایا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اس چڑیل کی آمتا آئندہ پورس کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ آئندہ تم دیکھو..... گی کہ میں کیسی چال چلتا ہوں۔"

ناصرہ میری اس بات سے خوش ہو گئی تھی۔ وہ اور ثنا چاہتی تھیں کہ میں پارس اور پورس میں صلح کرا دوں۔ میں نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ آئندہ ان دونوں کے معاملات میں کچھ نہ کہا کرو۔ تماشے دیکھتی رہو۔ ان کی ایک دوسرے سے ہمدردی اور ایک دوسرے سے دشمنی دنیا سے نرالی ہے۔"

میں نے آمنہ کے پاس پہنچ کر ناصرہ کے متعلق بتایا کہ جسم اس کا ہے لیکن اس کے اندر نیلما کی آمتا ہے۔ وہ اب اپنی آمتا دشمنی کھو چکی ہے لیکن ناصرہ کے اندر رہ کر پرانی دشمنی کے باعث پورس کو جانی نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ ایک بار پورس کو ہلاک کرنے کی تقریباً کامیاب کوشش کر چکی تھی مگر ناصرہ نے اپنا زہر پورس کے جسم سے چوس کر اسے بچا لیا۔

آمنہ نے کہا "میں تو ناصرہ کی مجبوری سمجھ رہی ہوں۔ وہ پورس کو محفوظ رکھنے کے لیے خود کشی کرے گی تو نیلما کی آمتا اس کے جسم سے نکل جائے گی پھر اس میں اتنی شکتی نہیں رہے گی کہ وہ کسی دوسری عورت کا جسم حاصل کر سکے اور پورس، ناصرہ کو خود کشی

کرنے سے باز رکھ رہا ہے۔"

"یہی بات ہے۔ فی الحال نیلماں کی آتما اسی اندیشے سے پورس پر دوبارہ جان لیوا حملہ نہیں کر رہی ہے کہ پورس کے ساتھ ناصرہ بھی اپنی جان پر کھیل جائے گی تو اس کی آتما بھی بھٹکتی رہ جائے گی۔"

"تم چاہتے ہو کہ نیلماں کبھی پورس سے دشمنی نہ کرے اور ناصرہ خوش رہا کرے یہ روحانیت یا آتما شکتی کا معاملہ ہے۔ ہمیں تبریزی صاحب سے ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔"

"وہ ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی عبادت میں مداخلت نہ کرو۔ تم بھی روحانی ٹیلی پیتھی کا علم حاصل کر چکی ہو۔ اپنے ہی طور پر کچھ کرو۔"

آمنہ نے کہا "دنیاوی علم بہت وسیع ہے اور دینی یا روحانی علم تو کائنات کی طرح لامحدود ہے۔ دانائی یہ ہے کہ جب بہت کچھ حاصل ہونے لگے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ابھی کچھ کچھ حاصل کیا ہے۔ ویسے تبریزی صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔ تم دس منٹ کے بعد میرے دماغ میں آؤ۔"

میں اس کے پاس سے چلا آیا۔ میرا خیال تھا' آمنہ اور تبریزی صاحب جیسی روحانی شخصیات کے لیے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ نیلماں کی آتما شکتی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی انتقامی کارروائیوں کو ختم کر دیا جائے گا۔

میں دس منٹ کے بعد آمنہ کے دماغ میں آیا۔ وہ مجرے میں تبریزی صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھی سر جھکائے ناصرہ اور نیلماں کے حالات بتا رہی تھی پھر اس نے کہا "اعلیٰ حضرت! میرے مجازی خدا میرے پاس آئے ہیں۔"

میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا "یہ بات یقینی ہے کہ ناصرہ کی طبعی عمر تک نیلماں اس کا جسم چھوڑ کر نہیں جائے گی کیونکہ ناصرہ کی وفات کے بعد اس کی آتما بھٹکتی رہے گی۔"

میں نے کہا "اعلیٰ حضرت! میں چاہتا ہوں کہ آپ نیلماں کی آتما کو انتقامی کارروائیوں سے باز رکھیں۔"

"پاکیزگی نصف ایمان ہے۔ مسلمان کی روح ہو یا ہندو کی آتما' یہ پاکیزہ ہوتی ہیں۔ نیلماں نے آتما شکتی حاصل کرنے کے لیے کالے جادو کا بھی سہارا لیا تھا اور کالے جادو کے شیطانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے غلاظت اور گناہوں سے گزرتی رہی تھی۔ ہم اپنے پاکیزہ روحانی علوم کو اس سے دور رکھیں گے۔ اگر ہم اس کی ناپاکیوں کو دور کرنے کے لیے ناصرہ کو کلام پاک کی چند آیات پڑھنے کو دیں گے تو اس کی آتما کلام پاک کی پاکیزگی برداشت نہیں کر پائے گی۔ ناصرہ کے جسم کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ اس طرح ناصرہ کی بھی موت واقع ہو گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک زیر لب پڑھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

"ابھی میں روحانی ٹیلی پیتھی کے ذریعے ناصرہ کے پاس گیا تھا۔ ناصرہ جسمانی طور پر سکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ نیلماں کی آتما سہم کر اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ سانس روک لے۔ میں سانس روکنے کے باوجود وہاں موجود رہا تو وہ تھر تھر کانپتی ہوئی سکڑتی رہی۔ میرے اس عمل سے اندازہ کرو کہ میری اور آمنہ کی موجودگی سے نیلماں کی آتما سہم کر انتقامی کارروائی سے باز رہے گی لیکن ناصرہ بھی مشکلات میں رہے گی۔"

میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "بے چاری ناصرہ نے مجھے پاپا کہا تھا اور میں نے اسے بیٹی بنا کر وعدہ کیا تھا کہ اسے نیلماں کی انتقامی کارروائیوں سے نجات دلاؤں گا۔"

تبریزی صاحب نے کہا "ناصرہ کے اندر ناپاک روح ہے لیکن اس کے ساتھ رہنے والے جلال پاشا اور ثنا نمازیں پڑھتے ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگر وہ باپ بیٹی وقتاً فوقتاً ناصرہ کے سامنے دعائیہ آیات پڑھتے رہیں گے تو نیلماں کی آتما سہمی ہوئی سی ناصرہ کی مرضی کے مطابق رہا کرے گی۔ فی الحال ناصرہ اور پورس کو اسی طرح نیلماں کی ناپاک آتما سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔"

میں نے وہاں سے آ کر ناصرہ سے کہا کہ وہ جلال پاشا اور ثنا کو اپنے دماغ میں بلائے۔ جب وہ دونوں آ گئے تو میں نے تبریزی صاحب سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتائی پھر کہا "ناصرہ کے اندر ایک ناپاک آتما ہے۔ ثنا یا جلال پاشا صاحب کبھی کبھی ناصرہ کے سامنے یا اس کے دماغ میں رہ کر دعائیہ آیات پڑھتے رہیں گے تو وہ ناپاک آتما سہمی رہے گی اور کبھی پورس کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرے گی۔"

جلال پاشا نے کہا "فرہاد صاحب! ہم عبادت کرنے والے پاکیزگی کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ تبریزی صاحب نے درست فرمایا ہے۔ اس ناپاک آتما کو دشمنی اور پورس کے خلاف کارروائیوں سے روکنے کے لیے یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ ہم باپ بیٹی ناصرہ کے سامنے دعائیہ آیات پڑھتے رہیں۔ آپ ناصرہ اور پورس کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔"

میں نے ناصرہ سے کہا "بیٹی ناصرہ! تم نے مجھے باپ کہہ دیا ہے۔ انشاء اللہ میں کبھی تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ جب بھی تمہارا کوئی مشکل مسئلہ ہو' مجھے فوراً آواز دینا۔ میں آ جاؤں گا۔"

وہ خوشی سے نہال ہو کر میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ اس وقت ہماری گفتگو کے دوران میں پورس موجود نہیں تھا۔ جب وہ آیا تو ناصرہ نے پوچھا "کہاں گئے تھے؟"

اس نے کہا "تم نے خیال خوانی کے ذریعے یہ کیوں نہیں معلوم کیا کہ میں کہاں تھا؟"

"تھوڑی دیر پہلے میرے پاپا فرہاد علی تیمور آئے تھے۔ ثنا اور پاشا انکل بھی موجود تھے۔ وہ مجھے اور تمہیں نیلماں کی ناپاک آتما

کی دشمنی سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتا رہے تھے۔"

ناصرہ نے اسے تفصیل سے تیمرزی صاحب کے مشوروں کے متعلق بتایا پھر کہا "میرے پاپا سچ مچ ہم دونوں کے تحفظ کے لیے ایک باپ کی طرح ذمے داری ادا کر رہے ہیں۔ تم اور پارس ایک دوسرے کے عجیب دشمن ہو لیکن تمہیں میرے پاپا کی فرض شناسی اور نیک نیتی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔"

"میں ابتدا ہی سے فرہاد صاحب کی غیر جانبداری کا معترف ہوں۔ انہوں نے اپنے بیٹے پارس کی حمایت میں کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ جب میں نے ان کی ہلاکت کی خبر سنی تھی تو یقین کرو' مجھے ایسا صدمہ پہنچا تھا جیسے میرے باپ کو ہلاک کیا گیا ہو۔"

"جب تمہیں ایک بیٹے کی طرح صدمہ پہنچا تھا تو تم انہیں فرہاد صاحب کیوں کہتے ہو؟ پاپا کیوں نہیں کہتے ہو؟"

"میں سوچتا تھا' شاید وہ میری زبان سے پاپا کہنا گوارا نہ کریں لیکن اب تم نے پاپا کہا ہے اور انہوں نے تمہیں بیٹی بنا لیا ہے تو آج سے میں بھی انہیں پاپا کہہ کر مخاطب کروں گا۔"

جلال پاشا نے کہا "سچے دل سے پاپا کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ پارس تمہارا بھائی ہے۔ لہٰذا دو بھائیوں میں جو عداوت ہوتی ہے' اسے ختم ہونا چاہیے۔"

"اگر پارس میرے معاملات میں مداخلت نہ کرے تو ہم دونوں ایک جان دو قالب بن کر رہیں گے۔"

"ایک بھائی کے معاملات کا تعلق دوسرے بھائی سے ہوتا ہے۔ کسی بھی معاملے کا نقصان یا فائدہ دونوں بھائیوں کو پہنچتا ہے۔ تم دونوں کے دل صاف ہوں گے تو پھر ایک دوسرے کی کسی بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اعتراض وہ کرے گا۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ پارس سے اس بات کی ضمانت لیں کہ میں جو غیر معمولی دوائیں تیار کرا رہا ہوں' اس سلسلے میں وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔"

"ہم اس سلسلے میں ابھی پارس سے بات کریں گے۔"

"وہ پہلے کی طرح آپ سب کو پچھاڑنے سے انکار کر دے گا۔"

"ہم فرہاد صاحب کے ذریعے اسے کنٹرول پر مجبور کریں گے۔"

جلال پاشا نے مجھے مخاطب کیا اور کہا "آپ کی دانائی سے ہمارے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ہم پارس اور پورس کے آپس کے اختلافات دور کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "میری ہدایت کے مطابق پارس اختلافات ختم کر دے گا۔ آپ بتائیں کہ پورس کیا چاہتا ہے؟"

"پورس چاہتا ہے کہ پارس اس کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔"

"پورس کو بتائیں کہ میں اس کے دماغ میں آ رہا ہوں۔ آپ تمام بھی اس کے اندر موجود رہیں۔ خدا کرے کہ ان کی عداوتیں ختم ہو جائیں۔"

جلال پاشا چلا گیا۔ میں نے ایک منٹ کے بعد پورس کے دماغ میں آ کر اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا "پاپا! آداب۔ ناصرہ نے مجھ سے کہا ہے کہ جب آپ نے اسے بیٹی بنا لیا ہے تو آپ مجھے بھی بیٹا بنا لیں گے۔"

"ناصرہ نے درست کہا ہے۔ پارس کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو۔ اکثر دو بھائیوں میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ اگر تم دونوں کے جھگڑے ختم ہو جائیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔"

"آپ کو تو خوشی ہوگی لیکن میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا کیونکہ دنیا والے مجھے آپ کا ٹیلی ممبر کہیں گے۔"

"تو پھر بتاؤ' تمہیں پارس سے کیا شکایت ہے؟"

"وہ میرے کئی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ اس نے کئی بار میری کامیابیوں کو ناکامیوں میں بدل دیا ہے۔"

"اپنا اپنا دل صاف کرنے کے لیے لازمی ہے کہ پچھلی عداوتیں بھلا دی جائیں اور موجودہ حالات اور مستقبل میں اپنے اپنے تحفظ اور دوستانہ تعلقات کی باتیں طے کر کے ان پر عمل کیا جائے۔"

"موجودہ معاملہ یہ ہے کہ میں کچھ غیر معمولی دوائیں تیار کرنا چاہتا ہوں لیکن پارس نے چیلنج کیا ہے کہ وہ مجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔"

"اسی چیلنج کرنے والے پارس نے ان غیر معمولی دواؤں کے نسخے تم سے چھین لیے تھے۔ وہ چاہتا تو تمہیں ان نسخوں سے محروم رکھ سکتا تھا۔ ایسے میں تم وہ غیر معمولی دوائیں کیسے تیار کرتے؟"

"اس وقت میں صبر کرتا اور ان نسخوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔"

"اگر تم یہ فرض کر لو کہ پارس نے دیانت داری سے نسخے واپس نہیں کیے ہیں۔ مہینے دو مہینے سال دو سال میں انہیں دوبارہ حاصل کر سکو گے تو پھر کم از کم ایک برس تک وہ غیر معمولی دوائیں تیار نہ کرو۔ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ پارس بھی وہ دوائیں تیار نہیں کرے گا۔ وہ تمام نسخے تم دونوں کے پاس ہیں۔"

"غیر معمولی دوائیں تیار کرنے پر اعتراض کیا ہے؟"

"وہ شیطانی نسخے ہیں۔ ان کے ذریعے دشمنوں کو زیر کیا جا سکتا ہے لیکن جب بھی کوئی چیز ایجاد ہوتی ہے' وہ دشمنوں اور جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں میں بھی پہنچتی ہے۔ ایک سوئی سے لے کر ایٹم بم کی ایجادات تک کسی بھی ایجاد کو آج تک کوئی چھپا کر نہیں رکھ سکا۔ تم نے عارضی طور پر ٹیلی پیتھی کو ختم کرنے کی دوا تیار کی۔ ہم نے اس کے جواب میں ہمیشہ کے لیے ٹیلی پیتھی کو ختم کرنے کی دوا تیار کر لی۔ اس دوا سے صرف تمہیں نہیں' میرے بیٹوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ میرے بیٹے اور ہمارے کتنے ہی ٹیلی پیتھی جاننے والے ماہر اس علم سے محروم ہو گئے۔ کیا تم میری اس بات پر

بھروسا کرو گے کہ پارس ان شیطانی نسخوں سے دوائیں تیار نہیں کرے گا؟"

"میں آنکھیں بند کر کے' کسی شک و شبے کے بغیر آپ پر بھروسا کرتا ہوں اور ایک بیٹے کی زبان سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک آپ حکم نہیں دیں گے' میں وہ دوائیں تیار نہیں کروں گا۔"

"شاباش بیٹے! تم نے دل خوش کر دیا ہے۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم سب کتنے طاقت ور ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے اتحاد سے دشمنوں کو پسینہ آئے گا۔"

وہ سب خوش ہو کر ایک دوسرے کو ایک نئے اور مستحکم اتحاد کے سلسلے میں مبارک باد دینے لگے۔ میں نے کہا "پارس پراسرار بن کر رہنے والے شیڈو کو پورس کے تعاون سے گرفت میں لے کر جالی کے ساتھ علی کے پاس گیا ہے۔ کل تک پیرس آئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ پورس بھی کل یا پرسوں تک پیرس آئے' پارس اسے ٹیلی ٹرانسفر لگائے گا۔"

وہ سب خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ میں اپنی معصومیات کے بارے میں سوچنے لگا۔ جلال پاشا نے کہا "بیٹے پورس! اتحاد میں بڑی طاقت ہے۔ تم ناصرہ اور ثنا کے ساتھ پیرس جاؤ۔ میں بھی آؤں گا۔"

جلال پاشا پیرس میں ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ناصرہ' ثنا اور پورس نے رات کا کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں وہ نئے اتحاد کے سلسلے میں دلی مسرتوں کا اظہار کرتے رہے۔ وہ تینوں کچھ کہہ رہے تھے کہ ہم سے اتحاد کر کے وہ کتنے طاقت ور ہو گئے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ثنا کو ناصرہ کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں آئی پیڈ کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس کے روبرو ہو کر دعائیہ آیات پڑھنے لگی۔ پورس ان سے ذرا دور ایک صوفے پر بیٹھا سوچتا رہا۔ مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ مطمئن تھا اور سوچ رہا تھا کہ پاپا کے سائے میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

دعاؤں کے اختتام پر ناصرہ نے کہا "بے شک اللہ تعالیٰ کے کلام میں تاثیر ہے۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی ہوں اور آج تو پاپا نے اتنا مطمئن کیا ہے کہ مجھے بہت گہری نیند آئے گی۔"

ثنا وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پورس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ باہر کے دروازے اور کھڑکیاں پہلے ہی اندر سے بند کر دی گئی تھیں۔ غیر ضروری بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کے کانٹے ایک سیکنڈ میں حرکت کرتے ہوئے ہر گزرتے ہوئے لمحے کو قتل کر رہے تھے تاکہ قتل ہونے والا وقت واپس نہ آ سکے۔ وقت بھی انسانوں کی طرح مرتا ہے اس لیے کبھی واپس نہیں آتا۔

رات کے دو بج گئے۔ ناصرہ اور پورس ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور محبت کے فرائض ادا کر کے بڑے مطمئن ہو کر سو رہے تھے۔ ایسے ہی وقت ناصرہ نیند میں کسمسانے لگی۔ اسے خواب میں ایک ایسی بوڑھی عورت دکھائی دے رہی تھی جس کی عمر ڈیڑھ سو سال تھی۔ وہ نیلماں تھی۔ اس سے کہہ رہی تھی "مجھے دیکھ' میں کبھی جسمانی طور پر ایسی تھی پھر آہستہ آہستہ شکتی سے کئی بار نوجوان لڑکیوں کے جسموں میں داخل ہو کر حسین و جمیل بنتی رہی۔ اب تو میرا آخری جسم ہے۔ تیرے اندر سے نکلوں گی تو پھر کسی کے جسم میں داخل نہیں ہو سکوں گی۔ میری آتما بھٹکتی رہ جائے گی۔"

ناصرہ نے نیند میں پوچھا "تو میرے جسم سے باہر کیسے آئے گی؟"

"میں جسم سے باہر آؤں گی تو تو مر جائے گی۔ میں تیرے خواب میں خیال خوانی کے ذریعے آئی ہوں۔ پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ روح کے بغیر جس طرح جسم مردہ ہو جاتا ہے اسی طرح دماغ بھی مر جاتا ہے۔ تجھے اس کا مطلب سمجھ لینا چاہیے کہ میری روح کی بدولت تیرا جسم اور تیرا دماغ کام کر رہا ہے اور میری روح کو پاکر تیرے دماغ میں ٹیلی پیتھی کا علم آیا ہے۔"

ناصرہ نے کہا "میں مانتی ہوں' پہلے ٹیلی پیتھی نہیں جانتی تھی۔ تیرے آنے سے خیال خوانی کرنے لگی ہوں۔"

"تو احسان فراموش ہے۔ مجھ سے ایک غیر معمولی اور زبردست علم حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کی آسمانی مقدس کتاب کی آیات کے ذریعے مجھے بے بس اور تابع بنا رہی ہے۔"

"کیا قرآن مجید کی آیتوں کا تجھ پر اثر نہیں ہوا تھا؟"

"بہت اثر ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت بڑے پہاڑ تلے دب گئی ہوں اور کبھی اس کے نیچے سے نکل نہیں پاؤں گی لیکن تمہاری اور پورس کی چند باتی غلطی سے آزاد ہو گئی ہوں۔ تم دونوں نے ناپاک ہو کر اس پاکیزگی کو ختم کر دیا ہے جسے ثنا تمہارے تحفظ کے لیے ڈھال بنا کر گئی تھی۔"

"او خدایا! میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ واقعی جب تک تجھے پوری طرح بے بس اور تابع نہ بنا دیا جاتا' تب تک مجھے پورس سے دور رہنا چاہیے تھا۔"

"آج میں نے طہارت اور پاکیزگی کے حوالے سے اس آسمانی کتاب کی قوت کو سمجھا ہے۔ آئندہ میں پہاڑ جیسا بوجھ برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ثنا اور پاشا روز دعائیہ آیات پڑھتے رہیں گے تو میں چند دنوں میں بالکل ہی بے بس اور کمزور ہو جاؤں گی۔ یہ فیصلے کی آخری رات ہے۔ اگر تو میری باتوں پر عمل نہیں کرے گی تو میں تیرے جسم سے نکل جاؤں گی۔ اپنا بھی نقصان کروں گی اور تیرا بھی لیکن اس سے پہلے تجھ پر غالب رہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"تو کیا کرنا چاہتی ہے؟ میں اپنے پورس کو نقصان پہنچانے نہیں دوں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی "نقصان پہنچانے کی ابتدا کر چکی ہوں۔ تم دونوں نے ناپاک ہو کر ہیشہ کی طرح سہانے رکھا ہوا دودھ پینا چاہا تھا۔ تب میں نے تمہارے دماغ پر قبضہ جما لیا اور تم نے میری مرضی

کے مطابق دودھ میں اعصابی کمزوری کی دوا ملا دی تھی۔ اس دودھ کو تم دونوں نے پیا اور سو گئے۔ ان لمحات میں پورس دماغی طور پر کمزور ہو کر سو رہا ہے اور میں تمہارے ذریعے خیال خوانی کر کے اس کے دماغ میں جاؤں گی۔"

"میں ہرگز اپنے پورس کے دماغ میں نہیں جاؤں گی۔"

وہ انکار کرنے کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا بھی دماغ کمزور تھا اور نیلاں کی ٹیلی پیتھی کی گرفت میں تھا۔ وہ اپنے محبوب پورس کے خوابیدہ دماغ میں جا کر اس پر تنویمی عمل کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں یہ باتیں نقش کرنے لگی کہ وہ فرہاد کو اپنا باپ نہیں سمجھے گا۔ اس سے اتحاد کرنے والی باتیں بھول جائے گا۔ ثنا اور پاشا سے بھی دور ہو جائے گا اور آئندہ کسی بھی پرائی سوچ کی لہروں کو اپنے دماغ میں نہیں آنے دے گا۔ وہ ایک محبوبہ کی حیثیت سے ہو گئے گی' وہ اس پر عمل کرے گا۔

ناصرہ اس پر تنویمی عمل کر کے پھر پورس کے پاس لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کر کے نیلاں کی آتما کی مرضی کے مطابق اپنے ہی دماغ پر تنویمی عمل کرنے لگی۔ عمل یہ تھا "میں آئندہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب کی کوئی آیت نہیں سنوں گی۔ فرہاد کے ساتھ قائم ہونے والے باپ بیٹی کے رشتے کو بھول جاؤں گی اور کسی کی بھی سوچ کی لہروں کو اپنے دماغ میں نہیں آنے دوں گی۔ نیلاں کی آتما کی موجودگی نے مجھے ٹیلی پیتھی کا علم دیا ہے۔ میں اس آتما کی مرضی کے مطابق خیال خوانی کرتی رہوں گی۔"

پورا عمل کرنے کے بعد وہ پورس کی طرح دو گھنٹے کے لیے تنویمی نیند سو گئی۔ اولادِ آدم ازل سے شیطان کے زیرِ اثر آ کر گمراہ ہوتی رہی ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ صرف وہ مومن جو ایمان کی پختگی کے باعث شر سے محفوظ رہتے آئے ہیں وہ کبھی شیطان کے زیرِ اثر آ کر گمراہ نہیں ہوتے۔

صبح اذان کے وقت ناصرہ اور پورس کی آنکھیں کھلیں تو ان کے دل اور دماغ بدل چکے تھے۔ ناصرہ نے کہا "ہم اپنے ایک بیگ میں ضروری سامان لے کر ابھی یہاں سے جائیں گے۔"

تنویمی عمل کے مطابق پورس اس کا تابع بن چکا تھا۔ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں نے ایک بیگ میں ضروری سامان رکھا۔ ناصرہ نے نیلاں کی مرضی کے مطابق پورس سے کہا "ہمارے دشمن جتنے کم ہوں' اتنا ہی اچھا ہے۔ تم اس دعائیہ آیات پڑھنے والی دشمن کو ہلاک کر دو پھر ہم یہاں سے چلیں گے۔"

پورس نے کہا "اسے تو میں گلا دبوچ کر مار ڈالوں گا۔"

وہ دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے ثنا کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ گہری نیند سونے والوں کو ہلاک کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ وہ دونوں ثنا کے کمرے کے پاس آئے۔ اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ ثنا کو آواز دینے تو بے چاری دروازہ کھول کر خود موت کو دعوت دینے چلی آتی۔ آواز دینے سے پہلے دونوں نے کھڑکی کے پاس آ کر اس کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ جائے نماز پر فجر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ دونوں فوراً ہی کھڑکی کا پردہ چھوڑ کر ذرا پیچھے چلے گئے۔

ناصرہ نے نیلاں کی مرضی کے مطابق کہا "وہ پاک صاف رہتی ہے۔ ابھی نماز پڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد آسمانی کتاب کی تلاوت کرے گی تو تلاوت کی آواز میرے کانوں تک پہنچے گی۔ اس سے پہلے ہی یہاں سے چلو۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے بنگلے کے باہر آئے پھر کار اسٹارٹ کر کے بنگلے سے باہر نکل گئے۔ ناصرہ مجبور تھی۔ اس کے اندر کی ناپاک آتما نے اسے جکڑ لیا تھا اور اس کے ذریعے پورس کو بھی پھانس لیا تھا۔ وہ سچے دل سے مجھے باپ کی جگہ دے کر پارس کا ... بھائی اور دوست بننا چاہتا تھا لیکن شیطانی قوت بھی تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے' پلک جھپکتے ہی دوست کو پھر سے دشمن بنا دیتی ہے۔

پورس قریب ہوتے ہوتے پھر دور ہوتا جا رہا تھا۔

○☆○

ہزاروں لاکھوں ڈالر لے کر دنیا کی اہم سماجی اور سیاسی شخصیات کو قتل کرانے والے تین پراسرار مجرموں میں سے مسٹر اَن نون اور مسٹر شیڈو کے حالات میں بیان کر چکا ہوں۔ تیسرا پراسرار مجرم ہائیڈ اینڈ سیک ہمارے ہاتھ آنے سے پہلے اپنا اور برین آدم کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

ہائیڈ اینڈ سیک اسرائیل نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ قاہرہ جانے والی ایک فلائٹ میں سفر کر رہا تھا لیکن الپا پائلٹ کے دماغ پر قبضہ کر کے اس طیارے کو قتل ایبب لے آئی تھی۔ الپا کی ٹیلی پیتھی سے دور رہنے کے لیے ہی وہ اسرائیل نہیں جانا چاہتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا' وہی اس کے ساتھ ہونے لگا۔ تل ایبب کے ائرپورٹ پر طیارے سے اترتے ہی اسرائیلی فوج کے جوانوں نے اسے حراست میں لے لیا پھر اسے خفیہ قید خانے میں لے آئے۔

اس نے انجان بن کر پوچھا "مجھے گرفتار کیا گیا ہے؟ یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کیا میں نے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے؟"

ایک فوجی افسر نے کہا "اگر تم مجرم نہیں ہو تو کہو' ہم تمہیں فرہاد علی تیمور یا اس کے بیٹے علی تیمور کے پاس پہنچا دیں؟ ان کے سامنے تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ تم خود ہی اپنے بے شمار جرائم کی فہرست پیش کر دو گے۔"

وہ کچھ بول نہ سکا۔ سوچنے لگا۔ برین آدم نے کہا "میں نے طیارے میں جادو کا کمال دکھایا تھا۔ اس جادو کے ذریعے میں تمہاری پوری ہسٹری بیان کر سکتا ہوں۔"

"تم جادوگر نہیں ہو۔ میڈم الپا کی ٹیلی پیتھی کے ذریعے قاہرہ جانے والے طیارے کو یہاں لے آئے ہو۔"

"چلو میڈم الپا کے ذریعے ہی سہی' تم ایک قیدی بن کر آگئے ہو۔ ٹیلی پیتھی بھی ایک جادو ہے اور یہ جادو بول رہا ہے کہ بڑے بڑے ممالک کے سربراہ تمہیں ایک فرضی نام ہائیڈ اینڈ سیک کے طور پر جانتے ہیں جبکہ تمہارا اصل نام تھارن آوین ہے۔ امریکا' برطانیہ' فرانس اور اٹلی کے بینکوں میں تمہارے لاکھوں ڈالرز اور پاؤنڈز ہیں۔ شنگاکو کے ایک ذاتی بنگلے کے تہ خانے میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ کے ہیرے جواہرات اور بڑے ممالک کو بلیک میل کرنے والی کئی اہم دستاویزات ہیں۔ کہو تو ہم تمہاری پرسنل لائف کی بہت سی شرمناک باتیں بتا سکتے ہیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "مانتا ہوں۔ یہاں میرا کوئی راز چھپا نہیں رہے گا۔ میں اپنی تعریف سے بہت دولت مند بنتا رہا ہوں لیکن اب اتنی دولت سے نہیں کھیل سکوں گا۔ میں میڈم الپا کے شکنجے میں آ گیا ہوں۔ کیا وہ مجھ سے باتیں کرنا اور مجھ سے ملاقات کرنا پسند کریں گی۔"

الپا نے اس قید خانے میں داخل ہو کر کہا "تم ملاقات کرنے کی اپیل نہ کرتے' تب بھی میں تمہیں دیکھنے آ جاتی۔ میرے بگ برادر کا کہنا ہے کہ تمہاری آنکھیں خطرناک حد تک پُرکشش ہیں۔ تم آنکھیں ملانے والا پینترا نہ کرو۔ تمہاری آنکھیں مجھے دیکھ کر مسحور ہو جائیں گی۔ تم دور سے دیکھ رہے ہو گے' تم بہت خوب رو ہو اور ایک کردار شخصیت کے مالک ہو۔ حسین عورتیں تم پر مرتی ہوں گی۔ وہ تمہاری اثر ہو سنس بھی تمہاری آنکھوں کے سحر میں جکڑ گئی تھی۔ اسے میں نے تمہارے سحر سے نکالا تھا۔"

"میں یہ مانتا ہوں کہ میں پراسرار رہ کر تمہاری حکومت کے ساتھ برین آدم کو بلیک میل کرتا رہا ہوں لیکن ان سے بھاری معاوضہ لے کر ان کے سیاسی دشمنوں کو قتل کراتا رہا ہوں۔ اب میں انہیں بلیک میل نہیں کر سکوں گا۔ تم نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے وہ جگہ معلوم کر لی ہے جہاں وہ اہم دستاویزات اور ڈیڑھ سو کروڑ سے زیادہ کے ہیرے جواہرات رکھے ہوئے ہیں۔"

الپا نے کہا "ہاں اب وہ خزانہ اور تمام اہم دستاویزات ہم حاصل کریں گے۔"

"اور وہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد مجھے مار ڈالا جائے گا۔"

"تمہیں زندہ رکھا جائے گا۔ تم سے آئندہ بھی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔"

وہ بولتی ہوئی اس کے روبرو آ گئی۔ تھارن آوین نے نظریں ملا کر اسے دیکھا۔ اس سے نظریں ملتے ہی الپا جیسے ان غیر معمولی آنکھوں کی کشش سے نکلنے کے لیے اپنی آنکھیں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کی نگاہوں کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی۔ وہ کشش کہتی رہی "نظریں نہ پھیرو۔ یہ کشش تمہارے لیے ہے۔ اپنے خیال خوانی کرنے والے دماغ کو یہ اچھی طرح سمجھنے دو کہ میری یہ آنکھیں تمہارے دل و دماغ میں نقش رہیں گی۔ ان آنکھوں کو دوبارہ دیکھے بغیر تمہیں نیند نہیں آئے گی' تمہیں بھوک نہیں لگے گی اور انہیں بار بار دیکھنے کے لیے....."

ٹیلی پیتھی جاننے والے بڑی دماغی قوتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ الپا نے اپنی پوری دماغی توانائیوں سے کام لیتے ہوئے اس کی نظروں سے اپنی نظریں ہٹا لیں پھر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اب تک پارس کے سوا کسی نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ اس نے ماضی میں پارس سے ایک طویل جدائی کے باوجود کسی مرد کو اپنی تمنائی میں نہیں آنے دیا تھا۔ دوسری بار بھی پارس سے دشمنی مول لینے کے باوجود اس نے کسی دوسرے کو جیون ساتھی نہیں بنایا تھا لیکن اس ہائیڈ اینڈ سیک یعنی تھارن آوین کی آنکھوں میں ایسی غیر معمولی اور شیطانی کشش تھی کہ صرف ایک بار کسی سے بھی نظریں ملاتے ہی' اس کے دل و دماغ کو اور اس کے تمام وجود کو اپنی طرف کھینچ کر اپنی مقناطیسی شخصیت کے سحر میں جکڑ لیتا۔ وہ منہ پھیر کر فوراً ہی وہاں سے جاتے ہوئے برین آدم سے بولی "بگ برادر! اسے یہیں لاک اپ میں رکھیں۔ ہم اس کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے۔"

اس نے جاتے وقت برین آدم کو بھی نہیں دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے چہرے کی بدلی ہوئی رنگت سے کوئی اس کی دلی کیفیات کا اندازہ کر سکے۔ وہ خفیہ قید خانے کے ایک ائرکنڈیشنڈ آفس میں آ کر شکست خوردہ انداز میں ایک صوفے پر گر پڑی۔ آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے دل کی بے لگام دھڑکنوں پر قابو پانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد برین آدم آفس میں آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے اپنا بڑا بھائی سمجھتی آئی تھی اور ہمیشہ اس کے مشوروں پر عمل کر کے کامیاب ہوتی رہی تھی۔ برین آدم نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔ تم وہاں سے اچانک کیوں چلی آئیں؟"

"میں تھارن آوین کے بارے میں سوچ رہی ہوں اور اپنی سوچ کے مطابق ہمیشہ کی طرح آپ سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔"

"کیا اس کی آنکھوں نے تمہیں متاثر کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں اس کے سامنے سے یہ سوچ کر چلی آئی کہ جب اس کی آنکھیں مجھے متاثر کر سکتی ہیں تو عام لوگوں سے نظریں ملاتے ہی فوراً اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہوں گی۔ ہم ٹیلی پیتھی جاننے والے دو سروں کے مقابلے میں زیادہ قوتِ ارادی کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں مجھے متاثر کر رہی تھیں۔ میں نے دماغی قوت سے اپنے آپ کو بچا لیا ہے۔ میری اس سچ بیانی سے اندازہ کریں کہ ہم اس کی ہپناٹائز کرنے والی آنکھوں سے کئی طرح کے فائدے اٹھا سکتے ہیں۔"

"درست کہتی ہو۔ میں نے بھی اتنی لمبی زندگی میں پہلی بار ایسا ہپناٹائز کرنے والا دیکھا ہے جو آنکھیں ملاتے ہی شیطانی انداز میں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ میں بھی اس کی نظروں سے کترا کر اس

سے گفتگو کر رہا تھا۔ ہم اسے اپنی گرفت میں رکھیں گے تو یہ ہماری مخالفت کرنے والی بڑی بڑی شخصیات پر تنویمی عمل کر کے انہیں ہماری مخالفت سے باز رکھ سکتا ہے۔"

"اب یہ سوچا جائے کہ ہم اسے کس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا تابع بنا کر رکھ سکتے ہیں۔"

"علی تیمور نے تمام بڑے ممالک کے اکابرین کو سزائیں دی تھیں۔ ان سزا پانے والوں میں ہمارے اکابرین بھی تھے۔ سزائیں اس لیے دی تھیں کہ تمام بڑے ممالک کے اکابرین نے علی کے باپ فرہاد علی تیمور کو قتل کرانے کے لیے اَن نون' شیڈو اور ہائیڈ اینڈ سیک کی خدمات حاصل کی تھیں پھر اس نے اَن نون کو گرفتار کرنے کے بعد یہ کہہ کر سزائیں ختم کر دیں کہ تمام بڑے ممالک باقی دو بھی کسی طرح ڈھونڈ کر ان دونوں کو یعنی شیڈو اور ہائیڈ اینڈ سیک کو علی کے حوالے کریں۔"

الپا نے کہا "اطلاع ملی ہے کہ علی نے شیڈو کو بھی گرفتار کرا لیا ہے۔"

"ہاں اب یہ ہائیڈ اینڈ سیک یعنی تھارن آوین رہ گیا ہے۔ فرہاد اور اس کی فیملی کے علاوہ تمام ممالک بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ یہ گرفتار ہونے اور موت کی سزا پانے سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی جان بچا کے یہاں سے دوسری جگہ نہیں جائے گا لیکن ہمارا تابع رہنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ ہم اسے اپنا غلام رکھنے کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اپاہج بنا کر رکھ سکتے ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اس پر تنویمی عمل کروں گی۔"

"کیسے کرو گی؟ تمہاری طرح یہ بھی غیر معمولی دماغی قوتوں کا حامل ہے۔ جو آنکھیں ملاتے ہی دوسروں کو اپنے زیر اثر لے آتا ہے وہ تمہارے تنویمی عمل کے اثر میں نہیں آئے گا۔"

"آئے گا۔ آپ اسے کسی آرام دہ بنگلے میں ٹرانسفر کر دیں۔ اس بنگلے میں وہ تنہا رہے گا۔ باہر سے کھڑکیاں اور دروازے بند رہیں گے۔ باہر مسلح فوجی جوان پہرا دیں گے۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس سے کہا جائے کہ میں اس کے ساتھ رات کا کھانا کھاؤں گی پھر میں کھانے پینے کی کسی چیز میں اعصابی کمزوری کی دوا ملا دوں گی۔ اس کے اثر سے وہ دماغی طور پر کمزور ہو جائے گا۔ ایسے وقت اس کی آنکھیں بھی غیر معمولی کشش سے محروم ہو جائیں گی۔ اس طرح وہ میرے تنویمی عمل کے اثر میں آجائے گا۔"

"یہ طریقہ مناسب ہے لیکن میں تمہارا تحفظ چاہتا ہوں۔ تم اس کے پاس رات کے کھانے کے لیے جاؤ گی تو اس وقت وہ اعصابی کمزوری میں مبتلا نہیں رہے گا۔ جب وہ شام کو چائے یا کافی پینا چاہے گا تو ہمارا ایک مسلح گارڈ اس میں اعصابی کمزوری کی دوا ملا دے گا۔ جب وہ کمزوری میں مبتلا ہو گا تب تم بنگلے میں اس کے سامنے جاؤ گی۔"

"یہ حفاظتی تدبیر بہتر ہے۔ آپ اسے کڑی نگرانی میں یہاں سے لے جائیں۔ میں شام کو چائے کے وقت آپ سے رابطہ کروں گی۔"

برین آدم وہاں سے چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہی پھر اپنی خفیہ رہائش گاہ میں آگئی۔ لنچ کا وقت آیا تو بھی اس نے کچھ نہیں کھایا۔ بھوک لگ رہی تھی مگر کھانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ خفیہ قید خانے میں تھارن آوین کی نظریں اس کی آنکھوں میں پیوست ہو کر اس سے کہہ رہی تھیں "اپنے خیال خوانی کرنے والے دماغ کو یہ اچھی طرح سمجھنے دو کہ میری یہ آنکھیں تمہارے دل و دماغ میں نقش رہیں گی۔ ان آنکھوں کو دوبارہ دیکھے بغیر تمہیں نیند نہیں آئے گی' تمہیں بھوک نہیں لگے گی اور انہیں بار بار دیکھنے کے لیے...."

تھارن کی بات پوری نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی شیطانی آنکھوں نے اس سے جتنا کہا تھا' اتنی باتیں اس کے دماغ پر نقش ہو گئی تھیں اور اس کا اثر یہی ہو رہا تھا کہ وہ لنچ کے وقت نہیں کھا رہی تھی۔ بھوک کے باوجود وہ کھانا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے سوچا "کیا ان لمحات میں اس کی بے زبان آنکھیں اپنا اثر دکھا رہی ہیں؟ کیا میں ان آنکھوں کو دوبارہ دیکھے بغیر کھانے کی طرف مائل نہیں ہو سکوں گی؟"

اس نے آنکھیں بند کر کے تھارن آوین کی آنکھوں کو تصور میں دیکھا۔ بند آنکھوں کی تاریکی میں وہ مقناطیسی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ نہایت واضح طور پر وہ نظریں اس کے دماغ میں پیوست ہو گئیں تب اس نے محسوس کیا کہ ان آنکھوں کو دوبارہ دیکھنے کے بعد کھانے کو جی کر رہا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کچن میں جا کر سیل بند ڈبوں سے کھانا نکال کر انہیں گرم کرنے کے بعد کھانے لگی اور سوچنے لگی۔

"وہ مقناطیسی آنکھیں مجھے گرفت میں لے چکی ہیں۔ ان آنکھوں نے کہا تھا کہ میں انہیں دوبارہ دیکھے بغیر نہ کھا سکوں گی اور نہ سو سکوں گی۔ ابھی میں تصور میں دوبارہ ان کو دیکھنے کے بعد کھانے کی طرف مائل ہوئی ہوں۔ شاید رات کو بھی انہیں دوبارہ دیکھے بغیر مجھے نیند نہیں آئے گی۔ یہ اچھا ہی ہے کہ رات سے پہلے شام ہی کو اسے چائے وغیرہ پلا کر اعصابی کمزوری میں مبتلا کر دیا جائے گا۔ میں اس پر تنویمی عمل کر کے اپنے ذہن سے اس کی نقش ہونے والی آنکھوں کو معدوم کروں گی پھر اسے اپنا غلام بنا کر حکم دوں گی کہ آئندہ وہ اپنی آنکھوں سے مجھے شکار کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

شام پانچ بجے اس نے خیال خوانی کے ذریعے برین آدم سے پوچھا "بگ برادر! کیا اسے چائے یا کافی میں اعصابی کمزوری کی دوا پلائی گئی ہے؟"

"ہاں اس نے خود ہی شام کی چائے طلب کی تھی۔ ایک مسلح

فوجی جوان بنگلے کے اندر جا کر اس کے لیے چائے تیار کر رہا ہے۔ تم چلی آؤ۔"

"آل رائٹ۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔"

وہ لباس تبدیل کر کے آئینے کے سامنے بن سنور کر بنگلے سے نکل کر اپنی کار میں آ بیٹھی پھر اسے ڈرائیو کرتی ہوئی جانے لگی۔ اس دوران میں کئی بار اس کے تصور میں تھارن کی آنکھیں جھلکتی رہیں اور وہ اپنے تصور سے انہیں مٹاتی رہی۔ جس بنگلے میں تھارن کو رکھا گیا تھا اس بنگلے کے احاطے میں برین آدم دو فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ الپا نے وہاں آ کر کار سے اتر کر پوچھا "ہیلو برادر! آپ لوگ باہر کیوں بیٹھے ہیں؟"

برین آدم نے کہا "ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ اندر جا کر تھارن آدمین سے باتیں کریں۔ اس سے نظریں ملتے ہی ایک عجیب طرح کی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔"

"کیا اس نے چائے نہیں پی ہے؟"

"پی چکا ہے۔ ایک فوجی جوان چائے پینے تک وہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ چائے پینے کے بعد کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بیڈ روم میں جا کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ فوجی باہر آ گیا۔ تم جاؤ۔ یہ اچھا موقع ہے۔ کمزوری کے باعث اسے نیند آئے گی اور نیند کے باعث اس کی آنکھیں بند ہوں گی۔ وہ تمہیں دیکھ بھی نہیں سکے گا اور تم بہ آسانی اپنا کام کر سکو گی۔"

الپا اندر جانے سے پہلے تھارن کے دماغ میں پہنچی۔ پتا چلا کہ وہ بستر پر آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے مطمئن ہو کر برین آدم سے کہا "میں نے اس کے دماغ میں جا کر دیکھا ہے۔ وہ کمزوری محسوس کر رہا ہے اور اب سونے والا ہے۔ اس پر تنویمی عمل کرنے کے بعد میں ایک گھنٹے تک تنویمی نیند سو کر بیدار ہونے کا حکم دوں گی پھر اسے آزماؤں گی کہ وہ میرا تابع بن چکا ہے یا نہیں؟ اس کام میں دو گھنٹے لگیں گے۔ کیا آپ اس وقت تک یہاں رہیں گے؟"

برین آدم نے کہا "میں ضروری کام سے جا رہا ہوں لیکن یہ دونوں فوجی افسر اور کئی مسلح جوان موجود رہیں گے۔"

الپا نے دونوں افسروں سے کہا "آپ دونوں مستعد رہیں گے۔ اگر میں کوئی خطرہ محسوس کروں گی تو دماغ میں پہنچ کر پکاروں گی۔ آپ فوراً مسلح جوانوں کے ساتھ آ کر اسے قابو میں کریں گے۔"

وہ تمام احتیاطی تدابیر کے بعد دروازے کے پاس آئی۔ وہاں کھڑے ہوئے ایک فوجی پہرے دار نے دروازہ کھولا پھر اس کے اندر جانے کے بعد اسے باہر سے بند کر دیا۔ وہ اندر آ کر ڈرائنگ روم سے گزرتی ہوئی ایک بیڈ روم کے دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولنے سے پہلے آواز دی "مسٹر تھارن!"

پھر اس نے دستک دیتے ہوئے آواز دی "مسٹر تھارن!"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے تھارن کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا۔ اس کے خیالات نے بتایا۔ وہ کمزوری کے باعث پکارنے والی کو جواب نہیں دے پا رہا ہے۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی ہے۔ پکارنے والی کو اندر آنا چاہیے۔ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔

اس نے مطمئن ہو کر دروازے کو کھولا۔ کمرے میں ایک جانب بڑی سی کھڑکی کے پاس وہ بیڈ پر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی جیسے وہ اپنی جسمانی اور دماغی کمزوری سے لڑ رہا ہو۔ اس نے قریب آ کر آواز دی۔ "تھارن!"

اس نے بڑی تکلیف سے اندر کی سانس چھوڑتے ہوئے "آہ" کی آواز نکالی۔ الپا نے اس کے چہرے پر جھک کر کہا "ابھی تمہاری کمزوری اور پریشانی دور ہو جائے گی۔ میں نیلی پیتھی کے ذریعے تمہیں گہری نیند سلا دوں گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تھارن نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی مقناطیسی نظروں سے نظریں ملتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بلا کی کشش تھی کہ وہ نظریں ملانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ بھاری مگر دھیمی سی آواز میں بولا "تم بہت حسین ہو۔ بہت حسین ہو۔ یوں جھکی نہ رہو۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

وہ بستر کے سرہانے پر یوں بیٹھی کہ نظروں سے نظریں نہ ہٹ سکیں کیونکہ تھارن اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے پیوست کیے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا پھر اس کے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں میں اس طرح جکڑ لیا کہ اب وہ ہزار کوششوں کے باوجود اس سے نظریں نہیں چرا سکتی تھی۔

وہ اپنی شیطانی آنکھوں سے چند سیکنڈ میں کسی کی بھی نظروں کو جکڑ لیتا تھا اور الپا اس بار بڑی دیر سے جکڑی ہوئی تھی۔ اب اس کا دل اور دماغ کہہ رہا تھا کہ اپنے پورے وجود سے اس کی آنکھوں میں سما جائے۔ وہ حکم دے تو اس کے قدموں میں خاک ہو جائے۔

اس نے حکم دیا "میری نظروں سے نظریں ہٹانے کے بعد بھی میری آنکھیں تمہارے دل اور دماغ میں رہیں گی۔ تم جدھر دیکھو گی ادھر صرف میری آنکھیں دکھائی دیں گی۔ اب نظریں ہٹاؤ اور کہیں بھی دیکھ کر بتاؤ۔ تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟"

اس نے نظریں ہٹائیں۔ دروازے کو دیکھا' دیوار اور کھڑکی کے پردے کو' سر اٹھا کر چھت کو' سر جھکا کر بستر کو دیکھا' ہر جگہ صرف اس کی طلسمی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے تھارن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تم جہاں دیکھتی ہوں' وہاں تم ہی تم ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں تمہاری آنکھوں کے سوا کچھ

نہیں ہے۔ اگر کچھ ہو گا تب بھی میں کچھ نہیں دیکھوں گی۔ تمہاری آنکھوں میں ڈوبتی رہوں گی۔"

تھارن نے اسے دونوں بازوؤں میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا "آؤ اور ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں میں ڈوب جاؤ۔"

وہ چٹان جیسے سینے سے لگ کر دل کی دھڑکنوں کو آرام پہنچانے لگی۔ اس کی آنکھیں جہاں دیکھ رہی تھیں' وہاں طلسمی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے تھارن کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "وہ فوجی جوان احمق تھا۔ کچن میں چائے بناتے وقت اس نے یہ خیال نہیں رکھا کہ میں سامنے والے آئینے میں اسے کوئی دوا ملاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ وہ کیسی دوا تھی؟"

وہ سحر زدہ سی آواز میں بولی "وہ اعصاب کو کمزور کرنے والی دوا تھی۔ میں تمہیں کمزور کر کے تم پر تنویمی عمل کرنا چاہتی تھی۔ کیا اس دوا نے تم پر اثر نہیں کیا؟"

"اگر چائے پی لیتا تو وہ دوا ضرور مجھے نقصان پہنچاتی۔ اس فوجی جوان نے میرے سامنے پیالی رکھتے ہوئے مجھے دیکھا تو میری آنکھوں نے اسے جکڑ لیا۔ میں نے حکم دیا "میری آنکھوں میں دیکھتے رہو۔"

وہ کئی منٹ تک دیکھتا رہا پھر میں نے حکم دیا "اب اپنی آنکھیں بند کرو۔ میں چائے پینے کے بعد تمہیں آنکھیں کھولنے کا حکم دوں گا۔ اس وقت تک تم اپنی بند آنکھوں کے پیچھے تصور میں میری آنکھیں دیکھتے رہو گے اور میری آنکھوں میں ہمیشہ ڈوب جانے کی خواہش کرتے رہو گے۔"

اس نے میرے حکم کے مطابق آنکھیں بند کیں۔ میں چائے کی پیالی اٹھا کر باتھ روم میں آیا۔ تمام چائے واش بیسن میں ڈال کر نلکا کھول دیا۔ چائے پانی کے ساتھ بہہ گئی۔ میں نلکا بند کر کے واپس کمرے میں آ گیا۔ پیالی کو سامنے رکھ کر بولا "آنکھیں کھولو۔"

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میری اجازت کے بغیر وہ مجھ پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ میں نے پوچھا "تم نے چائے میں کون سی دوا ملائی تھی؟"

وہ سحر زدہ سی کر بولا "اعصاب کو کمزور کرنے والی دوا۔ جب آپ کمزوری محسوس کرنے لگیں گے تو میڈم آکر آپ پر تنویمی عمل کریں گی اور اپنا تابع بنا لیں گی۔"

"تم باہر جا کر رپورٹ دو گے کہ میں نے تمہاری آنکھوں کے سامنے تمام چائے پی لی اور تمہارے باہر جاتے وقت کمزوری محسوس کر رہا تھا اور اپنے بیڈ روم کی طرف ڈگمگاتے ہوئے جا رہا تھا۔"

"میں باہر جا کر آپ کے حکم کے مطابق افسران کو رپورٹ دوں گا۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔"

وہ پلٹ کر اس کمرے سے چلا گیا۔ میں یہاں آ کر کمزوری محسوس کرنے لگا۔ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ یہ جانتا تھا کہ تم میرے دماغ میں آ کر میری کیفیت معلوم کرو گی۔ کیا تم میرے دماغ میں آئی تھیں؟"

"ہاں آئی تھی اور تمہارے خیالات پڑھ کر مطمئن ہو گئی تھی کہ تم کمزوری میں مبتلا ہو گئے ہو۔"

"تم مجھ پر تنویمی عمل کرنا چاہتی تھیں۔ کیا تم نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی میری جیسی آنکھیں دیکھی ہیں؟"

"نہیں' پہلی بار دیکھی ہیں اور ان آنکھوں کی اسیر ہو گئی ہوں۔"

"میں چند سیکنڈ میں کسی کو بھی عارضی طور پر اپنا معمول بنا لیتا ہوں لیکن ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا تابع بنانے کے لیے ابھی تم پر باقاعدہ مہارت سے عمل کروں گا۔ آؤ آرام سے لیٹ جاؤ۔"

اس نے الپا کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر بستر پر لٹایا پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے پر جھک کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تنویمی عمل کرنے لگا۔

باہر بیٹھے ہوئے افسران سوچ رہے تھے کہ ان کی میڈم الپا اس قیدی تھارن پر تنویمی عمل کر کے اسے تابع... بنا رہی ہو گی۔

اور تھارن اس کے دماغ میں یہ احکامات نقش کر رہا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کی تابع رہے گی لیکن دنیا والوں کو دکھانے کے لیے اسے غلام بنا کر اپنے ساتھ رکھا کرے گی۔ وہ سب کے سامنے بظاہر اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے گا لیکن درپردہ وہ اس کے منصوبوں پر بے چون و چرا عمل کیا کرے گی۔ وہ اپنی کسی بھی حرکت سے یہ ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ اس پر حاوی ہو گیا ہے اور وہ اس کے زیر اثر رہنے لگی ہے۔

تھارن نے تمام ضروری احکامات اس کے دماغ پر نقش کر دیے۔ وہ اپنی شیطانی فطرت اور شیطانی آنکھوں کی کشش کے ذریعے ایسا زبردست اور خطرناک چٹائر کا ماہر بن گیا تھا کہ تنویمی عمل کے ذریعے اپنے کسی بھی معمول کے دماغ کے چور خانے کو بند کر دیتا تھا۔ اس نے الپا کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ کوئی اس کے چور خیالات کو پڑھ نہیں سکتا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں تنویمی عمل کی گہرائیوں تک پہنچا ہوا عامل تھا۔ جو حکم صادر کرتا تھا' اسی پر اس کا معمول عمل کرتا تھا۔ اس نے الپا کے دماغ میں یہ بات نقش کی تھی کہ کبھی زخمی یا بیمار ہو جانے کی صورت میں دماغ کمزور ہونے کے باوجود نہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کے دماغ میں پہنچ کر اس کے خیالات پڑھ سکے گا اور نہ ہی الپا کے دماغ کے چور خانے میں داخل ہو سکے گا۔ وہ ہر حال میں صرف اس کی معمولہ اور تابع رہے گی۔

عام حالات میں وہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک کر ان سوچ کی لہروں کو بھگا دے گی لیکن ایک مخصوص آواز اور لب و لہجے کو اپنے دماغ میں محسوس نہیں کرے گی۔ اس

نے وہ مخصوص لب ولہجہ اس کے دماغ میں نقش کرکے اسے آدھے گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کا حکم دیا۔ وہ آدھے گھنٹے تک سوتی رہ گئی۔

جب آدھا گھنٹا ختم ہونے میں ایک منٹ رہ گیا تو اس نے بیڈ روم کے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اس کے پاس آکر لیٹ گیا۔ اس کے سر کو اپنے ایک بازو پر رکھ لیا۔ اس کی زلفوں کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا' اسے تھارن کی آنکھیں اپنے اوپر جھکی ہوئی نظر آئیں۔ وہ بڑے پیار سے ان آنکھوں کو دیکھنے لگی۔ اس نے پوچھا "کیا میری آنکھوں سے ڈر لگتا ہے؟"

وہ اس کی گردن میں بانہہ ڈال کر بولی "نہیں۔ پہلے تمہاری آنکھیں پرائی تھیں۔ خوف ناک انداز میں اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اب تو یہ آنکھیں میری آنکھوں میں اتر آئی ہیں' میرے دل و دماغ میں سما گئی ہیں۔ اب یہ تمہاری نہیں' میری آنکھیں ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ تن من سے اس پر نچھاور ہونے لگی۔ تھارن نے کہا "تم نے باہر بیٹھے ہوئے افسران سے کہا تھا کہ دو گھنٹے کے بعد ان سے دماغی رابطہ کروگی۔ دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہاں مزید میرا دل خوش کرنے کے لیے ان سے کہو کہ ایک گھنٹے بعد انہیں بنگلے کے اندر ڈرائنگ روم میں بلاؤ گی۔"

الپا نے اس کے حکم کے مطابق بنگلے کے باہر بیٹھے ہوئے ایک افسر کے دماغ میں پہنچ کر کہا "تھارن آوین مزید ایک گھنٹے تک تنویمی نیند سوتا رہے گا۔ اس کے بیدار ہونے کے بعد تم دونوں افسران کو اندر بلاؤں گی۔"

دوسرے افسر نے پوچھا "میڈم! دیر کیوں ہو رہی ہے؟ آپ خیریت سے ہیں؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تھارن آوین زبردست قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ اگرچہ اسے دوا کے ذریعے اعصابی کمزوریوں میں مبتلا کردیا گیا تھا' اس کے باوجود اسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے گہری نیند سلانے اور ٹرانس میں لاکر تنویمی عمل کرنے میں کافی وقت لگا۔ بہرحال کامیابی ہوئی ہے۔ میں نے اسے اپنا معمول اور تابع بنالیا ہے اور دو گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کا حکم دیا ہے تاکہ میرا عمل اس کے پُرسکون دماغ میں گہرائیوں تک نقش ہوتا رہے۔"

"میڈم! آپ کے بگ برادر برین آدم نے فون کے ذریعے آپ کی خیریت پوچھی تھی۔"

"بگ برادر سے کہو' میں خیریت سے ہوں۔ تھارن کے بیدار ہونے تک اس کے دوسرے ساتھیوں مسٹر اَن نون اور مسٹر شیڈو کے بارے میں خیال خوانی کے ذریعے معلوم کررہی ہوں کہ علی تیمور انہیں کہاں لے گیا ہے اور ان کے ساتھ کیا سلوک کررہا ہے؟ مجھے امید ہے کہ تھارن کی طرح اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی ٹریپ کرکے یہاں لاسکوں گی۔"

وہ خیال خوانی ختم کرکے پھر تھارن کے گلے کا ہار بن گئی۔ آئندہ کبھی جیت کی کوئی منزل آنے تک ہارنے والی کو اس کے گلے کا ہار بن کر رہنا تھا۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہو رہا تھا۔ پارس کو اپنی بے وفائی سے بار بار ہارنے کے بعد اس نے تھارن کو جیتنے کا موقع دے دیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ کھلونا بنتی رہی پھر تھارن نے کہا "میں اپنے ساتھی شیڈو کی آواز اور لب ولہجے کی نقل سنا رہا ہوں۔ تم اسے ذہن نشین کرکے اس کے پاس پہنچو اور اس کے اندر رہ کر خاموشی سے معلوم کرو کہ علی تیمور نے اسے اور اَن نون کو کہاں چھپا کر رکھا ہے؟"

تھارن اپنے ساتھی شیڈو کی آواز اور لب ولہجے میں بولنے لگا۔ وہ توجہ سے سنتی رہی پھر خیال خوانی کی پرواز کرتی ہوئی شیڈو کے دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ یوگا کا ماہر نہیں تھا۔ الپا کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہ کرسکا۔ وہ اس کے خیالات پڑھنے لگی۔ پتا چلا کہ علی نے اَن نون کو حکومتِ فرانس کے حوالے کرکے یہ تاکید کی ہے کہ اَن نون کے دونوں بازوؤں کا زخم بھرنے تک جیل کے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا جائے اور جیل کے اس حصے میں جیلر اور فوج کے اعلیٰ افسران کے سوا کسی اور کو جانے کی اجازت نہ دی جائے۔

اگر اَن نون جیل کے بھی تعاون سے فرار ہوگا تو فرانس کے اکابرین کو پہلے کی طرح ٹیلی پیتھی کے ذریعے سزا دی جائے گی۔ وہ اکابرین پہلے کی طرح سونے کے وقت نہیں سو سکیں گے۔ دن ہو یا رات' جب بھی سونا چاہیں گے تو ان کے دماغوں کو بجلی جیسے جھٹکے پہنچیں گے۔ اس طرح وہ دن رات جاگنے کے عذاب میں مبتلا رہ کر مرجائیں گے۔

فرانس کے اکابرین اور فوجی افسران آئندہ ایسی بدترین سزا سے محفوظ رہنے کے لیے اَن نون کی کڑی نگرانی کررہے تھے۔ اَن نون کے لیے علی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے ایک ویران جزیرے کے ایک کاٹیج میں ایک ہفتے کا راشن اور پانی دے کر چھوڑ دیا جائے گا۔ دوسرا کوئی اس جزیرے میں آکر اس کاٹیج تک پہنچ کر اَن نون کو اس کے ہیرے جواہرات کے ساتھ نکال کر نہیں لے جاسکے گا کیونکہ جزیرے میں قدم قدم پر بارودی سرنگیں بچھی ہوں گی جو نظر نہیں آئیں گی۔ کاٹیج تک پہنچنے والوں کا ایک بھی قدم غلط پڑے گا تو دھماکے سے ان کے جسموں کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

شیڈو کے خیالات نے مزید بتایا کہ علی تیمور نے اسے اٹلی کے ایک جنوبی وسیع و عریض جزیرے سسلی میں قیدی بنا کر رکھا ہے۔ اس سمندر میں کارسیکا' سارڈینیا اور ملورکا نامی کئی چھوٹے جزیروں کے علاوہ اور دو چار بے نام اور غیر آباد جزیرے ہیں۔ ان میں سے ایک گمنام اور غیر آباد جزیرے میں اَن نون کو پہنچانے کے لیے ایک چھوٹا سا کاٹیج وہاں بنوایا گیا۔ ایک ہفتے کے لیے اس کے کھانے پینے کا انتظام کیا گیا تھا اور بابا صاحب کے بیس ماہرین کاٹیج سے ساحل

تک بارودی سرنگیں بچھا رہے تھے۔ یہ کام بڑی رازداری سے ہو رہا تھا۔

چونکہ اُن نون ابھی زیرِ علاج تھا اس لیے علی نے فیصلہ کیا تھا کہ اس جزیرے کا تمام ضروری کام دوسرے دن شام تک ختم ہو جائے گا۔ تب تیسرے دن اُن نون کی جگہ شیڈو کو وہاں پہنچایا جائے گا۔ کانج سے لے کر چاروں طرف ساحل تک بارودی سرنگیں ہوں گی لہٰذا ایک ہیلی کاپٹر شیڈو کو اس کانج تک لے جائے گا۔ بلندی سے ایک سیڑھی لٹکا کر شیڈو کو کانج کی چھت پر اتارنے کے بعد وہ ہیلی کاپٹر وہاں سے چلا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہیلی کاپٹر کو اس کانج کی طرف نہیں جانے دیا جائے گا۔ اس جزیرے کے آس پاس کے ممالک اٹلی، فرانس، اسپین اور جنوب میں الجزائر، لیبیا، مصر اور اسرائیل کے حکام سے کہہ دیا گیا تھا کہ جس ملک سے کوئی ہیلی کاپٹر اس گمنام جزیرے کی طرف جائے گا، اس ملک کے خلاف ٹیلی پیتھی کے ذریعے بڑی عبرت ناک انتقامی کارروائی کی جائے گی۔ شیڈو بھی اپنی مدد کے لیے آنے والے کسی ہیلی کاپٹر کے ذریعے فرار نہیں ہو سکے گا۔ اس سے پہلے کہ شیڈو کسی ہیلی کاپٹر کی لٹکائی ہوئی سیڑھی تک پہنچے، اسے خیال خوانی کے ذریعے کانج کے باہر دھکا دلوایا جائے گا۔ اس طرح وہ بارودی سرنگوں کی زد میں آکر حرام موت مرے گا۔

ویسے اس پر علی تیمور کو اعتراض نہیں تھا کہ کوئی بھی سمندری راستے سے جزیرے کے ساحل تک پہنچ کر بارودی سرنگوں سے گزر کر کانج سے شیڈو کو نکال لے جانے کا خطرہ مول لے یا شیڈو کسی تدبیر سے فرار ہو جائے۔ کانج کے چاروں طرف موت کا ایسا جال بچھایا گیا تھا کہ جرائم کی دنیا کا مکار سے مکار ہجرم بھی یہ خطرہ مول لینا پسند نہ کرتا۔ البتہ اُن نون اور شیڈو کے پاس جتنے ہیرے جواہرات تھے، ان سب کو اس کانج میں پہنچا دیا گیا تھا۔ کروڑوں ڈالرز کے ہیرے جواہرات کا لالچ ایسا تھا کہ بچ نہیں کتنے چال باز مجرم وہاں تک پہنچنے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔

الپا یہ تمام معلومات حاصل کر کے تھارن کو بتا رہی تھی۔ معلومات حاصل کرنے میں کافی وقت گزر گیا تھا۔ بیرونی دروازے پر ایک افسر دستک دے کر پوچھ رہا تھا "میڈم! بہت دیر ہو چکی ہے۔ آپ خیریت سے ہیں؟"

الپا نے خیال خوانی کے ذریعے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تھارن آوین نیوی نیند سے بیدار ہو چکا ہے۔ میں اسے آزما رہی ہوں کہ میرا نیوی عمل کس حد تک اس پر کامیاب رہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ پوری طرح میرا غلام بن چکا ہے۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔"

الپا وہاں سے اٹھ کر دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولا تو باہر دو فوجی افسران کے ساتھ برین آدم بھی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا "تم نے کہا تھا، دو گھنٹے بعد آؤ گی مگر ساڑھے تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں پریشان ہو کر پھر یہاں آیا ہوں۔"

"سب برادر! یہ آپ کی محبت ہے۔ ذرا سی کوئی بات ہو جائے تو آپ میرے لیے پریشان ہو جاتے ہیں۔"

وہ سب باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں تھارن... صوفوں کے پیچھے ایک تابع کی طرح سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ سب نے اسے دیکھا۔ الپا نے کہا "اب یہ قید خانے میں نہیں رہے گا۔ اس کی مقناطیسی آنکھیں میری حفاظت کے لیے بہت ہیں۔ یہ ہمیشہ میرا باڈی گارڈ بن کر میرے ساتھ رہے گا۔"

برین آدم نے پوچھا "تم بالکل مطمئن ہو؟ ایسا نہ ہو کہ بعد میں اس کی چالاکی اور فریب کا انکشاف ہو اور ہمیں پچھتانے کا بھی موقع نہ ملے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ مجھے دروازہ کھولنے میں اسی لیے دیر ہوئی کہ میں اسے طرح طرح سے آزما رہی تھی۔ اس نے شیڈو کے لب و لہجے کی نقل سنا کر مجھے اس کے دماغ میں پہنچایا تھا۔ میں نے شیڈو کے خیالات پڑھ کر بہت سی معلومات حاصل کی ہیں۔"

وہ بتانے لگی کہ علی تیمور نے اُن نون اور شیڈو کو کہاں کہاں قیدی بنا کر رکھا ہے اور پرسوں شیڈو کو ایک گمنام جزیرے کے کانج میں پہنچانے والا ہے۔ اس جزیرے کے بارے میں سب ہی اخبارات میں پڑھ چکے ہیں۔

ایک فوجی افسر نے کہا "تھارن آوین مقناطیسی آنکھوں کے ذریعے کسی سے بھی نظریں ملا کر اسے عارضی طور پر اپنا مطیع فرمان بردار بنا لیتا ہے۔ یہ ہمارے دشمنوں کو ہماری طرف مائل کر سکتا ہے اور آپ کا محافظ بنا رہے گا۔ کیا اس کی طرح شیڈو بھی کسی غیر معمولی صلاحیت کا مالک ہے؟"

"شیڈو در اصل پلان میکر ہے۔ پچھلے بارہ برسوں سے اُن نون اور تھارن آوین اس کی پلاننگ کے مطابق عمل کرتے اور بے انتہا دولت کماتے رہے ہیں۔ اس بار اُن نون اور تھارن نے کروڑوں ڈالر کمانے کے لالچ میں فرہاد کو قتل کرانے کی ذمے داری لی۔ شیڈو نے اعتراض کیا۔ ان کو سمجھایا کہ یہ لالچ انہیں لے ڈوبے گا۔ آج تک اس کی پلاننگ کے مطابق عمل کر کے کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ اس پر ان دونوں نے کہا کہ اس کی پلاننگ حرفِ آخر نہیں ہے اور فرہاد نے قیامت تک زندہ رہنے کے لیے اپنی تقدیر نہیں لکھوائی ہے۔ ایک دن اسے مرنا ہے۔ ممکن ہے اسے ان کے ہی کرائے کے قاتل ہلاک کریں لیکن وہ ہلاک نہیں ہوا۔ کتنے ہی کرائے کے قاتل اس کے اور علی تیمور کے ہاتھوں مارے گئے۔ وہ آج بھی زندہ ہے اور اس کا بیٹا علی ان تینوں کو عبرت ناک سزائیں دے کر ہلاک کرنے والا ہے۔ بارہ برس سے مسلسل کامیابیاں حاصل کرنے والے صرف اس لیے ناکام رہے کہ انہوں نے شیڈو کی مرضی کے خلاف کام کیا۔ اسے جو علمِ نجوم میں مہارت حاصل ہے، اس سے انکار کیا۔"

دوسرے فوجی افسر نے پوچھا "کیا شیڈو کو علمِ نجوم میں مہارت حاصل ہے؟"

"ہاں اس علم میں وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں اُن نون اور تھارن کا زائچہ اور ان کے ستاروں کی چال دیکھ کر پیش گوئی کیا کرتا تھا کہ انہیں کسی بڑی مصیبت کو ٹھل کرانے میں خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس بار اس نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ ناکام رہیں گے اور ان دونوں کے ساتھ وہ بھی مصیبتوں میں پھنسے گا۔ فرہاد اور اس کے بیٹے ان کا جینا حال کر دیں گے حتیٰ کہ ان میں سے کوئی ایک موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

برین آدم نے کہا "یہاں اس کے علمِ نجوم نے غلط کہا ہے۔ علی نے ان میں سے دو کو گرفتار کیا ہے۔ دونوں کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ صرف تھارن کو ہم اپنے مقصد کے لیے زندہ رکھیں گے۔"

"شیڈو کی پیش گوئی غلط نہیں ہو گی۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ بے معصوم اور شریف انسان دکھائی دیتا ہے، اندر سے انتہائی مکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ موت کے اس جزیرے سے صحیح سلامت نکل آئے گا۔"

برین آدم نے کہا "علی نے اخبارات کے ذریعے اعلان کیا تھا کہ وہ بھی قیدی اس جزیرے سے نکل کر فرار ہو گا۔ اسے بیس کلو میٹر دور تک کہیں بھی جا کر چھپنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس کے بعد علی اسے آگے کہیں بھاگنے اور روپوش ہونے کا موقع نہیں دے گا۔ شیڈو اپنی مکاری سے اس کانج کے باہر آئے گا۔ کسی طرح بارودی سرنگوں سے بچ کر ساحل تک پہنچے گا تو وہاں سے فرار ہونے کے لیے ایک موٹر بوٹ موجود رہے گی۔ وہ اس میں بیٹھ کر فرار ہو گا۔ ان اس جزیرے کے چاروں طرف جتنے جزیرے اور جتنے ممالک ہیں، انہیں وارننگ دی گئی ہے کہ جو اس کی مدد کرے گا یا اسے پناہ دے گا، اس ملک کے خلاف ٹیلی پیتھی کے ذریعے کارروائی کی جائے گی۔"

ایک افسر نے کہا "وہ موت کے جزیرے سے نکل کر بیس کلو میٹر تک سمندر میں بھٹکتا رہے گا۔ کوئی ملک اسے اپنے ساحل تک پہنچنے نہیں دے گا۔ ایسی صورت میں وہ زندہ کیسے بچے گا؟ اس کی موت لازمی ہو گی۔"

الپا نے کہا "نہیں ہو گی۔ اس کی پیش گوئی ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ جب وہ بارودی سرنگوں سے بچ کر جزیرے کے ساحل تک پہنچے گا تو موٹر بوٹ پر سمندر میں صرف چند کلو میٹر تک جائے گا۔ اس کے بعد ہمارا ایک ہیلی کاپٹر اسے موٹر بوٹ سے اٹھا کر لے جائے گا۔"

دوسرے افسر نے کہا "علی تیمور ہمارے خلاف کارروائیاں شروع کر دے گا۔"

"ہماری طرف سے جانے والا ہیلی کاپٹر سیاہ رنگ کا ہو گا۔ کسی ملک کی نشان دہی نہیں کرے گا کہ کہاں سے آئے گا۔ وہاں سے قریب جنوب میں لیبیا کے ایک ویران حصے میں ہمارا ایک چھوٹا طیارہ موجود ہو گا۔ شیڈو کو اس طیارے میں منتقل کیا جائے گا۔ وہ طیارہ شیڈو کو ہمارے پاس لائے گا اور اس سیاہ ہیلی کاپٹر کو ہم سے تباہ کروایا جائے گا۔"

برین آدم نے تائید میں سر ہلا کر کہا "یہ اچھی تدبیر ہے۔ فرہاد اور علی تیمور وغیرہ اس تباہ ہونے والے ہیلی کاپٹر کو لیبیا کی زمین پر دیکھ کر تسلیم کریں گے کہ ایک مسلمان ملک نے ان کے مجرم کو فرار ہو کر زندہ سلامت رہنے کا موقع دیا ہے۔ وہ لیبیا اور کرنل قذافی کے دشمن بن جائیں گے۔ ہم پر کبھی شبہ نہیں کریں گے۔"

ایک افسر نے کہا "لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے کہ فرہاد یا ثانی مفرور شیڈو کے دماغ میں رہیں گے اور معلوم کرتے رہیں گے کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔"

"شیڈو موٹر بوٹ سے سیڑھی پر چڑھ کر جیسے ہی سیاہ ہیلی کاپٹر میں آئے گا، اسے ایک انجکشن کے ذریعے بے ہوش کروایا جائے گا۔ کوئی خیال خوانی کرنے والا اس کے دماغ سے کچھ نہیں معلوم کر سکے گا۔"

"بیٹراٹ ازذن....."

سب نے اس طریقۂ کار کی تائید کی پھر تھارن آوین کی طرف متوجہ ہو کر اس کے بارہ برس تک پراسرار رہنے کے سلسلے میں کئی رازوں کے متعلق سوالات کرتے رہے اور وہ صحیح جواب دے کر ثابت کرتا رہا کہ وہ بے شک و شبہ الپا کا تابع بن چکا ہے۔

وہ سب مطمئن ہو کر الپا سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ تھارن نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا پھر الپا کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ روم کی طرف جانے لگا۔

○☆○

نئا فجر کی نماز پڑھنے اور کلام پاک کی تلاوت کرنے کے بعد کچن کی طرف جانے کے لیے ناصرہ اور پورس کے بیڈ روم کے سامنے سے گزرنے لگی۔ اس کمرے کا کھلا ہوا دروازہ دیکھ کر رک گئی۔ یہ روز کا معمول تھا کہ وہ دروازہ بند رہتا تھا۔ نئا ناشتا تیار کرنے کے بعد دروازے پر آکر دستک دیتی تھی۔ تب ناصرہ دروازہ کھولتی تھی لیکن اس روز خلافِ معمول کھلا ہوا دروازہ دیکھ کر اس نے باہر ہی سے ناصرہ کو آواز دی۔ اسے جواب نہیں ملا پھر اس نے پورس کو آواز دے کر پوچھا "بھائی جان! کیا بھابی واش روم میں ہیں؟"

اسے پورس کی طرف سے بھی جواب نہیں ملا۔ کمرے میں خاموشی رہی۔ وہ حیرانی سے سوچتی ہوئی کھلے ہوئے دروازے پر آئی۔ کمرا خالی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کمرے کے اندر آکر دونوں کو پکارا۔ باتھ روم کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اگر وہ دونوں باتھ روم

میں ہوتے تو ثنا کی آواز ان تک ضرور پہنچتی اور وہ دونوں ضرور جواب دیتے۔

وہ دونوں کو آوازیں دیتی ہوئی باتھ روم کے آدھے کھلے ہوئے دروازے پر آئی۔ وہاں بھی اندر کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں ناشتا کیے بغیر باہر نہیں جاتے تھے۔ صبح چہل قدمی نہیں کرتے تھے۔ اس نے باتھ روم سے پلٹ کر پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک الماری کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں پٹ کھول کر دیکھے۔ وہاں ناصرہ کی اٹیچی نہیں تھی۔ اس کے کچھ ملبوسات اور میک اپ کا سامان بھی دکھائی نہیں دیا۔ تب اس نے خیال خوانی کی پرواز کی۔ ناصرہ کے دماغ میں پہنچی مگر سوچ کی لہریں واپس آگئیں۔ اس نے سانس روک لی تھی۔ اس نے ایک ذرا وقفے کے بعد پھر اس کے دماغ میں پہنچتے ہی کہا "بھابی! میں ثنا....."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی ناصرہ نے سانس روک لی۔ ثنا نے پورس کے دماغ میں پہنچنا چاہا۔ اس نے بھی سانس روک کر اس کی سوچ کی لہروں کو باہر کردیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک سگے بھائی کی طرح محبت کرنے والا اور اس کے ہاتھ سے اپنی کلائی پر راکھی بندھوانے والا بھی بے مروتی سے بہن کی سوچ کی لہروں کو واپس کردے گا۔

اس نے پھر ذرا وقفے سے دماغ میں پہنچتے ہی کہا "میں آپ کی بہن ثنا ہوں....."

پورس نے پھر سانس روک لی۔ چار بار ناصرہ اور پورس کے دماغوں میں جا کر واپس آتے رہنے سے اتنا معلوم ہوا کہ وہ کار میں جا رہے ہیں۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی بنگلے کے بیرونی دروازے کی طرف آئی۔ وہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر پورچ میں ان کی رینٹڈ کار نہیں تھی۔

اس نے خیال خوانی کی پرواز کرکے جلال پاشا کو مخاطب کیا۔ "ابو! ناصرہ بھابی اور بھائی جان کہیں چلے گئے ہیں۔ میں ان کے دماغوں میں جاتی ہوں تو وہ سانس روک لیتے ہیں۔ پتا نہیں ایسی کیا شکایت مجھ سے ہو سکتی ہے کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے بھی مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں کر رہے ہیں۔"

جلال پاشا نے کہا "تمہاری باتیں سن کر حیرت ہو رہی ہے۔ ابھی سات گھنٹے پہلے رات کو فرہاد صاحب سے اتحاد ہوا تھا۔ پارس اور پورس کی دوستی ہونے والی تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں ہماری ٹیم مضبوط ہو گئی تھی پھر وہ دونوں اچانک ہم سے دور کیوں ہو رہے ہیں۔ ٹھہرو، میں ان سے رابطہ کرتا ہوں۔"

اس نے ان دونوں سے باری باری رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ انہوں نے اپنے بزرگ ساتھی جلال پاشا کا نام سننے کے باوجود سانسیں روک کر اس کی بات نہیں سنی، اپنے دماغوں سے نکال دیا۔ اس نے ثنا کے پاس آکر کہا "بیٹی! کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے نے ان دونوں کو ٹریپ کرلیا ہے۔"

"ابو! ہم سب کتنی محبت اور اعتماد سے متحد ہو کر ایک اچھی اور کامیاب زندگی کا آغاز کرنے والے تھے لیکن کوئی دشمن ہمارے اتحاد کو اپنے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے صبح ہونے سے پہلے ہی ان دونوں کو ہم سے دور کردیا اور میں سمجھتی ہوں، نیلماں نے ایسا کیا ہے۔ پچھلی رات وہ بھابی کے اندر رہ کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔"

"بے شک نیلماں ہی یہ دشمنی کر رہی ہے۔ میں فرہاد صاحب کو اطلاع دینے جا رہا ہوں۔"

اس نے خیال خوانی کے ذریعے مجھے مخاطب کیا اور ان دونوں کے اچانک جانے اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے بھی گفتگو نہ کرنے والی باتیں بتائیں۔ میں نے تمام باتیں سن کر کہا "آپ کا شبہ درست ہے۔ ایسا نیلماں ہی کر سکتی ہے۔ کوئی دوسرا ٹیلی پیتھی جاننے والا ان دونوں کو ٹریپ نہیں کر سکتا کیونکہ پورس یوگا کا ماہر ہے اور مضبوط قوتِ ارادی رکھتا ہے۔ اسے اعصابی کمزوری میں مبتلا کرکے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ناصرہ کے دماغ پر بھی کوئی قابو نہیں پا سکتا لیکن آتما کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور زندہ رہنے تک وہ دماغ سوچ سکتا اور کام کر سکتا ہے۔ اس حساب سے انسانی دماغ آتما کا محتاج ہوتا ہے۔ نیلماں کی آتما نے ناصرہ کو مجبور کیا ہوگا کہ وہ پورس کو اعصابی کمزوری میں مبتلا کرے۔ ناصرہ نے مجبوراً ایسا کیا ہوگا پھر پورس پر تنویمی عمل کرکے خود پر نیلماں کی مرضی کے مطابق تنویمی عمل کیا ہوگا۔ اس طرح وہ دونوں نیلماں کے زیرِ اثر آگئے ہیں۔"

"لیکن آپ نے فرمایا تھا کہ روزانہ ناصرہ کے سامنے دعائیہ آیتیں پڑھی جائیں تو نیلماں کی ناپاک آتما قرآن شریف کی آیتوں اور اس کے تقدس کے زیرِ اثر رہا کرے گی۔ وہ کبھی ناصرہ اور پورس کو کسی طرح کا بھی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"کیا پچھلی رات ناصرہ کے سامنے کلام پاک کی تلاوت کی گئی تھی؟"

"جی ہاں۔ ثنا نے دعائیہ آیتیں پڑھی تھیں۔"

"ہوں۔" میں سوچ میں پڑ گیا پھر بات سمجھ میں آگئی۔ میں نے کہا "ثنا درست کہہ رہی تھی۔ آیتیں پڑھی گئی ہوں گی لیکن وہ دونوں ایک ہی بیڈ روم میں رہتے ہیں۔ انہوں نے پہلے کی طرح جسمانی تعلق قائم کیا ہوگا۔ اس طرح نیلماں کی آتما نے ان کی ناپاکی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ دونوں ناپاک آتما کو اپنے زیرِ اثر رکھنے کے لیے پاک و صاف نہ رہ سکے۔ یوں ناپاکی اور شیطانیت کو غالب آنے کا موقع دیا ہے۔"

"فرہاد صاحب! یہ تو بہت برا ہوا۔ ناصرہ اور پورس میرے بچوں کی طرح ہیں۔ پورس آپ کو بھی سچے دل سے ایک باپ کی جگہ دے رہا تھا اور آپ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پارس کو

بھائی کہہ کر گلے لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔"

میں نے پاشا سے گفتگو کے دوران میں ناصرہ کو بیٹی اور پورس کو بیٹا کہہ کر مخاطب کیا۔ لیکن انہوں نے بے اختیار سانس روک لی۔ مجھ سے بھی بات نہیں کی۔ نیلاں کی آمنا نے ان دونوں کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔

میں نے آمنہ کے پاس آکر ان کے حالات بتائے۔ آمنہ نے کہا "میں ان دونوں کے حالات پر افسوس کر سکتی ہوں لیکن تم چاہو گے کہ میں انہیں نجات دلانے کے لیے نیلاں کی ناپاک روح کے پاس جاؤں اور ناصرہ کے جسم سے بھگا دوں یا اسے کچل ڈالوں تو میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔ تبریزی صاحب نے پہلی بار جو کچھ کہا تھا' اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس ناپاک آمنا کو صرف قرآنی آیات سے زیر کرتے کرتے اسے بالکل بے اثر کیا جائے گا پھر ناصرہ اپنے اندر اس کی موجودگی کے باوجود محفوظ رہے گی۔"

میں نے پاشا کو گفتگو کا لب لباب بتا کر کہا "ناصرہ اور پورس کو کسی طرح تلاش کر کے انہیں علیحدہ رہنے کا مشورہ دینا چاہیے۔ اگر وہ مشوروں پر عمل نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کے متشق میں ایک جگہ ایک ساتھ رہیں گے تو پھر ناپاک آمنا کی گٹھ پتلیاں بن کر رہیں گے۔"

"ہم انہیں تلاش کریں گے اور سمجھائیں گے۔"

"میں ثنا اور پارس سے کہتا ہوں۔ وہ ان دونوں کو ضرور تلاش کریں گے۔ وہ جہاں بھی پائے جائیں گے' ہم وہاں پہنچ کر انہیں ہر ممکن طور سے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ آمنہ اور تبریزی صاحب کے لیے یہ معمولی سی بات ہے۔ وہ ناصرہ کے جسم کو ناپاک آمنا سے نجات دلا سکتے ہیں لیکن اس طرح ناصرہ کا جسم مرجائے گا۔ پورس اگر دل و جان سے ناصرہ کی بہتری چاہتا ہے تو وہ اس سے علیحدگی اختیار کرلے گا۔"

"فرہاد صاحب! آپ سے ایک عرض ہے۔ جب تک وہ دونوں کہیں گم رہیں گے' میری بیٹی ثنا تمہارے ہی گھر رہے گی۔ کیا آپ اسے اپنی فیملی کے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟"

"بے شک۔ پورس نے اسے بہن بنایا تھا' پارس بھی اسے بڑے بھائی کا پیار دے گا۔ آپ ثنا سے کہہ دیں کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے رابطہ کر کے ثنا اور پارس کے پاس چلی جائے۔ اسے پھر ایک بھائی اور بھابی کی محبت ملے گی۔"

پیرس میں جھیل کے کنارے جتنے کاٹیج تھے' وہ سب بابا صاحب کے ادارے کی ملکیت تھے۔ میں اور میری فیملی کے افراد فرصت کے دنوں میں وہاں جاتے تھے اور کچھ عرصہ آرام اور تفریح میں گزارتے تھے۔ ثنا اور پارس' شیڈو کو علی تیمور کے حوالے کر کے وہیں ایک کاٹیج میں چند روز آرام کرنے آئے تھے۔ میں نے انہیں ناصرہ اور پورس کے حالات بتائے پھر پارس سے کہا "ثنا تم دونوں کے پاس رہائش کے لیے آرہی ہے۔ تم پورس کی طرح ثنا کو بڑے بھائی کا پیار دو اور کسی طرح ناصرہ اور پورس کو تلاش کرو۔ یہ معلوم کرو کہ وہ کہاں ہیں اور اپنے اصلی چہرے کے ساتھ ہیں یا نقلی؟"

دوسری طرف نیلاں کی مرضی کے مطابق ناصرہ اور پورس اسرائیل جا رہے تھے۔ ناصرہ نے کہا "تل ابیب میں رہ کر اپنا کو کسی طرح خیال خوانی کے ذریعے ٹریپ کیا جائے گا۔ ثنا اور جلال پاشا سے دور رہ کر ہم ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی ایک مضبوط ٹیم بنائیں گے۔"

پورس نے کہا "ایما کتنی چالاک بازہ ہے' یہ تم نہیں جانتیں لیکن تمہارے اندر سمائی ہوئی نیلاں کی آمنا جانتی ہے۔ ثنا اور جلال پاشا ہم سے محبت بھی کرتے ہیں اور ہمارے وفادار بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہم بالکل رشتے داروں کی طرح رہتے تھے۔"

ناصرہ نے ناگواری سے کہا "ان مسلمانوں کا نام نہ لو۔ وہ دونوں آسمانی کتاب پڑھ کر میری نیلاں کو مجھ سے دور کرنا چاہتے تھے۔"

پورس نے کہا "تمہیں کیا ہو گیا ہے ناصرہ! پہلے ہر بات محبت اور سہولت سے کرتی تھیں۔ اب ناگواری سے حکم دینے کے انداز میں بولتی ہو۔"

"اگر میرا لہجہ اور میرا انداز بدل گیا ہے تو کیا تم مجھے چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟ مگر جاؤ گے کہاں؟ نیلاں یعنی میری محبت کے بغیر تمہیں زندہ رکھا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہوں گی لیکن تم میرے بغیر زندہ رہنے کے لیے مجھ سے دور ہو جاؤ گے تو وہ میرے ذریعے معلوم کرلے گی کہ تم کہاں ہو؟ پھر تم وہاں بھی ہو گے' وہاں تمہیں مٹی میں ملا دے گی۔"

پورس کو وہ پہلا تجربہ یاد تھا جب نیلاں کی آمنا نے ناصرہ کے ذریعے اس کے اندر زہر کی مقدار اتنی پہنچا دی تھی۔ پہلی بار ناصرہ نے زہر چوس کر اسے بچا لیا تھا۔ لیکن اب ناصرہ اپنے محبوب کی نہیں' نیلاں کی حمایتی تھی۔ وہ علیحدگی چاہے گا تو نیلاں اسے ناصرہ کے ہی زہر سے مارے گی اور ناصرہ' نیلاں کے زہر سے نہ مرے گا اسے نہیں بچا سکے گی۔

وہ چپ چاپ ناصرہ اور نیلاں کو دھوکا دے کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ ناصرہ خیال خوانی کے ذریعے معلوم کرلے گی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ ایسا مجبور ہو گیا تھا کہ ایک معمول اور تابع بننے کے بعد ناصرہ کو اپنے اندر آنے سے نہیں روک سکتا تھا اور اس کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تنویمی عمل کے ذریعے بننے والا غلام نادیدہ زنجیریں توڑنے کا منصوبہ نہیں بنا سکتا جب دماغ میں تابع بننے کا عمل نقش کر دیا گیا ہو تو وہ تابع نہ دار نہیں بن سکتا۔

پورس کسی حد تک نیلاں کے خلاف اس لیے سوچ لیتا تھا کہ وہ بہت مضبوط ارادوں کا مالک تھا۔ جو مستقل مزاج اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوتے ہیں' ان پر تنویمی عمل کرنا تقریباً ناممکن

ہوتا ہے۔ اس لیے پورس کو پہلے اعصابی کمزوری میں مبتلا کیا تھا۔ اس کمزوری کے بعد اعصابی کمزوریاں دور ہو چکی تھیں۔ وہ پہلے کی طرح فولادی پورس بن چکا تھا۔ جو باتیں تنویمی عمل کے ذریعے داخل کردی گئی تھیں ان سے وہ فولادی طور پر عزم و ارادوں کے ساتھ کبھی کبھی لڑتا تھا پھر بے بس ہو جاتا تھا۔ انسان دماغ کے تابع رہتا ہے۔ عزم و ارادے بھی دماغ کے ذریعے مضبوط ہوتے ہیں اور شیطانی عمل سے دماغ کے ذریعے ہی کمزور بنا دیے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ پورس تابع ہونے کے باوجود بڑے عزم سے دماغ پر حاوی ہو جانے والے ناپسندیدہ احکامات سے لڑ رہا تھا۔ اس نے کبھی شیطانی قوتوں سے مات نہیں کھائی تھی۔ اس لیے اپنے اندر جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔

ثنا نے خیال خوانی کے ذریعے ثنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پارس نے بتایا ہے کہ تم ہمارے پاس آرہی ہو۔ ہمارے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن وہاں سے روانگی سے پہلے کچھ اہم معلومات حاصل کرنا۔"

ثنا نے کہا "آپ بتائیں' کس قسم کی معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"ناصرہ اور پورس کے پاس جن فرضی ناموں کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈز وغیرہ ہیں' وہ کس کے ذریعے امریکا سے کسی دوسرے ملک میں جائیں گے۔ نئے فرضی نام اختیار کرنے' پاسپورٹ اور ویزا کے لیے تصویریں اتروانے اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے متعلقہ افسران کے دماغوں میں گھس کر پاسپورٹ' ویزا اور شناختی کارڈز وغیرہ بنوانے کے لیے انہیں کم از کم دو گھنٹے لگیں گے۔ ان کے ذریعے ائیرپورٹ کے کسی بھی ایسے شخص سے بات کرو جو بورڈنگ کارڈز جاری کرنے والے کاؤنٹر پر ڈیوٹی دے رہا ہو۔ اس کی آواز سن کر ہم دونوں ان تمام کاؤنٹرز پر کام کرنے والوں کے دماغوں میں جائیں گے جو مسافروں کو بورڈنگ کارڈز جاری کرتے ہیں۔ اس طرح ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ناصرہ اور پورس فرضی ناموں کے ذریعے کس فلائٹ سے کس ملک کی طرف جا رہے ہیں۔"

ثنا نے خالی کو ناصرہ اور پورس کے فرضی نام اور ولدیت بتائی۔ خالی نے کہا "ائیرپورٹ پر بابا صاحب کے چند جاسوس موجود ہیں۔ ان کا سراغ ملتے ہی وہ ایکشن میں آجائیں گے۔"

خالی اور ثنا نے پہلے یہی کیا۔ فون کے ذریعے ایک شخص کی آواز سنی پھر اس کے دماغ میں جا کر اس کے ذریعے دوسرے کاؤنٹرز کے ملازمین کے دماغوں میں پہنچنے لگیں۔ وہ دونوں جن دو کاؤنٹرز پر کام کرنے والوں کے دماغوں میں جاتی تھیں وہ کمپیوٹر کے ذریعے معلوم کرتے تھے کہ ٹینا ولسن اور جیری ہیرالڈ (ناصرہ اور پورس) کس ملک کی فلائٹ میں کس ملک کے شہر تک جانے والے ہیں۔

آخر ایک کاؤنٹر کے کمپیوٹر کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ دونوں اسرائیل جانے والے ہیں اور اسرائیل کی فلائٹ اپنے شیڈولڈ نائم سے دو گھنٹے لیٹ ہے۔ دونوں مسافر ابھی بورڈنگ کارڈز حاصل کرنے نہیں آئے۔ جب ایسٹیکر کے ذریعے اسرائیل جانے والے مسافروں کو کال کیا جائے گا تو وہ بورڈنگ کارڈز حاصل کرنے جائیں گے۔

خیال خوانی کے دوران میں ثنا ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ائیرپورٹ پہنچ گئی تھی۔ ثانی نے کہا "وہیں ٹیکسی کے پاس ٹھہرو۔ اس کا نمبر بتاؤ۔ ہمارے جاسوس تمہارے پاس آرہے ہیں۔ ان میں سے ایک پاس ورڈ زاد اکرے گا۔ وی آر فار پارس اینڈ پورس۔"

ثنا نے ٹیکسی کا نمبر بتایا۔ وہ تمام جاسوس پارکنگ ایریا میں تھے۔ ایک منٹ کے اندر ثنا کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے مخصوص پاس ورڈز ادا کیے۔ ثنا ان کے ساتھ ائیرپورٹ کی عمارت کی طرف جاتے ہوئے بولی "وہ دونوں ویٹنگ ہال میں یا ریستوران میں ہوں گے۔ میں کوشش کروں گی کہ ان کی نظروں میں نہ آؤں اور دور ہی سے ان کی نشان دہی کردوں۔"

وہ ویٹنگ ہال میں پہنچ کر چھپنے کے انداز میں ایک دیوار کے قریب چلتی دوسری طرف جانے لگی۔ وہ دونوں آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس سے بہت دور تھے۔ اس نے خیال خوانی کے ذریعے ایک جاسوس سے کہا "میرے بھائی جان لائٹ گرے سوٹ اور گرے کلر کی ٹکائی میں ہیں۔ بھابی اورنج کلر کا بلاؤز اور بلیک اسکرٹ پہنے ہوئے ہیں۔ ان کی گردن کے گرد بلیک اسکارف ہے۔ جس ستون پر ٹی وی نصب ہے اس کے سامنے والے صوفے پر ہیں۔ ان کے بائیں طرف ٹیلی فون کاؤنٹر ہیں۔"

ان کی نشان دہی کے دوران میں وہ دونوں اٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔ ثانی نے کہا "ٹھیک ہے ثنا! ہمارے آدمیوں نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ تم ویٹنگ ہال سے باہر چلی جاؤ۔"

وہ باہر جانے لگی۔ ناصرہ اور پورس واش روم کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کاریڈور سے گزرتے وقت دو جاسوسوں نے سانس روک کر بے ہوشی کی دوا اسپرے کی۔ دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گرتے' دونوں جاسوسوں نے انہیں سنبھال لیا۔ باقی دو جاسوس پھرتی سے دو اسٹریچر لے کر آئے۔ اس پر دونوں کو لٹایا گیا۔ ان پر چادر ڈالی گئی پھر وہ اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے عمارت کے باہر آئے۔ وہاں دو ایمبولینسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک ایمبولینس کے پیچھے ناصرہ کو اور دوسری کے پیچھے پورس کو پہنچایا گیا۔ انہوں نے یہ تمام کام اتنی برق رفتاری سے کیا کہ کسی کو دیکھ کر کچھ سمجھنے اور پوچھنے کا موقع نہیں ملا کہ وہ مریض کون ہیں اور انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟

دونوں ایمبولینسیں وہاں سے آگے بڑھ کر دو مختلف راستوں پر

جانے لگیں۔ ثنا اس ایمبولینس میں تھی جس میں پورس کو لے جایا جارہا تھا۔ ثانی نے دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو کر پارس کو تمام حالات بتائے۔ پارس نے کہا "اس بات کا خاص خیال رکھو کہ پورس کے ہوش میں آنے کے ایک دو گھنٹے بعد ناصرہ کو ہوش آئے۔ اگر وہ پہلے ہوش میں آئے گی تو نیلماں اس کے ذریعے پورس پر کیے ہوئے تنویمی عمل کو مٹانے نہیں دے گی۔ جب تک پورس پر ہمارا تنویمی عمل مکمل نہ ہو' تب تک ناصرہ ہوش میں آئے تو اسے دوبارہ بے ہوش کردو۔"

ایمبولینس ایک بنگلے کے احاطے میں پہنچ گئی۔ دو افراد اس کا اسٹریچر اٹھا کر اندر گئے پھر ایک کمرے کے بیڈ پر اسے لٹا دیا۔ ثانی نے ثنا سے کہا "تم پورس کے پاس رہو۔ اپنے ابو سے کہو کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے وہاں موجود رہیں۔ پورس کو ہوش آنے لگے تو اس کے دماغ کو ٹرانس میں لیں۔ دماغی کمزوری کے باعث اس پر تنویمی عمل کیا جاسکے گا۔ تمہارے ابو اس کے دماغ سے ناصرہ کے تنویمی عمل کو مٹا دیں گے۔ ان سے کہنا کہ وہ پورس کو صرف ایک گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کی ہدایت دیں۔"

"صرف ایک گھنٹے تک کیوں؟"

"ہم اس وقت تک ناصرہ اور نیلماں کو کنٹرول کریں گے ورنہ وہ نیلماں کے زیرِ اثر رہ کر پورس کے دماغ میں آکر تمہارے ابو کے تنویمی عمل کو ناکام بنا دے گی۔"

"میں سمجھ گئی۔ ابھی ابو کو یہاں بلاتی ہوں۔"

"تم باپ بیٹی کے پاس ٹیلی پیتھی کا ہتھیار ہے۔ وہاں تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود دو مسلح گارڈز بنگلے کے باہر ہیں۔ اس کے علاوہ پاپا اپنی ضروری مصروفیات سے نمٹ کر تمہارے پاس آئیں گے۔ میں ناصرہ کے پاس جارہی ہوں۔"

ثانی چلی گئی۔ ثنا نے اپنے باپ سے رابطہ کر کے ناصرہ اور پورس کے بارے میں بتایا۔ جلال پاشا نے خوش ہو کر کہا "فرہاد صاحب اور ان کی فیملی کے افراد زبان کے دھنی ہیں اور جب کہتے ہیں تو دوستی نباہتے ہیں اور دلوں کو جیت لیتے ہیں۔ نیلماں جیسی چڑیل سے پورس کو نجات دلانا ممکن نہیں تھا لیکن انہوں نے چند گھنٹوں کے اندر اس چڑیل کی تمام چالوں کو ناکام بنا دیا ہے۔ میں تمہارے پاس آرہا ہوں مگر پہلے پورس کے دماغ میں جھانک کر دیکھ لوں۔"

اس وقت پورس کو ہوش آرہا تھا۔ جلال پاشا نے کہا "ثنا! یہ ہوش میں آرہا ہے۔ اس وقت دماغ ذرا کمزور رہتا ہے۔ میں تنویمی عمل کررہا ہوں۔ تم اس کمرے میں دماغی طور پر حاضر رہو۔"

جلال پاشا نے کہا "پورس! بیٹے پورس! میں تمہارا انکل پاشا بول رہا ہوں۔ ناصرہ یا نیلماں نے تمہارے دماغ کو لاک کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ تمہارا دماغ پوری طرح توانائی حاصل کرے اور پھر تنویمی عمل کے مطابق لاکڈ ہو جائے' اس کے تنویمی عمل کا توڑ کرنے کے لیے مجھ سے تعاون کرو۔ اپنے دماغ کو صرف میری آواز اور لب و لہجے پر مرکوز کردو۔"

پورس نے یہی کیا۔ جلال پاشا اس کے دماغ پر غالب آکر ناصرہ کے تنویمی عمل کا توڑ کرنے لگا پھر اسے ہدایات دیں "فرہاد اور اس کی فیملی کی محبت اور ان کے خلوص اور سچائی کی قدر کرو اور ان سے پیار و محبت کا رشتہ رکھو۔ ان الفاظ کے ساتھ اپنا عمل کررہا ہوں۔ تم ایک گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کے بعد بیدار ہو جاؤ گے۔ اب سو جاؤ۔"

جلال پاشا نے بیٹی کے پاس آکر کہا "خدا کا شکر ہے۔ میں نے کسی شیطانی مداخلت کے بغیر ناصرہ کے تنویمی عمل کا توڑ کیا ہے۔ پورس اب نیلماں کے سحر سے نکل چکا ہے۔ میں ناصرہ کے پاس جا کر دیکھنا چاہتا ہوں' وہاں کیا حال ہے؟"

ثنا نے ثانی کے پاس آکر کہا "ابو نے بھائی جان پر تنویمی عمل کا توڑ کردیا ہے۔ اس وقت میرے ساتھ ہیں۔"

ثانی نے کہا "السلام علیکم انکل!"

"وعلیکم السلام بیٹی! خدا تم سب کو خوش رکھے اور دشمنوں سے بھی محفوظ رکھے۔ تم سب ہمارے لیے باعثِ رحمت بن گئے ہو۔"

"انکل! ہم آپ کے ہی ہیں اور ہمیشہ آپ کے رہیں گے۔ ابھی پون گھنٹے پہلے ناصرہ کو ہوش آرہا تھا۔ ہم نے پھر اسے بے ہوش کردیا ہے۔ ثنا تم جاؤ اور پورس کے پاس دماغی طور پر حاضر رہو۔ انکل! آپ سے رابطہ ہوتا ہی رہے گا۔ ابھی بہتر یہ ہوگا کہ آپ وہاں ثانی کو تنہا نہ رہنے دیں۔ خیال خوانی کے ذریعے وہاں موجود رہیں۔"

وہ دونوں باپ بیٹی اس کا شکریہ ادا کر کے پورس کے پاس چلے گئے۔ ناصرہ کے کمرے میں ایک مسلح گارڈ تھا۔ اس بنگلے کے باہر بھی ایک گارڈ موجود تھا۔ ثانی وہاں خیال خوانی کے ذریعے ناصرہ کے حالات معلوم کرتی جارہی تھی۔

اس کمرے میں رہنے والے گارڈ نے کہا "میڈم! یہ کسمسا رہی ہے' کراہ رہی ہے۔ شاید ہوش میں آرہی ہے۔"

اس کی بات پوری ہونے تک ناصرہ نے آنکھ کھول دی۔ اس دوران میں نیلماں کی آتما اس کے اندر توانائی بحال کررہی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے پریشان تھی۔ اپنے مخالف کی چالوں کو ناکام بنانے کے لیے یہ سمجھ رہی تھی کہ ناصرہ کی بے ہوشی کے دوران میں مخالفین نے پورس کو اس کے تنویمی عمل سے نجات دلا دی ہوگی۔ اب وہ ناصرہ کو اپنے شکنجے سے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

ناصرہ نے نیلماں کی ہدایت کے مطابق اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر کہا "میرا حلق خشک ہورہا ہے۔ پلیز پانی پلاؤ۔"

ثانی نے گارڈ سے کہا "اسے پانی پلاؤ۔ میں اس کے دماغ میں رہوں گی۔"

گارڈ پانی لینے گیا۔ ثانی نے ناصرہ کے خیالات پڑھے۔ اس کے چور خیالات پڑھے نہیں جاسکتے کیونکہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ آئندہ کیا کرنے والی ہے۔ آئندہ کی شیطانی حرکتوں کے بارے میں صرف نیلاں کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟

گارڈ نے اسے گلاس میں پانی دے کر کہا "یہ لو۔ پانی پی لو۔"

ناصرہ بستر پر ایک کہنی ٹیک کر کمزوری سے اٹھ کر بیٹھ گئی پھر گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہی اچانک چھلانگ لگا کر گارڈ کی گردن میں بانہیں ڈال کر لیٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ ثانی اس کے دماغ کو جھٹکا پہنچا کر اسے گارڈ سے الگ کرتی، گارڈ کے حلق سے چیخ نکلی۔ ناصرہ نے اس کی گردن میں دانتوں کو پیوست کر کے اس کے جسم میں زہر پہنچا دیا تھا۔

نیلاں کی آتما کی شیطانی قوت اور دانتوں کی کوششوں سے ناصرہ نے سانس روکی تو ثانی کی سوچ کی لہریں ہر نکل گئیں۔ ثانی نے آخر کہا "مکرے میں جاؤ" فوراً ہی باہر کھڑے ہوئے گارڈز کے اندر اور رائفل سے ناصرہ کو صرف زخمی کرو۔"

وہ دوڑتا ہوا کمرے میں آیا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ ثانی نے کہا۔ "بیڈ کے نیچے اور دروازے کے پردے کے پیچھے دیکھو۔"

وہ بیڈ کے نیچے تلاش کرنے کے لیے جھکا۔ اسی لمحے میں ناصرہ دروازے کے پردے کے پیچھے سے چھلانگ لگا کر اس پر آئی اور آتے ہی اپنے دانت اس کے جسم میں پیوست کردیے۔ وہ چیخیں مارتا ہوا زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

ثانی اس دم توڑنے والے کے دماغ سے نکل کر پھر ناصرہ کے اندر آئی۔ اس نے سانس روک لی۔ ثانی نے فوراً ہی جلال پاشا سے کہا "نکل! ناصرہ ہاتھ سے نکلی جارہی ہے۔ نیلاں کی مدد سے سانس روک کر ہمارا راستہ روک رہی ہے۔"

جلال پاشا فوراً ہی خیال خوانی کی پرواز کرتا ہوا ناصرہ کے پاس گیا۔ ثانی نے مجھے مخاطب کیا "پاپا! ناصرہ نیلاں کی آتما غالب آگئی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس پر ہونے والے تخریبی عمل کا توڑ کرتے، وہ نیلاں کے زیر اثر ہو کر نکل گئی۔ ہم اس کے دماغ میں نہیں جاسکتے۔ وہ سانس روک لیتی ہے۔"

میں نے کہا "فی الحال اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ اس کی ایک کمزوری پورس ہمارے ساتھ ہے۔ اسے دل و جان سے چاہنے والی آئندہ اس تک پہنچنے کے لیے نیلاں سے لڑے گی۔ ابھی ہم سے دور بھاگ رہی ہے۔ بعد میں نیلاں سے بغاوت کرتی رہے گی اور پورس کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے تعاون کی محتاج رہے گی۔"

جلال پاشا بھی ناصرہ کے دماغ میں نہ جاسکا۔ اس نے واپس ثانی کے پاس آکر میری باتیں سنیں اور میری تائید کی۔ اس نے تسلیم کیا کہ ناصرہ دیوانگی کی حد تک پورس کو چاہتی ہے۔ فی الوقت نیلاں کے زیر اثر فرار ہوگئی ہے لیکن اپنے ناشتے کے لیے آئندہ نیلاں سے بغاوت کرے گی۔

○☆○

ایک ہیلی کاپٹر اس گمنام جزیرے کے چاروں طرف پرواز کررہا تھا۔ چار مسلح گارڈز کے درمیان شیڈو قیدی بنا ہوا بلندی سے اس جزیرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں کی ویران زمین پر ایک درخت بھی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی انسان نظر آرہا تھا۔ جزیرے کے وسط میں ایک بڑا سا کابچ تھا۔ ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا اس کابچ کی چھت کے اوپر بلندی پر آیا۔ وہاں سے رسیوں کی ایک سیڑھی لٹکائی گئی پھر شیڈو کو گن پوائنٹ پر اترنے کے لیے کہا گیا۔ اس کی پشت پر ایک کٹ بندھی ہوئی تھی۔ اس کٹ میں اس کی ضرورت کا کچھ سامان تھا۔ باقی کھانے پینے کا تمام ضروری سامان پہلے ہی کابچ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

وہ سیڑھی سے اترتا ہوا چھت پر آگیا۔ سیڑھی کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا وہاں سے دور جانے لگا۔ شیڈو دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر چھت پر کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ مسکرانے لگا۔ ایک ویران جزیرے میں تماشائی بن کر رہنا تھا لیکن اس عادی مجرم کو کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ اس کے لیے تنہائی فائدہ مند تھی۔ اگر اس کے ساتھ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اسے قتل کرکے اس کے حصے کا راشن استعمال کرتا۔ اس کے لیے ایک ہفتے کا راشن اور پانی تھا۔ وہ دوسرے کو قتل کرتا تو دو ہفتے کا راشن اور پانی لے کر تیسرے کو مل جاتا۔

وہ چھت سے اتر کر برآمدے میں آیا پھر اس کابچ کو اندر اور باہر سے اچھی طرح دیکھنے لگا۔ علی نے اسے ایک موبائل فون دیا تھا تاکہ وہ عالمی شہرت رکھنے والے مجرموں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکے۔ اخبارات، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کو انٹرویو دے سکے۔ اپنے بے شمار جرائم کا احوال سنا سکے اور یہ کہتا رہے کہ اس جیسے سفاک اور درندہ صفت مجرموں کو پھانسی نہ دی جائے۔ الیکٹرک چیئر پر بٹھایا جائے اور نہ انہیں گولیوں سے چھلنی کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ وہ ظالمانہ سلوک کیا جائے جیسے شیڈو کے ساتھ کیا جارہا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد اسے بھوکا پیاسا رہنا پڑتا۔ وہاں سے فرار ہونے کی کوششیں ناکام رہتیں کیونکہ کابچ کے چاروں طرف بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے وقت جہاں بھی ایک غلط قدم پڑتا، بارودی دھماکے سے اس کے جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے۔

اگر ٹی وی پر ایسا منظر دکھایا جاتا کہ ایک بھوکا پیاسا شخص ایک ایک دانے، ایک ایک قطرہ پانی کے لیے ترستا ہوا نڈھال سا ہو کر ساحل کی طرف جانے کے لیے اور موت سے لڑ کر زندگی بچانے کے لیے بارودی سرنگوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ اس کا ہر قدم کسی لمحے میں بھی نادیدہ بارودی سرنگ پر پڑنے والا ہے تو ایسے منظر کو دیکھنے والوں کے دل دہلتے رہیں گے اور جب اچانک ہی دھماکا اور آگ اور دھوئیں کے ساتھ اس کے جسم کے ٹکڑے فضا میں اڑیں گے تو بڑے بڑے خطرناک مجرم یہ منظر دیکھ کر عبرت حاصل کریں گے۔"

شیڈو نے کابچ کے باہر آکر دیکھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ کابچ کے چاروں طرف چھ گز تک یعنی اٹھارہ فٹ تک کوئی بارودی سرنگ نہیں ہے۔ اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ جب چاہے کابچ کے چاروں طرف اٹھارہ فٹ تک چہل قدمی کرسکتا ہے۔ وہ اس کے طور پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا ٹہلنے لگا۔ وہاں چاروں طرف اٹھارہ فٹ تک زمین صاف تھی۔ اس کے بعد کہیں جھاڑیوں کو کاٹ کر اور کہیں ریت اور بجری بچھا کر جزیرے کی اصل زمین کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس طرح یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کتنی ہوئی جھاڑیوں، ریت اور بجریوں کے نیچے کہاں کہاں بارودی سرنگ بچھی ہوئی ہے۔

اسے جو موبائل فون دیا گیا تھا اس کے ساتھ دو فاضل بیٹریاں بھی دی گئی تھیں۔ وہ صبح نو بجے سے شام چار بجے یعنی سات گھنٹے تک فون، کا پاور آن رکھ سکتا تھا۔ وہاں سے کسی کو بھی کال کرسکتا تھا اور کوئی بھی کال ریسیو کرسکتا تھا۔ اس نے علی سے رابطہ کیا اور کہا "فضول معلوم ہوچکا ہوگا کہ مجھے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نے کابچ کے چاروں طرف اٹھارہ فٹ کے فاصلے تک چہل قدمی کی ہے۔ کھانے پینے کا سامان بھی چیک کیا ہے۔ مجھے ایک ہفتے کے بعد بھوکا پیاسا رہ کر یہاں مرنا ہے یا جان ہتھیلی پر رکھ کر بارودی سرنگوں کے درمیان سے گزرنا ہے۔ اگر میں آدھا پیٹ کھانا کروں تو یہاں دو ہفتوں سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہوں لیکن دو ہفتے زندہ رہوں یا تین ہفتے، اس کے بعد تو مرنا ہی ہے۔"

علی نے کہا "میں نے عبرت ناک موت کی سزا دی ہے اور یہاں سے نکلنے کا بھی موقع دیا ہے۔ اپنی مدد کے لیے بے شمار مجرموں کو بلانے کے لیے موبائل فون کی سہولت بھی دی ہے۔ بڑے بڑے مجرموں کے حکمران تمہارے ذریعے بڑی بڑی اہم سماجی اور سیاسی شخصیات کو قتل کراتے تھے۔ ان سب کے فون نمبرز تمہاری ڈائری میں درج ہیں۔"

"میں مانتا ہوں، تم نے میری موت سے پہلے بڑی سہولیات فراہم کی ہیں لیکن تم نے ایک اہم اور قانونی بات مجھ سے نہیں پوچھی۔"

"کون سی بات؟"

"کسی کو پھانسی دینے یا گولی مارنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔"

"بے شک" میں نے تمہاری آخری خواہش نہیں پوچھی۔ اب پوچھ رہا ہوں۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں، تم ایسے انتظامات کرو کہ اس جزیرے کے چاروں طرف ساحل پر کوئی میری مدد کے لیے نہ آئے۔"

"تعجب ہے، تم کسی کو بھی مدد کے لیے نہیں بلاؤ گے؟"

"کسی کو نہیں بلاؤں گا۔ میری مدد کو آنے والوں میں میرا کوئی دشمن بھی ہوسکتا ہے۔ میرے فرار ہونے کے لیے جو موٹر بوٹ ساحل پر ہے، میرا کوئی دشمن اس بوٹ میں کوئی خرابی پیدا کرسکتا ہے۔"

"یعنی تمہیں یقین ہے کہ تم بارودی سرنگوں سے گزر کر زندہ سلامت اس موٹر بوٹ تک پہنچ سکو گے؟"

"یہ بعد کی بات ہے کہ میں ساحل پر موٹر بوٹ تک پہنچ سکوں گا یا نہیں، لیکن تم میری آخری خواہش پوری کردو۔ کسی انسان کو تو کیا، کسی کتے کو بھی اس جزیرے کے ساحل تک نہ آنے دو۔"

"میں تمہاری دلیری کی داد دیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ وہاں ساحل تک کوئی نہیں جاسکے گا اور تم وہاں سے موٹر بوٹ لے جاؤ گے تو تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ اس ساحل سے بیس کلو میٹر تک تم آزاد رہو گے، یعنی بیس کلو میٹر کے اندر ساری زندگی رہو گے تو تم پر ایک گولی بھی نہیں چلائی جائے گی اور نہ ہی کسی کو کھانے پینے کی امداد کی اجازت دی جائے گی۔ ہم دیکھیں گے کہ کھلے سمندر پر تم موٹر بوٹ میں بھوکے پیاسے کب تک زندہ رہ سکو گے۔"

"بے شک تم دیکھو، میں تماشے دکھاؤں گا اور وہاں تمہارے اس موبائل فون کا منتظر ہوں۔ میں اسے بند کررہا ہوں۔ آئندہ یہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی آن نہیں رہے گا۔ نہ میں کسی سے رابطہ کروں گا اور نہ ہی کوئی اس بند رہنے والے فون پر مجھ سے رابطہ کرسکے گا۔ ریشں آل۔"

اس نے موبائل کو آف کیا پھر اس کی بیٹری بھی نکال کر باہر پھینک دی۔ علی نے فون کے ذریعے بابا صاحب کے ادارے کو پیغام دیا کہ میں اس سے رابطہ کروں۔ جب مجھے اس کا پیغام ملا تو میں نے اس کے دماغ میں آکر پوچھا "کیا بات ہے بیٹے؟ کوئی پرابلم ہے؟"

"تو پاپا! میں نے شیڈو کو اس جزیرے میں پہنچا دیا ہے۔ اسے پیش آنے والی موت سے خوف زدہ ہونا اور فکرمند ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بہت مطمئن ہے۔ اس نے آخری خواہش بیان کی ہے کہ جزیرے کے ساحل تک کسی کو بھی مدد کے لیے آنے نہ دیا جائے کیونکہ مدد کو آنے والوں میں کوئی دشمن بھی ہوسکتا ہے اور اس موٹر بوٹ میں کوئی خرابی پیدا کرسکتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے کہا "شیڈو بہت پُراعتماد ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ بارودی سرنگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اس ساحلی موٹر بوٹ تک پہنچ جائے گا۔"

"پاپا! کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے؟"

"میں نے اس کے خیالات پڑھے تھے۔ پتا چلا، وہ بہت چال باز ہے اور بہترین منصوبہ ساز ہے۔ اُن فون اور ہائیڈ اینڈ سیک یعنی تھامن آوین تقریباً بارہ برس سے اس کے منصوبوں پر عمل کرتے ہوئے بے انتہا دولت مند بنتے رہے۔ آخری بار انہوں نے شیڈو

مرضی کے خلاف مجھے قتل کرانے کا بھاری معاوضہ کئی ممالک سے وصول کیا۔ شیڈو... علم نجوم کا ماہر ہے۔ اس نے مجھے قتل کرانے کے نقصانات کی پیش گوئی کی اور صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے قتل کرانے کے معاوضے میں حصے دار نہیں بنے گا۔"

"پھر تو وہ آپ کا اور ہمارا مجرم نہیں ہے۔ اسے صرف اس بات کی سزا دی جاسکتی ہے کہ وہ اَن نون اور تھارن آوین کے ساتھ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔"

"ہاں ہمیں چاہیے کہ اسے موت کی سزا نہ دیں اور اس ویران جزیرے میں مرنے کے لیے نہ چھوڑیں۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ چال باز اس جزیرے سے کس طرح زندہ سلامت نکلے گا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ بم ڈسپوزل کا ماہر ہے۔ کسی قسم کا بھی بم ہو' وہ اسے ناکارہ بنا دیتا ہے لیکن جزیرے کے چپے چپے پر بارودی سرنگیں بچھائی گئی ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آخر کتنے چھپے ہوئے بموں کو تلاش کر سکے گا؟ کتنے بموں کو ناکارہ بنا سکے گا؟ ایسا کرنے کے لیے ہفتوں گزر جائیں گے اور اسے تو دوسرے ہفتے میں ہی بھوک پیاس سے مرجانا ہے۔"

"پاپا! پھر تو یہ بڑا ہی دلچسپ تماشا ہوگا۔ اگر وہ کانیج سے زندہ سلامت ساحل تک آجائے گا تو میں اسے ایک خطرناک چال باز تسلیم کرلوں گا۔"

"صرف چال باز تسلیم کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ ایک تو وہ مجھے قتل کرانے والوں کا ساتھ نہیں دے رہا اور نہ ہی اس سلسلے میں معاوضے کی کوئی رقم لے رہا تھا۔ میرے نقطہ نظر سے اس نے ماضی میں جتنے جرائم کیے ہیں' اس کی سزا ابھی اسے دی جارہی ہے۔ اگر وہ موت سے لڑتا ہوا ساحل تک پہنچے گا تو اسے ناممکن کو ممکن بنانے کا انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ جرائم سے توبہ کرے گا تو اسے آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔"

"آپ کہتے ہیں پاپا تو یہی ہوگا۔ اگر وہ کانیج سے ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گا تو میں ہیلی کاپٹر میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔"

"میں ٹائی سے کہوں گا کہ خیال خوانی کے ذریعے اس کی چالبازیوں پر نظر رکھے لیکن اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ مجھے موقع ملتا رہے گا تو میں بھی شیڈو کے دماغ میں جھانکتا رہوں گا۔"

"جی ہاں مجھے اور فہمی کو معلوم رہنا چاہیے کہ وہ وہاں سے نکلنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔"

"کیا وہ جزیرے میں ضروریات کا بہت سامان لے گیا ہے؟"

"جی نہیں۔ اس کی کٹ میں بہت مختصر سا سامان تھا۔ آپ سامان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بیٹے! ابھی میں کہہ چکا ہوں' وہ بم ڈسپوزل کا ماہر ہے۔ وہ اپنے سامان میں ڈی ٹیکٹو آلہ لے کر گیا ہوگا۔"

"نہیں پاپا! میں نے اس کا سامان چیک کیا تھا۔ بارودی سرنگوں کے دھماکا خیز بارود یا سٹک کے خول میں ہوتے ہیں۔ انہیں تلاش کرنے کے لیے مختلف ڈی ٹیکٹو آلات ہوتے ہیں۔ ان آلات میں سے ایک آلہ بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔"

"پھر تو وہ کمال کا چال باز ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کب تک ساحل تک آئے گا۔ میں جارہا ہوں۔ کسی وقت اس کے دماغ میں جھانکوں گا۔"

میں علی کے دماغ سے چلا آیا۔ میں نے الپا پر شبہ نہیں کیا کیونکہ علی اسرائیلی اکابرین کو بھی سزائیں دے چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے اکابرین کی سلامتی کے لیے شیڈو کی زندگی اور موت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھے گی۔

لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ غیر معمولی صلاحیتوں والے افراد کو اپنا معمول اور تابع بنالینا تھی۔ اس نے تھارن آوین جیسے خطرناک پیٹائٹر کرنے والے اور مقناطیسی آنکھیں رکھنے والے کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی مگر خود اس کی کنیزوں اب شیڈو جیسے علم نجوم کے ماہر' مکار منصوبہ ساز اور بم ڈسپوزل کے ماہر کو اپنا تابع بنانے کے منصوبے پر عمل کر رہی تھی۔ دراصل تھارن اس کے ذریعے اپنے ساتھی شیڈو کو آزمانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھتی رہے کہ وہ کانیج سے نکل کب تک ساحل پر پہنچنے والا ہے۔

شیڈو پہلے دن نہایت اطمینان سے کانیج کی چھت پر چہل قدمی کرتا رہا اور ساحل تک دیکھتا رہا۔ جزیرہ چھوٹا تھا۔ ساحل تک تھا۔ کانیج سے اس کا فاصلہ ایک کلومیٹر سے کم ہوگا۔ چھت پر سمندر اور ساحل نظر آرہے تھے۔ شام کو سردی کا احساس ہوا چھت سے اتر آیا۔ کچن میں جا کر اپنے لیے دو کپ چائے بنائی برآمدے میں چائے لے آیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا ریڈیو اور کر ریکارڈر تھا۔ وہ ریکارڈر کو آن کر کے گیت اور موسیقی سننے لگا۔

اس وقت اس کے دماغ میں ٹائی اور الپا تھیں۔ دونوں خاموش تھیں اس لیے انہیں ایک۔ دوسرے کی موجودگی کا علم تھا۔ وہ دونوں حیران تھیں کہ وہ موت کے جزیرے میں کرسی پر چائے پیتے ہوئے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے ایسا تھا جیسے ایک چنگی بجائے گا اور موت ٹل جائے گی۔

وہ چائے پینے کے بعد برآمدے سے باہر آکر کانیج کے چاروں طرف ٹہلنے لگا۔ جب شام کے سائے گہرے ہوگئے اور تاریکی چھانے لگی تو اس نے ماچس کی تیلی سے کیروسین لیمپ جلایا۔ وہاں اور گیس لائٹ اور لالٹین بھی تھی لیکن ایک تنہا شخص کے لیے ایک ہی روشنی کافی تھی۔ اسے تو کھانے پینے کے بعد سو جانا تھا۔ اسے لیے کیروسین لیمپ کی بھی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

رات ہوتے ہی ٹائی اور الپا اس کے دماغ سے چلی گئی تھیں۔

ہوائی خطرناک وارداتیں رات ہی کو ہوا کرتی ہیں لیکن جزیرے پر قرار ہونے کے لیے دن کی روشنی لازمی تھی۔ وہ بارودی سرنگیں دن ہی کو تلاش کرنے سے دکھائی دے سکتی تھیں۔ رات کو کچھ دکھائی دیتیں اور کچھ آنکھ مچولی کھیل کر اس کی موت کا سبب بن جاتیں۔

رات کو ٹائی ایک بار پھر اس کے دماغ میں آئی۔ اس وقت وہ وہسکی شراب واڈکا پی رہا تھا۔ اس کے خیالات نے بتایا کہ وہ پینے کے بعد رات کا کھانا کھائے گا پھر سو جائے گا۔ ٹائی نے اسے مخاطب کیا "ہیلو مسٹر شیڈو! میں علی کا پیغام لے کر آئی ہوں۔"

وہ ایک گھونٹ پی کر بولا "اس جزیرے میں دنیا بھر کے پیغامات آئیں گے۔ صرف طبعی عمر تک زندہ رہنے کا پیغام نہیں آئے گا اسی لیے میں نے موبائل فون بند رکھا ہے۔"

وہ بولی "انسان جیتا ہے بڑی احتیاط سے اور مرتا ہے بے احتیاطی سے۔ تم بہت محتاط' بہت چالاک ہو۔ یہ بتاؤ خود کو ذہانت یا چالاکی سے بچا کر ساحل تک پہنچ گئے اور پھر سمندر پار کر کے کسی ملک میں داخل ہو گئے تو اس کے بعد کیسی زندگی گزارو گے؟"

"تمہاری طرح کیسی ٹیلی پیتھی جاننے والی ہستیاں مجھے کہیں روپوش ہونے نہیں دیں گی۔ دنیا کے بدترین گوشے میں جا کر چھپنا چاہوں گا' وہاں سے نکال لائیں گی۔"

"بارودی سرنگوں کے درمیان سے گزرنا کیسے ممکن نہیں ہے اور تم جیسے ناممکن کو ممکن بنانے والے ہو۔ کیا ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں کر سکو گے۔"

اس نے واڈکا کی بوتل اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا "شاید بچاؤ کی تدبیر کرلیتا... مگر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔"

"کیا شراب زندگی سے زیادہ قیمتی ہے؟"

"شراب لاکھ قیمتی ہو' لیکن زندگی نہیں رہے گی تو اسے پیے گا کون؟ اب میں زندہ رہنے کے لیے اسے چھوڑوں تو ایک ہفتے میں موت کی مشقیں کر کے اپنے دماغ میں آنے والوں کو نہیں روک سکوں گا۔"

"اگر ہم تمہیں اتنے عرصے تک زندہ رہنے کا موقع دیں کہ تم شراب چھوڑ کر یوگا کرتے رہو اور اپنے دماغ سے پرائی سوچ کی لہروں کو روکنے کے قابل ہو جاؤ تو کیسی رہے گی؟"

"علی تیمور نے مجھے موت کی سزا دی ہے اور تم زندگی دینے کی بات کر رہی ہو؟"

"فیصلے بدلے جاسکتے ہیں۔ تمہارے خیالات کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ہمارے پاپا کے قتل کی سازش میں تم شریک نہیں تھے بلکہ اَن نون اور تھارن آوین کو بھی یہ قدم اٹھانے سے منع کرتے رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ تم بم ڈسپوزل کے ماہر ہو۔ تم نے سچی پیش گوئی کی تھی کہ پاپا کو قتل کرانے کی سازش کرنے والے آئندہ مصائب میں گرفتار ہوں گے۔ تمہاری پیش گوئی درست ثابت ہو رہی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ تم بم ڈسپوزل کے ماہر ہو۔ تمہارے جیسے قابل اور چالاک شخص کو مرنا نہیں چاہیے۔"

"تو پھر جینا چاہیے؟"

"ہاں لیکن اسی شرط پر کہ آئندہ مجرمانہ زندگی نہیں گزارو گے۔ اگرچہ تم پاپا کو قتل کرانے کی سازش کے خلاف تھے تاہم ماضی میں قتل اور ڈکیتی جیسے بڑے بڑے جرم کرتے رہے ہو۔ آئندہ زندہ رہ کر ان جرائم کی تلافی کرو گے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو انسانیت کی بہتری کے لیے استعمال کرو گے تو تمہاری موت کی سزا ختم کر دی جائے گی۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شیشے کے جام کو سامنے دیوار پر مار کر چکنا چور کرتے ہوئے کہا "یہ دیکھو بارودی سرنگ سے میرے جسم کے جتنے ٹکڑے ہوتے' اس سے زیادہ میں نے جام کے ٹکڑے کر دیے اور شراب بہا دی۔" اس نے کھلی ہوئی بوتل کو الٹ کر شراب کو بہاتے ہوئے کہا "اس سے اچھی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ میں زندہ رہ کر اپنی پچھلی تمام برائیوں سے زیادہ نیکیاں کرتا رہوں اور تمام انسانوں کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہوں۔ یوگا کی مشقیں کرتے کرتے ایک دن دماغی طور پر اس قدر مستحکم ہو جاؤں کہ دشمنوں کی سوچ کی لہریں میرے دماغ میں نہ آسکیں۔"

"میں تمہاری باتوں سے اور تمہارے چور خیالات سے سمجھ رہی ہوں کہ تم سچے دل سے توبہ کر رہے ہو۔ تمہیں زندہ رہنے کا موقع ملے گا تو ایک اچھے کردار کے مالک بنو گے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ کل دن میں گیارہ بجے ہمارا ایک ہیلی کاپٹر کانیج کی چھت پر آئے گا۔ تم رسیوں کی سیڑھی سے چڑھ کر اس ہیلی کاپٹر میں علی تیمور کے پاس جاؤ گے۔ اگر ہماری پناہ میں محفوظ رہنا چاہو گے تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ ورنہ تم جہاں جانا چاہو گے' تمہیں آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔"

"فرہاد صاحب اور علی صاحب کے سائے میں یقینی طور پر تحفظ حاصل ہوگا۔ علی صاحب جو کہیں گے' میں اس پر عمل کروں گا۔"

"تم اب تک ایک مجرم کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ انشاء اللہ آئندہ ایک اچھے اور سچے انسان کی طرح نمایاں مقام حاصل کرو گے۔ اب رات کا کھانا کھا کر آرام سے دن چڑھے تک سوتے رہو۔ کل گیارہ بجے تمہیں یہاں سے لے جانے کے لیے ہیلی کاپٹر آئے گا۔ میں جارہی ہوں۔"

ٹائی "شب بخیر" کہہ کر چلی گئی لیکن وہ شب محفوظ اور بخیر نہیں تھی۔ ان کی گفتگو کے دوران میں الپا' شیڈو کے دماغ میں پہنچی تھی اور خاموشی سے اس کی اور ٹائی کی باتیں سنتی رہی تھی۔ ٹائی کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہ کر اس کے خیالات پڑھتی رہی۔ اس کے خیالات بتا رہے تھے کہ وہ سچ مچ مجرمانہ زندگی نہیں گزارے گا اور علی تیمور کی ہدایات کے مطابق باعزت طور پر

ایک نئی زندگی گزار رہا ہے گا۔

وہ اپنے نئے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوا وہاں سے اٹھ کر کچن میں جا کر سیل بند ڈبے کا کھانا گرم کر کے کھانا چاہتا تھا۔ الپا اس کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے دوسرے کمرے کے بیڈ پر لے گئی۔ وہاں اسے چاروں شانے چت لیٹنے پر مائل کیا۔ اس نے اس کی مرضی کے مطابق بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں پھر ٹیلی پیتھی کی لوری سنتے سنتے گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

تھارن آوین نے الپا کو اپنی تابع کنیز بنا رکھا تھا۔ وہ تھارن کے پاس آ کر اسے شیڈو اور جزیرے کے حالات بتا چکی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ ثانی بھی شیڈو کے دماغ میں آتی ہے۔ علی تیمور نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ اب وہ اسے سزائے موت نہیں دے گا بلکہ دوسرے دن گیارہ بجے کانیج کی چھت کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا آئے گا اور شیڈو کو اس جزیرے سے بخیریت لے جائے گا۔

تھارن نے کہا "وہ وقت آنے میں ابھی انیس گھنٹے باقی ہیں۔ تم اس پر تنویمی عمل کر کے اس کے دماغ کو لاک کر دو... تاکہ ثانی اور فرہاد وغیرہ اس کے اندر نہ آ سکیں پھر اسے حکم دو، جس چالاکی سے وہ بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنا کر ساحل تک پہنچنے والا تھا، وہی حکمتِ عملی رات کو اختیار کرے اور تنویمی نیند سے بیدار ہوتے ہی وہاں سے نکل کر ساحل تک چلا جائے۔"

الپا نے کہا "وہ رات کے وقت بارودی سرنگوں کو ناکارہ کیسے بنائے گا؟ اگر ایک بھی بارودی سرنگ کہیں چھپی رہ گئی... تو شیڈو یا تو ہلاک ہو جائے گا یا ہاتھ پاؤں سے اپاہج بن کر رہ جائے گا۔"

"علی تیمور کے زیرِ سایہ جانے سے بہتر ہے کہ وہ مر جائے۔ اگر صرف زخمی اور اپاہج بن جائے تو تم ٹیلی پیتھی کے ذریعے اسے ہلاک کر دینا۔ وہ زندہ ثابت و سالم رہے گا تو ہمارے کام آ سکے گا۔ جاؤ، ابھی اسے اپنا معمول اور تابع بناؤ۔"

اس کے حکم کے مطابق وہ شیڈو کے خوابیدہ دماغ میں آ کر عمل کرنے لگی۔ جتنی ضروری باتیں تھیں، وہ سب اس کے دماغ میں نقش کرنے کے بعد حکم دیا کہ وہ ایک گھنٹے تک تنویمی نیند پوری کرنے کے بعد کانیج سے ساحل تک جانے کی اپنی حکمتِ عملی کے مطابق کام شروع کر دے گا۔

وہ تنویمی عمل مکمل کر کے دماغی طور پر تھارن آوین کے پاس حاضر ہوئی۔ اسے بتایا کہ اس نے شیڈو کے دماغ میں کیسے کیسے احکامات نقش کیے ہیں۔ تھارن نے پوچھا "وہ ہیلی کاپٹر کہاں ہے، جو شیڈو کو وہاں سے لیبیا لے جائے گا؟"

"ہمارے اس ہیلی کاپٹر پر کالا رنگ کر دیا گیا ہے۔ وہ سسلی کے ایک ویران علاقے میں ہے۔ اس کا پائلٹ اور گن مین ہمارے حکم کے منتظر ہیں۔"

"ابھی دیکھتے ہی دیکھتے ایک گھنٹا پورا ہو جائے گا۔ پائلٹ اور گن مین سے کہو، وہ تیار رہیں۔ شاید دو گھنٹے کے اندر انہیں پرواز کرنا ہو گا۔ جب تک ہمارا مقصد پورا نہ ہو، تمہیں خیال خوانی کے ذریعے ان سب کے پاس جاتے رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ثانی، فرہاد پھر کسی کام سے شیڈو کے دماغ میں آئیں۔ اس طرح انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے شیڈو کے دماغ کو لاک کر دیا ہے۔ شیڈو اپنے دماغ میں انہیں نہیں آنے دے گا۔ اپنا مقصد پورا ہونے تک دشمنوں کو غافل رہنا چاہیے۔"

وہ تھارن کی کنیز اور حکم کی بندی بن چکی تھی پھر خیال خوانی کرتے ہوئے کبھی شیڈو کے خوابیدہ دماغ میں اور کبھی ہیلی کاپٹر پائلٹ اور چار گن مین کے پاس جا کر انہیں ہدایات دیتی رہی۔ اس جزیرے کے ساحل سے کس طرح شیڈو کو سیڑھی کے ذریعے ہیلی کاپٹر پر لانا ہے۔ اس کے دماغ کو لاک کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود علی تیمور کی ٹیلی پیتھی جاننے والی اس پر غالب آنا چاہے تو ایک انجکشن کے ذریعے اسے بے ہوش کر دیا جائے۔

شیڈو ایک گھنٹے بعد بیدار ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک یونہی لیٹا سوچتا رہا پھر اس نے الپا کے تنویمی عمل کے مطابق فیصلہ کیا کہ وہ اس جزیرے میں قیدی بن کر نہیں رہے گا۔ ابھی یہاں سے نکل کر ساحل پر کھڑی ہوئی موٹر بوٹ تک جائے گا۔

وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے سامان کی کٹ کھول کر اس میں سے ایک بڑی سی ٹارچ، ایک لانبے پھل والا چاقو اور ایک ڈیڑھ فٹ لانبا اور موٹا لوہے کا نکیلا سریا نکالا۔ کمرے میں لیمپ کی روشنی تھی۔ اس نے ٹارچ کو پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا۔ چاقو اور لوہے کے سریے کو ایک ہاتھ میں اور دوسرے ہاتھ میں لیمپ اٹھا کر باہر آیا۔ روشنی میں جہاں تک نظر آتا تھا، وہاں تک سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم ذہن میں دہرا رہا تھا۔ اس نے دن کو چھت پر سے بہت دور ساحل پر کھڑی ہوئی موٹر بوٹ کو دیکھا تھا۔ اب وہ کانیج سے ایک سیدھا راستہ ساحلی بوٹ تک بنانا چاہتا تھا۔ صرف دو یا تین فٹ چوڑا راستہ بنانے کے لیے اسے اتنی بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانا تھا جو موٹر بوٹ تک پہنچنے کی راہ میں حائل تھیں۔

ٹائم بم وغیرہ کو ناکارہ بنانے کے لیے بم سے منسلک تاروں کو سمجھ کر انہیں کاٹ کر الگ کرنا پڑتا ہے لیکن بارودی سرنگ میں کوئی تار نہیں ہوتا۔ یہ ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا کی طرح ہوتی ہے۔ بعض اتنی چھوٹی کہ اس ڈبیا کو ایک مٹھی میں چھپایا جا سکتا ہے لیکن اس ننھی سی ڈبیا میں خطرناک جان لیوا بارود بھرا ہوتا ہے جس پر دباؤ پڑتے ہی وہ پلاسٹک کی ڈبیا یا بارودی سرنگ ایک دھماکے سے پھٹ پڑتی ہے۔ کسی کے چیتھڑے اڑا دیتی ہے اور کسی کو اپاہج بنا دیتی ہے۔ یہ دنیا کا سب سے خطرناک اور سب سے سستا ہتھیار ہے۔ صرف تین ڈالر میں تیار ہو جاتا ہے۔

شیڈو ہر قسم کے ہوں کی کارکردگی کو سمجھتا تھا۔ بارودی سرنگوں کے متعلق یہ جاننا تھا کہ یہ پھٹ پڑنے کے بعد اپنے اطراف صرف تین یا چار فٹ تک تباہی پھیلاتی ہے۔ یعنی اسی کو ہلاک کرتی ہے جو لاعلمی میں اس پر پیر رکھتا ہے۔ وہ کسی بم کی طرح پوری بستی کو یا پورے ایک محلے کو تباہ کرنے کے لیے نہیں پھیلتی ہے۔

اس نے برآمدے میں ایک طرف لیپ رکھ کر دیوار پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہ سرخ اینٹوں سے تعمیر کی ہوئی دیوار تھی۔ وہ چاقو کو ایک طرف رکھ کر لوہے کے نکیلے سریے سے دیوار کو کھود کھود کر ایک ایک اینٹ نکالنے لگا۔ اس طرح تقریباً بیس اینٹیں نکالنے کے بعد وہ ہاتھوں میں چار چھ اینٹیں اٹھا کر کاریڈور سے اٹھارہ فٹ دور تک آیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ کاریڈور سے اٹھارہ فٹ کی دوری تک کوئی بارودی سرنگ نہیں ہے۔ اس حساب سے شیڈو بارودی سرنگوں سے چھ فٹ دور تھا۔ اس نے تمام اینٹیں زمین پر رکھ دیں پھر ایک اینٹ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چھ فٹ کی دوری پر پھینکا۔ جہاں وہ اینٹ جا کر گری، وہاں یک بارگی دھماکا ہوا۔ شیڈو بھاگ کر پیچھے چلا آیا۔ جبکہ بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں وہ اینٹ گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئی تھی، وہیں تین چار فٹ تک آگ کے شعلے بھڑک گئے تھے اور ایک ہی منٹ کے اندر دھیمے پڑتے جا رہے تھے۔ اس نے پھر آگے بڑھ کر دوسری اینٹ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس جگہ کا نشانہ لیا جہاں دھماکے سے چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔ اس نے گڑھے کے ساتھ والی زمین پر دوسری اینٹ کو پھینکا پھر ایک دھماکا ہوا، ایک گڑھے کے ساتھ دوسرا گڑھا بن گیا۔ دونوں مل کر چار فٹ چوڑے گڑھے بن گئے۔ وہ باقی اینٹیں بھی اسی حساب سے پھینکنے لگا۔ ہر دھماکے کے ساتھ زمین پر گڑھے بنتے گئے اور آگے دور تک چار فٹ چوڑے گڑھوں کا راستہ بنتا گیا۔ وہ ان گڑھوں سے گزر کر جاتا تو کسی بارودی سرنگ پر پاؤں نہ پڑتا۔

وہ لوہے کے نکیلے سریے سے دیواروں کو کھود کر اینٹیں نکالتا رہا اور گڑھوں میں سے گزر کر آگے کی سمت ایک ایک اینٹ پھینکتا رہا۔ ساحل کی طرف چار فٹ چوڑا راستہ بناتا رہا۔ ایسا اس کے دماغ میں رہ کر اس کی چال بازی کی معترف ہو رہی تھی۔ جب ساحل تک بارودی سرنگیں ناکارہ ہونے لگیں تو اس نے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے کہا "کم آن۔ وہ ساحل تک پہنچنے والا ہے۔ پرواز کرو۔"

وہ سب تیار تھے۔ ایک منٹ کے اندر ہی ہیلی کاپٹر کا پنکھا گردش کرنے لگا۔ دوسری طرف جزیرے سے مسلسل دھماکوں کی آوازیں گونجتی ہوئی سسلی اور اٹلی کے جنوبی حصوں کی طرف جا رہی تھیں۔ وہاں بابا صاحب کے ادارے کے جاسوس موجود تھے۔ انہوں نے فون پر علی تیمور کو اطلاع دی کہ شیڈو کو جہاں قید کیا گیا ہے، اس جزیرے سے مسلسل دھماکوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

علی تیمور نے مجھے فون پر مخاطب کیا۔ میں قاہرہ میں سنگریلا اور سونیا کی معرکہ آرائیوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے ثانی سے کہا "یہ میں بہت مصروف ہوں۔ تم فوراً شیڈو کے پاس جاؤ۔ اس جزیرے میں مسلسل دھماکے ہو رہے ہیں۔"

ثانی نے اسی وقت خیال خوانی کی پرواز کی۔ شیڈو کے دماغ میں پہنچنا چاہا۔ اس نے سانس روک لی۔ وہ حیرانی سے دماغی طور پر حاضر ہو کر پارس سے بولی "میں وہاں کے وقت کے مطابق رات کے آٹھ بجے اس کے دماغ میں گئی تھی۔ اس نے سچے دل سے تمام جرائم سے توبہ کی تھی۔ اس کے چور خیالات نے بتایا کہ وہ دل و جان سے تمام غلطیوں کی تلافی کرنے کے لیے آئندہ انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہے گا لیکن اب وہ اچانک دشمن کی طرح سانس روک کر مجھے اپنے دماغ میں کچھ بولنے کا موقع نہیں دے رہا ہے۔"

پارس نے کہا "اس نے تمہارے سامنے شراب کا جام توڑا۔ آئندہ نشہ نہ کرنے اور یوگا میں مہارت حاصل کرنے کا عہد کیا لیکن یہ ناممکن ہے کہ نشہ چھوڑتے ہی کوئی یوگا کا ماہر ہو جائے۔ کسی نے اس کے دماغ میں پہنچ کر تنویمی عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو لاک کیا ہے۔"

"مگر یہ معلوم کرنا ہوگا کہ کس نے اس کے دماغ کو لاک کیا ہے اور اس جزیرے میں مسلسل دھماکے کیوں ہو رہے ہیں؟"

"جب تک ہمارے جاسوس اس جزیرے کے ساحل تک نہیں جائیں گے، ہمیں اصل واقعے کا پتا نہیں چلے گا۔"

ثانی نے خیال خوانی کے ذریعے اٹلی میں رہنے والے اپنے ایک جاسوس سے کہا "اپنے ساتھیوں کی ایک ٹیم لے کر جتنی جلدی ہو سکے، ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس جزیرے پر جا کر پرواز کرو۔ ان دھماکوں کے باوجود اگر شیڈو نظر آئے تو اسے اٹھا کر لے جاؤ۔"

اس کی ہدایات کے مطابق تعمیل ہونے لگی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ شیڈو اپنے بنائے ہوئے گڑھوں میں سے گزرتا ہوا ساحل تک پہنچ گیا تھا۔ وہ موبائل فون کو استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن ایک سیاہ ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا آ گیا تھا جس میں سے رسیوں کی ایک سیڑھی لٹک رہی تھی۔ وہ ایک معمول اور تابع کی طرح اس سیڑھی پر چڑھتا ہوا ہیلی کاپٹر میں آ گیا۔

ثانی نے پھر ایک بار اس کے دماغ میں آنے کی کوشش کی۔ اس کے سانس روکنے تک اس نے ہیلی کاپٹر کے گردش کرتے ہوئے پنکھوں کی آوازیں سنیں پھر اپنے جاسوس کے دماغ میں پہنچی۔ پتا چلا اس جاسوس کی ٹیم کا ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا جزیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ بولی "شیڈو اب جزیرے میں نہیں ملے گا۔ اسے کوئی دوسرا ہیلی کاپٹر لے جا رہا ہے۔ اسے تلاش کرو۔"

اس جزیرے کے اطراف کے ممالک میں بابا صاحب کے ادارے

سے تعلق رکھنے والے جاسوس ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ثانی ان سب کے پاس جا کر کہنے لگی "فوراً ہیلی کاپٹر میں جاؤ۔ کوئی دشمن شیڈو کو ایک ہیلی کاپٹر میں اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ اسے کسی ملک کی بحری سرحد تک پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں گھیر لو۔"

اس کی ہدایات کے مطابق کئی ممالک سے ہیلی کاپٹرز پرواز کرنے لگے۔ دیر تک اور بہت دور تک دشمن ہیلی کاپٹر کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ سیاہ رنگ کا ہیلی کاپٹر رات کی سیاہی میں کہیں جا کر گم ہو گیا تھا۔

○☆○

میں سنگریلا کے ساتھ ریسلنگ آفس میں پہنچا تو تھا مس جیرالڈ نے سنگریلا کو دیکھا۔ اس کے نیگرو بنیان، چہرے اور جسم پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ دو گاڑیاں پیٹرول کی آگ سے بلاسٹ ہوئی تھیں۔ ہم وہاں سے اپنی سلامتی کے لیے بھاگ رہے تھے۔ بھاگتے کے دوران اوندھے منہ کیچڑ میں گر پڑا تھا۔ اب اس کا حلیہ قابلِ دید تھا۔

ہمارے ساتھ جانے والے چار پہلوانوں میں سے ایک بری طرح زخمی ہوا تھا۔ وہ دم کے سے چند سیکنڈ پہلے گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ اگر قریب پہنچ چکا ہوتا تو ضرور ہلاک ہو جاتا۔ دوری کے باعث صرف زخمی ہوا تھا۔ اس کے تین ساتھی پہلوان اسے اسپتال لے گئے تھے۔ انہوں نے فون کے ذریعے اپنے باس جیرالڈ کو تفصیل سے بتا دیا تھا کہ سونیا نے انہیں وہاں ہلاک کرنے کس طرح ان کی دو گاڑیاں تباہ کی ہیں اور ان کا ایک پہلوان بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ وہ اسے اسپتال میں لے آئے ہیں اور وہیں سے اطلاع دے رہے ہیں۔

جیرالڈ نے سنگریلا کو دیکھا۔ وہ میرے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور غصے سے تلملا کر کہہ رہا تھا "میں اس کمینی کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے اس طرح تڑپا تڑپا کر اور دوڑا دوڑا کر ہلاک کروں گا کہ....."

جیرالڈ نے کہا "ابھی تو وہ تمہیں دوڑا دوڑا کر بے حال کر رہی ہے۔ آئینہ دیکھو گے تو اپنا حلیہ دیکھائی دے گا۔ واش روم میں جاؤ اور غسل کر کے آؤ۔ میں اپنے ملازم سے ایک نئی نیکر اور بنیان منگوا دیتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر بولا "میں اسی گیلی نیکر اور بنیان میں رہوں گا۔ میرے سائز کا کپڑا کہیں ملتا نہیں ہے۔ مجھے سلوانا پڑتا ہے۔"

وہ واش روم میں چلا گیا۔ جیرالڈ نے مجھ سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے، سنگریلا کے ساتھ کب سے ہو؟"

"میرا نام فیصل درانی ہے۔ میں پاکستان میں ایک ٹیکسٹائل مل کا مالک ہوں۔ میرا قیام ہوٹل الحدیقہ میں ہے۔ وہیں ڈانسنگ ہال میں سنگریلا سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں ہم ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ ائرپورٹ پر سونیا کو پہچاننے کے لیے مجھے بھی ساتھ لے گیا تب سے میں دشمنی کے شعلے اور خون کی ہولی دیکھتا آ رہا ہوں۔"

"تم سنگریلا کے ساتھ اس کے بنگلے کی طرف گئے تھے۔ تم دونوں کی گاڑی اس بنگلے سے دور ہو گی۔ ہمارے پہلوانوں کی گاڑی اس بنگلے کے سامنے تھی۔ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ہماری گاڑی کو ریموٹ کنٹرولر بم سے تباہ کر کے بھاگی ہو گی مگر تمہاری گاڑی تو بہت دور تھی۔"

میں نے کہا "اس نے ریموٹ کنٹرولر بم سے گاڑیوں کو تباہ نہیں کیا ہے۔ اس نے پہلوانوں کی گاڑی کی نکی میں سوراخ کر کے پیٹرول کو بہایا ہو گا۔ وہ پیٹرول ڈھلان کی طرف بہتا ہوا ہماری گاڑی کی طرف آنے لگا۔ ہم نے اندھیرے میں بہتے ہوئے پیٹرول کو نہیں دیکھا۔ جب وہ ہماری گاڑی کے قریب آیا تو ہم نے اس کی بُو محسوس کی۔ اسی وقت پہلوانوں کی گاڑی کے نیچے آگ بھڑک اٹھی۔ وہ آگ پیٹرول کے ذریعے بہتی ہوئی ہماری گاڑی کی طرف آنے لگی۔ اسی وقت پہلوانوں کی گاڑی دھماکے سے پھٹ پڑی۔ ہم اپنی گاڑی چھوڑ کر تیزی سے بھاگتے ہوئے دور جانے لگے۔ اگر دور نہ جاتے تو اپنی گاڑی کے ساتھ ہمارے جسموں کے چیتھڑے اڑ چکے ہوتے۔"

جیرالڈ نے سر ہلا کر کہا "ہُوں۔ اس عورت نے بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ پہلے اس راستے کو دیکھا تھا اور حساب کیا تھا کہ اگلی گاڑی کی نکی سے پیٹرول بہے گا تو ڈھلان کے باعث وہ پیٹرول دوسری گاڑی تک جائے گا۔ اس نے ماچس کی ایک تیلی سے دو گاڑیاں تباہ کی ہیں۔ بہت باکمال عورت ہے۔"

میں نے کہا "سونیا نے پانچ گھنٹوں کے اندر سنگریلا کو دو زبردست جھٹکے دیے ہیں مگر یہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے، اس پر ردِعمل نہیں ہو رہا ہے۔"

"ہو رہا ہے مگر یہ ظاہر نہیں کر رہا ہے۔ اس کے باوجود لاشعوری طور پر جھنجلا رہا ہے۔ غصہ دکھا کر اپنے اس خوف کو دبا رہا ہے کہ پتا نہیں اب سونیا تیسرا حملہ کب اور کیسے کرے گی۔ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ میں نے اسی لیے اسے واش روم بھیجا ہے کہ غسل کرے گا تو دماغ کچھ ٹھنڈا ہو گا۔"

وہ غسل سے فارغ ہو کر آیا۔ سر سے پیر تک کپڑوں سمیت بھیگا ہوا تھا۔ جیرالڈ نے کہا "تولیے سے بدن پونچھ لو۔ گیلی نیکر اور بنیان نہ پہنو۔ سردی سے بیمار ہو جاؤ گے۔ کوئی بڑا سا تولیا لپیٹ لو۔ ملازم آدھے گھنٹے میں یہ کپڑے دھو کر اور سکھا کر لے آئے گا۔"

"سردی، گرمی اور برسات، کوئی موسم مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میرے کام آئیں۔ کسی طرح معلوم کریں، وہ... کہاں چھپی ہوئی ہے؟"

"سنگریلا! وہ کہیں چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ کھلے ائرپورٹ

پر تمہاری موجودگی میں وہاں سے گزر گئی۔ اگر اسے چھپنا ہوتا تو وہ تمہارے ہی بنگلے میں جا کر تمہیں نہ بلاتی۔ تمہیں اپنی ناکامی پر غصہ آرہا ہے۔ مجھے بھی اس بات کا غصہ ہے کہ تمہاری مدد کرنے کے نتیجے میں میرے دو پہلوان اسپتال پہنچ گئے ہیں۔ میں کل کی ریسلنگ میں لاکھوں ڈالر ہارنے والا ہوں۔ اتنے بڑے نقصانات کے باوجود میں غصہ برداشت کررہا ہوں۔ جانتے ہو کس لیے؟"

"ہاں جانتا ہوں۔ میں تمہاری طرف سے کل ریسلنگ رنگ میں جاؤں گا تو تمہیں لاکھوں کروڑوں ڈالرز کا فائدہ پہنچاؤں گا۔"

"اگر ذہنی طور پر نارمل نہیں رہو گے تو اپنے مخالف پہلوان سے کیسے جیت پاؤ گے؟ کیسے میرے نقصانات کی تلافی کرو گے؟ کیسے مجھے فائدہ پہنچاؤ گے؟"

"میں اس لمحے میں بھی کسی بھی مخالف پہلوان کو توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا ہوں۔ تم مجھے ایب نارمل نہ سمجھو۔"

"اگر نارمل ہو تو اپنے اندر سے غصہ نکالو اور کل رات ریسلنگ کے اختتام تک سونیا کو بھول جاؤ۔ اسے معلوم نہ ہونے دو کہ تم ابھی کہاں ہو اور آئندہ کس جگہ رہو گے۔"

"ایک تو میں یہ توہین برداشت کررہا ہوں کہ ایک عورت مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑا دوڑا کر بے وقوف بنا رہی ہے۔ اس پر تم کہہ رہے ہو کہ اسے میرا پتا ٹھکانا معلوم نہ ہو اور میں ایک عورت سے چھپ کر رہوں۔ اس سے بڑی توہین کیا ہوگی۔ کیا تم مجھے بزدلی سکھا رہے ہو؟"

"بزدل نہیں ہو' ایب نارمل نہیں ہو تو ذہانت سے کام لے کر سوچو کہ سونیا مکاری سے اپنے پیچھے دوڑا کر تمہیں ہر ہار ناکام بنا کر جھنجلاہٹ میں مبتلا کررہی ہے۔ جو جھنجلاہٹ اور غصے میں رہتا ہے اور دشمن کی چال بازی کو نہیں سمجھتا' اسے ایب نارمل کہتے ہیں۔ پلیز میری بات پر غور کرو' کیا نارمل لوگ تمہاری طرح سائے کے پیچھے دوڑتے ہیں یا اپنے مخالف کی چالوں کو سمجھتے ہیں؟"

"تمہاری بات پر غور کرنے سے یہی بات سمجھ میں آئے گی کہ کل رات ریسلنگ کے اختتام تک تقریباً میں گھنٹے تک ایک عورت سے چھپ کر رہنا اور ابدی توہین برداشت کرتے رہنا ہوگا۔"

"برداشت کرنے کی کوشش کرنے سے ہی اپنا غصہ اپنی بے عزتی برداشت کرنے کی عادت پڑتی ہے پھر یہ عادت بڑھ جائے تو یہ دماغ بڑے سکون سے سوچنے کے قابل ہوتا ہے کہ آج ملنے والی توہین کا انتقام کل کتنی زبردست حکمتِ عملی سے لیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "سنگیلا! ہماری ایک رات کی ملاقات ہے لیکن میں تم سے بہت لگاؤ محسوس کررہا ہوں۔ میری بات کو ایک ذرا عقل سے سوچو کہ نہ تمہاری توہین ہوئی ہے نہ شکست ہوئی ہے کیونکہ تم نے اس سے مقابلہ نہیں کیا ہے۔ جب وہ روبرو آتی اور تم سے مقابلہ کرتی تو بات جیت کا فیصلہ ہوتا۔"

جیرالڈ نے خوش ہو کر کہا "واہ مسٹر درانی! تم نے بہت ہی معقول اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات سمجھائی ہے۔ سنگیلا! اب اپنی عقل سے سمجھ کر بولو۔ تم نے اب تک اپنی جسمانی قوت اور فائٹنگ کا انداز اس پر آزمایا نہیں ہے۔ تمہارے مقابلے میں آئی تو ایک چپکلی کی طرح مرجاتی۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تمہارے خوف سے سامنا نہیں کررہی ہے۔ بزدل دشمن کی طرح دوری سے نقصان پہنچا کر بھاگ جاتی ہے۔"

بہت دیر بعد سنگیلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "تم واقعی اچھے دوست ثابت ہورہے ہو۔ تم نے میرے دماغ سے سارا غصہ اور نامعلوم سا بوجھ اتار دیا ہے۔ بے شک وہ میری نہیں' اپنی توہین کررہی ہے۔ آئندہ وہ جب تک روبرو مقابلے کے لیے نہیں آئے گی' میں خوا مخواہ اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔"

جیرالڈ نے اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر ہمارے پاس آکر پہلے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "مسٹر درانی! میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے مسٹر سنگیلا کے ذہن کو پُرسکون بنا کر اسے کل ریسلنگ رنگ میں مقابلے کے قابل بنا دیا ہے۔"

پھر اس نے سنگیلا کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں نے یہاں تمہاری معمولی سی فائٹ دیکھی ہے اور اپنے تجربات سے سمجھ لیا ہے کہ تم ایک ناقابلِ شکست ریسلر ہو۔ صرف کل رات تک اس بزدل سونیا کو بھول جاؤ اور پوری قوت و ذہانت سے کل مخالف پہلوانوں سے مقابلے کرو پھر ہم سب کو سونیا کو کسی طرح تمہارے روبرو مقابلے کے لیے لے آئیں گے۔"

سنگیلا نے کہا "تم اطمینان رکھو۔ میں اپنے مقابلے میں کل والے تمام پہلوانوں کو اپاہج بنا دوں گا۔"

غم و غصہ دھل گیا تھا۔ جیرالڈ کی یہ تشویش ختم ہوگئی کہ سنگیلا ایب نارمل رہ کر مخالف پہلوانوں سے کیسے مقابلہ کرے گا؟ اب یقین ہوگیا تھا کہ وہ پوری ذہنی دفاعی سے مقابلہ کرکے اسے کروڑوں ڈالر کا فائدہ پہنچائے گا۔

وہ خوش ہو کر اپنی ریوالونگ چیئر پر جا بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھ کر بولا "صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔ تم دونوں کو جا کر اطمینان سے سونا چاہیے۔ میں چاہوں گا کہ میں نے اپنے پہلوانوں کے لیے جو بنگلوں رہائش کے لیے حاصل کیے ہیں' ان میں سے ایک بنگلے میں تم دونوں رہو۔ اس چال باز عورت کو مسٹر سنگیلا کا پتا اور فون نمبر معلوم نہیں ہوگا۔ وہ خوا مخواہ پریشان نہیں کرے گی۔"

میں نے کہا "میرا قیام ہوٹل الحدید میں ہے۔ میں وہاں جا کر سو جاؤں گا۔"

سنگیلا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں دوست! جب ائیرپورٹ پر گولی چلائی گئی تو تم ہی مجھے وہاں سے کھینچتے ہوئے میری جان بچاتے ہوئے باہر لے آئے۔ دوسری بار پیٹرول کے ذریعے آگ ہماری طرف آرہی تھی' اس وقت بھی تم مجھے کھینچ کر دور لے گئے۔ تم ذہین ہو' حاضر دماغی سے کام لیتے ہو۔ اب بھی میرے دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ پلیز میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ ہوٹل میں اپنا سامان رہنے دو۔ میرے ساتھ چلو۔"

جیرالڈ نے کہا "مسٹر درانی! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تم اپنی انا کے مسٹر سنگیلا کو کبھی جوش اور جنون میں مبتلا نہیں ہونے دو گے۔ پلیز کل رات ریسلنگ کے اختتام تک اس کے ساتھ رہو۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیرالڈ نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "راہول میں تمہاس جیرالڈ بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے امریکی سفیر کی آواز سنائی دی "ہیلو میں امریکی سفیر بول رہا ہوں اور سنگیلا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جیرالڈ نے سنگیلا کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے میزبان' امریکی سفیر بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ریسیور لے کر کان سے لگا کر کہا "سنگیلا بول رہا ہوں۔"

سفیر نے کہا "سنگیلا! ہم نے تمہیں اپنا محافظ بنایا تھا مگر تم ہمارے لیے بہت بڑی مصیبت بن گئے ہو۔"

"میں تمہارے لیے کیسے مصیبت بن سکتا ہوں؟"

"اپنے فون کا اسپیکر آن کرو تاکہ تمہارے ساتھی بھی ہماری گفتگو سن سکیں۔"

اس نے فون کا..... اسپیکر آن کرکے ریسیور رکھ دیا پھر کہا۔ "ہاں اب بولو۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "بول رہی ہوں۔ میری آواز سنتے ہی سم کو فون نہ بند کرنا۔"

وہ سونیا کی آواز سن کر چونکا پھر بولا "تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں تم سے خوفزدہ ہوں۔"

"میں انسانی نفسیات کو سمجھتی ہوں۔ میں نے تمہارے بنگلے میں صرف تمہیں بلایا تھا۔ لیکن تم اتنے خوف زدہ تھے کہ اپنے ساتھ چار پہلوان لے کر آئے تھے۔ کیا اسے خوف اور دہشت نہیں کہتے؟ میری دہشت؟"

"یو شٹ اپ! میں تمہارے جیسی چھپکلی کو اپنے پاؤں تلے کچل دوں گا۔ تم مجھ سے مقابلہ نہیں کررہی ہو۔ اگر تم واقعی فرہاد علی تیمور کی واقف ہو تو ایک بار میرے روبرو آجاؤ پھر میں دکھاؤں گا کہ یہ ہڈیوں کا ڈھانچا کتنا طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔"

حسین وہ! جو چھپائے نہ چھپے!

میرے نسوانی حسن کا راز

بلوسم بریسٹ کریم (یونانی)

قدرتی جڑی بوٹیوں پر برسہابرس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ایک نئی ایجاد

بلوسم بریسٹ کریم جو قیمت =/150

- بریسٹ کے ٹشوز کو سخت کرکے اُبھار لاتی ہے۔
- بریسٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کرکے پروقار شخصیت کا مالک بناتی ہے
- کھوئی ہوئی نسوانی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے

ایسٹ کاسٹ:
ابن سینا سٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازیخان
طاہر بک سنٹر ریل بازار اکاڑہ
محمد گارمنٹس اینڈ سنز متروی والے چوک بازار ملتان
ابو ہر سٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
نیو ڈیل سٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
مسلم جنرل سٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ایم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ظہیر اسٹور مدینہ مارکیٹ۔ رحیم یار خان
بازار سٹور مدینہ مارکیٹ۔ رحیم یار خان
اوکاڑہ ویل ورد خانہ کچہری روڈ سکھر
نیو ڈیل سٹور سبزی روڈ سکھر
نیو ڈیل سٹور پریس روڈ ڈہرکی
مسلم جنرل سٹور مسلم بازار گوجرات
ایس ایچ بخش سٹور صدر بازار گوجرات
انجمن ورد خانہ شاہی بازار سادیوال
بادشاہ وی مٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی
گل برادرز آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد
نیو جنرل سٹور پریس مارکیٹ شاہ عالم لاہور
جرمن ہومیو سٹور بازار ریمبو یار خان
کوئٹہ ورد خانہ کارخانہ بازار فیصل آباد
شکار محل مارکیٹ مسجد اہلحدیث بیال پنڈی
عراقی ورد خانہ مین بازار منٹگمری آباد
پرنس پارک سٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
برنس پارک سٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
انعام سٹیٹ حسن روڈ پشاور
سعید ہیئر سیلون سٹور اندرون لاک گیٹ کراچی
ورد خانہ شفاء مینا بازار مشتہرہ سوات
ملت ورد خانہ گھنٹہ گھر شاہ پور
گل سدارہ کامنیکل مینیز فتان مارکیٹ شاہین بازار کراچی پورٹ قاسم
قاسم اینڈ سنز ناظمی گرمش مارکیٹ میرپور آزاد کشمیر

ڈسٹری بیوٹرز:
ریاض محمود ۹۹۔ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور ● بادشاہ وی مٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی
● محمد سلیمین اینڈ سنز متروی والے چوک بازار ملتان ● مکمل تفصیل بذریعہ وی پی یا پارسل منگوانے کے لئے

حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

"سنگریلا! کیا تمہارے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ درندے جانور اپنی جسمانی قوت سے آپس میں لڑتے ہیں کیونکہ جانور ذہانت سے خالی ہوتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی قوت بھی دی ہے اور ذہانت بھی۔ لہٰذا ہم انسانوں میں کوئی جسمانی طاقت سے مقابلہ کرتا ہے، کوئی ذہانت سے مدمقابل کو شکست دیتا ہے۔ کوئی اپنے ہتھیاروں سے مارتا ہے، کوئی اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات سے مقابل کو کچل دیتا ہے۔ انسانوں نے مقابلہ کرنے اور فتح حاصل کرنے کے کئی طریقے اختیار کیے ہیں۔ اگر تم انسانوں سے کہو گے کہ اپنی ذہانت سے مخالف طریقے اختیار نہ کریں اور جانور بن کر صرف جسمانی مقابلہ کریں تو ساری دنیا تم سے پوچھے گی، کیا تم جانور ہو؟ عقل سے خالی ہو؟"

وہ گرج کر بولا "تم مجھے جانور کہہ رہی ہو؟ میں.... میں...."

"میں نہیں، ساری دنیا کہے گی۔ جنگ کبھی ایک ہتھیار سے نہیں لڑی جاتی۔ دنیا کا سب سے بڑا طاقت ور ملک امریکا ہے۔ اس کے پاس سب سے زیادہ فوجی طاقت ہے، سب سے زیادہ جدید اسلحہ ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے حد و حساب ذرائع اور بڑے زبردست اختیارات کا مالک ہے۔ اس کے مقابلے میں اسامہ بن لادن کے پاس جہاد کرنے کے لیے صرف ایمانی قوت ہے۔ جیسے میں تمہیں دوڑا رہی ہوں، ویسے اسامہ بن لادن امریکا کو دوڑا رہا ہے۔ اب وہ اسامہ بن لادن سے کہے کہ بھئی ایمانی قوت کو چھوڑ کر سامنے آ کر لڑو۔ نہیں تو ہم لڑائی لڑائی نہیں کھیلیں گے۔ تو ایسا کہنے والا کتنا بڑا گدھا ہو گا؟ کیا تم گدھے ہو؟"

گدھا کہنے پر وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے گالیاں دینے لگا۔ جیرالڈ نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا "میڈم سونیا! تم مسٹر...."

دوسری طرف سے آواز آئی "میں سونیا نیس امریکی سفیر جان ڈولسن بول رہا ہوں۔"

"ابھی ہم سونیا کی آواز سن رہے تھے۔"

"ہاں۔ وہ بول رہی تھیں، اب میں بول رہا ہوں۔ کیا میری آواز سنگریلا سن رہا ہے؟"

جیرالڈ نے کہا "ہاں سن رہا ہے۔"

جان ڈولسن نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے سنگریلا سے کہا تھا کہ وہ ہمارے لیے بہت بڑی مصیبت بن گیا ہے اور وہ مصیبت ہے 'میڈم سونیا'۔ اس وقت سونیا نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھا ہے اور کہہ رہی ہے، جب تک میری جان بچانے کے لیے سنگریلا یہاں نہیں آئے گا تب تک وہ میری پٹائی کرتی رہے گی۔ میں اتنا مجبور ہوں کہ سنگریلا کے سوا کسی اور کو مدد کے لیے نہیں بلا سکتا۔ ورنہ مجھے بچانے کے لیے پورا امریکا آ سکتا ہے۔ آپ خود سنیں یہ کیا کہہ رہی ہیں۔"

چند سیکنڈ کے بعد سونیا کی آواز آئی "امریکا کی طرح میرے ٹیلی پیتھی جاننے والے بھی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتے ہیں۔ میرے خیال خوانی کرنے والے مجھے ایک ایک لمحے کی خبر دیتے رہیں گے کہ اس سفیر کے لیے امریکی امداد پہنچ رہی ہے یا صرف سنگریلا آ رہا ہے۔ اگر وہ بزدل پہلے کی طرح پہلوانوں کو لے کر آئے گا یا خفیہ امریکی امداد پہنچے گی تو میں اس سفیر کو اس کے پورے خاندان کے ساتھ جہنم میں پہنچا دوں گی۔ اس سفیر کو پورے خاندان کے ساتھ صرف دو گھنٹے تک سانس لینے کی اجازت دے رہی ہوں۔ انہیں بچانے کے لیے صرف سنگریلا آئے گا اور یہاں صرف میں اس کے روبرو رہوں گی۔ وہ جسمانی قوت سے لڑے گا، میں ذہانت سے اسے مات دوں گی۔ اس کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکیں گے کہ میں نے یہاں کس طرح ذہانت کا جال بچھایا ہے۔ آثارِ قدیمہ سے نکلے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے! اگر وہ دیکھ اور بزدل نہیں ہے تو دو گھنٹے سے پہلے چلا آ۔ دیٹس آل۔"

جیسے بجلی کڑکتی ہے، ویسی ہی کڑک دار آواز کے ساتھ جیرالڈ نے چیختے ہوئے میز پر ہاتھ مارا..... میز کی سطح شیشے کی تھی۔ وہ شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

"میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ وہ پہلی بار روبرو آئے گی۔"

جیرالڈ نے دوڑتے ہوئے جا کر باہر جانے والے دروازے کو بند کرتے ہوئے مجھ سے کہا "سونیا نیس امریکی ایجنٹ ہے۔ سونیا نے اپنی مکاری سے پھر اسے جنون میں مبتلا کر دیا ہے۔"

شیشہ ٹوٹنے کے باعث اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا زخمی ہاتھ پکڑ کر کہا "جاؤ۔ سونیا کے روبرو پیش ہو کر اس چیلنج پر غور کرو کہ اس نے اپنی ذہانت سے کیسا جال بچھایا ہوا ہے۔ اپنی ذہانت سے سوچو کہ وہ تم جیسے خوں خوار شیر کو پنجرے میں بند کرنے کے لیے کیسی چالیں چل چکی ہو گی۔ سوچے سمجھے بغیر وہاں جانا گویا خودکشی کرنا ہے۔"

اس کا سر چکرا رہا تھا۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ کچھ سوچ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے کیسی کارروائی کرے؟

جیرالڈ فرسٹ ایڈ بکس لا کر اس کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ ذہانت اور مکاری اسی کو کہتے ہیں۔ میری جان نے اپنا ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اس کا ہاتھ زخمی کر دیا تھا۔ اسے روبرو ہونے سے پہلے اس کی ذہانت کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ آئندہ وہ میری یا جیرالڈ کی ذہانت پر انحصار کر سکتا تھا۔

سونیا نے میرے لیے ایسا راستہ ہموار کیا تھا کہ میری ذہانت اسے بری طرح لے ڈوبتی۔ وہ صرف امریکی آقاؤں کی ذہانت کو خود کو بچا سکتا تھا۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟

ٹیلی پیتھی کے خصوصی کارفرہاد علی تیمور کی اس مقبول سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے

وقار عظیم

غلامی اور تنگ دستی میں دن گزارنے والی ایک عورت کے کتنے خواب تھے اور کتنی آرزوئیں تھیں۔ ان کی تکمیل کے لیے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ارادے کتنے مستحکم تھے۔ اس کے حوصلے کتنے بلند تھے۔ اس کی ہمت کتنی جواں تھی۔ اس کے عزائم کتنے پختہ تھے۔ اس کی جدوجہد کتنی مسلسل تھی۔ اس کی کوششیں کتنی پیہم تھیں۔ اس کی محنت کتنی شدید تھی۔ اس کی مشقت کتنی کٹھن تھی۔ اس کی مساعی کتنی بار ناکامی سے دوچار ہوئی تھیں۔ اس کی تدبیریں کتنی بار الٹی پڑی تھیں۔ اس کی تقدیر کتنی بار اس کے ساتھ مذاق کر چکی تھی۔ اس کی قسمت کتنی بار اس کے ساتھ کھیل چکی تھی۔ اس کی زندگی کتنی بار اس کے ساتھ کھلواڑ کر چکی تھی۔ اس کی امیدیں کتنی بار اس کے ہاتھوں سے پھسل چکی تھیں۔ اس کی آرزوئیں کتنی بار اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔ اس کے خواب کتنی بار اس کے ہاتھوں سے ٹوٹ چکے تھے۔ اس کی تمنائیں کتنی بار اس کے ہاتھوں سے چھن چکی تھیں۔ اس کی آس کتنی بار اس کے ہاتھوں سے ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی دنیا کتنی بار اس کے ہاتھوں سے لٹ چکی تھی۔ اس کی کائنات کتنی بار اس کے ہاتھوں سے برباد ہو چکی تھی۔ اس کی کشتی کتنی بار اس کے ہاتھوں سے ڈوب چکی تھی۔ اس کا سفینہ کتنی بار اس کے ہاتھوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا سفر کتنی بار اس کے ہاتھوں سے کھو چکا تھا۔ اس کی منزل کتنی بار اس کے ہاتھوں سے چھن چکی تھی۔ اس کی جستجو کتنی بار اس کے ہاتھوں سے ہار چکی تھی۔ اس کی تلاش کتنی بار اس کے ہاتھوں سے گم ہو چکی تھی۔ اس کی جدوجہد کتنی بار اس کے ہاتھوں سے ناکام ہو چکی تھی۔ اس کی کوششیں کتنی بار اس کے ہاتھوں سے رائیگاں ہو چکی تھیں۔ اس کی تدبیریں کتنی بار اس کے ہاتھوں سے الٹی پڑ چک

ختم ہوتے۔

مظفر کو زرینہ سے اس لیے نفرت نہیں تھی وہ پھوہڑ یا بدصورت تھی۔ بلکہ بیوی سے نہ بننے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس شادی میں اس کی پسند شامل نہیں تھی۔ مظفر کو یہ رشتہ بالکل پسند نہ تھا۔ یہ ڈھول اس کی ماں نے زبردستی اس کے گلے میں لٹکا دیا تھا۔ وہ اس کی بھانجی تھی آخر۔ بھانجی کو بہو کیوں نہ بناتی؟ وہ بھی اس حالت میں کہ بمن نے مرتے وقت بنی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر وعدہ لیا تھا۔ پھر وہ بھانجی کو کس طرح نظر انداز کر سکتی تھی؟ کوئی عیب ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ بقول ماں کے چاند کا ٹکڑا تھی۔ یہ تو اللہ کا بڑا کرم تھا کہ گھر بیٹھے ایسی بہو مل گئی۔ زرینہ کا باپ زندہ ہوتا تو یہ رشتہ کہیں مل سکتا تھا؟ اس کا بیٹا کون سا کلغم تھا جو ایسے نخرے کر رہا تھا؟ ٹریفک کانسٹیبل ہی تو تھا۔ دن بھر موٹروں کے سامنے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہتا تھا۔

ماں اپنے بیٹے کے لیے بھانجی کو بیاہ کر تو لے آئی لیکن بیٹے کے دل میں بھانجی کے لیے جگہ نہ بنا سکی۔ یہ اس کے بس میں ہی نہ تھا، ورنہ وہ یہ بھی کر گزرتی۔ بھانجی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ مظفر نے ماں کے بے حد اصرار اور دھمکیوں سے مجبور ہو کر زرینہ سے شادی تو کر لی لیکن اسے کبھی بیوی کی حیثیت نہ دی۔ زرینہ سے بات کرنا تو درکنار وہ اسے ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ کھانا ماں سے مانگتا۔ کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو ماں سے کہتا۔ شادی کے آٹھ، دس ماہ بعد ماں کے کمرے میں سونے لگا۔ ماں نے بہت سمجھایا مگر نہ مانا۔ ماں نے مجبور کیا تو دھمکی دی کہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ یہ دھمکی اثر کر گئی۔ ماں خاموش ہو گئی۔ مظفر صبح جلدی ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا اور رات کو دیر سے لوٹتا۔ ماں سو جاتی تھی، لیکن زرینہ شوہر کے انتظار میں جاگتی رہتی۔ اس کے کان دروازے پر لگے رہتے۔ جب رات کی خاموشی میں دور سے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دیتی، وہ جلدی جلدی اٹھ کر دروازے کی کنڈی کھول دیتی اور ساس کو جگا کر، چولھے کی راکھ کرید کر انگاروں پر کھانا گرم کرنے بیٹھ جاتی۔ مظفر سیدھا ماں کے کمرے میں چلا جاتا۔ زرینہ کھانا گرم کر کے کمرے سے باہر ہی ساس کو دے دیتی۔ ماں، بیٹے کو کھانا کھلا کر جھوٹے برتن بھی کو دے جاتی تھی اور زرینہ آنسو بہاتے ہوئے اسی وقت برتن دھو ڈالتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مظفر کے بھاری جوتوں کی آواز، رات کے اندھیرے میں دور سے قریب آتی سنائی دیتی۔ زرینہ فوراً کھانا گرم کرنے بیٹھ جاتی۔ قدموں کی آواز قریب آتی جاتی.... اور گھر کے سامنے سے کوئی گزر جاتا۔

"کوئی اور پولیس والا ہوگا۔" زرینہ سوچتی "جو ڈیوٹی سے اپنے گھر جا رہا ہے۔" ایک دو بار اس طرح بھی ہوا کہ مظفر دروازے تک آیا۔ زرینہ باورچی خانے کی طرف چل دیتی اور کھانا گرم کرنے لگتی۔ دروازے پر اسے کوئی دوست مل جاتا اور وہ اس کے ساتھ کہیں چلا جاتا۔ وہ انتظار میں باورچی خانے میں ہی بیٹھی رہتی اور آنکھ اس وقت کھلتی جب ساس فجر میں نماز کے لیے اٹھتی۔

شادی کے بعد زرینہ کو پہلی خوشی تب ملی، جب شادی کے گیارہ ماہ بعد اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ دادی تو پوتے پر قربان ہوئی جا رہی تھی لیکن مظفر اس طرح الگ تھلگ رہتا جیسے وہ اس کا بیٹا ہی نہ ہو۔

مناجب ڈھائی سال کا ہوا، دادی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ جب زرینہ کی ماں مری تھی، اس وقت بھی زرینہ اچھی خاصی سمجھ دار تھی۔ وہ اس وقت روئی بھی تھی لیکن اس طرح دہاڑیں مار کر روئی تھی جس طرح ساس کے مرنے پر وہ روئی۔ وہی تو اس کو بیاہ کر لائی تھی۔ وہی تو اس کا سہارا تھی۔ آج وہ سہارا بھی چھوٹ گیا تھا۔ پھر کیوں نہ وہ پچھاڑیں کھاتی؟ ساس جو کہ نہ صرف اس کی خالہ بلکہ ماں بھی تھی، اس کے مرنے پر زرینہ واقعی بہت دکھی ہو گئی تھی۔ وہ اس کے لیے ڈھال کے مانند تھی، وہ بھی نہ رہی۔

ساس کو مرے گیارھواں دن تھا۔ پورا گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان سب کی موجودگی میں ایک معمولی سی بات پر شوہر گرج گیا اور اسے دھکا دے کر رکھ دیا۔ عورتیں دوڑیں مگر اتنی ہی دیر میں مظفر الٹی پچھلی کسریں نکال چکا تھا۔ پہلے ایسے اتفاقات سالوں، مہینوں اور ہفتوں کے بعد اب روزانہ کا معمول بنتے جا رہے تھے۔ شادی کو دس سال ہو چکے تھے، زرینہ مار کھاتی رہی۔ مظفر کا سب سے غصہ آتا سے پہلے بٹکے کی شامت آتی، الرحیم کے برتن شکل اختیار کر چکے تھے، ایک بار پھر جانے کے باعث عجیب و غریب شکل اختیار کر چکے تھے، ایک بار پھر اپنی ہیئت بدلنے پر مجبور ہو جاتے۔ شور پر محلے کے بچے دروازے سے جھانکتے جو زرینہ کو مار کھاتا دیکھ کر ہنستے تھے۔ پڑوسن جلدی سے چارپائی کھڑی کر کے تاک جھانک کرتی۔ تب مظفر بھاری بوٹوں سے ٹھپ، ٹھپ کرتا گھر سے نکل جاتا۔ اس کے جانے کے بعد زرینہ سنے کو جو کہ پہلے ہی رو رہا ہوتا، کلیجے سے چمٹا کر بچاتی ہوئی چمٹ جاتی۔ جب وہ چیخ چیخ کر رونے لگتا تب وہ بھی بیٹھ کر رونے لگ جاتی۔

آج بھی یہی سب کچھ ہوا تھا۔ بین کرتے کرتے زرینہ کی آنکھ لگ گئی، جب آنکھ کھلی دھوپ دیوار پر چڑھ چکی تھی۔ اس نے منے کو دیکھا، وہ رو رو کر زمین پر ہی سو گیا تھا۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی میلی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس نے دوپٹے سے منے کا منہ پونچھا اور اسے چارپائی پر لٹا کر خود باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس نے صفائی تو کر لی لیکن گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اسے یاد آیا کہ آج یہ واویلا ہوا ہی اسی وجہ سے تھا۔ اس نے مظفر سے کہا تھا "آٹا، مسالے، گھی سب کچھ ہی ختم ہو چکا ہے۔" مظفر نے گالیاں دیتے ہوئے کہا تھا "سب کچھ ختم ہو چکا ہے تو تم کب ختم ہو گی؟" اور اس کے بعد پٹائی۔

زرینہ کو جیسے ہی وہ باتیں یاد آئیں، اسے غصہ آنے لگا۔ آج زیادہ غصہ اس لیے بھی آ رہا تھا کہ اس نے اس کی ماں کو بھی برا بھلا کہا تھا اور گالیاں دی تھیں۔

"میری خالہ کا بھی لحاظ نہیں اسے۔" وہ بڑبڑائی۔

آج بُرا بھلا کہنے اور مارنے کے علاوہ دھمکی بھی دے گیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا تھا "میں لعنت بھیجتا ہوں اس گھر پر۔ اب اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھوں گا۔ دوسری شادی کر رہا ہوں..... تمہیں تین طلاق دیے جا رہا ہوں۔ اب جہاں چاہے منہ کالا کر کے چلی جاؤ۔ چاہو تو دوسری کر لو۔"

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن شوہر کی زبانی ایسے الفاظ برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے "عورت کا طلاق یافتہ کے بجائے بیوہ ہونا بہتر ہے۔" زرینہ نے پہلی بار شوہر کے سامنے زبان کھولی تھی۔ اور اس کے جانے کے بعد دل کھول کر کوسنے دیے تھے "نہ تم رہو نہ دوسری شادی کرو اور نہ مجھے طلاق دو۔ خدا کرے تم کسی موٹر کے نیچے آ کر مرو۔"

○☆○

دوپہر سے شام اور شام سے اب رات ہو چکی تھی۔ نہ گھر میں کچھ کھانے اور نہ ہی پکانے کا تھا۔ تیل بھی نہ تھا کہ لالٹین جلاتی۔ کچھ پرانے ڈبے اور بوتلیں کباڑی کو بیچ کرنے کا تو پیٹ بھر چکی تھی لیکن خود بھوکی تھی۔ بھوکی تو وہ کبھی نہ رہی تھی، لیکن آج پہلی بار اس نے مستقبل کے لیے سوچا۔ مظفر نے اگر دوسری شادی کر لی..... تو اس کا کیا ہوگا؟ وہ ضرور طلاق دے گا..... بلکہ دے چکا..... اس کا اور منے کا کیا ہوگا؟ اب سوچوں نے یلغار کر دی تھی۔

اب وہ شوہر کے ساتھ ساتھ ساس کو بھی کوسنے لگی۔ جس نے اسے اس جہنم میں لا پھینکا تھا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے، وہ منے کی چارپائی سے ٹیک لگائے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تب کسی نے دروازے کی کنڈی بجائی۔ زرینہ کے ہاتھ پاؤں خطے سے لرزنے لگے۔ شوہر تو تین طلاقیں دے کر جا چکا تھا۔ اب کیوں آیا ہے؟ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھے گی۔ جس نے اس کی اتنی بے عزتی کی تھی۔ وہ غصے میں سوچتی رہی۔ کنڈی پھر بجی، اور جب تیسری بار مسلسل بجتی رہی تو وہ غصے سے بھری اٹھی اور چیخ کر بولی "اب کیوں آئے ہو؟ تم تو مجھے تین طلاقیں دے گئے تھے۔ شادی نہ ہو سکی کیا؟" اور جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

"خالہ..... خالہ..... منے کے ابا موٹر کے نیچے آ گئے ہیں۔ لوگ اسپتال لے گئے ہیں۔" محلے کے بچے نے جتنی جلدی وہ خبر سنائی اس سے بھی جلدی وہ بھاگ گیا۔

زرینہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت جواب دے گئی۔ نہ جانے کس طرح وہ کمرے میں واپس آئی اور جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ نہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ چہرے پر غم کے آثار۔ رات کے پچھلے پہر مظفر کی لاش اسپتال سے لائی گئی۔ تب بھی وہ خاموش تھی۔ مظفر ڈیوٹی کے دوران میں موٹر کے نیچے آ گیا تھا اس لیے کفن دفن کا بندوبست پولیس انتظامیہ نے کیا تھا۔ جنازہ صبح دس بجے پولیس کے اعزاز کے ساتھ اٹھایا گیا۔ جب اسپتال سے لاش لائی گئی تھی، اس وقت بھی شوہر کی کچلی ہوئی لاش دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ جب جنازہ اٹھا، منے بھر کی آنکھیں نم تھیں مگر زرینہ خاموش تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"بے چاری کو سکتہ ہو گیا ہے۔" یہ اچانک غم کا پہاڑ ٹوٹنا ہے اس پر۔" عورتیں تبصرے کر رہی تھیں۔

لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ زرینہ کو سکتہ نہیں ہوا تھا۔ ری غم کے پہاڑ والی بات، تو مظفر نے زندگی میں اسے کون سا سکھ دیا تھا۔ جنہیں یاد کر کے وہ روتی؟ پوری عمر وہ اپنی نااہلیت کے باعث کانسٹیبل کا کانسٹیبل ہی رہا، کچھ ترقی نہیں کی۔ اب کل کی ہی تو بات تھی لڑ کر کہہ گیا تھا۔ "تین طلاقیں دیے جا رہا ہوں۔ میں تو دوسری شادی کر رہا ہوں۔" زرینہ نے کوستے ہوئے کہا تھا "خدا کرے کسی موٹر کے نیچے آ کر مرو..... نہ ہو گے نہ دوسری شادی کرو گے اور نہ ہی مجھے طلاق دو گے۔" اور جب کہ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ مظفر موٹر تلے آ کر مر گیا تھا۔ اب وہ کس منہ سے روئے اور کیوں روئے؟ ہنسنے کا وقت بھی نہ تھا۔ رونا اسے آ نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ خاموش تھی۔ اس کو شوہر کے مرنے کا کوئی دکھ نہ تھا۔

مظفر کے مرنے کے دوسرے دن شام کے وقت، پولیس کا ڈی آئی جی، مظفر کے گھر آیا۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر تعزیت کی اور رنجیدہ لہجے میں بولا..... "بہن..... تمہارا شوہر فرض کی ادائیگی کے دوران میں اس جہان سے چلا گیا ہے۔ ہمیں اس کی موت پر افسوس اور آپ سے ہمدردی ہے۔"

"ہمدردی" زرینہ نے دل میں سوچا "مجھ سے اس نے کبھی ہمدردی نہیں کی۔ مرا تو کچھ چھوڑ کر نہ گیا، جو میں اور میرا بیٹا برا بھلا وقت گزار سکیں، اب یہ اس سے ہمدردی جتا رہے ہیں۔ جس سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔" لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی خاموش رہی۔

"بہن ہمیں پورا احساس ہے اب آپ کی زندگی کیسے گزرے گی۔ آپ کا اب اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں رہا۔ بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے۔ آپ کے شوہر ڈیوٹی دیتے ہوئے فوت ہوئے ہیں اس لیے پولیس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے آپ کو بیس ہزار روپے دیئے جا رہے ہیں اور پانچ سو روپے ماہانہ پنشن بھی جاری کی جا رہی ہے۔" ڈی آئی جی نے نوٹ پردے کے پیچھے بیٹھی زرینہ کی طرف بڑھائے۔

نوٹ لیتے ہی زرینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ یہ غم کے آنسو تھے یا خوشی کے؟

گمشدہ

ڈاکٹر صاحبہ امجد

راتوں رات امیر بننے کے جنون نے کتنے ہی لوگوں کو تباہ کیا... مگر یہ جال اتنا پُرکشش ہے کہ دوسروں کا عبرت ناک انجام دیکھنے کے باوجود بھی لوگ اپنی کوششوں سے باز نہیں آتے اپنے ہی ایک واقعے سے شروع ہونے والا سلسلہ جو دیکھتے ہی دیکھتے دراز ہوتا چلا گیا۔

بھول کر بھی نہ بھولنے اور بھلا دینے کو محو کر دینے کا قصہ

درانی پچھلے دس سال سے اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔

یہ فلیٹ اس کی سسرال والوں نے جہیز میں دے دیا تھا ورنہ تو وہ اب بھی شادی سے پہلے کی طرح کرائے کے مکانوں میں گھومتا پھر رہا ہوتا۔ اس کی حقیر آمدنی اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہی ناکافی تھی، سر چھپانے کے لیے ٹھکانا خریدنے کا تو وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اسے یہ شکوہ ہمیشہ سے تھا کہ وہ گریجویٹ ہونے کے باوجود محض ایک کلرک ہے۔ اگر عزت کی روٹی مل بھی جاتی ہے تو کیا وہ صرف روٹی کھانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ روٹی کے علاوہ بھی زندگی میں بہت سی آسائشیں ہیں۔ یہ آسائشیں دوسروں کا مقدر کیوں ہیں، اس کی قسمت میں کیوں نہیں ہیں۔ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے اس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا لیکن ہوا یہ کہ رہی سہی آمدنی بھی جوئے کی نذر ہونے لگی تھی۔ جب مسلسل نقصان کے بعد اس نے اس عادت کو ترک کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ تو جواری بن چکا ہے۔ یہ عادت چھوٹے ہی میں نہیں آتی تھی اور پھر یہ کہ اس نے دل کو تسلی دے لی کہ لوگ کیسی کیسی عیاشیاں کرتے ہیں۔ میں اگر دوستوں میں بیٹھ کر ہی بہلا لیتا ہوں تو کیا حرج ہے۔

ان دس برسوں میں کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے بھی اپنی مفلسی ہی سمجھتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے اکثر کہتا تھا کہ قدرت نے ہمیں ہر اعتبار سے مفلس بنایا ہے۔ وہ اسے ایسی ناانسانی قرار دیتا تھا جس میں قدرت بھی برابر کی شریک ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اسے اس زندگی کا عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی جا رہی تھی، احتجاج کے لیے اس کی زبان کھلتی جا رہی تھی۔ راتوں رات امیر بننے کی دھن ایسی سوار ہوئی تھی کہ غلط اور صحیح کا امتیاز بھی اس کی آنکھوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اگر وہ حد سے زیادہ احتیاط پسند نہ ہوتا تو کوئی بھی جرم کرتا اور اپنے لیے دولت کے ڈھیر لگا لیتا۔ اس کی فطری بزدلی ہر مرتبہ اس کے آڑے آجاتی تھی۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر مختلف جرائم مختلف زاویوں سے غور کرتا لیکن پکڑے جانے کا خوف، اسے عملی قدم اٹھانے سے باز رکھتا۔ وہ کسی ایسے راستے کی تلاش میں تھا جو بے ضرر بھی ہو اور منافع بخش بھی۔ یہ سوچتے ہوئے بھی اسے کئی سال گزر گئے تھے اور اب تو وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ شاید وہ سوچنے کے لیے پیدا ہوا ہے، کر کچھ نہیں سکتا۔

○☆○

چھٹی کا دن تھا۔ درانی منہ لپیٹے پڑا تھا جبکہ اس کی بیوی راحیلہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس گھر میں صرف چھٹی کے دن اخبار آتا تھا لہٰذا راحیلہ ہفتے بھر کی کمی پوری کر لیتی تھی۔ ایک ایک سطر پڑھ کر پیسے وصول کرتی تھی۔

درانی کئی مرتبہ لحاف سے منہ نکال کر دیکھ چکا تھا کہ راحیلہ اخبار سے فارغ ہو تو وہ اس سے چائے کے لیے کہے لیکن راحیلہ کو خود ہی احساس ہوا کہ وقت بہت ہو چکا ہے، اب ناشتا کرنا چاہیے۔ اس نے درانی کو آواز دی اور خود ناشتا تیار کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔

درانی سوچ رہا تھا کہ جاگتا۔ راحیلہ کے جاتے ہی اٹھ بیٹھا۔ وہ ضروریات سے فارغ ہوا تھا کہ راحیلہ ناشتا لے کر آگئی۔ دونوں خاموشی سے ناشتا کرنے بیٹھ گئے۔ راحیلہ نے دو چار لقمے کھانے کے بعد اخبار پھر ہاتھ میں لے لیا۔

"یہ اشتہار پڑھا آپ نے؟ اسکول کیا، گمشدگی کی خبر ہے؟" راحیلہ نے کہا۔

"نہیں۔" درانی نے کہا اور سر جھکا کر ناشتا کرتا رہا۔

"میں تو کہتی ہوں کیسے کیسے سنگدل لوگ ہوتے ہیں۔ دیکھیے تو کیسا پیارا بچہ ہے۔ کسی نے اسکول کے باہر سے اٹھا لیا۔ کیا گزر رہی ہوگی ماں، باپ پر۔" راحیلہ نے درانی کی طرف اخبار بڑھایا۔

"ہوگا، ایسے واقعات روز ہوتے ہیں۔" درانی نے اخبار لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے تو کیسا پیارا بچہ ہے؟"

درانی نے وہ اشتہار دیکھنا شروع کر دیا۔ بچہ واقعی بہت پیارا تھا۔ اتنا چھوٹا تھا کہ خود کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ یقیناً کسی نے اٹھایا ہوگا۔ اس اشتہار میں بچے کو تلاش کرنے والے کے لیے پچاس ہزار روپے کے نقد انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ درانی نے بھی افسوس کا اظہار کیا اور اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ راحیلہ بہت دیر تک اس بچے اور اس کے والدین پر گزرنے والی قیامت کی باتیں کرتی رہی۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد راحیلہ نے برتن سمیٹے اور ایک مرتبہ پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

درانی صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ وہ ناشتے کے بعد لیٹ کر ایک سگریٹ ضرور پیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ اچانک اس کا دھیان اخبار میں چھپے ہوئے اشتہار کی طرف گیا۔ اگر میں اس بچے کو ڈھونڈ نکالوں تو پچاس ہزار فوراً مل سکتے ہیں لیکن وہ بچہ اتنی آسانی سے ملنے والا ہوتا تو اس اشتہار کی نوبت نہ آتی۔ کیا مصیبت ہے! وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دولت اتنی مشکل چیز ہے۔ آسانی سے آتی ہی نہیں۔ اب ان صاحب زادے کو کہاں سے لاؤں جو دولت ملے۔ پھر اچانک اس چراغ سے ایک چراغ جل گیا۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانے میں آیا۔ یہ دیکھنے کہ اس کی بیوی اس وقت کیا کر رہی ہے۔ وہ چاہتا تھا راحیلہ اسے سوچتے ہوئے بھی نہ دیکھے۔ وہ اس بات پر سوچنا چاہتا تھا، اس میں اتنی ہی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اس کی بیوی برتن دھو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے ابھی کچھ دیر لگے گی۔ برتن دھونے کے بعد وہ باورچی خانہ دھوئے گی۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آیا۔

یہ بچہ تو مجھے نہیں مل سکتا لیکن ایسا ہی ایک بچہ اگر میرے پاس ہو اور اس کے والدین نقد انعام کا اعلان کریں تو میں اس رقم کے عوض اس بچے کو پیش کر سکتا ہوں۔ یہ خیال اس کے لیے اتنا ہیجان خیز تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے رگڑنے لگا۔ اس نے جلدی سے ایک سگریٹ اور جلایا۔ کسی بھی رئیس گھرانے کا بچہ اگر میں اٹھا کر لے آؤں اور دو چار دن کے لیے اپنے فلیٹ میں چھپا لوں تو اچھا خاصا مال دار بن سکتا ہوں۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو ہر مہینے دو مہینے بعد اس وارادات کو دہرایا جا سکتا ہے۔ دولت مندوں کے پاس جو دولت ہے، آخر اس میں کچھ حصہ میرا بھی تو ہونا چاہیے۔ اگر ایسے نہیں تو ایسے سہی۔

وہ ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا کہ راحیلہ آگئی۔ وہ اپنے خیالات میں اتنا غرق تھا کہ راحیلہ کی آمد کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" راحیلہ کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا۔

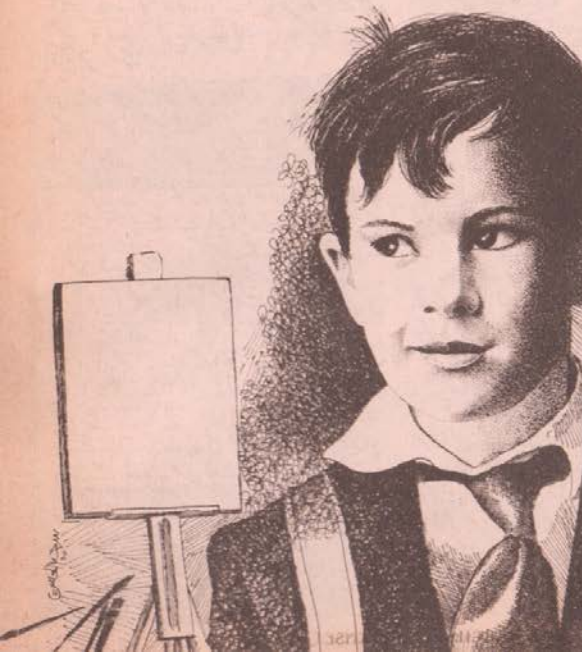

"کیا ہوا مجھے' ٹھیک تو ہوں۔"

"آپ کو تو پسینے آرہے ہیں۔"

"ارے ہاں' وہ بس.... ناشتا کرنے کے بعد کچھ گھبراہٹ سی محسوس کررہا ہوں۔"

"آپ کچھ دیر اور لیٹ جائیں۔"

"ہاں' میں کچھ دیر لیٹ جاؤں تو ٹھیک ہے۔"

وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ لحاف میں بند ہو کر اچھی طرح اپنے پلان پر سوچنا چاہتا تھا۔ راحیلہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ درانی کے خیالات پھر سے آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ وہ ایک ایک پہلو پر غور کررہا تھا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ کسی بچے کو اغوا کرلے گا لیکن اسے راحیلہ کی طرف سے مخالفت کا خدشہ تھا۔ وہ بزدل عورت ضرور مخالفت کرے گی۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا ورنہ ان باتوں پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتا۔

یہ کوئی ایسا بڑا جرم نہیں تھا جس میں جان پر کھیلنے کی نوبت آتی مثلاً بینک ڈکیتی وغیرہ۔ ایک معصوم' کمزور بچے کو اغوا کرنا کون سی مشکل بات ہے۔ پھر یہ کہ وہ اپنی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں کرے گا کہ اغوا برائے تاوان کا الزام اس پر آئے۔ وہ تو کہہ دے گا' بچہ اسے روتا ہوا ملا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا اور اب اشتہار دیکھ کر بچے کو اس کے پتے پر لے آیا۔ اس سے محفوظ طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

وہ کئی دن برابر اپنے آپ سے لڑتا رہا اور بالآخر اس نے طے کرلیا کہ جب بھی موقع ملا' وہ بچہ اغوا کرلے آئے گا۔ رہا راحیلہ کا مسئلہ' وہ جب مخالفت کرے گی اس وقت دیکھا جائے گا۔ کسی اور کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی جو مخالفت کا سامنا ہو۔

وہ ایک دن اپنے دفتر سے جلدی اٹھا اور پہلے سے طے کیے ہوئے ایک اسکول کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے خیال کے مطابق اس اسکول میں ایسے گھرانوں کے بچے پڑھتے تھے جن کے والدین ان کی گم شدگی پر بھاری رقم کا اشتہار دے سکتے تھے۔

اسکول کی چھٹی ہوئی اور بچے اسکول کے وسیع میدان میں پھیلنا شروع ہوگئے۔

درانی کسی ایسے بچے کے انتظار میں تھا جو سب سے الگ تھلگ اکیلا نظر آئے۔ اسکول کے سامنے کاروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ بچے اسکول سے نکل کر اپنی اپنی گاڑیوں کا رخ کررہے تھے۔ بہت سے بچے ایک پیڑ کے نیچے جمع تھے۔ ان کے قریب ہی ایک بچہ ان سب سے الگ' باپ کا رن کھانے میں مشغول تھا۔ درانی آہستہ آہستہ اس کے قریب آگیا۔

"ارے تم یہاں کھڑے ہو اور تمہارے ڈیڈی کار میں تمہارا انتظار کررہے ہیں" درانی نے کہا۔

"میں کار میں نہیں جاتا ہوں۔ میں تو اسکول بس میں جاتا ہوں۔ وہ دیکھو بس آگئی" بچے نے کہا اور بس کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی درخت کے نیچے جمع دوسرے بچے بھی ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بس کی طرف بھاگے۔

درانی کے ہاتھوں سے تمام مچھلیاں ایک ایک کرکے پھسل گئیں۔ غصے سے وہ دانت پیس رہا تھا کہ تقریباً چار سال کی عمر کا ایک بچہ' اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے مزے سے ٹہل رہا تھا۔

"ارے' تم یہاں ٹہل رہے ہو۔ ڈیڈی تمہارا باہر انتظار کررہے ہیں۔"

"ڈیڈی کیوں انتظار کررہے ہیں۔ مجھے تو ڈرائیور لینے آتا ہے۔"

"آج تمہارا ڈرائیور نہیں آیا' ڈیڈی آئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں لینے کے لیے مجھے بھیجا ہے' وہ باہر کھڑے ہیں۔"

"اچھا! بڑے چالاک ہوگئے ہیں وہ" بچے نے کہا اور باہر کی طرف بھاگا۔

درانی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے باہر آگیا۔ بچہ باہر آکر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس کی گاڑی ابھی نہیں آئی۔ وہ اس بچے کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔

"یہاں کیا دیکھ رہے ہو؟ تمہاری گاڑی سب سے پیچھے کھڑی ہے۔ آؤ' میرے ساتھ۔"

"انکل' آپ کون ہیں؟"

"میں تمہارے ڈیڈی کا دوست ہوں۔"

"اچھا!" بچے نے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے

درانی لاتعلقی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ساتھ چلتے ہوئے بھی اس طرح چل رہا تھا جیسے وہ اس کے ساتھ نہیں

"انکل' کہاں ہیں ڈیڈی!"

"وہ رہے" درانی نے بچے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اسکول کے سامنے کھڑی لائن کاروں کی قطار ختم ہوگئی۔ ابھی تک بچے نے اپنی کار شناخت نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب ہے' اس کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔

احتیاط کے طور پر درانی اپنے ایک دوست کی موٹر سائیکل مانگ کر لے آیا تھا۔ اب وہ اسی موٹر سائیکل کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے بچے سے پوچھا۔

"عدنان احمد!"

"عدنان صاحب' آیئے آپ کو موٹر سائیکل پر آپ کے گھر چھوڑ آئیں۔ آپ کے ڈیڈی تو شاید انتظار کرکے چلے گئے۔"

درانی نے ادھر اُدھر دیکھ کر اچھی طرح اطمینان کرلیا اور بچے کو گود میں اٹھا کر آگے کی طرف بٹھالیا۔ پیچھے بٹھاتے ہوئے وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں راستے ہی میں نہ کود پڑے۔ جلدی سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گلیوں گلیوں ہوتا ہوا اسکول سے دور نکل گیا۔

بچہ چپ چاپ بیٹھا اس کھلی سواری سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ بچہ نیند کے نشے میں جھوم رہا ہے۔ یہ اچھی بات تھی۔ فلیٹ کے سامنے اترتے اور فلیٹ میں جاتے ہوئے وہ غیر ضروری سوالات نہیں کرسکے گا۔ اس نے سوچا اور نہایت احتیاط سے موٹر سائیکل چلانے لگا کبھی کبھی ایک ہاتھ سے عدنان کو پکڑ لیتا کہ کہیں گر ہی نہ جائے۔

اس کی بلڈنگ اتنی معمولی نوعیت کی تھی کہ دروازے پر کوئی چوکیدار تک نہیں تھا جو بچہ لے جاتے ہوئے اسے دیکھتا۔ یہاں رہنے والوں کی نظر یقیناً پڑ سکتی تھی لیکن یہ خطرہ تو بہرحال مول لینا تھا۔

اس نے اپنے فلیٹ سے چند گز کے فاصلے پر موٹر سائیکل کھڑی کی اور عدنان کو گود میں اٹھا کر کندھے سے لگالیا۔ عدنان نے ایک پل کے لیے آنکھیں کھولیں اور پھر سوگیا۔

دن کا وقت تھا۔ مرد اس وقت گھروں پر کہاں ہوتے ہیں۔ عدنان کو لے جاتے ہوئے چند بچوں کے سوا کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا۔

تیسری منزل پر پہنچ کر اس نے اپنے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے راحیلہ نے دروازہ کھول دیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے درانی کی طرف دیکھنے لگی جو بچے کو کندھے سے لگائے تیزی سے اندر آرہا تھا۔

"کون ہے یہ بچہ؟" راحیلہ نے کہا۔

"شش!" درانی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کو کہا "جلدی سے دروازہ بند کرو۔"

راحیلہ نے فوراً دروازہ بند کردیا اور اس کمرے میں آئی جہاں درانی بچے کو لے کر آیا تھا۔ درانی نے بچے کو بستر پر لٹادیا تھا اور اب اس کے جوتے اتار رہا تھا۔ ایک طرف اس کا بستہ اور پانی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

راحیلہ اب کچھ بولتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس نے اشارے سے درانی سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ یہ بچہ کون ہے۔ درانی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"درانی' مجھے تو ہول آرہے ہیں۔ جلدی بتاؤ' آخر بات کیا ہے' کس کا بچہ ہے یہ؟"

"جلدی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ ابھی بتاتا ہوں کہ یہ سب ہے کیا؟"

راحیلہ بھاگ کر گئی اور پانی لے کر آگئی۔ پانی پینے کے بعد اس نے جیب سے سگریٹ نکالی اور ہوا میں دھوئیں کے مرغولے پھینکنے لگا۔

"درانی' خدا کے واسطے جلدی بتاؤ' کون ہے یہ بچہ؟"

"یہ بچہ نہیں ہے' پچاس ہزار روپے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یاد ہے' تم نے اخبار میں ایک بچے کی گم شدگی کی خبر پڑھی تھی۔"

"اے ہے' یہ وہ بچہ ہے؟"

"وہ بچہ نہیں ہے لیکن ظاہر ہے اس کے ماں باپ بھی اشتہار ضرور دیں گے۔ بچہ ہمارے پاس ہے اس لیے انعام کے مستحق ہم ہوں گے۔"

"خدا خدا کرکے آپ کس کا بچہ اٹھا کر لے آئے۔"

"اٹھا کر نہیں لایا ہوں یار۔ راستے میں کھڑا رو رہا تھا' میں اسے یہاں لے آیا۔"

"آپ کو اسے پولیس اسٹیشن لے کر جانا تھا۔ یہاں کیوں لے آئے۔ اٹھائے آپ ہی نہ پھنس جائیں۔"

"نہیں پھنستے یار۔ بس کل ہی کے اخبار میں دیکھنا۔ اشتہار آجائے گا۔ ایک دن تم اسے چھپا کر رکھ لو۔"

"درانی میرا تو دل دھڑک رہا ہے۔ یہ گناہ ہے۔"

"ارے گناہ کا بچہ کا۔ کسی اور کے ہاتھوں پڑ جاتا تو سوچو کیا ہوتا۔ میں تو پھر بھی اسے واپس کرنے کی نیت سے لایا ہوں۔"

"تو پھر واپس کیوں نہیں کر آتے۔ اتنا بڑا بچہ ہے' گھر کا پتا تو بتا سکتا ہوگا۔ اسکول کا کارڈ وغیرہ ہوگا اس کے بستے پر' اس پر لکھا ہوگا پتا۔"

"پاگل ہوگئی ہو کیا۔ اس طرح انعام مل سکے گا مجھے؟ اس کے والدین کو اعلان تو کرنے دو۔ بڑے لوگ ہیں اچھی خاصی رقم کا اعلان کریں گے۔"

"آپ کو کچھ نہ ہوجائے۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔ بس کسی کو معلوم نہ ہو کہ ہمارے گھر کوئی بچہ

ہیپاٹائٹس کیا ہے؟

ہیپاٹائٹس بی اور سی کیا ہے؟
بی اور سی وائرس انسان کو کس طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے؟
کیا ہیپاٹائٹس قابل علاج مرض ہے؟
انمول اکسیر کتابچہ کا مطالعہ آپکو
حقیقت کا آئینہ دکھائے گا
خط لکھ کر مفت حاصل کریں

حکیم محمد اعظم بٹالوی
16-A
پیپلز کالونی فیصل آباد

ہے۔"

"درانی' اتنا چھوٹا سا تو گھر ہے۔ کہاں چھپاؤں گی اسے۔ اور پھر اگر اس نے ہنگامہ کیا تو کیا باہر شور نہیں جائے گا۔"

"اس کا انتظام میں نے کرلیا ہے۔ یہ نیند کی گولیاں لے آیا ہوں۔ زیادہ گڑبڑ کرے' ایک گولی دو اور سلادو۔ ویسے میں دفتر سے چھٹیاں لے لوں گا۔ تم فکر مت کرو' میں سب سنبھال لوں گا۔"

بچہ ابھی تک سو رہا تھا لیکن ظاہر ہے اسے اٹھنا بھی تھا۔ اٹھتے ہی وہ کیا کہے گا' اسے یہ بھی معلوم تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے نیچے گیا' موٹر سائیکل لاکر بلڈنگ کے اندر کھڑی کی اور پھر گھر میں آگیا۔ اس کے آتے ہی بچہ سو کر اٹھ گیا اور توقع کے مطابق رونے لگا۔ درانی پر نظر پڑتے ہی وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوا مگر پھر رونے لگا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟ میں اپنے گھر جاؤں گا۔"

"تم روتے رہے تو اپنے گھر کبھی نہیں جاسکو گے۔ پہلے چپ ہو جاؤ' پھر میں تمہیں تمہارے گھر لے کر جاؤں گا۔"

بچہ ہوشیار تھا۔ وہ نہ صرف چپ ہوگیا بلکہ دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو بھی پونچھ لیے۔

"شاباش!" درانی نے کہا "اب بات سنو! تمہارے ممی' ڈیڈی ایک ہفتے کے لیے ملک سے باہر گئے ہیں۔ تم ہمارے پاس رہو' جب وہ آجائیں گے تو ان کے پاس چلے جانا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے ممی کے پاس جانا ہے" اس نے پھر رونا شروع کردیا۔

اب درانی کو احساس ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ہاتھ پاؤں پھلا دیے' آئندہ تو نہ جانے کیا کرے گا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ رونے کی آواز باہر نہ چلی جائے۔ بچہ اب باہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔ درانی اسے سمجھا کر' بہلا کر تھک چکا تھا لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نرمی سے نہیں' سختی سے کام چلے گا۔ وہ باورچی خانے سے چھری اٹھا کر لے آیا۔

"اگر اب تو نے آواز نکالی تو یہ چھری تیرے گلے پر پھیر دوں گا" درانی نے اس کا گلا دبوچتے ہوئے کہا۔

یہ ترکیب کارگر ہوئی اور بچے کی آواز گھٹ گئی لیکن سسکیاں وہ اب بھی بھر رہا تھا۔

راحیلہ نے اسے سینے سے لگالیا "کوئی میرے عدنان کو ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ خبردار' جو اس کے گلے پر چھری پھیری۔ اب یہ نہیں روئے گا۔"

"آنٹی' آپ مجھے ممی کے پاس لے جائیں۔"

"بس ایک دن ہمارے پاس رہو' کل تمہاری ممی کے پاس لے جائیں گے۔"

بچے کا دھیان بٹانے کے لیے وہ اس سے اس کے گھر کی باتیں پوچھنے لگی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے والد کا نام افتخار اور والدہ کا نام نیلم ہے۔ اس سے بڑے دو بھائی ہیں' سلمان اور فرحان۔ والد بزنس کرتے ہیں۔

بچہ اب بالکل پُرسکون ہوگیا تھا۔ اتنی باتیں کرنے کے بعد وہ راحیلہ سے مانوس بھی ہوگیا تھا۔

"آنٹی' آپ کے گھر کچھ کھانے کو ہوگا؟"

"کیوں نہیں۔ میں اپنے بیٹے کو ابھی کھانا لاکر دیتی ہوں۔"

راحیلہ جلدی سے گئی اور جو کچھ پکا تھا' لے کر آگئی۔ بچے نے بڑی حقارت سے کھانے کی طرف دیکھا۔

"آپ کو پتا نہیں' میں انڈا کھاتا ہوں اور بالائی بھی۔ آپ کے گھر تو جوس بھی نہیں ہے۔"

"عدنان بیٹا' ہم غریب لوگ ہیں۔ ابھی یہی کھالو۔ انڈا ہم تمہیں شام کو بنادیں گے۔"

"میں ڈائننگ ٹیبل پر کھاتا ہوں۔"

"وہ تو ہمارے گھر ہے ہی نہیں۔"

"چلو' کھالیتا ہوں۔ میں اپنے ڈیڈی سے کہہ کر آپ کو بھی ڈائننگ ٹیبل دلوادوں گا۔"

عدنان میں مرچیں اتنی تھیں کہ وہ چند لقموں سے زیادہ نہ کھاسکا۔ گھر میں کچھ دودھ رکھا تھا۔ راحیلہ نے وہ دودھ اسے پلادیا اور وہ خوش ہوگیا۔

راحیلہ اسے لے کر لیٹ گئی اور وہ اپنے گھر کی باتیں کرتے کرتے راحیلہ کے سینے سے لگ کر سوگیا۔

راحیلہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بچے کی گرمی کس طرح کلیجے میں ٹھنڈ ڈالتی ہے۔

درانی نے موقع غنیمت جانا۔ فلیٹ کو باہر سے تالا لگایا اور دوست کی موٹر سائیکل واپس کرنے چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو رات ہوچکی تھی۔ عدنان اور راحیلہ اس طرح آپس میں کھیل رہے تھے جیسے سگے ماں' بیٹے ہوں۔ وہ عدنان کے لیے انڈا' دودھ اور مکھن لے کر آیا تھا۔ سب چیزیں اس نے راحیلہ کو دیں اور خود تھکن اتارنے کے لیے بستر پر دراز ہوگیا۔ بس ایک رات کی بات اور ہے۔ صبح کے اخباروں میں انعام کی رقم بھی چھپی ہوئی ہوگی۔ وہ کئی خوب صورت تصورات سے کھیلتے کھیلتے سوگیا۔

اس کی آنکھ صبح ہونے سے پہلے ہی کھل گئی تھی۔ وہ اب بے چینی سے دن نکلنے کا انتظار کررہا تھا کہ کب دن نکلے اور کب وہ اخبار خرید کر لائے۔

راحیلہ اور عدنان اس کی کیفیت سے بے خبر مزے کی نیند سو رہے تھے۔ وہ دونوں یوں سوتے ہوئے اسے اچھے لگے۔ وہ بہت دیر تک محبت سے انہیں دیکھتا رہا۔ کاش! یہ ہمارا اپنا بچہ ہوتا۔ آج یا پھر کل یہ بچہ یہاں سے چلا جائے گا۔ راحیلہ پھر اکیلی رہ جائے گی۔

اس نے احتیاطاً اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کا بھی ایک اخبار خرید لیا۔ بڑے لوگ ہیں' کیا خبر انگریزی اخبار میں اشتہار دیا ہو۔ اس نے دونوں اخبار بغل میں دبائے اور تقریباً بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔ بچوں کے بل چلتا ہوا راحیلہ کے بستر تک آیا۔

"راحیلہ' اٹھو! اخبار نہیں پڑھو گی؟"

"کیا اشتہار آیا ہے؟"

"ابھی دیکھا کہاں ہے۔ آیا ضرور ہوگا۔ تم ڈرائنگ روم میں آؤ تو۔"

سب سے پہلے اس نے انگریزی اخبار دیکھنا شروع کیا۔ ایک صفحہ کئی کئی مرتبہ دیکھ لیا۔ کہیں کوئی اشتہار نہیں تھا۔ راحیلہ اردو اخبار دیکھ چکی تھی۔ اشتہار اس میں بھی نہیں تھا۔ درانی کا منہ لٹک گیا۔ اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔

"کمال ہے' اشتہار آیا کیوں نہیں!" درانی نے کہا۔

"کل تو اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈنے میں لگے رہے ہوں گے۔ اشتہار کا خیال ہی کہاں آیا ہوگا۔ آج خیال آئے گا تو کل کے اخبار میں اشتہار دیں گے۔"

"اب کل تک پھر انتظار کرو۔"

"وہ تو کرنا پڑے گا۔ میں تو کہتی ہوں انتظار چھوڑیں اور اس بچے کو آج ہی اس کے گھر چھوڑ آؤ۔ کسی کا صبر مت سمیٹیں۔"

"اگر اب تم نے اسے واپس کرنے کی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا' سمجھیں تم!" درانی نے راحیلہ کو بری طرح ڈانٹا۔ "ہم پاگل ہیں کہ کل سے محنت کرتے پھر رہے ہیں۔ اب جا کر اسے اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ میں نے کہہ دیا ہے میں اسے مار کے پھینک دوں گا لیکن پیسوں کے بغیر اسے اس کے گھر والوں کے سپرد نہیں کروں گا۔"

وہ اتنے غصے میں تھا کہ راحیلہ نے خاموشی ہی میں عافیت جانی اور کچھ دیر بعد اٹھ کر عدنان کے پاس آگئی۔

عدنان سو کر اٹھا تو اس نے پھر رونا شروع کردیا۔ اب تو وہ اتنے غصے میں تھا کہ اس نے ناشتا بھی اٹھا کر پھینک دیا۔ راحیلہ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ جب بچے کا یہ حال ہے تو اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کم بخت چڑیا کا بچہ بھی گھونسلے سے غائب ہوجائے تو چڑیا چوں چوں کرکے پورے گھر کو سر پر اٹھالیتی ہے۔ اس نے سوچا' وہ دو تین دن اور دیکھے گی۔ اشتہار آتا ہے تو ٹھیک ورنہ وہ اس بچے کو خود اس کے گھر چھوڑ کر آجائے گی۔ درانی اچھا مانے یا برا۔ یہ کوئی بات ہے' بچے کو قید کرکے رکھا ہوا ہے۔

درانی نے دفتر کی چھٹی کرلی تھی اس لیے عدنان کو سنبھالنا آسان ہوگیا ورنہ وہ راحیلہ کے بس کا نہیں تھا۔ راحیلہ نے بڑی مشکل سے ایک دن کی مہلت عدنان سے اور لے لی کہ بس ایک دن اور ٹھہر جاؤ' اس کے بعد ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔ اس نے روتے منہ بسورتے ایک دن اور گزار دیا۔

دوسرے دن درانی دو اخبار پھر خرید کر لے آیا۔ آج اسے پوری امید تھی کہ اشتہار ضرور ہوگا لیکن پورے اخبار میں کہیں اشارہ تک نہیں تھا۔ کیسے بے فکرے ہیں اس کے ماں باپ۔ بچے کو غائب ہوئے دو دن ہوگئے اور ایک اشتہار تک نہیں دیا۔ اب کیا میں اشتہار دوں کہ بچہ میرے پاس ہے۔ بچہ رکھنا کوئی مذاق ہے۔ روز کا خرچہ الگ ہورہا ہے۔ ایک چھوڑ دو دو اخبار لانا پڑ رہے ہیں۔

"میں کہتی ہوں' اب بھی بچہ واپس کردیں۔"

"ابھی دو دن ہوئے ہیں' دو مہینے نہیں ہوگئے۔"

"سچ بتائیں دو دن دو مہینوں کی طرح نہیں گزرے ہیں؟" راحیلہ نے کہا۔

وہ سوچ رہا تھا راحیلہ کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔ کتنی مشکل سے دو دن گزرے ہیں لیکن اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ اشتہار کا انتظار کریں۔

انتظار کی بھی حد ہوتی ہے' جب چار دن گزر گئے تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ اب اس کی حالت اس آدمی کی طرح تھی جس کے گلے میں ہڈی پھنس گئی ہو۔ اس ہڈی کو وہ نہ اگل سکتا ہو نہ نگل سکتا ہو۔ یہ اس کا دل جانتا تھا یا راحیلہ جانتی تھی کہ یہ چار دن انہوں نے کس طرح گزارے۔ عدنان کو بہلانے میں خود ان پر کیا گزر گئی۔ یہ دھڑکا الگ کہ کہیں راز فاش نہ ہوجائے۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ عدنان کو صدمے کی وجہ سے بخار رہنے لگا تھا۔ اس کے تروتازہ رخسار مرجھا کر رہ گئے تھے لیکن درانی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھی نہیں جارہا تھا۔ راحیلہ سخت فکرمند تھی۔ یہ بچہ اندر ہی اندر گھلتا رہے گا اور ایک دن مرجائے گا۔ درانی کی ضد اسے زندہ نہیں رہنے دے گی۔ وہ درانی سے کہہ کہہ کر تھک گئی تھی لیکن وہ بچے کو واپس کرنے پر تیار نہیں ہورہا تھا۔ اسے امید تھی کہ ایک دن انعام کا اعلان ضرور ہوگا۔

○☆○

عدنان کی گمشدگی پر شہر کی پولیس آرام سے نہیں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی بازیابی کے لیے سرتوڑ کوششیں کی جارہی تھیں البتہ اس تلاش کی خبروں کو سینۂ راز میں رکھا جارہا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ وہ مجرموں کو ہوشیار کیے بغیر اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرلے گی۔

اس وقت بھی عدنان کے والد افتخار احمد ڈی آئی جی کے دفتر میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچے ہوئے تھے اور پولیس کی ناکامی پر سخت برہم تھے۔

"افتخار صاحب' ہمیں افسوس ہے کہ ہم ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکے ہیں" ڈی آئی جی نے کہا۔

"جناب' آپ کے افسوس سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ میں یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ کی پولیس پھر کس مصرف

کے لیے ہے۔ شہریوں کو تحفظ نہ مل سکے تو ان کے وجود کا جواز کیا ہے۔ چند مجرم آپ کے ہزاروں پولیس والوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔"

"آپ جذباتی ہورہے ہیں مسٹر افتخار ورنہ ایسا قطعی نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں ہے ایسا۔ اگر نہیں ہے تو پھر کہاں ہے میرا بچہ؟"

"پولیس اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ بچہ شہر میں موجود ہی نہیں۔ اس قسم کے جرائم کرنے والے سیکڑوں افراد کو ہم نے گرفتار کیا لیکن بچہ ان کے پاس نہیں ہے۔"

"اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی آپ کی ہر کارروائی مفروضات پر مبنی ہے۔ کوئی ٹھوس بات آپ اب بھی نہیں کہہ پارہے ہیں۔"

"ہمیں کس طرح کام کرنا ہے' یہ ہم جانتے ہیں۔"

"میں اب بھی کہتا ہوں کہ مجھے اشتہار دینے دیجیے۔ انعام کے لالچ میں پولیس کے ساتھ ساتھ شہری بھی اس تلاش میں شامل ہوجائیں گے۔"

"مسٹر افتخار' یہ انعامی اشتہارات کا ہمیشہ سے مخالف رہا ہوں۔ اس سے مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ انہیں کمائی کا آسان نسخہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ ہم سے تعاون نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔"

"دیکھیے جناب' میں نے بہت تعاون کرلیا۔ میں آپ سے تعاون کروں یا عدنان کی ماں کو دیکھوں جس پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے' میں اپنا کام کرتا ہوں۔ میں اشتہار دے رہا ہوں۔ میں اپنی ساری دولت دینے کو تیار ہوں" یہ کہتے ہوئے افتخار احمد کی آواز بھرا گئی۔

ڈی آئی جی بھی اب کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ وہ افتخار احمد کے دکھ کو محسوس کررہے تھے۔ بالآخر انہوں نے اشتہار دینے کی اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ انعامی رقم کا اعلان نہیں کیا جائے گا۔ متصد صرف یہ تھا کہ بچے کی تصویر کو تمام لوگ دیکھ لیں۔

افتخار احمد نے ذرا سی بحث کے بعد اس شرط کو تسلیم کرلیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اس سے بھی کام نہیں چلا تو بعد میں انعامی رقم کا اعلان بھی کردیں گے۔

انہوں نے گھر آتے ہی عدنان کی تصویر نکالی' اشتہار کا مضمون تیار کیا اور تمام اخبارات کو بھیج دیا۔

آٹھ دن گزر جانے کے باوجود پولیس کو کامیابی نہیں ہوسکی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس کی ساری توجہ پیشہ ور مجرموں کی طرف تھی جبکہ عدنان ایک ایسے آدمی کے گھر میں موجود تھا جس کا کوئی ریکارڈ پولیس کے پاس نہیں تھا۔

○☆○

اس دن عدنان کو ایسی ضد سوار ہوئی کہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر پورے گھر کو سر پر اٹھالیا۔ درانی نے گھبرا کر پوری آواز سے ریڈیو آن کردیا تاکہ عدنان کی آواز باہر نہ جاسکے۔ پھر ایک ہی ترکیب اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے عدنان کو اسٹور میں بند کیا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ اس نے سوچا جب بھوکا پیاسا رہے گا تو ساری اکڑ نکل جائے گی۔

یہ ترکیب واقعی کارگر ہوئی۔ کچھ دیر تو اس کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز باہر آتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔

"سنیے!" راحیلہ نے درانی سے کہا "عدنان روتے روتے اچانک کیوں چپ ہوگیا۔ دروازہ کھول کر دیکھیں۔"

"چپ کرکے بیٹھی رہو۔ سو گیا ہوگا۔ ہم نے بہت سر کھپا لیا ہے' اب ذرا سزا بھی ملنی چاہیے۔ جب بھوک لگے گی تب آئے گی ہماری قدر۔ خبردار جو شام سے پہلے اسے باہر نکالا۔"

"بے چارے کا دم گھٹ جائے گا۔"

"میں دیکھ رہا ہوں' تم ضرورت سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگی ہو۔"

"بچے کو ترستی رہی ہوں نا اس لیے" راحیلہ نے کہا اور اپنی آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشوں کو دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

درانی نے اس کی اس کیفیت کو بھانپ ضرور لیا لیکن اس وقت ہمدردی کا کوئی موقع نہیں تھا اس لیے وہ راحیلہ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

آج وہ بہت دن بعد پُرسکون ہوا تھا۔ عدنان اسٹور میں بند تھا اور اسٹور کی چابی اس کی جیب میں تھی۔ دو ستوں سے ملے بہت دن

بسم اللہ الرحمن الرحیم
حیدر شاکر ہومیو کلینک
ڈاکٹر آصف شاکر ● ڈاکٹر مرسل عقیل
قطیل بیوز ـــــــ جملہ امراض
ع۔ ۱۲۰ ہومیو کمرشل ایریا، طارق روڈ بالمقابل پوسٹ آفس کراچی
اوقاتِ ملاقات: صبح ۱۱ تا ۲ بجے
گلشن اقبال کراچی
۶/۱ سفاری ویو بلاک 7 نزد مین گیٹ سفاری پارک گلشن اقبال کراچی
اوقاتِ ملاقات: شام ۶ تا ۹ بجے رات
شاکر ہیلتھ آل ہومیو پیتھک
مزید معلومات کیلئے فون: 4966698

ہو گئے تھے۔ شام تک فرصت اس کے پاس تھی۔ وہ گھر سے نکل گیا۔

دن بھر دوستوں میں گزارنے کے بعد وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کسی کو اسٹور میں بند کر کے آیا ہے۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی اسے عدنان کا خیال آیا۔ ارے اب تو بہت دیر ہو گئی۔

راحیلہ بے چینی سے اسٹور کے دروازے کے سامنے ٹہل رہی تھی۔ درانی خود بھی گھبرایا ہوا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور اسٹور کا دروازہ کھول دیا۔ عدنان ایک بڑے سے کاغذ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ درانی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔

"درانی بھیجیں تو" یہ تصویر کیسی ہے؟" راحیلہ نے چیخ کر کہا۔

درانی اسے بستر پر لٹا کر واپس آیا اور تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کسی مرد کا پنسل اسکیچ تھا۔ قریب ہی پنسل پڑی تھی۔ اس تصویر پر عدنان سر رکھے سو رہا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ تصویر اس نے بنائی ہے لیکن دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ایسا شاندار اسکیچ ایک چار سال کے بچے نے بنایا ہو گا۔ درانی نے دفتر سے موٹے کاغذ کی کچھ شیٹیں لا کر رکھی تھیں۔ یہ تصویر انہی میں سے ایک شیٹ پر بنائی گئی تھی۔ راحیلہ اور درانی حیرت سے اس شاہ کار کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا ننھا سمان اس عمر میں ایسا باکمال آرٹسٹ ہو گا' یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

اب عدنان کے اٹھنے کا انتظار تھا۔ وہی بتا سکتا تھا کہ وہ ایسی شاندار تصویریں کس طرح بنا لیتا ہے اور یہ تصویر اس نے کس کی بنائی ہے۔

عدنان تھک کر ایسا سویا تھا کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رات کو کسی وقت وہ سو کر اٹھا۔ راحیلہ نے اسے ہاتھ لگایا تو ہاتھ جل گیا۔ اس کا بدن بخار سے پھنک رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن بخار اتنا شدید تھا کہ درانی مجبور ہو گیا۔ اس نے عدنان کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا اور راحیلہ کو ساتھ لے کر فلیٹ سے نیچے اتر آیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر کبھی نہ جاتا لیکن نہ جاتا تو اس کی جان جا سکتی تھی۔

رات کا وقت تھا' اسے کسی نے فلیٹ سے نیچے اترتے ہوئے نہیں دیکھا۔ باہر آتے ہی اس نے ٹیکسی روکی اور اسے ایک پرائیویٹ اسپتال لے گیا۔ بخار اتنا تیز تھا کہ ڈاکٹروں نے اسے داخل کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ ایسا خطرہ تھا جسے مول لینے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں تھا۔ راحیلہ تو اس پر بھی تیار تھی لیکن درانی' بچے کی جان دے کر بھی اسے اسپتال میں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

ڈاکٹروں نے انجکشن لگایا' کچھ دوائیں لکھ کر دے دیں اور وہ اسے لے کر گھر آ گئے۔

تصویر کا مسئلہ ابھی تک اپنی جگہ پر تھا۔ عدنان نیم غنودگی میں تھا۔ اس وقت اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا جا سکتا تھا۔

وہ دونوں رات بھر جاگ کر عدنان کی تیمارداری کرتے رہے۔

اب درانی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ وہ مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ انعام کی رقم ملنے کے بجائے جیب کی پونجی بھی بچے پر خرچ ہو رہی ہے۔ ہر وقت کا دھڑکا الگ۔ آزادی سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ دفتر سے چھٹی لے کر بیٹھا ہوا تھا تاکہ اس کی موجودگی کی وجہ سے محلے کی عورتیں گھر میں نہ آئیں۔ ہر وقت کی قید ہے۔ آج کے واقعے نے تو اس کے ضمیر کو بھی مجروح کیا تھا۔ وہ اس معصوم کو کس قدر تکلیف پہنچا رہا ہے۔

صبح ہوتے ہوتے دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ دوپہر میں کسی وقت آنکھ کھلی۔ راحیلہ نے گھبرا کر عدنان کا ماتھا چھوا۔ بخار اترچکا تھا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی عدنان نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹوں پر پراسرار سا تبسم تھا۔

"عدنان بیٹا' اب کیسی طبیعت ہے؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں آنٹی۔ آپ مجھے میرے گھر لے کر کب جائیں گی؟"

"بس بیٹا' آج ہی" اس نے عدنان کو سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آنٹی' آپ روتی کیوں ہیں؟ میں آپ سے ملنے آیا کروں گا۔ آپ تو بہت اچھی ہیں' انکل بہت برے ہیں۔"

"نہیں بیٹا' یہ بھی بہت اچھے ہیں۔"

"چلو' مانے لیتا ہوں۔ پھر میں تیار ہو جاؤں؟"

"شام کو چلیں گے۔ ابھی تھوڑا اور آرام کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔"

درانی بھی سو کر اٹھ گیا تھا اور دونوں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے اشاروں سے راحیلہ سے کہا کہ وہ تصویر کے بارے میں پوچھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ راحیلہ سے خوش ہے' اسے صحیح بات بتا دے گا۔

راحیلہ نے اس سے پوچھا "یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟"

"جی آنٹی' اچھی ہے نا؟"

"بہت اچھی ہے مگر یہ ہے کس کی؟"

"میرے ڈیڈی کی۔"

"تم اتنی اچھی تصویریں بناتے ہو؟"

"اس سے بھی اچھی بناتا ہوں۔ میری پنسلوں کا بکس میرے پاس نہیں تھا۔ اگر وہ ہوتا تو آپ دیکھتیں۔"

"تم اتنے سے تو ہو اور ایسی تصویریں بناتے ہو!"

"میرے ڈیڈی کہتے ہیں' میں پیدائشی آرٹسٹ ہوں۔ جب میں دو سال کا تھا' تب سے تصویریں بناتا ہوں۔ ڈیڈی کہتے ہیں میں بڑا ہو کر بہت بڑا آرٹسٹ بنوں گا۔"

"تم نے کسی سے سیکھا ہو گا؟"

"پہلے تو خود ہی بناتا تھا۔ پھر ڈیڈی نے ٹیوٹر رکھ دیا۔ میری ٹیوشن کی بھی چھٹی ہو رہی ہے۔ مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔"

"تم راحیلہ آنٹی کی تصویر بنا سکتے ہو؟" درانی نے پوچھا۔

"بنا تو سکتا ہوں انکل لیکن میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے گھر جانا ہے نا۔"

"گھر کے بچے! کون لے کر جا رہا ہے تجھے گھر۔ اب اگر گھر کا نام لیا تو زبان کھینچ لوں گا تیری۔"

درانی اتنے زور سے دہاڑا کہ عدنان' راحیلہ سے لپٹ گیا۔ وہ ایسا سہم گیا تھا کہ رونا بھی بھول گیا لیکن جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ اسے ڈانٹ پڑی ہے' وہ رونے لگا۔

درانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اسے اٹھایا اور اسٹور میں بند کر کے تالا لگا دیا۔

"کیا کر رہے ہیں' مر جائے گا بے چارہ۔ ابھی تو بخار سے اٹھا ہے۔ دوا بھی پلانی تھی مجھے۔ کچھ کھایا بھی نہیں ہے اس نے۔" راحیلہ نے کہا۔

"مجھے اس کے سر سے اس کے گھر کا بھوت اتارنا ہے۔"

"ہم پیار سے بھی..."

"پیار سے وہ نہیں مانے گا۔ ہمیں اس کے دل پر خوف بٹھانا پڑے گا۔"

"آپ اس کی جان لے لیں گے اور کچھ نہیں" راحیلہ نے کہا۔

"اچھا مجھے چابی دیں' میں اسے کچھ کھلا تو دوں۔ دوا بھی دینی ہے۔"

"یہ لو چابی لیکن خبردار جو باہر نکالا۔"

عدنان کی تصویر کشی نے اسے نیا راستہ دکھایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' ذرا سی محنت سے وہ بہت بڑا آرٹسٹ بن سکتا ہے۔ محنت اس کی ہو گی' نام میرا ہو گا۔ شہرت میرے قدم چومے گی' دولت میرے ساتھ ہو گی۔ میں مشہور کروں گا کہ اسکیچز میں بناتا ہوں۔ ان سے ہونے والی آمدنی میری ہو گی۔ بعد میں یہ آمدنی بڑھ بھی سکتی ہے۔ میں بہت سے ایسے آرٹسٹوں کو جانتا ہوں جو اپنے فن کے بل بوتے پر لکھ پتی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت نہیں بھی ملی تو شہرت تو ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔ میری تصویروں کی نمائشیں منعقد ہوں گی' میرے انٹرویوز شائع ہوں گے۔ میں اس آرٹسٹ کے بچے کو سات پردوں میں چھپا کر رکھوں گا۔ کسی کا سایہ بھی اس پر نہیں پڑنے دوں گا۔ یہ اب میرے گھر میں عمر قید کاٹے گا اور میرے لیے تصویریں بنائے گا۔

سوچتے سوچتے وہ اس مرحلے پر آ گیا کہ عدنان لاکھ پیدائشی مصور ہو' اسے بالکل بچے کے لیے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہو گا۔ اگر میں کسی ٹیوٹر کا انتظام کرتا ہوں تو میری اتنی آمدنی کہاں ہے۔ اس کا یہ منگا شوق میں کہاں برداشت کر سکتا ہوں۔ یہاں پہنچ کر وہ مایوس ہونے لگا۔ یہ تو اچھا خاصا دس سالہ منصوبہ ہے اور مجھے فوری دولت درکار ہے۔

راحیلہ نے عدنان کو ناشتا کرا دیا تھا اور بہلا پھسلا کر اسٹور سے باہر لے آئی تھی۔

"یہ کہہ رہا ہے' گھر جانے کی ضد نہیں کرے گا۔"

"پھر ٹھیک ہے' اس سے کہو بیٹھا رہے ایک کونے میں۔"

"میں نے پنسل اور کاغذ دے دیا ہے کہ جو جی چاہے بنائے۔"

"اسے اسٹور میں بند ہونے کی عادت ڈالو۔ کل سے میں دفتر جاؤں گا تو اسے اسٹور میں بند کر کے ہی جاؤں گا۔" درانی نے کہا۔

اسے یاد آیا کہ اس نے اب تک اخبار نہیں پڑھا ہے۔ عدنان کا اشتہار دیکھنے کے لیے اس نے اخبار والے سے کہہ دیا تھا جو روزانہ اخبار ڈال جاتا تھا۔

وہ بالکونی میں گیا۔ اخبار ابھی تک وہیں پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آ کر وہ اخبار پڑھنے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ عدنان کی تصویر چھپی تھی۔ یہ یقیناً انعامی اشتہار ہو گا۔ اس نے راحیلہ کو آواز دی۔

"آ گیا' اشتہار آ گیا۔ یہ دیکھو عدنان کی تصویر" وہ خوشی سے چیخ رہا تھا "میں نے کہا تھا نا کہ ایک نہ ایک دن ہماری قسمت ضرور پلٹا کھائے گی۔ آخر اشتہار آ ہی گیا۔"

"پڑھیے تو لکھا کیا ہے۔ کتنی رقم کا اعلان کیا ہے؟"

سو سالہ ڈائمنڈ فلم ڈائریکٹری آ گئی

اس فلم ڈائریکٹری میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۹۷ء تک بننے والی اردو فلموں کی مکمل تفصیل اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۷ء تک پاکستان میں بننے والی اردو' پنجابی' سندھی' پشتو فلموں کی تفصیل کے ساتھ معلومات۔ اس کے علاوہ اس ڈائریکٹری میں آرٹ پیپر پر بے گنتی' چار رنگی تصاویر ☆ پاکستان کی فلمی تاریخ ☆ پاکستان کے فلم تقسیم کاروں کی مکمل فہرست نام اور پتے مع فون ☆ انگریزی فلموں کے امپورٹر کے نام اور پتے مع فون ☆ پاکستان کے تمام سینماؤں کے نام' پتے اور فون ☆ کراچی کی فلم صنعت پر چار سو اداکاروں کی پہلی فلم ☆ نگار ایوارڈ کے ۳۹ سال' کراچی کے فلمی اداروں کے پتے اور نام اور بے شمار دلچسپیاں۔ قیمت دو سو روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں اور یہ فلمی خزانہ منگالیں۔ وی پی ارسال نہیں ہو گا۔

پتہ : روپ پبلشرز
نزد دفتر رسالہ روبان۔ آسن مل اوجھا روڈ کراچی
فون نمبر 213496

"پڑھتا ہوں، پڑھتا ہوں۔ ذرا سانس تو ٹھکانے آجائے۔"

اس نے اشتہار پڑھنا شروع کیا۔ گمشدگی کا اعلان تھا۔ تلاش کرنے والے کو ثواب دارین کا واسطہ دیا تھا۔ رقم کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ لکھا تھا ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ نیچے پتا تھا کہ بچے کو یہاں پہنچا دیا جائے۔ بچہ واپس لانے والے سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔

اس نے کئی مرتبہ اس اشتہار کو پڑھا لیکن رقم کا ذکر ہوتا تو نظر آتا۔ اس نے جھنجلا کر اخبار کو دور پھینک دیا۔

"اتنی دولت ہونے کے باوجود کنجوسی کا یہ حال ہے۔ بچے کے لیے پانچ روپے کا اعلان نہیں کیا گیا۔ اب لے کر دکھادو اپنا بچہ۔ ثواب کمانے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔"

اس کے منہ میں جو آیا، بکتا چلا گیا۔ اس کے نہ صرف تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے بلکہ اس کی اسکیم بھی ٹیل ہوتی نظر آرہی تھی۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ اسے مصوری کی تعلیم دلوائے گا لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تصویر سب نے دیکھ لی ہے۔ اب تو اسے چھپانا بہت ضروری ہو جائے گا۔ اس نے سوچا، اس مصیبت کو گھر سے نکال ہی دینا چاہیے۔ چپکے سے..... جا کر اس کے گھر کے سامنے چھوڑ آؤں۔ کنڑ مرتی کو پالنے کا کیا فائدہ۔ قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔ میری قسمت میں دولت تھی ہی نہیں۔

راحیلہ اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کئی دفعہ وہ اٹھ کر گئی اور عدنان کو دیکھ آئی جو ہر چیز سے بے نیاز، کاغذ پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن درانی کو پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔

"تو کیا سوچا آپ نے؟ اسے چھوڑ آئیں گے؟"

"اور کیا اچار ڈالوں گا اس کا۔ دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ زندگی بھر کے لیے قیدی بنالوں۔ ایسے ماں باپ کی سزا تو یہی ہے لیکن کیا فائدہ؟"

"درانی!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا ہے؟"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے ہم واپس نہ کریں۔ اپنا بیٹا بنا کر رکھیں۔ اس کی ماں کے پاس تو دو بچے اور ہیں۔ میرے پاس تو ایک بھی نہیں ہے۔"

"اب یہ کیسے ممکن ہے" درانی نے کہا "کس کس سے چھپاتی پھروگی۔ دس پندرہ دن کی بات اور تھی لیکن کب تک چھپاؤ گی۔"

"بڑھتی عمر ہے۔ سال دو سال گزریں گے تو اس کے ماں باپ بھی اسے نہیں پہچان سکیں گے۔"

"کیا یہ گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ محلے والوں سے کیا کہو گی۔"

"میں اسے اسٹور میں بند رکھوں گی۔ بس خود دیکھا کروں گی۔ عدنان کو مجھے بخش دو۔"

"پاگل ہو گئی ہو۔ کیا کوئی رشتے دار بھی ہمارے گھر نہیں آئے گا؟"

"ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ رشتے داروں کو پتا بھی نہیں ہو گا ہم کہاں گئے۔ میری مامتا کو قرار آجائے گا۔ اگر یہ واپس چلا گیا تو میں زندہ نہیں بچوں گی۔"

"یہ اپنے گھر والوں کو بھول سکے گا؟"

"وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ ابھی عمری کیا ہے۔ سب بھول جائے گا۔ میں اسے اتنی محبت دوں گی کہ سب بھول جائے گا۔" راحیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بے اولاد تو درانی بھی تھا۔ اس کے دل میں بھی بے ایمانی آنے لگی۔ وہ دولت کے لیے اسے اغوا کرا لایا تھا لیکن اتنے دن کی قربت نے اس کے دل میں بھی کسی اور جذبے نے جگہ بنالی تھی۔ راحیلہ نے صرف اتنا کیا کہ اس جذبے کو بیدار کر دیا۔

"کچھ ہو گیا تو زیادہ تر تم ہو گی" درانی نے کمزور آواز میں کہا۔

"اللہ مالک ہے۔ ہم اس پر ظلم نہیں کر رہے ہیں۔ پیٹا بنا رہے ہیں۔"

"بہت ہوشیاری سے رہنا ہو گا۔"

"میں رہ لوں گی۔ بس آپ اجازت دے دیں۔"

"بلاؤ اسے۔"

راحیلہ گئی اور اسے گود میں اٹھا کر لے آئی۔ درانی نے اسے گود میں لیا اور دیوانوں کی طرح اسے چومنے لگا۔ عدنان نے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

درانی کا پورا نام عاشق حسین درانی تھا۔ اس نے عدنان کا نام ناصر حسین درانی رکھ دیا۔

اب خطرہ اور بڑھ گیا تھا۔ اس کا فوٹو سب نے دیکھ لیا تھا۔ اسے بہت دن تک سب کی نظروں سے بچانا تھا۔ اس نے یہ ارادہ بھی ملتوی کر دیا کہ کسی ٹیوٹر کے ذریعے اسے مصوری کی تعلیم دلائی جائے۔

درانی نے عدنان سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے گھر جانے کا نام لیا تو وہ اسے اسٹور میں بند کر دے گا اور پھر کبھی نہیں کھولے گا۔ اس خوف سے اس نے گھر جانے کی ضد بالکل چھوڑ دی تھی۔

درانی نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ دولت کی آرزو اسے اب بھی تھی لیکن اس طریقے کی ناکامی کے بعد کسی اور طریقے پر اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کچھ قسمت پرست ہو گیا تھا۔ سوچنے لگا تھا کہ انسان کتنی ہی کوشش کر لے، قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ اب اس وقت کے انتظار میں رہنے لگا تھا جب قسمت خود بخود پلٹا کھائے۔

کچھ دن مسلسل عدنان کی گم شدگی کے اشتہار آتے رہے، پھر یہ سلسلہ رک گیا۔

راحیلہ سب کی نظروں سے چھپا کر عدنان کو اپنی اولاد کی طرح

پال رہی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ اپنی ماں کو یاد کرتا تو اسے احساس جرم سا ہوتا۔ وہ فرق محسوس ہوتا جو اپنی اولاد اور دوسرے کی اولاد میں ہوتا ہے۔

کہتے ہیں جو بچہ دنیا میں آتا ہے، اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے۔ عدنان اس گھر میں آیا اور جب سے ملے ہو گیا کہ اسے یہیں رہنا ہے تو اس کی قسمت نے اس گھر میں ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے قدم ایسے مبارک ثابت ہوئے کہ درانی کو ایک سال میں دو پروموشن مل گئے۔ کلرکی سے آفیسر گریڈ میں آگیا۔ وہ تو اسے عدنان کے قدموں کی برکت ہی سمجھتا تھا۔

آمدنی بڑھی تو گھر میں کچھ خوش حالی بھی آگئی لیکن ایسی خوشی کس کام کی جس میں آزادی نہ ہو۔ پلی پلائی اولاد مل گئی تھی لیکن اسے گھر سے باہر لے کر نہیں جا سکتے تھے۔ کوئی مہمان آجائے تو اس کے منہ پر ٹیپ لگا کر، ہاتھ پاؤں باندھ کر اسٹور میں بند کرنا پڑتا تھا۔

اس بچے کے دل پر کیا گزرتی ہو گی جو کھیلنے کی عمر میں کھیلنا تو درکنار، گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ فلیٹ کے دروازے بھی ہر وقت بند رکھنا پڑتے تھے کہ ادھر ادھر سے کوئی اسے گھورتا ہوا بھی دیکھ لے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس گھر میں کوئی بچہ بھی ہے۔ دھوپ دیکھنے کے لیے بھی اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

اس مسلسل قید سے عدنان کی صحت کو خراب کر دیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ کچھ مفلوج سا ہونے لگتا تھا۔ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے خود ہی ہنسنے لگتا تھا یا رونے لگتا تھا۔ راحیلہ اسے اکیلا پیار کرے، بچہ تو بچوں میں خوش ہوتا ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ضد کرتا تھا لیکن راحیلہ اسے باہر نہیں بھیج سکتی تھی۔

اس ذہنی انتشار کے باوجود تصویریں بنانے میں اس کا خوب دل لگ رہا تھا۔ اس نے پورے گھر کو اسٹوڈیو بنا دیا تھا۔ کچھ سامان درانی نے لا کر دے دیا تھا اور وہ دن بھر تصویریں بناتا رہتا تھا۔

عدنان کو ان کے ساتھ رہتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ ان دو برسوں میں اس کی صورت بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ درانی جب تصویر کو اس کی صورت سے ملاتا تھا تو بہت فرق ظاہر ہوتا تھا۔ درانی کے لیے یہ خوشی کا مقام تھا۔ اس کا مطلب ہے جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جائے گی، اخبار میں چھپنے والی تصویر سے اتنا مختلف ہو جائے گا کہ کوئی شناخت نہیں کر سکے گا۔ شناخت کرنا تو اب بھی آسان نہیں تھا لیکن فلیٹ والے سب جانتے تھے کہ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ پوچھ سکتے تھے کہ اچانک یہ بچہ کہاں سے آگیا؟ اور ممکن ہے انہیں شک ہو جائے تو وہ حقیقت تک بھی پہنچ جائیں۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا تھا کہ یہ فلیٹ بیچ کر کسی اور جگہ فلیٹ یا مکان لے لیا جائے۔ نئے محلے میں کسے معلوم ہو گا کہ یہ بچہ ان کا ہے یا کسی اور کا۔

ابھی وہ مکان بیچنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ قدرت نے ایک اور انتظام کر دیا۔ اس کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ محلہ بدل رہا تھا، شہر چھوڑنے کا انتظام ہو گیا۔ یہ تبدیلی اس کے لیے نعمت سے کم نہیں تھی۔ نئے شہر میں اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ آزادی سے رہ سکتا تھا۔

دوسرے شہر میں آکر اسے احساس ہوا جیسے وہ بند کمرے سے کھلے آسمان تلے آگیا۔ یہ خیال اس کے لیے تقویت کا باعث تھا کہ وہ عدنان کے والدین سے بہت دور آگیا ہے۔ راحیلہ کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہو گئی تھی کہ وہ عدنان کے ساتھ تفریحی مقامات پر جائے۔ اس کے ساتھ کھیلے، اس کے ساتھ گھومے۔ سرکاری مکان ملا ہوا تھا، سرکاری گاڑی تھی۔ عدنان آیا تھا تو اپنے ساتھ اپنے عید بھی لے کر آیا تھا۔ یہ شک بہرحال اب بھی تھا کہ نہ جانے کس کے سامنے وہ کیا کہہ دے، اس لیے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔

عدنان اب بھی پوری طرح آزاد نہیں تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح نہ تو باہر جا کر کھیل سکتا تھا اور نہ ابھی تک اسکول جانا شروع کیا تھا۔ فرصت کے ان لمحوں میں وہ تصویریں بناتا رہتا تھا۔ اس کا یہ شوق اب جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

اس کا شوق دیکھ کر درانی کو ایک مرتبہ پھر اسے مصور بنانے کا خیال آیا لیکن اب اس خیال کی صورت دوسری تھی۔ اب وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ عدنان کی محنت سے وہ شہرت حاصل کرے۔ اب وہ کوئی غیر نہیں، اس کا بیٹا تھا۔ اب وہ اسے شہرت کی بلندیوں پر دیکھ کر خوش ہونا چاہتا تھا۔ اس کی آمدنی بھی اب اتنی ہو گئی تھی کہ وہ اس کے لیے کسی اچھے آرٹسٹ کو ٹیوٹر کے طور پر رکھ سکتا تھا۔ اس نے عدنان کی بنائی ہوئی کچھ تصویریں ایک بڑے آرٹسٹ کو دکھائیں۔

"یہ آٹھ سال کے ایک بچے کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ انہیں دیکھ کر بتائیے کہ فن کے اعتبار سے یہ کیسی ہیں؟"

ظلم و تشدد سے بھرپور بربریت و معاشرے کی پراسرار دہشتناکیوں کا منفرد انداز بیان
ناگن کے انتقام کی سنسنی خیز اور رُوح مالی داستان
ناگن
صفحات: 320
قیمت: 150 روپے
150 روپے
VP
منگوانے کے لیے خط لکھیے
اعلیٰ مجلد کتاب
نواب سنز پبلی کیشنز

تصویریں دیکھ کر وہ آرٹسٹ ششدر رہ گیا "آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟ یہ تصویریں واقعی آٹھ سال کے بچے نے بنائی ہیں؟"

"نہیں صاحب' میں آپ سے کیوں مذاق کرنے لگا تھا۔"

"یہ بچہ کس عمر سے تصویریں بنا رہا ہے؟"

"دو سال کی عمر سے۔"

"اور اس جوہر یاب کو ابھی تک آپ نے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ بچہ ان چند فنکاروں میں سے ایک ہے جو ماں کے پیٹ سے مصور پیدا ہوتے ہیں۔"

"میں چاہتا ہوں' آپ اسے سکھائیں' اسے باکمال بنا دیں۔"

"الٰہی کی تخلیقی قدرت خود کرتی ہے۔ میں اسے کیا سکھا سکتا ہوں۔ اس کے اسٹروکس اتنے طاقتور ہیں جو سیکھنے سے نہیں آتے۔ میں اسے اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ مشورے دے سکتا ہوں اور بس۔"

"یہی سہی۔"

"تو پھر لے آیئے صاحب زادے کو کسی دن۔"

"یہی تو مجبوری ہے" درانی نے کہا "یہ بھی کوئی فنکارانہ ادا ہے اس کی کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ آپ کو میرے گھر آنا پڑے گا۔ میں ایک معقول نذرانہ آپ کو دوں گا۔"

"دیکھیے صاحب' نذرانہ تو میں نہیں لوں گا کیونکہ ایسے شاگرد' استاد کی ناموری کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ میں یہ موقع کھونا نہیں چاہتا۔"

یہ آرٹسٹ عدنان کے فن کو نکھارنے کے لیے اس کے گھر آنے لگا۔

عدنان اپنی بنائی ہوئی تصویروں کے ہجوم میں ایسا گم ہوا کہ لگتا تھا سب کچھ بھول چکا ہے۔ اسے کسی طرح بھی نارمل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ راحیلہ اس کی طرف سے فکرمند تھی لیکن درانی جانتا تھا کہ فنکاروں کی زندگی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے۔ عدنان نہ کپڑوں کی فکر تھی نہ اپنے بڑھے ہوئے بالوں کی۔ پہلے اس پر اکیلے نکلنے پر پابندی تھی' اب وہ کسی کے ساتھ بھی باہر جانے پر تیار نہیں تھا۔ اظہارہ گھنٹے تصویریں بناتے ہوئے گزار دیتا تھا۔

اس گوشہ نشینی کے باوجود اس کی بنائی ہوئی تصویریں خوشبو کی طرح پھیلنے لگی تھیں۔ اس کے پرستار اس کی تصویریں' گھر آکر خرید رہے تھے لیکن خود اسے نہ شہرت سے غرض تھی نہ ان تصویروں کی قیمت سے۔ تصویروں کی خرید و فروخت درانی کے سپرد تھی۔

اس کی یہ بے خبری درانی کے لیے حوصلہ افزا تھی۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ اپنا ماضی بھول چکا ہے۔ اب تو وہ ایسی مشین بن گیا ہے جس سے ہزاروں روپے کمائے جا سکتے ہیں۔

صرف بیس سال کی عمر میں وہ بے پناہ شہرت کا مالک بن گیا تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ اس کے سیکڑوں انٹرویو ز شائع ہو چکے تھے لیکن ہر انٹرویو میں اس نے درانی اور راحیلہ ہی کو اپنے والدین کے طور سے متعارف کرایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا ماضی یکسر فراموش کر چکا ہے۔ بچپن کی کوئی بات بھی اس کے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ اسے اب یاد بھی نہیں رہا تھا کہ درانی نے اسے اغوا کیا تھا۔ وہ ماضی کا آدمی ہی نہیں رہا تھا۔ کوئی اس سے اس کے بچپن کے متعلق سوال کرتا بھی تھا تو وہ سوال کرنے والے کا منہ تکنے لگتا تھا۔ سوال کرنے والا اسے ایک خبطی مصور سمجھ کر مسکرانے لگتا تھا۔

اس کے فن نے درانی کا یہ خواب پورا کر دیا تھا کہ اس کے پاس دولت کے ڈھیر ہوں۔ اس کی تصویریں بہت مہنگے داموں فروخت ہو رہی تھیں اور ہر تصویر کی قیمت کا واحد مالک درانی تھا۔ اب اسے اپنی قسمت سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اسے ایک بنا بھی مل گیا تھا اور دولت بھی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پھر اپنے شہر واپس آگیا اور ایک نہایت پوش علاقے میں رہائش اختیار کر لی۔ اب وہ ملک کے ایک نامور آرٹسٹ ناصر حسین درانی کے باپ کی حیثیت سے خود بھی شہرت کا حامل تھا۔ اب کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ ناصر حسین درانی' ماضی کا عدنان احمد ہے۔

شہر کی آرٹ گیلری میں عدنان کی تصویروں کی نمائش تھی۔ اس نمائش کا موضوع تھا۔ "بچے" وہ دن رات' ہر عمر کے ہر قوم کے بچوں کی تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے تر و تازہ بچے' ترقی پذیر ملکوں کے مرجھائے ہوئے بچے' غریب ملکوں کے بھوک سے بلکتے بچے۔ ماں باپ کے سائے میں پلنے والے بچے' ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچے۔

میڈیا سے اس نمائش کے لیے خوب چرچے ہو رہے تھے۔ ناصر حسین درانی کے کمال فن کی تصویر کھینچی ہوئی تھی۔

سات روزہ اس نمائش کا آج آخری دن تھا کہ افتخار احمد کے دوست اسے بھی نمائش میں لے گئے۔ معصوم اور مظلوم بچوں کے دلفریب دو پینڈیر چہرے نہایت جاذب نظر تھے۔ افتخار احمد ایک ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک جگہ ان کے قدم خود بخود رک گئے۔ ایک تصویر کو دیکھ کر ان کی آنکھیں' تصویر کا تعاقب کرتی ہوئی بہت دور چلی گئیں۔ وہ اس چہرے کو کیسے بھول سکتے تھے۔ یہ ان کے عدنان کا بچپن تھا۔ انہوں نے آنکھیں مل کر تصویر کو پھر غور سے دیکھا کہ کہیں ان کی آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں لیکن یہ چہرہ تو ایک پل کے لیے ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتے تھے۔ اس تصویر کے برابر ہی ایک تصویر اور لگی ہوئی تھی۔ یہ ان کے بڑے بیٹے سلمان کا بچپن تھا۔ یا الٰہی! میرے بچوں کی تصویریں یہاں کیسے آگئیں۔ انہوں نے مزید غور کیا تو ایک خاص بات اور نظر آگئی۔ عدنان جب

بچپن میں تصویریں بناتا تھا تو ہر تصویر میں تین دائرے' ایک دوسرے میں پیوست ضرور بناتا تھا۔ یہی اس کے دستخط ہوا کرتے تھے۔ یہ دائرے ان تصویروں میں بھی موجود تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی اور تصویروں کو دیکھا۔ نمائش میں لگی ہر تصویر میں یہ تین دائرے موجود تھے۔ تو کیا یہ تصویریں عدنان کی بنائی ہوئی ہیں؟ اسی لیے اس نے اپنے اور اپنے بھائی کا بچپن بھی پینٹ کیا ہے۔ اس کے سوا کس آرٹسٹ نے اس کا بچپن دیکھا ہوگا۔

افتخار اپنے دوستوں کے ساتھ گیلری کی انتظامیہ کے پاس گئے اور ناصر درانی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"جناب ناصر صاحب بہت کم کسی سے ملتے ہیں۔ اگر آپ بضد ہیں تو ان کے والد سے اجازت لینی ہوگی۔"

"اس کا والد تو میں ہوں۔ وہ میرا بیٹا ہے" افتخار احمد اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔

"کمال کر رہے ہیں آپ۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ان کے والد عاشق حسین درانی ہیں۔ ناصر صاحب خود کئی مرتبہ اپنے انٹرویوز میں ان کا نام بطور والد لے چکے ہیں۔"

"دھوکا' سب دھوکا۔ بہرحال کہاں ہے وہ عاشق حسین درانی!"

"آپ انتظار کریں۔ میں آدھے گھنٹے بعد آتا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد افتخار احمد ہی کی عمر کا ایک آدمی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے دفتر میں داخل ہوا۔ اسے غالباً کسی نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی صاحب اس کے منتظر ہیں۔ اس لیے اس نے آتے ہی افتخار احمد سے ہاتھ ملایا۔

"کہئے' کیا کام ہے مجھ سے؟"

"آپ سے نہیں' مجھے ناصر سے کام ہے۔"

"وہ گوشہ نشین ہے' کسی سے ملتا نہیں ہے۔"

"مجھے اس کی تصویروں کے بارے میں اس سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"اگر آپ کو تنقید کرنی ہے تو کسی اخبار میں مضمون لکھ دیجئے وہ اس کا جواب دے دے گا۔ تصویریں خریدنی ہیں تو مجھ سے بات کیجئے۔"

افتخار احمد غصے سے کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ اور کہنے ہی والے تھے کہ ان کے دوستوں نے انہیں روک دیا۔

"ہمیں ان کی دو تصویریں خریدنی ہیں" افتخار احمد کے ایک دوست نے کہا۔

"تصویر پر قیمت اور تصویر کا نمبر لکھا ہوا ہے۔ آپ نمبر بتایئے' قیمت ادا کیجئے۔ تصویریں آپ کو نمائش ختم ہونے کے بعد مل جائیں گی۔"

افتخار احمد نے پے منٹ کی اور خاموشی سے گیلری سے نکل آئے۔

یک نہ شد

ایک ٹھیکے دار کسی محکمے میں اپنا کام نکلوانے کے لیے ایک افسر کو کار کی پیش کش کر رہا تھا۔ افسر نے متانت سے کہا "جناب' یہ رشوت ہوگی اور میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"لیکن سنئے تو" ٹھیکے دار صاحب نے لجاجت سے کہا "میں یہ کار آپ کو مفت نہیں دے رہا۔ آپ مجھے اس کار کے عوض دس روپے دے دیں۔ اب تو یہ رشوت نہیں ہوگی۔ یہ تو خرید و فروخت کا سیدھا سادہ سا معاملہ ہے۔"

افسر نے چند لمحے غور کیا اور بولا "ایسی صورت میں تو میں دو کاریں لینا پسند کروں گا۔"

کراچی سے علی یاور نے روانہ کیا

دراصل ان کے دوستوں نے یہ ایک چال چلی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ افتخار احمد جذبات میں ایسی باتیں کہہ دیں کہ عاشق حسین وقت سے پہلے ہوشیار ہو جائے۔

انہوں نے باہر آتے ہی ایک وکیل کی خدمات لیں اور عاشق حسین کے خلاف عدنان کے اغوا اور اسے جبراً بے جا میں رکھنے کا مقدمہ دائر کر دیا۔

پورے شہر کے لیے یہ ایک دلچسپ اور انوکھا مقدمہ تھا۔ ناصر حسین کی ولدیت کا دعویٰ ایک اور شخص افتخار احمد نے کر دیا تھا۔

مقدمے کی ساعت شروع ہوئی۔ افتخار احمد نے بیس سال پہلے اخباروں میں چھپنے والا اشتہار اور عدنان کی تصویر پیش کی۔ نمائش میں رکھی جانے والی تصویر اس دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اسی آرٹسٹ کے بچپن کی دو تصویریں ہیں۔ اس نے اپنے بھائی کے بچپن کی تصویر بھی بنائی ہے۔ یہ ہرگز خیالی نہیں ہو سکتی۔ آرٹسٹ کے بچپن کی یادیں ہیں جو ان تصویروں میں ابھر آئی ہیں۔ پولیس ریکارڈ سے بھی اس بچے کی گم شدگی ثابت ہو رہی تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ عدنان کو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ وہ درانی ہی کو اپنا باپ کہنے پر بضد تھا۔

"پھر یہ تصویریں آپ نے کیسے بنا لیں؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آرٹسٹ کا تخیل ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ یہ تصویریں کس سے ملتی ہیں۔"

درانی پر جرح ہوئی' اس سے بھی کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ باتیں سب مفروضوں پر مبنی تھیں اور اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

"اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میری بیوی نے اسے جنم دیا ہے۔"

"کسی اسپتال میں اس کا رجسٹریشن تو ہوگا۔"

"اس کی پیدائش گھر پر ہوئی تھی۔"

"اس کا اندراج تو کرایا ہوگا۔"

"اسے آپ میری کاہلی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اندراج نہیں کرایا تھا۔"

"کسی اسکول میں تو داخل کرایا ہوگا۔"

"یہ دو سال کی عمر میں تصویریں بنانے لگا تھا لہٰذا میں نے اسے مصور بنایا، کسی اسکول میں داخل نہیں کرایا۔ میں سمجھتا ہوں میرا یہ فیصلہ درست تھا۔"

"اس کے بچپن کی کوئی تصویر ہے آپ کے پاس؟"

"میں مذہبی آدمی تھا اور تصویریں کھنچوانے کا سخت مخالف تھا۔ یہ الگ بات کہ میں بیٹے کے شوق سے مجبور ہوگیا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔"

"آپ نے اسے اس خوف سے باہر نکلنے نہیں دیا کہ کوئی پہچان نہ لے۔"

"بالکل نہیں۔ یہ بچپن ہی سے کچھ اینا نارمل تھا۔ گوشہ نشین اور خبطی سا تھا۔"

کئی دنوں تک جرح ہوتی رہی لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل سکا۔ عدنان یہی کہتا رہا کہ اسے اپنے بچپن کی صرف یہ بات یاد ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور اسٹور میں بیٹھا تصویریں بناتا رہتا تھا۔

اس مقدمے میں عدنان کا بیان بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ جب اغوا ہوا تھا، اس کی عمر چار سال تھی۔ اس عمر کے بچے کو کوئی ایک بات تو یاد دلانے پر یاد آجاتی ہے لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

عدالت نے تصویروں کی مشابہت کو ایک باکمال مصور کے تخیل کا کمال کہہ کر مقدمہ خارج کردیا۔

افتخار احمد کو اس فیصلے کے باوجود اپنے دعوے پر اصرار تھا۔ وہ عدنان سے ملے بھی لیکن اسے کچھ یاد نہ دلا سکے۔ عدنان کو ان سے ہمدردی تھی۔ وہ صرف دعا کرسکتا تھا کہ ان کا بیٹا انہیں مل جائے۔

درانی اور عدنان ایک ہی گاڑی سے عدالت سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

"عجیب خبطی پڑھا تھا۔ دوسرے کی اولاد کو نہ جانے کیوں اپنی اولاد کہنے پر بضد تھا۔" راستے میں درانی نے عدنان سے کہا۔

"وہ خبطی نہیں تھا، سچا تھا۔" عدنان نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا تم۔"

"مجھے واقعی کچھ یاد نہیں رہا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ آپ مجھے کہیں سے لائے تھے۔ کہاں سے؟ یہ یاد نہیں تھا۔ عدالت میں جب ڈیڈی نے مجھے میرا بچپن یاد دلایا تو مجھے بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ میری ماں یاد آئی جو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ میرا بھائی سلمان یاد آگیا لیکن میں انجان بنا رہا۔ میری یادیں آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگوا سکتی تھیں اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ اگر میں ڈیڈی کو پہچان لیتا تو سوچئے آپ کہاں کھڑے ہوتے۔ راحیلہ آنٹی کو میں کیا منہ دکھاتا۔

"اگر آپ نے مجھے اغوا کیا تو آپ کے احسانات بھی ہیں مجھ پر۔ ان احسانات کا بدلہ میں اسی طرح اتار سکتا تھا۔ ڈیڈی تو خیر میرے بغیر رہ ہی رہے تھے، اور رہ لیں گے۔ آپ پر میں اتنی ہی مہربانی کرسکتا تھا۔ اس سے زیادہ مجھ سے توقع نہ رکھیے گا۔"

وہ بری طرح سسک رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ پھر سے چار برس کا ہوگیا ہے اور درانی اسے اغوا کرکے لے جا رہا ہے۔

"تمہیں آخر سوجھی کیا تھی کہ تم نے اپنے بچپن کی تصویر بنائی۔"

"مجھے نہیں معلوم وہ کس کی تصویر تھی۔ بھلا کوئی اپنی چار سال کی صورت کیسے یاد رکھ سکتا ہے۔ وہ بچہ میرے لاشعور میں کہیں چھپا ہوا تھا جو مناسب وقت پر مجھ سے باہر آگیا۔"

"خیر، بھول جاؤ۔ جو ہونا تھا ہوا۔"

"اب میں ایک ایسے آدمی کے گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں جو مجھے اغوا کرکے لایا ہے۔ اب میں کمزور بچہ نہیں ہوں۔"

"میں نے تمہیں پالا ہے۔"

"اس کا لحاظ میں رکھ چکا۔ اسی لحاظ کے نتیجے میں آپ کی گاڑی خود چلا رہا ہے میں۔"

"یہ تمہاری گاڑی ہے بیٹا۔"

"میرا کچھ نہیں ہے۔ میرا لاوارث بستہ تھا جسے لے کر میں اسکول جاتا تھا۔ اب میں وہ کہاں سے لاؤں؟"

"راحیلہ کی محبت بھی بھول گئے۔"

"ان کی محبت ہی تو مجھے گھر لے جا رہی ہے۔"

وہ گھر پہنچے تو راحیلہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں کو خیریت سے گھر میں دیکھ کر اس نے شکر ادا کیا اور عدنان سے گلے مل کر دیر تک روئی۔ عدنان بھی اس کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔

دوسرے دن کے اخباروں نے اس خبر کو اپنی اپنی اشاعتوں میں نمایاں جگہ دی کہ نامور مصور ناصر درانی ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

اخبارات اسے فنِ مصوری کی ناقدری اور اہلِ وطن کی بے حسی کا نتیجہ قرار دے رہے تھے۔

عرصہ گزر گیا تھا، اس کی کوئی تصویر منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ وہ کہاں ہے، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

ایسی شہرت اور پھر ایسی گمنامی!

پرانی سی اس عمارت میں واقع وہ اپارٹمنٹ تین کمروں مشتمل تھا جن کی چھتیں پرانی طرز تعمیر کے مطابق اونچی اونچی تھیں۔ فرش چوبی تختوں کا تھا۔ باتھ روم اور کچن کے ٹائلز اپنی چمک دمک کھو چکے تھے۔ اس عمارت میں لفٹ بھی نہیں تھی اور جب یہ بنی تھی تو شہر کے مرکزی علاقے سے بہت دور تھی۔ اسے شہر کے تقریباً مضافاتی علاقے کی عمارت شمار کیا جاتا تھا مگر اب یہ شہر کے گنجان اور بارونق حصے میں آگئی تھی اور اس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک شہر کی مصروف ترین سڑکوں میں سے ایک تھی۔

جم نے چیختے چنگھاڑتے اور دوڑتے بھاگتے شہر کی یہ پیش قدمی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ شہر روزبہ روز، سال بہ سال اس کے سامنے پھیلا تھا اور گویا اس عمارت کو نگلتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ عمارت کے اس اپارٹمنٹ میں جم نے تینوں ہی کمروں میں کتابوں کے انبار لگا رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ تیزی سے بڑھتے ہوئے شہر کی پیش قدمی روکنے کے لیے کتابوں کے مورچے بنا رہا تھا مگر یہ مورچے اس کے کام نہیں آسکے تھے۔

زیادہ تر تو وہ اپنے اپارٹمنٹ تک ہی محدود رہتا تھا اور کتابیں اس کی بہترین ساتھی تھیں لیکن اسے آدم بیزار بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اسے بچوں سے پیار تھا۔ جب وہ مطالعے سے اکتا جاتا اور احساس تنہائی اس پر غلبہ پاتا تو وہ پڑوسیوں کے بچوں، پوتوں اور نواسوں میں جا کر دل بہلا لیتا۔ وہ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھا۔ اسے تھوڑی سی پنشن اور اپنے تحقیقی کاموں کی معمولی سی رائلٹی ملتی تھی۔

اس آمدنی میں جتنی بھی زیادہ سے زیادہ گنجائش نکلتی وہ اس سے معصوم اور نوعمر بچوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ کسی کو ٹافیوں یا بسکٹ کے لیے کچھ دے دیتا، کسی کو رنگین پنسلیں یا کومک بک لا دیتا اور ذرا بڑے بچوں کو اسکوٹر میں پیٹرول ڈلوانے یا پراٹھا کھانے کے لیے پیسے دے دیتا۔ یوں گویا وہ ان بچوں میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں تقسیم کرتا تھا جو اس کے سامنے بڑے ہو رہے تھے۔ وہ ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم رازوں میں بھی شریک اور ان کا امین تھا۔

یہ بچے اور بچیاں ہی گویا اس کا خاندان تھے اور ان کی صحبت میں رہ کر وہ خود بھی بقول اپنے "بچپن اور نو عمری کی ہوا سونگھ لیتا تھا۔" ان کے ساتھ وقت گزار کر وہ خود کو بھی ایک کارآمد انسان اور دنیا کا ایک حصہ محسوس کرتا تھا ورنہ ایک تنہا، بوڑھے، ریٹائرڈ اور غریب سے ٹیچر کی بھلا کیا زندگی تھی؟ اسے تو شاید کوئی عشوہ معطل بھی شمار نہ کرتا۔

بھری زندگی پر محیط ایک شخص کی جذباتی وابستگی کا احوال

کامل ظہیر

وابستگی

کسی شے سے جذباتی طور پر وابستہ افراد کے لیے اس سے جدائی کا تصور ہی روح فرسا ہوتا ہے۔ حالات خواہ اچھے ہوں یا برے، انہیں اس کی قربت ہر نعمت سے بڑھ کر عزیز ہوتی ہے۔ اور اگر کبھی علیحدگی کا دن گزر بسر حلقہ کی بھی جائے تو وہ یہ آن کے لیے زمین کی اور موت کا معاملہ ہوتا ہے۔

بچوں کے بعد اس کی سب سے زیادہ وابستگی اس اپارٹمنٹ کے ساتھ تھی جس میں اس کی تقریباً پوری زندگی گزری تھی۔ وہ اسے کچھ اسی طرح اپنا رفیق محسوس کرتا تھا جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان تھا جو اس کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہو رہا تھا۔ وہ اس کی تمام خوبیوں خامیوں سے واقف تھا اور اسے اس کی صرف خوبیوں سے ہی نہیں، خامیوں سے بھی پیار ہو چکا تھا۔

اگر کسی پرانی کھڑکی کی درزوں اور رخنوں سے سرد ہوا اندر آتی تھی تو وہ اسے برداشت کرتا تھا اور اگر کہنہ سال دروازہ کہیں چوکھٹ میں پھنسنے لگتا تھا تو وہ غصے سے اسے لات نہیں مارتا تھا، مسکرا دیتا تھا اور کسی ضدی بچے کی طرح اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سے سوئچ کو کس خاص انداز میں دبانا پڑتا تھا تب لائٹ آن ہوتی تھی۔

اس گھر کی جس چیز سے اسے سب سے زیادہ محبت تھی وہ اس کی بڑی سی کھڑکی تھی جو سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے سمندر کا دل فریب نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کا جب کسی اور شغل میں دل نہ لگتا تو اسی کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا تھا۔ سردیوں میں وہ بند کھڑکی کے شیشے سے نظارہ کرتا۔ شیشے پر اس کے سانس کے ساتھ بار بار دھند لاہٹ پھیلتی رہتی۔ گرمیوں میں وہ کھلی کھڑکی کے چھجے پر کہنیاں ٹکا کر کھڑا ہو جاتا اور نمکین ہوا پھیپھڑوں میں جذب کرتے ہوئے جھاگ اڑاتی لہروں کا نظارہ کرتا۔

درحقیقت اسی کھڑکی نے اسے اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے پر مجبور کیا تھا حالانکہ یہ اسے اس اسکول سے بہت دور پڑتا تھا جہاں وہ پڑھاتا تھا۔ اس کے ایک کزن نے اسے یہ اپارٹمنٹ برائے نام کرایے پر دیا تھا۔ کزن امریکا جا رہا تھا اور وہ اپنا اپارٹمنٹ کسی اجنبی کو سونپ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک توہم پرست آدمی تھا اور اس کے خیال میں اپنا گھر کسی اجنبی کے سپرد کرنے کے نتائج اچھے نہیں ہوتے تھے۔

اس کے کزن نے امریکا جا کر بہت ترقی کی۔ بہت دولت مند ہو گیا اور زندگی میں کبھی اسے وطن واپس آنے کی فرصت نہیں ملی۔ اس کی میت ہی واپس آئی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ اسے اس کے شہر میں سمندر کے قریب والے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ وہ دیارِ غیر میں دفن ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس کی روح آخرت میں بھی بھٹکتی رہے گی۔

ایک اس کے کزن پر ہی کیا موقوف، اس علاقے کے تقریباً سبھی لوگ توہم پرست واقع ہوئے تھے۔ اس جدید دور میں بھی توہم پرستی ان میں نسل در نسل سفر کر رہی تھی۔ جم اپنے اردگرد جمع ہونے والے بچوں کو توہم پرستی سے بچنے کی تلقین کیا کرتا تھا لیکن اسے احساس ہوتا تھا کہ اس کی ان کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے کزن نے جس قبرستان میں اپنے آباؤ اجداد کی قبروں کے درمیان دفن ہونے کی وصیت کی تھی، وہ قبرستان ہی باقی نہیں رہا تھا۔ عفریت کی طرح بڑھتا ہوا شہر اس قبرستان کو بھی نگل گیا تھا۔ اس کے کزن کو ایک جدید قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس کے لیے شاید "دفن" کرنے کی اصطلاح بھی درست نہیں تھی کیونکہ اسے وہاں شہد کے چھتے کی طرح بنے ہوئے کنکریٹ کے خانوں میں سے ایک خانے میں جگہ ملی تھی جو تقریباً دوسری منزل جتنی بلندی پر تھا۔ اس کا تابوت اس میں محفوظ کر کے خانے کو سر بمہر کر دیا گیا تھا۔

آخری رسوم کے دوران میں اسے نفیس سوٹ میں ملبوس ایک لمبے تڑنگے اور وجیہہ نوجوان کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ وہ اس کے کزن کا بیٹا تھا۔ رشتے کے اعتبار سے وہ جم کا دور پار کا بھتیجا تھا۔ اس کا کزن جب امریکا رخصت ہوا تو یہ لڑکا اس کے بازو پر تھا اور بمشکل ایک فٹ کا تھا۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ وہ اب کسی اور ہی دنیا کا باسی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شہر کے بہترین ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا لیکن رشتے داری کی روایات بہرحال اپنی جگہ تھیں۔ جم نے اصرار کیا کہ آخری رسوم کے بعد کسی وقت وہ ایک بار ضرور اس کے گھر آئے اور اگر اس کے ساتھ کھانا کھانا اپنی شان کے منافی سمجھتا ہو تو کم از کم کافی ہی پی لے۔ جم نے دل میں سوچا تھا کہ اس "امریکی نوجوان" کا نام وہ دے دیا تھا۔

اس کے اصرار پر امریکی نوجوان جب اس کے اپارٹمنٹ میں آیا تو اس بڑی کھڑکی سے سمندر کا نظارہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھا "او مائی گاڈ! یہ تو بہت خوب صورت جگہ ہے۔۔۔ شہر کے اتنے قریب اور اتنا خوب صورت نظارہ دکھانے والا یہ اپارٹمنٹ تو بہت مہنگا اب ایک مہنگی جائداد ہے۔"

یہ تبصرہ سن کر جم کے معدے میں گرہ سی پڑ گئی تھی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ لڑکے کو باپ سے کنٹریکٹر کا بزنس ورثے میں ملا تھا۔ جم نے دل کو تسلی دی کہ جائدادوں کی قیمت کا تخمینہ لگانا شاید اس کی عادت تھی۔ وہ مشفقانہ انداز میں مسکرا دیا۔ اسے اس وجہ سے بھی اطمینان تھا کہ لڑکے کی جیب میں دوسرے روز کی فلائٹ کا ٹکٹ موجود تھا۔ آئندہ روز اسے امریکا واپس جانا تھا۔

مگر دوسرے روز جبکہ جم اسی کھڑکی کے پاس بیٹھا ڈوبتے سورج کے حسین نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا، امریکی نوجوان دوبارہ آ گیا۔ وہ بیٹھے بغیر بلا تمہید بولا "میں نے اس اپارٹمنٹ کے بارے میں رات بہت سوچا اور میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ اتنی قیمتی جائداد کو بے مصرف چھوڑے رکھنا کوئی عقل مندی نہیں۔ میں نے اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

جم ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

امریکی نوجوان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "امید ہے آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ برسوں برائے نام کرائے پر اس میں رہتے رہے ہیں۔ آپ اس جائداد سے بہت فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ میرے والد جذباتی آدمی تھے۔ رشتوں اور روایتوں کے احترام میں کچھ نہیں بولتے تھے لیکن میں جذباتی ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کاروبار بہرحال کاروبار ہے اور نفع نقصان بہرحال نفع نقصان ہے۔ آپ اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں یا اگر موجودہ مارکیٹ پر اپارٹمنٹ خرید سکتے ہیں تو خرید لیں۔"

جم کے سر پہاڑ سا آن گرا۔ اس اپارٹمنٹ سے نکل کر، اپنے بچوں سے دور جا کر زندگی گزارنے کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس اپارٹمنٹ سے نکل کر "اپنے بچوں" سے دور جا کر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ نوجوان اپنی بات کہہ کر، اس کی کوئی بات سنے بغیر رخصت ہو گیا۔ جم نے اسی رات بیٹھ کر اسے ایک خط لکھا جس میں اس کی منت سماجت بھی تھی کہ عمر کے آخری حصے میں اس سے یہ ٹھکانا نہ چھینا جائے۔ وہ کہیں دست تھا۔ کہیں اور کرائے پر جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خط جم نے دستی اسے بھجوا دیا۔

دو تین روز بعد شہر کے ایک بڑے وکیل کے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ شدہ ایک خط ملا۔ خط کیا، ایک قانونی نوٹس تھا جس میں اسے مطلع کیا گیا تھا کہ ایک طویل عرصے سے چونکہ وہ برائے نام کرایہ بھی ادا نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ ڈیفالٹر تھا اور اپارٹمنٹ کسی بھی وقت مزید کسی نوٹس کے بغیر اس سے خالی کرایا جا سکتا تھا۔

"کرایہ۔۔۔؟ ڈیفالٹر۔۔۔؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔

کرایہ ادا کرنا در حقیقت اس نے اس لیے بند کر دیا تھا کہ کافی دنوں پہلے قطعی غیر متوقع طور پر کرسمس کے موقع پر اس کے کزن نے امریکا سے اسے مبارک باد کا فون کرتے ہوئے کہا تھا کہ برائے نام کرایہ ادا کرتے کرتے بھی وہ اس اپارٹمنٹ کی پرانی قیمت کے برابر تو رقم ادا کر ہی چکا تھا۔ اس کا کزن اب اتنا دولت مند ہو چکا تھا کہ اسے اپنے اس غریب رشتے دار سے یہ معمولی سا کرایہ لیتے ہوئے شرم آنے لگی تھی۔ اسے اب اس رقم کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ در حقیقت اسے تو اس اپارٹمنٹ کی بھی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسے جم ہی کے نام کر دے گا۔

لیکن مصروفیات نے اسے اجازت نہیں دی تھی کہ وہ اس سلسلے کی ضروری کاغذی اور قانونی کارروائی مکمل کرتا اور پھر موت نے اسے اس کی بھی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ اپنے وصیت نامے میں اس کا تذکرہ شامل کرا دیتا۔ اب کزن کا بیٹا ایسی کسی "نیکی فی گنگو" پر یقین کرنے اور ایسے کسی وعدے پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اپارٹمنٹ چھوڑنے کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اپارٹمنٹ کو بھی گویا اس بات کی خبر ہو گئی تھی اور وہ بھی اس دیرینہ رفیق کی طرح اداس اور مایوسیت زدہ رہنے لگا تھا جس سے بچھڑنا ناگزیر ہو چکا ہو۔ حتیٰ کہ اب تو دروازوں نے بھی چرچرانا بند کر دیا تھا۔ ان کی وہ محبت بھری سرگوشیاں بند ہو چکی تھیں جو چرچراہٹ کی صورت میں ابھرتی تھیں۔ کھڑکی میں کھڑے ہونے پر اسے سمندر کا دل فریب نظارہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں۔

یہ کوئی زندگی نہیں تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس طرح جینا کوئی جینا نہیں تھا۔

دوسرے روز "اس کے" بچے اس سے ملنے، معمول کے مطابق اس کے ساتھ کھیل کود اور فرمائشیں کرنے کے لیے اوپر آئے تو انہوں نے دیکھا اپارٹمنٹ کے دروازے کے نیچے سے خون بہتا ہوا سیڑھیوں تک آ گیا تھا اور جم گیا تھا۔ اپارٹمنٹ کا فرش ڈھلوان تھا اس لیے خون باہر تک آ گیا تھا۔

بچے اندر پہنچے تو انہوں نے جم کو اسی کھڑکی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھے پایا جس سے سمندر کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت نقش ہو کر رہ گئی تھی لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اذیت کی وجہ امریکی نوجوان کا فیصلہ تھا یا پھر دھیرے دھیرے اس کی روح پر قبضہ کرنے والی موت؟

اس کی کٹلی کی رگیں کٹی ہوئی تھیں۔

اس المناک موت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ بچہ بچہ اس سے آگاہ ہو گیا۔ دکانوں، بازاروں میں لوگ جمع ہوتے تو تاسف آمیز انداز میں یہی قصہ چھڑ جاتا۔ خصوصاً اس بلڈنگ اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے بچے تو ہر اس شخص کو تمام تر جزئیات کے ساتھ یہ قصہ سناتے جو اپارٹمنٹ خریدنے کے ارادے سے اس کا معائنہ کرنے آتا۔

اپارٹمنٹ برائے فروخت تھا۔ اس پر بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔۔۔ لیکن وہ کبھی فروخت نہیں ہو سکا۔ اس پر ہمیشہ کے لیے تالا پڑ گیا کیونکہ شہر کے لوگ توہم پرست واقع ہوئے تھے۔ وہ بھلا ایک ایسا اپارٹمنٹ کیونکر خرید سکتے تھے جس میں ایک تنہا، غریب، بوڑھے اور ریٹائرڈ ٹیچر نے خودکشی کر لی تھی۔ جس اپارٹمنٹ میں، دل کو بوجھل کر دینے والا ایسا المیہ جنم لے چکا تھا اس میں بھلا کوئی ہنسی خوشی زندگی گزارنے کی امید کیونکر رکھ سکتا تھا؟

(انگریزی سے ترجمہ)

زیرپرست

مرزا امجد بیگ

کسی بھی چیز کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش ہمیشہ تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ بعض لوگ حصولِ زر کی خاطر اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ کسی انسان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ خدا جبار و قہار بھی ہے۔ وہ اتنا باریک بین ہے کہ ایک ایک سانس کا حساب رکھتا ہے۔ پھر اس کی قدرت جو بتاتے دکھاتی ہے، اس کے سامنے بڑے سے بڑا سورما بھی بے بس دکھائی دیتا ہے۔ ایک جرم زدہ تحریر۔

سوس زر میں مبتلا ایک شخص کا بیحد انکھ فسانہ زیرپرستوں کے لیے تازیانہ

ماہ فروری کے الوداعی ایام تھے۔ کوئٹہ کی جانب سے آنے والی برفیلی ہواؤں نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سردی کی شدت میں غیر معمولی اضافے نے شہریوں کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ غیر متوقع طور پر برسات کا آغاز ہوگیا۔ مشہور ہے کہ کراچی کے موسم کی سختی تین روز سے زیادہ نہیں رہتی مگر اس سال یہ مقولہ بھی غلط ثابت ہوگیا۔ لگاتار بارش اور خون منجمد کردینے والی ہواؤں نے کراچی کے باسیوں کو موسمِ سرما کی حقیقت سے روشناس کروادیا تھا۔

ایک ایسے ہی نم آلود دن میں دو افراد میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ میاں بیوی نظر آتے تھے، بعد میں میرے خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس روز موسم کی خرابی کے باعث میں نے اپنی سیکریٹری کو جلدی چھٹی دے دی تھی۔ ویسے بھی کام زیادہ نہیں تھا۔ آج بس دو تین کلائنٹ ہی آئے تھے جنہیں میں فارغ کرچکا تھا اور اب خود بھی دفتر سے اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا کہ وہ جوڑا آگیا۔ سردست میں نے اپنے ارادے کو ملتوی کیا اور ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مرد کی عمر پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے ایک صاف اور بے داغ سوٹ زیب تن کررکھا تھا۔ اس کی پیشانی کشادہ اور آنکھیں ذہانت تھیں جن میں ذہانت کی چمک واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ وہ وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے ایک معزز شخص نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی عورت نے پھول دار ساڑی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک خوب صورت اور پُرکشش عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور چھبیس سال کے درمیان لگایا۔ بہرحال ایک بات تھی، وہ یہ کہ دونوں کی جوڑی بڑی مناسب تھی۔

میں نے انھیں اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا پھر رسمی علیک سلیک کے بعد ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا "جی، فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"ہمیں نظامی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" خوش لباس شخص نے بتایا "انہوں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ آپ ہماری مدد کرسکتے ہیں۔"

میرے جاننے والوں میں تین نظامی صاحبان تھے۔ میں نے استفسار کیا "آپ کون سے نظامی صاحب کا ذکر کررہے ہیں؟"

"وہ جو بلاک کالونی میں رہتے ہیں۔"

"اچھا!" میں فوراً سمجھ گیا "آپ کی مراد فیروز نظامی سے ہے؟"

مرد گویا ہوا "جی ہاں، بالکل وہی۔ ہم بھی پاکستان کا دورہ کرنے سے آئے ہیں۔ نظامی صاحب ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔"

"آپ نے ابھی تک تعارف نہیں کروایا۔" میں نے مسکرا کر باری باری دونوں کو دیکھا۔

مرد نے جھینپنے والے انداز میں کہا "واقعی۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ میں بہت شرمندہ ہوں وکیل صاحب۔" پھر اس نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا "میرا نام خلیق الزماں ہے بیگ صاحب اور یہ میرے ساتھ میری زوجہ محترمہ فوزیہ ہیں۔ ہم حال ہی میں کویت سے یہاں پہنچے ہیں۔ ہمیں آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور قلم پیڈ سنبھال لیا۔

مرد جس نے اپنا نام خلیق الزماں بتایا تھا، سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بات کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ فوزیہ نے اس کی استفساریہ نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا "آپ بیگ صاحب کو بلاکم و کاست ساری کہانی سنا دیں۔ میں اس شیطان کے بچے کو پھانسی کے پھندے میں جھولتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے فوزیہ کی آواز قدرے بلند ہوگئی تھی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ غم و غصے کے ایک نادیدہ طوفان کو اپنے اندر روکے بیٹھی تھی۔

خلیق الزماں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "بیگ صاحب، آپ کس طرح کے کیس ڈیل کرتے ہیں؟"

مجھے اس کا یہ بے تکا سوال عجیب سا لگا تاہم میں نے جواب دیا "میں خصوصاً فوجداری کے مقدمات اور عموماً سول مقدمات لیتا ہوں البتہ سال میں ایک آدھ چیریٹی کیس بھی فری کرلیتا ہوں۔ آپ کے کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی، بولا "معاملہ قتل کا ہے۔"

"ذرا تفصیل سے بتائیں۔" میں نے کہا "کس نے کس کو قتل کردیا ہے؟"

خلیق الزماں کے بجائے فوزیہ نے جواب دیا "بیگ صاحب، تقریباً دو ماہ پیشتر میرے بہنوئی نے میری اکلوتی بڑی بہن کو قتل کردیا تھا لیکن قاتل قانون کی گرفت میں نہیں آسکا۔ پولیس نے اسے اتفاقی حادثہ قرار دے کر فائل داخلِ دفتر کردی تھی۔"

فوزیہ کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا "ابھی آپ کے شوہر نے بتایا ہے کہ آپ لوگ حال ہی میں کویت سے آئے

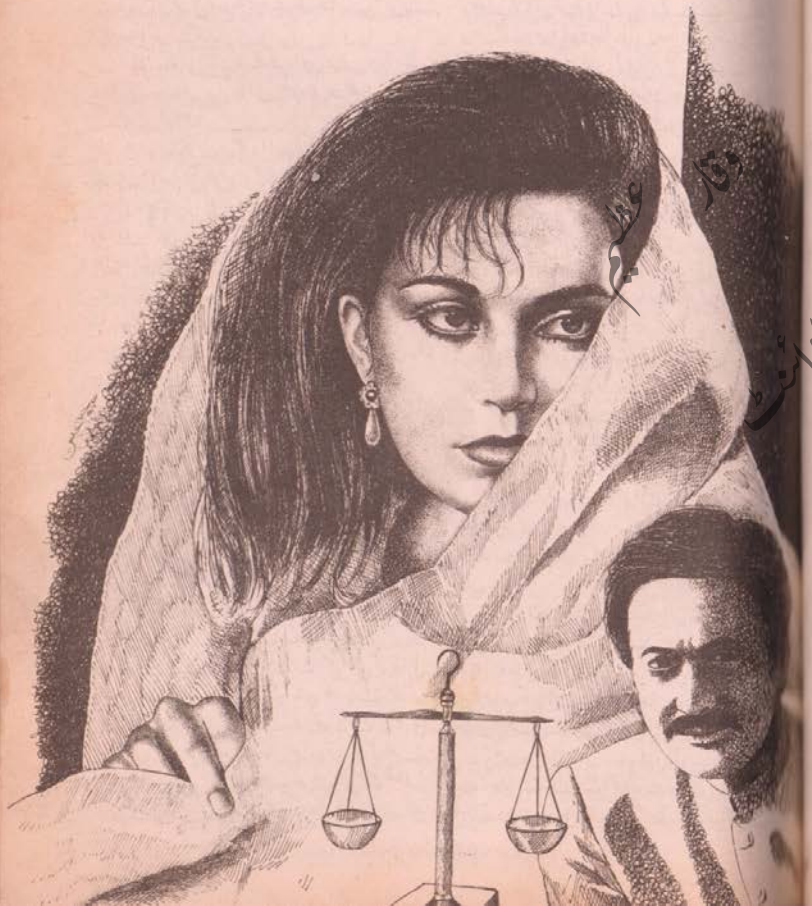

ہیں۔ کیا آپ کی غیر حاضری میں یہ حادثہ پیش آیا تھا؟"

"حادثہ نہ کہیں بیگ صاحب' یہ صریحاً قتل کی واردات ہے۔" خلیق الزماں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "میں اپنے ہم زلف کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ وہ... بدذات دولت کے حصول کی خاطر انتہائی پستی میں بھی گر سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "یعنی آپ کو یقین ہے کہ آپ کے ہم زلف نے کسی بڑے فائدے کے لیے آپ کی سالی..... کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟"

"ہمیں صد فی صد یقین ہے بیگ صاحب۔" فوزیہ نے پورے وثوق سے کہا۔

میں نے کہا "آپ کے گھر والوں نے... میرا مطلب ہے' آپ کے والدین نے اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کیوں نہیں کیا؟"

فوزیہ کے چہرے پر غم واندوہ کی بدلی چھا گئی' افسردہ لہجے میں بولی "ہمارا کوئی عزیز رشتے دار یہاں ہوتا تو پولیس اتنی آسانی سے کیس داخل دفتر نہ کرتی۔ رضوانہ اور میں صرف دو بہنیں تھیں۔ میں گزشتہ ایک سال سے کویت میں مقیم ہوں۔" پھر اس نے خلیق الزماں کی جانب اشارہ کیا "ان کے گھر والے یہاں پاک کالونی میں رہتے ہیں لیکن ان کا رضوانہ باجی کے یہاں آنا جانا بالکل نہیں تھا۔ وجہ میرے منحوس بہنوئی کا رویہ ہی ہے۔ وہ کسی سے تعلق واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔"

"اور آپ کے والدین وغیرہ..." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

فوزیہ بولی "وہ ہم سے بچھڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔"

"آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس طرح ملی؟" میں نے پوچھا۔

"اتفاقاً" خلیق الزماں نے بتایا "اگرچہ میرا وہ بدطینت ہم زلف ہم سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی ہم مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار فون کرکے رضوانہ کی خیریت دریافت کرلیا کرتے تھے۔ رضوانہ نے کبھی کھل کر تو اپنی پریشانیوں سے ہمیں آگاہ نہیں کیا لیکن ہم جانتے تھے کہ آفتاب عالم سے شادی کا فیصلہ کرکے رضوانہ نے زندگی کی سنگین ترین غلطی کی تھی۔ بہرحال' پندرہ فروری کو ہم نے رضوانہ کو فون کیا۔ آفتاب عالم کے گھر میں اس کے ضعیف والدین بھی ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ملازمہ بھی ہے لیکن اس روز ایک اجنبی آواز نے فون ریسیو کیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ ڈیڑھ دو ماہ قبل رضوانہ چھت سے گر کر ہلاک ہوگئی تھی۔ میں نے پوچھا' وہ کون ذات شریف ہے۔ فون ریسیو کرنے والی نسوانی آواز نے جواب نہیں دیا میں "ہیلو ہیلو" کرتا رہا اور اس نے فون بند کردیا۔ میرا پریشان ہوجانا لازمی تھا۔ میں نے دوبارہ ڈائل کیا لیکن انگیج ٹون نے میرا استقبال کیا۔ بار بار کی کوشش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور رہنا کر رکھ دیا گیا ہوگا۔

"میں نے فوراً اپنے والدین کو فون کیا تو پتا چلا' رضوانہ کو پیش آنے والے حادثے سے بے خبر تھے۔ اگلے دوسرے روز میرا چھوٹا بھائی میرے اصرار پر رضوانہ کے گھر گیا۔ اسی روز میرے چھوٹے بھائی رفیق الزماں نے مجھے فون کرکے اطلاع دی کہ واقعی رضوانہ حادثاتی موت کا شکار ہوچکی تھی۔ آفتاب عالم کے بوڑھے والد مشرف حسین سے رفیق الزماں کو پتا چلا تھا کہ رضوانہ کو یہ حادثہ چوبیس دسمبر کی صبح پیش آیا تھا۔"

"اور آپ کا خیال ہے کہ رضوانہ کا قتل کیا گیا ہے؟" خلیق الزماں کے طویل بیان کے اختتام پر میں نے کہا پھر فوزیہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا "اور آپ کو بھی اپنی بہن کے قاتل یعنی اپنے بہنوئی آفتاب عالم کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتی ہیں؟"

وہ غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی "میرے بس میں ہو تو میں اس خبیث کی بوٹیاں نوچ لوں۔"

"ہم دراصل قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہتے۔" خلیق الزماں نے مسکرا کر کہا "ورنہ کرنے کو تو بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "میں آپ کے دلی جذبات کو سمجھ رہا ہوں اور آپ کے حالات کا احترام بھی کرتا ہوں۔ قانون کو ہاتھ میں لینا دانش مندی کی علامت نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں بیگ صاحب۔" فوزیہ نے کہا "اگر آپ رضوانہ باجی کا کیس لینے کو تیار ہوجائیں تو مجھے امید ہے' ہم انصاف حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ نظامی صاحب نے جس انداز میں آپ کی تعریف کی ہے' میرے وثوق کی بنیادی وجہ وہی ہے۔"

"تعریف صرف اس ذاتِ باری کی ہے جس نے ہم سب کو بنایا ہے۔" میں نے انکسار سے کہا "میں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے اور انصاف کے حصول کی جنگ لڑی ہے۔

اس منصف اعلیٰ کا کرم ہے کہ اس نے ہر مرحلے پر میری لاج رکھی ہے۔"

"انشاء اللہ' وہ مردود بھی عبرت ناک انجام کو پہنچے گا۔" فوزیہ نے خلا میں گھورتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا۔

میں نے خلیق الزماں کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا ہم زلف لالچی فطرت کا مالک ہے۔ دولت کے حصول کی خاطر وہ انتہائی پست حرکت بھی کرسکتا ہے۔ آپ کے خیال میں' رضوانہ کے قتل سے اس کا کون سا مفاد وابستہ تھا؟"

"مالی مفاد بیگ صاحب۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"ذرا وضاحت کریں۔"

خلیق الزماں نے کچھ دیر توقف کیا پھر بتایا "رضوانہ کی حادثاتی موت سے آفتاب عالم کو بہت بڑا مالی فائدہ پہنچ سکتا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ آج کل اس فائدے کے حصول کی تگ و دو میں لگا ہوگا۔"

"کون سا بیمہ پالیسی کا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا "یا رضوانہ کسی بہت بڑی جائداد کی مالک تھی۔"

"آپ بہت ذہین ہیں۔" اس نے فراخ دلی سے میری تعریف کی۔

میں نے کہا "خلیق صاحب' آپ میری ذہانت کو نا پنے کے بجائے واضح الفاظ میں اپنے مؤقف کی وضاحت کریں۔ اس طرح میرا قیمتی وقت بھی بچے گا اور میں آپ کی بات بہتر انداز میں سمجھ پاؤں گا۔"

"سوری بیگ صاحب۔" وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔ "اب میں آپ کو کھل کر بتاتا ہوں۔"

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے کھل کر بتایا کہ آفتاب عالم نے اپنی بیوی رضوانہ کی ایک بھاری بیمہ پالیسی لے رکھی تھی جو رضوانہ کی حادثاتی موت کے بعد یقیناً اسی کو ملنا تھی۔ اس سلسلے میں آفتاب نے ابتدائی کام مکمل کرلیا تھا۔ اس نے اچھی خاصی رشوت دے کر پولیس سے رضوانہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا تھا اور متعلقہ انشورنس کمپنی میں کلیم داخل کردیا تھا۔ اس سلسلے میں انشورنس کمپنی کے کلیم ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والی ایک لڑکی اس کے ساتھ بہت تعاون کررہی تھی۔ خلیق الزماں نے انکشاف بھی کیا کہ مذکورہ لڑکی جس کا نام انیلا واسطی تھا' آفتاب عالم کے گھر میں بھی اس کی آمد و رفت شروع ہوچکی تھی۔ اسے یہ بھی شک تھا کہ پندرہ فروری کو جس نامانوس آواز نے اس کی کال اٹینڈ کی تھی وہ انیلا واسطی ہی ہوسکتی تھی۔ علاوہ ازیں' مرحومہ رضوانہ نے تقریباً تین لاکھ روپے مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ بھی خرید رکھے تھے جو ظاہر ہے' رضوانہ کی موت کے بعد اب آفتاب عالم ہی کی ملکیت تھے۔ آٹھ لاکھ روپے کی پالیسی اور تین لاکھ روپے کے سرٹیفکیٹ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ گیارہ لاکھ روپے کے لیے قتل کرنا اچنبھے کی بات نہیں تھی اور وہ ایک لالچی اور بدفطرت انسان کے لیے۔

خلیق الزماں کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "بہت خوب۔ خلیق صاحب' آپ نے تو یہاں آتے ہی اچھی خاصی معلومات حاصل کرلی ہیں۔ آپ کو پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "ویسے..... آپ کویت میں کیا کرتے ہیں؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "پولیس ڈپارٹمنٹ والی بات سے تو آپ مجھے معاف ہی رکھیں جناب۔ اور آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ کویت میں' میں ایک آئل کمپنی میں فورمین ہوں۔ ایک سال پہلے کویت گیا تھا۔ اپنی محنت' کام سے لگن اور سب سے بڑھ کر خوش قسمتی کے سبب ایک سال ہی میں فورمین بن گیا ہوں۔"

میں نے پوچھا "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ کے ہم زلف نے پولیس کو بھاری رشوت دے کر حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے؟"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "پاکستان میں سکہ رائج الوقت بہت بڑی قوت ہے۔ میں نے بھی اسی قوت کو استعمال کیا ہے۔ حالانکہ مجھے یہاں آئے ہوئے کم و بیش ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا لیکن میں نے رضوانہ کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بہت سے حقائق جمع کرلیے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔"

"خلیق صاحب!" میں نے پیڈ پر کچھ لکھنے کے بعد سوال کیا "کیا آپ مجھے یہ کیس صرف اس لیے دینا چاہتے ہیں کہ نظامی صاحب نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے؟"

"ایک وجہ یہ بھی ہے۔" وہ بولا "لیکن میں خاص طور پر کسی اچھے... وکیل کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا حالانکہ یہ سیدھا سادہ فوج داری کا معاملہ ہے۔ عدالت خود مجھے سرکاری وکیل مہیا کرسکتی ہے مگر میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔"

"اس میں رسک کی کون سی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ جو شواہد جمع کرچکے ہیں ان کی بنا پر سرکاری وکیل بہت

مضبوط کیس بنا سکتا ہے پھر آپ میری ہی خدمات کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ بولا "بیگ صاحب' سرکاری وکیل کے منہ میں عموماً سرکاری زبان بولتی ہے۔ یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے۔ آپ ہمارے ملک کے قانون اور عدالتی نظام کو میری بہ نسبت زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ پولیس کا بھرپور تعاون مجرم کے ساتھ ہو' کسی سرکاری وکیل سے کامیابی کی توقع رکھنا حماقت کے زمرے میں آتا ہے۔"

"ہوں!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر پوچھا "کیا پولیس نے رضوانہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کروایا تھا؟"

وہ تلخی سے بولا "پولیس صرف وہی کام شدومد سے کرتی ہے جس میں ان کا بھلا ہوتا ہو۔ رضوانہ کے قتل کو حادثاتی موت کا رنگ دینے میں ان کا "بھلا" ہو رہا تھا اس لیے پوسٹ مارٹم ضروری ہی نہیں سمجھا گیا۔"

"اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رضوانہ کا کوئی والی وارث یہاں موجود نہیں تھا۔" فوزیہ نے کافی دیر کے بعد گفتگو میں حصہ لیا "اگر کوئی اس معاملے کی پیروی کرنے والا ہوتا تو پولیس اتنی آسانی سے اس کیس کو دبا نہیں سکتی تھی۔"

خلیق الزماں نے پُرعزم لہجے میں کہا "لیکن اب گڑے مُردے اکھیڑ کر رہیں گے۔ افسوس کہ میں وکیل نہیں ہوں ورنہ۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی' میں نے فوراً کہا۔ "آپ وکیل نہ ہوتے ہوئے بھی خاصے مستعد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے تعاون سے ہم بہت بہتر نتائج حاصل کرلیں گے۔"

"آپ صرف عدالت کے اندرونی معاملات کو سنبھال لیں۔۔۔ بیگ صاحب۔" وہ بااعتماد انداز میں بولا "باہر کی بھاگ دوڑ میں خود کروں گا۔ آپ خرچے وغیرہ کی بھی پروا نہ کریں۔ میں ہر قیمت پر اس منحوس شخص کو سزا دلوانا چاہتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "آپ کتنی چھٹی لے کر آئے ہیں؟"

"فی الحال دو ماہ کی چھٹی ہے۔" خلیق الزماں نے بتایا۔ "لیکن اس مدت میں اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب آپ مجھے تمام حالات تفصیل سے بتادیں۔"

"گویا آپ ہمارا کیس لینے کے لیے تیار ہیں؟" فوزیہ نے پوچھا "فیس ہم آپ کو ڈبل دیں گے۔ اس کی فکر نہ کریں۔"

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "فیس تو میں آپ سے سنگل ہی لوں گا لیکن کیس لینے کا فیصلہ میں پوری بات سننے کے بعد کروں گا۔ کویت کی کمائی کو ذرا سنبھال کر رکھیں۔ انسان اپنے وطن سے دور رہ کر بڑی مشکل سے پیسہ کماتا ہے۔"

آخری بات میں نے مسکراتے ہوئے کہی تھی۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب۔" خلیق الزماں نے جلدی سے کہا "فوزیہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کو تختۂ دار تک پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گی۔"

اس کے بعد دونوں میاں بیوی مجھے رضوانہ کے پس منظر' آفتاب عالم سے اس کی شادی' شادی کے بعد دونوں کے جھگڑے اور باہمی چپقلش' آفتاب عالم کی لالچی فطرت اور کمینہ پن' اس کا رضوانہ کو زدوکوب کرنے وغیرہ کے بارے میں مجھے تفصیلاً بتاتے رہے۔ خاص طور پر خلیق الزماں نے آفتاب عالم کی پولیس سے سازباز اور انیلا واسطی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے۔ میں ایک مرتبہ پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ یہ شخص اگر پولیس میں ہوتا تو یقیناً بہت ترقی کرتا۔ خیر آئل کمپنی میں بھی اس نے کچھ کم ترقی نہیں کی تھی۔

ایک گھنٹے کی مزید گفتگو کے بعد میں نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کرلیا اور مشورہ دیا "زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ استغاثہ صاحبہ کی جانب سے دائر کیا جائے۔ مدعیہ اگر مقتولہ کی سگی بہن ہوگی تو کیس زیادہ مضبوط بنے گا۔"

دونوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔

میں نے وکالت نامے نکال کر فوزیہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے وکالت نامے کا سرسری جائزہ لینے کے بعد دستخط کردیے پھر بولی "اندراج آپ خود کرلیجیے گا۔"

خلیق الزماں نے میری مطلوبہ فیس نکال کر میرے حوالے کی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید جاری کردی اور کہا "میری فیس کے علاوہ کورٹ کے اخراجات بھی آپ ہی کو برداشت کرنا ہوں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا "جو آپ کہیں گے وہی ہوگا۔"

پھر کچھ دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہوگئے۔

اس سے پہلے میں نے خلیق الزماں کے ذمے دو تین نہایت ضروری کام لگا دیے تھے اور اس نے اس ذمے داری کو نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ سب سے زیادہ اہم کام انشورنس کمپنی کے کلیم ڈپارٹمنٹ کی ورکر انیلا واسطی سے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا۔

اگلے تین چار روز میں واقعی خلیق الزماں نے بڑی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ انیلا واسطی اور آفتاب عالم کے تازہ ترین تعلقات کے بارے میں اس کے انکشافات نے اس کیس میں میری دلچسپی کو دوچند کردیا تھا۔ علاوہ ازیں خلیق الزماں نے موقع کے ایک اہم ترین گواہ فاکروب مائیکل سے بھی بڑی سودمند ملاقات کی تھی۔ پھر آفتاب عالم کے ماضی کو بھی کھنگال ڈالا تھا۔

میں نے پوری تیاری کرنے کے بعد اپنے وکالت نامے کے ساتھ فوزیہ کی جانب سے عدالت میں استغاثہ دائر کردیا۔ عدالت نے ابتدائی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اس حادثے کے انکوائری افسر سرفراز شاہ اور ملزم آفتاب عالم کو بذریعہ سمن عدالت میں طلب کرلیا۔ تفتیشی افسر سرفراز شاہ ایک اے ایس آئی تھا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی سے پہلے بہتر ہوگا کہ میں اپنے کیس کے پس منظر سے آگاہ کروں تاکہ پیش منظر کو سمجھنا آسان ہوجائے۔ یہ تمام حالات میں ترتیب وار بیان کررہا ہوں۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ واقعات میں تسلسل پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کا ذہن عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

○☆○

رضوانہ اور فوزیہ دو بہنیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ فوزیہ اپنی بہن رضوانہ سے لگ بھگ پانچ سال چھوٹی تھی۔ ان کے والدین نے اچھے وقتوں میں ڈالی گھر بنالیا تھا۔ اس دو منزلہ گھر کی بالائی منزل کرائے پر اٹھی ہوئی تھی جبکہ زیریں منزل میں فوزیہ اور رضوانہ اپنے والدین کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ ان کا گھرانا پوش نگر میں تھا۔

رضوانہ اور فوزیہ کے والد ایک سرکاری محکمے میں سیکشن افسر تھے لیکن انتہائی ایمان دار اور دیانت دار ہونے کے باعث صرف تنخواہ پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کی اس خصوصیت کی بنا پر محکمے کے تمام افراد انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

رضوانہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کے والد کی میعادِ ملازمت پوری ہوگئی۔ البتہ متعلقہ سرکاری محکمے کی جانب سے انہیں پیش کش کی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو ان کی ملازمت میں مزید پانچ سال کی توسیع ہوسکتی ہے لیکن انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کے اس فیصلے کے پیچھے رضوانہ کی امی کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر باقی ماندہ عمر آرام و سکون سے گزاریں۔ حکومت کی طرف سے جو فنڈز وغیرہ کی رقم ملی تھی وہ انہوں نے دونوں بچیوں کی شادی کے لیے بینک میں محفوظ کروادی تھی۔ مکان کے بالائی پورشن کا کرایہ بھی آرہا تھا اور بینک سے ماہانہ منافع بھی مل رہا تھا۔ یہ تمام رقم ملا جلا کر ان چار افراد کی گزراوقات کے لیے کافی تھی۔

فوزیہ نے جب جوانی کی حدود کو چھوا تو رضوانہ گریجویشن کرچکی تھی۔ اس موقع پر رضوانہ نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ ایک انسٹی ٹیوٹ میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنا شروع کردی۔ اس کے والد نے شروع میں اس بات پر اعتراض بھی کیا لیکن رضوانہ ملازمت کا ارادہ کرچکی تھی۔ اس نے اپنے والد کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ رضوانہ شروع ہی سے سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی جبکہ اس کے برعکس فوزیہ میں لاابالی پن بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس نے کبھی اچھے نمبر حاصل نہیں کیے تھے۔ بڑی مشکل سے پاس ہوتی تھی۔

فوزیہ حسن بے مثال کا شاہکار تھی۔ اس کی اٹھان ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاکھوں میں نہ سہی' وہ ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ رضوانہ کوئی بدصورت لڑکی تھی۔ البتہ رضوانہ واجبی سی شکل کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ اس کے سراپا میں ایسی کوئی نمایاں بات نہیں تھی کہ جسے یاد رکھا جاسکے جبکہ فوزیہ کو ایک نظر دیکھنے والا بار بار دیکھنے کی خواہش کرتا تھا۔ پھر رضوانہ صحت کے معاملات میں بھی خاصی بدقسمت واقع ہوئی تھی۔ اسے کوئی نہ کوئی مرض لاحق رہتا جس کی وجہ سے وہ دھان پان ہوگئی تھی۔

جس گھر میں جوان لڑکیاں ہوں وہاں رشتے آیا ہی کرتے ہیں۔ ان کے والدین کو بھی ان کی شادی کی بڑی فکر تھی اور رشتے بھی آرہے تھے لیکن ایک پے چیدگی پیدا ہوگئی تھی۔

والدین یہ چاہتے تھے کہ پہلے رضوانہ کی شادی ہو لیکن لڑکے والے رضوانہ کو نظرانداز کرکے فوزیہ کو پسند کرلیتے تھے۔ اس طرح معاملہ کھٹائی میں پڑجاتا۔ اس الجھن کو سلجھانے کے لیے رضوانہ کے والد نے ایک ترکیب سوچ لی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب لڑکے کے گھر والے لڑکی کو دیکھنے آئیں تو وقتی طور پر فوزیہ کو وہاں سے ہٹا دیا جائے یعنی جب فوزیہ وہاں موجود ہی نہیں ہوگی تو پھر مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوگا۔

یہ ترکیب کامیاب رہی اور ایک لڑکے کی والدہ اور بہنیں رضوانہ کو پسند کرکے چلی گئیں لیکن کسی طرح لڑکے کو

فوزیہ کے بارے میں پتا چل گیا اور اس نے اس رشتے سے انکار کردیا۔ اس طرح بات بنتے بنتے بگڑ گئی۔

اس صورتِ حال نے رضوانہ کو بے انتہا دل برداشتہ کردیا۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور ایک روز وہ والدین کے سامنے پھٹ پڑی۔

"ابو!" اس نے روہانسے لہجے میں اپنے والد کو مخاطب کیا "کیا ضروری ہے کہ پہلے میری ہی شادی ہو؟"

اس کے والد نے نہایت نرمی سے سمجھایا "بیٹی، تم بڑی ہو۔ اس لیے تمہاری شادی پہلے ہونا چاہیے۔"

"یہ کوئی فارمولا تو نہیں ہے۔"

"فارمولا نہیں ہے لیکن ہمارے معاشرے کا دستور... یہی ہے بیٹی۔" اس کی والدہ نے کہا "اگر تمہارے بجائے فوزیہ کی شادی ہم پہلے کردیں تو تمہارے رشتے کے لیے دشواری پیدا ہوجائے گی۔ لوگ کہیں گے، بڑی میں کوئی عیب تھا اس لیے پہلے چھوٹی کو بیاہ دیا۔"

رضوانہ نے احتجاجی انداز میں کہا "اگر لڑکے والے میرے بجائے فوزیہ کو پسند کرجاتے ہیں تو اس میں فوزیہ کا کیا قصور ہے۔ اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ اس طرح اس کی شادی کیسے ہوگی۔ میری وجہ سے اس کا نقصان کیوں ہو۔ آپ لوگ میرے رشتے کے انتظار میں اس کا وقت..... کیوں ضائع کررہے ہیں۔ آپ میری فکر چھوڑیں اور فوزیہ کی بات کہیں پکی کردیں۔"

"اے ہے، تمہاری فکر کیسے چھوڑ دیں بیٹی۔" اس کی والدہ نے سرزنش کی "ہمارے لیے دونوں بیٹیاں ایک جیسی ہیں۔"

رضوانہ نے تلخی سے کہا "مگر دنیا والے آپ کی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

"اللہ کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی دے گا بیٹی۔" اس کے والد نے کہا "تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ہم ہیں نا سوچنے کے لیے۔"

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ تواتر سے رشتے آتے رہے اور رضوانہ کے بجائے فوزیہ کو پسند کرکے جاتے رہے۔ ان کے والدین اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ پہلے شادی بڑی بیٹی ہی کی ہوگی۔ اس دوران میں فوزیہ نے پاسنگ مارکس سے گریجویشن کرلیا۔ اس کا آگے پڑھنے کا ارادہ بالکل بھی نہیں تھا۔ رضوانہ نے بھی فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کردیا تھا البتہ کمرشل تعلیم اور ہنر سیکھنے کے بعد اس نے ملازمت کا آغاز کردیا تھا۔ جب صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو اس نے والدین کو اپنے ایک عجیب و غریب فیصلے سے آگاہ کیا۔

ایک روز اس نے اپنی والدہ سے کہا "امی! میں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اس وقت اس کی عمر چھبیس سال کے قریب تھی اور ملازمت کرتے ہوئے اسے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟" اس کی والدہ بھونچکا رہ گئیں۔

وہ بولی "میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر اب بھی آپ نے فوزیہ کے رشتے کی بات پکی نہیں کی اور میرے رشتے کی راہ دیکھتے رہے تو میں اس گھر میں آنے والے ہر رشتے کو انکار کردوں گی۔"

"تم تو بہت جلد مایوس ہوگئی ہو بیٹی۔" اس کی والدہ نے ہم دردانہ نظروں سے اسے دیکھا "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کئی گھروں میں پینتیس پینتیس سال کی لڑکیاں بیٹھی ہیں مگر وہ بھی ایسی بے دلی کی باتیں نہیں کرتیں۔"

"بیٹھی ہوں گی پینتیس پینتیس سال کی، میری بلا سے۔" رضوانہ نے بے پروائی سے کہا "میں نے آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا ہے۔ آپ ابو کو بھی بتادیں۔"

رضوانہ کی والدہ نے اسی رات اپنے شوہر کو ساری صورتِ حال بتادی۔ دوسرے روز فوزیہ بھی اپنی بڑی بہن کے اس فیصلے سے واقف ہوچکی تھی۔ اس نے بہت احتجاج کیا، والدین نے بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر رضوانہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ والدین رضوانہ کی اس عادت سے واقف تھے۔ وہ یا تو کسی بات کی ضد ہی نہیں کرتی تھی یا پھر ایسی ضد کرتی تھی کہ ماں باپ کو نہیں دیتی تھی۔

الغرض اس واقعے کے کئی ماہ بعد فوزیہ کے لیے خلیق الزماں کا رشتہ آگیا۔ پھر آئندہ چھ ماہ کے اندر اندر فوزیہ بیاہ کر خلیق الزماں کے گھر پہنچ گئی۔ فوزیہ اس گھر سے کیا رخصت ہوئی کہ جیسے لڑکے والے اس گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔ کسی نے جھوٹے منہ بھی رضوانہ کا رشتہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کا رضوانہ پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے زمانے کی بے حسی اور اپنی ناقدری کا رونا رونے کے بجائے خود کو ایک خول میں مقید کرلیا اور پوری تن دہی سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

فوزیہ نے آنے والے دو سالوں میں خاصی ترقی کی اور دو بچوں کی ماں بن گئی۔ انہی دو سالوں کے دوران میں رضوانہ مختلف دفاتر میں کام کرتے ہوئے ٹائپسٹ سے اسٹینو گرافر اور اسٹینو گرافر سے پرسنل سیکریٹری ہوگئی۔ اس کی موجودہ جاب ایک کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کمپنی میں تھی جس

میں اس وقت آفتاب عالم تھا اور رضوانہ اس کی پرسنل سیکریٹری۔ اس کمپنی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر تھا۔

رضوانہ نے اس دفتر میں آتے ہی اپنی اہمیت کو منوالیا۔ وہ باس کی نظروں میں آگئی۔ دفتر کے باقی اسٹاف سے وہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ ہاں اگر کوئی اس سے بات کرتا تو وہ کبھی طرح اس کی بات کا جواب دیتی تھی مگر کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ وہ زیادہ توجہ اپنے کام پر دیتی اور کبھی کام پر اور کیے بغیر نہیں اٹھتی..... وہ یہاں اسٹینو گرافر کی حیثیت سے آئی تھی مگر اس کی بہترین کارکردگی کو دیکھتے ہوئے دو ماہ کے اندر ہی آفتاب عالم نے اسے پرسنل سیکریٹری بنالیا اور اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کردیا۔

ایک روز آفتاب عالم نے رضوانہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور ایک طویل فہرست اسے تھماتے ہوئے بولا "مس رضوانہ، ایک ارجنٹ کام ہے۔ اسے فوراً ٹائپ کردو۔"

"یس سر۔" اس نے باس کے ہاتھ سے وہ فہرست لے لی اور اپنے کیبن میں آکر کمپیوٹر کی انگلیاں چلانے لگی۔

اس وقت پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ رضوانہ محض پانچ منٹ آف کرتی تھی لیکن اس طویل فہرست کو ٹائپ کرتے کرتے سوا پانچ ہوگئے۔ اپنا کام ختم کرکے وہ باس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

آفتاب عالم نے اس کے ہاتھ سے فہرست لیتے ہوئے کہا۔ "آپ جاؤ مس رضوانہ۔"

رضوانہ آفتاب عالم کی میز کی دائیں جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ عموماً اسی کرسی پر بیٹھ کر باس سے ڈکٹیشن لیتی تھی۔ آفتاب عالم نے ٹائپ شدہ فہرست کا جائزہ لینے کے بعد انٹر کام پر چپراسی سے دو کافی لانے کو کہا اور دیوار پر لگے دنیا کے نقشے کو دیکھنے لگا۔

"میں جاؤں سر۔" رضوانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

آفتاب عالم اس کی جانب مڑتے ہوئے نہایت ہی نرم لہجے میں بولا "میں نے تمہارے لیے کافی منگوائی ہے۔"

رضوانہ کو اپنے باس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ آفتاب عالم عموماً اس انداز میں بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنے ملازمین پر چیختا چلاتا رہتا تھا یا پھر انتہائی سنجیدہ اور دو ٹوک بات کرتا تھا۔

رضوانہ نے متذبذب لہجے میں کہا "مجھے دیر ہوجائے گی سر۔"

آفتاب عالم نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی پھر بولا "مس رضوانہ، تمہیں دیر تو ہوچکی ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں ڈراپ کردوں گا۔"

رضوانہ نے کہا "سر، میرا گھر آپ کے راستے میں نہیں پڑتا۔ آپ خوا مخواہ زحمت نہ کریں۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے رضوانہ۔" آفتاب عالم نے کہا "پھر میں نے کافی منگوائی ہے۔ وہ تو پیتی جاؤ۔"

رضوانہ نے زیادہ انکار مناسب نہ سمجھا اور بیٹھ گئی۔

آفتاب عالم نے پہلے کبھی اسے یوں اپنے کمرے میں بٹھا کر کافی نہیں پلائی تھی۔ وہ اپنے باس کے رویّے پر سوچنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب عالم ان دنوں تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا جس کے بعد وہ خاصا چڑچڑا اور سنجیدہ ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی فیروزہ بیگم کچن میں اچانک آگ بھڑک جانے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں آفتاب عالم اپنی میز پر رکھی ہوئی مختلف چیزوں کی ترتیب بدلتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے درازوں میں بھی جھانکا۔ رضوانہ نے صاف طور پر محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن موزوں الفاظ کی تلاش میں ہو۔ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے رضوانہ نے اپنے باس کی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ آخر کار وہ بول اٹھا۔

"مس رضوانہ، تمہیں اس دفتر میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"یہی... کو تین ماہ ہوجائیں گے سر۔"

آفتاب عالم نے کہا "تم نے بہت مختصر مدت میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا ہے۔ میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔"

"تھینک یو سر۔"

"میں نے بہت کم ایسے ورکرز دیکھے ہیں جو صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہوں اور ان کی پوری توجہ اپنے فرائض کی ادائیگی پر لگی رہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا پھر بولا "میں ایسے ملازمین کو پسند کرتا ہوں جو خود کم بولتے ہوں اور ان کا کام زیادہ بولتا ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

رضوانہ نے مختصر سا جواب دینے پر اکتفا کیا۔ وہ عموماً ایسے ہی الفاظ بولتی تھی۔ اوکے سر، یس سر، تھینک یو سر، ٹھیک ہے سر وغیرہ وغیرہ۔

"یس سر، میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

آفتاب عالم بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری بہترین... کارکردگی کے پیشِ نظر اس ماہ تمہاری تنخواہ میں اضافہ کردیا جائے۔"

رضوانہ نے چونک کر اسے دیکھا "سر' آپ نے تو پچھلے ماہ ہی میری تنخواہ بڑھائی تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "میں نے ہمیشہ محنتی ورکرز کی قدر کی ہے۔ میں اس کمپنی سے جو کچھ کماتا ہوں اس میں دیانت دار ملازمین کی محنت بھی شامل ہوتی ہے۔"

رضوانہ خاموش ہوگئی۔ آج اسے اپنا باس خاصا بدلا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ وہ پہلے والا تند مزاج اور غصہ ور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر ان کے درمیان دفتری امور سے ہٹ کر باتیں ہونے لگیں۔ رضوانہ بس "ہوں' ہاں" کررہی تھی اور آفتاب عالم اسے اپنی نجی زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آفتاب عالم نے رضوانہ سے بھی ذاتی نوعیت کے کچھ سوالات کیے جن کا اس نے نہایت ہی مختصر جواب دیا تھا۔

رضوانہ نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ اس روز وہ اپنے باس سے بات کرتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اسے سے آپس میں بے تکلف ہوں۔ شاید اس کی بڑی وجہ آفتاب عالم کا بدلا ہوا خوشگوار رویہ ہی تھا۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم ہونے لگی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد رضوانہ کو محسوس ہوا کہ آفتاب عالم سے ڈھیروں باتیں کرنے کے باوجود بھی جی نہیں بھرتا تھا۔ وہ زندہ دل شخص رضوانہ کے دل میں گھر کرتا چلا جارہا تھا۔ رضوانہ کی زندگی پر طاری جمود آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا۔ اب اسے اپنے اردگرد کی ہر چیز اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کے اندر کا موسم بڑی تیز رفتاری سے تبدیل ہوا تھا۔ وہ خود کو خوش قسمت ترین سمجھ رہی تھی کہ اس جیسی معمولی شکل و صورت کی لڑکی پر ایک وجیہہ و شکیل مرد جان دینے لگا تھا اور اس کو اپنانے کے لیے انتہائی سنجیدہ بھی تھا۔

وہ بھی سنجیدہ ہوگئی۔

کہتے ہیں کہ اچانک ملنے والی خوشی یا غم چھپائے نہیں چھپتا۔ اس کا تاثر چہرے پر ..... چمکنے لگتا ہے۔ رضوانہ کے مزاج و عادات میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو والدین نے فوراً محسوس کیا۔

"یہ آج کل ہماری بیٹی کو کیا ہوتا جارہا ہے۔" ایک رات رضوانہ کے والد نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔

وہ بولیں "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے بھی اس میں بہت تبدیلی محسوس کی ہے۔ بڑی زندہ دلی اور شوخی کا مظاہرہ کررہی ہے ان دنوں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ بولے "دو سال سے تو یہ بالکل مردوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ ہر چیز سے بیزار اور نالاں۔" ایک لمحے کو رک کر انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا "زمانہ بہت خراب ہے بیگم۔ تم ذرا رضوانہ میں رونما ہونے والی تبدیلی کے اسباب کا کھوج تو لگاؤ۔ کہیں خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات....."

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی؟" انہوں نے شوہر کی بات کاٹ دی "زمانہ خراب ہے تو ہوا کرے' ہمیں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔"

رضوانہ کے والد نے کہا "اعتماد اپنی جگہ لیکن ہم والدین ہیں۔ ہمیں اپنی بیٹی کی مصروفیات کا علم رہنا چاہیے۔"

رضوانہ کی والدہ بات کی تہ تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے' میں رضوانہ کو کریدنے کی کوشش کروں گی۔"

لیکن انہیں کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ رضوانہ نے خود ہی ان کا کام آسان کردیا تھا۔ اس کے اندر اچانک پیدا ہونے والی تبدیلیوں نے اس کے عزائم کا اظہار کردیا تھا۔ وہ اپنے لباس کا خیال رکھنے لگی تھی اور میک اپ پر بھی توجہ دینا شروع کردی تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آفتاب عالم اس کی زبان کے راستے اس کے گھر تک چلا آیا تھا۔

"آفتاب صاحب نے بتایا ہے کہ دو ماہ بعد میری تنخواہ مزید بڑھ جائے گی۔"

"آفتاب صاحب میرے کام سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ہی اس عید پر مجھے بونس بھی ملے گا۔"

"کل آفتاب صاحب کے والد بھی دفتر آئے تھے۔"

"آفتاب صاحب کے والد بہت خلیق اور مہربان انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے بیٹی کہہ کر سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔"

"آفتاب صاحب کو اس سال بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔ وہ اپنے دفتر میں میری آمد کو اپنی خوش بختی سے تعبیر کرتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز رضوانہ کی والدہ نے محتاط انداز میں کہا۔ "بیٹی' تمہارے باس کی تعریف سن سن کر ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوگیا ہے۔ ان سے کہو' کبھی اپنی بیوی کے ساتھ

ہمارے گھر آئیں۔"

رضوانہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی "امی' ان کی بیوی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب' کیا ابھی تک انہوں نے شادی نہیں کی؟"

"شادی تو کی تھی۔" رضوانہ نے بتایا "لیکن کچھ عرصہ قبل ان کی بیگم کا انتقال ہوچکا ہے۔"

"اوہ!" رضوانہ کی والدہ کے چہرے پر تفکر آنے لگا۔

رضوانہ نے کہا "آپ پریشان کیوں ہوگئیں امی۔ کیا آفتاب صاحب اکیلے ہمارے گھر نہیں آسکتے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس کی والدہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

رضوانہ نے کہا "اچھا ہوا' آپ نے خود ہی کہہ دیا ورنہ میں تو آفتاب صاحب کو گھر آنے کی دعوت دینے ہی والی تھی۔"

"ہاں ہاں' ضرور بلاؤ انہیں بیٹی۔" اس کی والدہ نے جلدی سے کہا پھر پوچھا "آفتاب صاحب کی عمر لگ بھگ کتنی ہوگی؟"

"میرا خیال ہے' اڑتیس انتالیس سال ہوگی۔"

رضوانہ کی والدہ کے چہرے پر اطمینان جھلک اٹھا۔ رضوانہ اس وقت اٹھائیس سال کی ہوچکی تھی۔ ان کے خیال میں یہ ایک مناسب جوڑی تھی۔ اگرچہ رضوانہ نے واضح الفاظ میں کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس کی والدہ سب کچھ سمجھ رہی تھیں پھر بھی سب کچھ انہوں نے اپنے شوہر کے گوش گزار کردیا۔

"یہ تو مناسب نہیں ہے۔" رضوانہ کے والد نے فوراً اعتراض کردیا "رضوانہ صریحاً غلطی کرنے جارہی ہے۔"

"اس میں نامناسب والی کون سی بات ہے؟" رضوانہ کی والدہ نے پوچھا "اس سے اچھا رشتہ رضوانہ کے لیے کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمہاری بات میں بھی وزن ہے لیکن جانے کیوں' میرا دل مطمئن نہیں ہے۔"

"آپ خوامخواہ پریشان ہورہے ہیں۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولیں "یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ رضوانہ کی اپنی پسند ہے ورنہ وہ تو سرے سے شادی ہی سے انکاری تھی۔"

"وہ ہم سے زیادہ اپنا برا بھلا نہیں سوچ سکتی۔"

"میرا خیال آپ سے مختلف ہے۔" رضوانہ کی والدہ نے کہا "اور میرا خیال یہ ہے کہ اپنا برا بھلا سب سے زیادہ خود رضوانہ ہی سوچ سکتی ہے۔"

"تم بیٹی کی حمایت میں بہت سی باتوں کو بھول رہی ہو۔"

"میں بیٹی کو نہیں بھولنا چاہتی اس لیے بہت سی باتوں کو نظرانداز کررہی ہوں۔" رضوانہ کی والدہ نے مدبرانہ لہجے میں کہا "آپ تو اس کی ضدی طبیعت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اگر ہم نے اس کے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو ممکن ہے۔"

اچانک انہوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے رضوانہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"میں کافی دیر سے آپ کی گفتگو سن رہی ہوں۔ اگرچہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہے مگر بہرحال مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوچکی ہے۔ میں باہر دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔"

اس کے والد نے کہا "بیٹی' میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ جو اونچ نیچ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتی ہو۔ میں جو بھی کروں گا' تمہاری بہتری ہی کے لیے کروں گا۔"

رضوانہ نے گردن جھکا دی "مجھے افسوس ہے ابو کہ آپ کو میرے فیصلے سے دکھ پہنچا ہے۔"

"نہیں بیٹی' ایسی بات نہیں ہے۔" وہ اپنی روہانی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "میں صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ ذرا فوزیہ اور خلیق الزماں سے بھی مشورہ کرلوں۔"

رضوانہ نے کہا "زندگی مجھے گزارنا ہے ابو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹی لیکن دنیاداری بھی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے' آپ دنیاداری کے تقاضے پورے کریں لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔" وہ قطعیت سے بولی۔

اس سے پہلے کہ اس کے والد کچھ بولتے' وہ کمرے سے جاچکی تھی۔ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے "یہ اب ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔"

ان کی بیوی نے کہا "ایسا نہ کہیں۔ رضوانہ نے زندگی میں پہلی بار ہم سے کچھ مانگا ہے۔ آپ اپنے اندر ذرا لچک پیدا کریں۔ کہیں آپ کی مخالفت اس کے اندر بغاوت کے جذبات نہ پیدا کردے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ واقعی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" وہ نیم دلی سے بولے "پھر بھی فوزیہ اور خلیق الزماں کو اس معاملے میں شریک کرنا ضروری ہے۔"

"میں نے کب منع کیا ہے۔" وہ جلدی سے بولیں "میرا خیال ہے انہیں... رضوانہ کے اس فیصلے سے خوشی ہوگی۔"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

قصہ مختصر' طے یہ پایا کہ جس روز آفتاب عالم ان کے گھر آئے اس روز فوزیہ اور خلیق الزماں کو بھی بلالیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

رضوانہ کا فیصلہ دو ٹوک اور اٹل تھا۔ خلیق الزماں اور فوزیہ سے رائے لینا اہتمام حجت سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ طے یہ پایا کہ دو ماہ بعد آفتاب عالم برات لے کر آجائے۔ اس دوران میں رضوانہ نے دفتر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آفتاب کی دلہن بن کر اس کے گھر میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

کہنے کو دو ماہ بہت کم مدت ہوتی ہے' دن پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں لیکن اس عرصے کے دوران میں رضوانہ کے گھر پر ایک قیامت سی گزر گئی۔ اس کے والد نمونیا کا شکار ہو کچھ روز کے اندر ہی چل بسے۔ اس کی والدہ اپنے شوہر کے اچانک انتقال کی تاب نہ لاسکیں اور ایک ماہ کے بعد ہی وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

رضوانہ پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا مگر اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے اس مصیبت کے دنوں میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اس صدمے کو جھیل گئی۔ وہ اب گھر میں اکیلی رہ گئی تھی اس لیے فوزیہ کے اصرار پر خلیق الزماں اپنے بچوں کے ساتھ وہاں شفٹ ہوگیا۔

رضوانہ کی والدہ کا چہلم ہوچکا تو آفتاب عالم نے شادی کا تقاضا شروع کردیا۔ رضوانہ کی آمادگی کو دیکھتے ہوئے خلیق الزماں اور فوزیہ نے رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح بالآخر چند روز بعد رضوانہ' آفتاب عالم کی بیوی بن کر اس کے گھر پہنچ گئی۔ آفتاب عالم کی رہائش طارق روڈ کے سینٹرل کمرشل ایریا میں تھی۔

خلیق الزماں اور فوزیہ بدستور پاپوش نگر والے گھر میں رہ رہے تھے۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی آفتاب عالم نے کینچلی بدل لی۔ اس نے رضوانہ پر زور دیا کہ وہ پاپوش نگر والے گھر سے اپنا حصہ وصول کرلے۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔" رضوانہ نے حیرانی سے کہا۔ "والدین کی وفات کے بعد اس گھر پر ہم دونوں بہنوں کا برابر کا حق ہے۔ میں اپنا حصہ کیسے وصول کرلوں۔"

آفتاب عالم نے کہا "میں بھی تمہیں یہی بات سمجھانا چاہتا ہوں۔ اس گھر پر تم دونوں بہنوں کا حق ہے۔ لیکن معاف کرنا' تمہاری چھوٹی بہن مع اپنے بچوں اور شوہر کے اپنا حق پوری طرح وصول کررہی ہے اور تمہیں دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال باہر کیا ہے۔ تمہیں چاہیے برا لگے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے بہنوئی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس مکان پر مستقل قبضہ جمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔" رضوانہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا "فوزیہ کی نیت میں کوئی کھوٹ ہے اور نہ ہی خلیق الزماں لالچی فطرت کے مالک ہیں۔ میں ان دونوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ تو محض میری تنہائی دور کرنے اس گھر میں آئے تھے۔"

آفتاب عالم نے طنزیہ انداز میں کہا "اور ابھی تک تمہاری تنہائی دور کرنے کے لیے وہ وہاں جمے ہوئے ہیں!"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔"

"میں نے تو تمہیں حقیقت سے آگاہ کردیا ہے۔" آفتاب عالم نے اپنے لہجے میں مصنوعی اپنائیت بھرتے ہوئے کہا "آگے تمہاری مرضی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ تمہاری بہن تمہاری دشمن ہے۔ مگر تمہارے بہنوئی پر مجھے بھروسا نہیں ہے۔ وہ بہت کائیاں شخص ہے۔ تم دیکھنا' ایک روز وہ پورا مکان ہی ہڑپ کر جائے گا اور تمہیں خبر ہی نہ ہوگی۔"

رضوانہ اپنے شوہر کے رویے کے بارے میں جتنا سوچتی' اس کا ذہن اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ چند روز کے وقفے سے آفتاب عالم نے پھر اسی نوعیت کی باتیں شروع کردیں۔ زچ ہوکر رضوانہ پوچھ بیٹھی۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟"

آفتاب عالم نے صاف صاف کہہ دیا "دیکھو رضوانہ' ہمیں اپنے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تمہارا مستقبل اب مجھ سے وابستہ ہے۔ اگر مجھے کسی بات سے فائدہ پہنچے گا تو یقیناً وہ تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ رضوانہ نے پوچھا "خدا خیر کرے' کیا پریشانی ہے آپ کو؟"

آفتاب عالم نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا "رضوانہ تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہے اور نہ ہی میں نے تمہیں بتانے کی کبھی کوشش کی ہے۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر خاموش ہوگیا۔ رضوانہ نے پوچھا۔

"آپ کس بات کا ذکر کررہے ہیں؟"

"وہ بات یہ ہے رضوانہ۔" اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا "آج کل بزنس بہت ڈاؤن جا رہا ہے۔ اگر کچھ عرصہ یہی صورت حال رہی تو سمجھو کہ کاروبار بالکل ہی ٹھپ ہو جائے گا لیکن اگر تم چاہو تو اس نازک موقع پر اس ڈوبتے ہوئے کاروبار کو سنبھالا دے سکتی ہو۔"

"میں..... مگر کس طرح؟" وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔

"مجھے فوری طور پر کچھ رقم کی ضرورت ہے۔" وہ چالاکی سے بولا "اگر تم اس کا انتظام کر دو تو۔۔۔"

رضوانہ نے اس کی بات کو قطع کرتے ہوئے کہا "میں بھلا رقم کا انتظام کس طرح کر سکتی ہوں؟"

"بہت آسانی سے۔" آفتاب عالم کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی "اگر پاپوش نگر والے مکان کو فروخت کر دیا جائے تو تمہارے حصے میں آنے والی رقم میرے بہت کام آ سکتی ہے لیکن لگتا ہے، تمہیں میری پریشانی سے کوئی غرض نہیں ہے۔"

"ہوں۔" رضوانہ سوچ میں پڑ گئی۔

آفتاب عالم نے رضوانہ کو سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر کہا "تمہارے بہنوئی کے پاس رہنے کو ذاتی گھر موجود ہے۔ تم اپنے گھر میں خوش و خرم ہو۔ پاپوش نگر والے گھر کی فروخت سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ میں تمہیں زبردستی تو اس کام پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر یہ تجویز پیش کی تھی کیونکہ ہم دونوں کا مفاد اب ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں فوزیہ سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔" رضوانہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

آفتاب عالم جلدی سے بولا "میرا خیال ہے، اسے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی نامناسب بات بھی نہیں ہے البتہ تمہارا بہنوئی کوئی رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔"

رضوانہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی "دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

لیکن بات ختم نہیں ہو سکی۔ خلیق الزماں نے مکان کی فروخت کی مخالفت کی۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ آفتاب عالم رضوانہ کو بے وقوف بنا رہا تھا لیکن رضوانہ اپنے شوہر کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ فوزیہ نے بھی رضوانہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ آفتاب عالم کاروبار کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس سے رقم ہتھیانا چاہتا تھا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ماشاء اللہ اس کا کاروبار اچھا خاصا چل رہا تھا۔ رضوانہ اپنی بات پر ڈٹی رہی چنانچہ فوزیہ اور خلیق الزماں کو اس کے سامنے ہتھیار پھینکنا پڑے۔ پاپوش نگر والا دو منزلہ مکان چھ لاکھ میں فروخت ہو گیا۔ خلیق الزماں نے رضوانہ کے حصے کے تین لاکھ روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔

"رضوانہ! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ میں بڑا بھائی ہونے کے ناتے تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس رقم کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا۔ ٹھیک ہے، تم اپنے شوہر پر بہت اعتماد کرتی ہو لیکن مجھے اس پر ذرا اعتبار نہیں ہے۔ بہرحال، یہ تمہاری رقم ہے۔ میں مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔ تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔"

فوزیہ نے کہا "رضوانہ، میری مانو تو اس رقم کو کسی اسکیم میں لگا دو۔ کوئی سرٹیفکیٹ وغیرہ خرید لو۔ تمہاری رقم بڑھتی رہے گی۔"

رضوانہ کو ان کے مشوروں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے تین لاکھ روپے کی رقم لے جا کر اپنے شوہر آفتاب عالم کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ رضوانہ اس وقت خود پر بہت فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس نے ایک انتہائی نازک موقع پر اپنے شریکِ حیات کی مدد کی تھی۔ وہ بے وقوف اس منصوبے سے بے خبر تھی جو عیار آفتاب عالم کے ذہن میں ترتیب پا چکا تھا۔

ایک ماہ بعد آفتاب عالم نے اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کیا۔ ایک رات وہ دفتر سے واپس آیا تو اس کی ایک ایک ادا سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ رضوانہ اس کی خوشی کا سبب پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے، آج آپ خلافِ معمول بہت خوش نظر آ رہے ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے رضوانہ۔" وہ اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے بولا "تم میرے لیے واقعی بہت خوش بخت ثابت ہو رہی ہو۔"

"میں بھی تو سنوں، آخر ایسا کیا ہو گیا؟" رضوانہ نے کہا۔

وہ اپنی جیب سے ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ نکال کر رضوانہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا "یہ لو، گن لو۔ پورے تین لاکھ روپے ہیں۔ تمہاری یہ رقم مجھ پر قرض تھی۔"

رضوانہ نے حیرانی سے اسے دیکھا "میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ گزشتہ ماہ میں نے تم سے تین لاکھ روپے لے کر کاروبار میں لگائے تھے۔" آفتاب عالم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا "میں نے رقم لیتے وقت ہی دل میں

فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ روپے مجھ پر قرض ہوں گے اور جیسے ہی کوئی بہتر صورت نظر آئے گی میں یہ رقم تمہیں واپس لوٹا دوں گا۔"

رضوانہ نے کہا "مگر میں نے تو آپ کو یہ رقم بطور قرض نہیں دی تھی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "خیر، یہ بتائیں کہ کاروبار میں ایسی کون سی بہتری آ گئی ہے؟"

"میں نے کہا نا، تم بہت بھلی ہو۔" آفتاب عالم سرور لہجے میں بولا "دو تین پارٹیوں کے پاس بڑی بڑی بے منٹس رکی ہوئی تھیں۔ پچھلے چھ دنوں میں ساری کلیئرنس ہو گئی ہے اور ایک بہت بڑا کنٹریکٹ بھی ملا ہے۔"

"مبارک ہو، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" رضوانہ نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ پھر نوٹوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا "یہ آپ ہی رکھ لیں۔ میں بھلا اس کا کیا کروں گی۔"

آفتاب عالم نے یوں اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے جیسے رضوانہ نے کوئی خطرناک چیز اس کی سمت بڑھا دی ہو، پھر بے تکلفی سے بولا "یہ رقم میرے پاس تمہاری امانت تھی۔ تم جیسے چاہو، استعمال کرو۔ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دو یا زیورات بنوا لو، تمہاری مرضی ہے۔"

اس وقت رضوانہ کو آفتاب عالم دنیا کا عظیم ترین انسان نظر آ رہا تھا۔ فوزیہ اور خلیق الزماں خوا مخواہ اس کی جانب سے بدگمان تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان دونوں کو صلواتیں سنانے لگی۔ اس دوران میں وہ محبت بھری نظروں سے آفتاب عالم کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ آفتاب عالم اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا سوچنے لگیں تم؟" آفتاب عالم نے پوچھا۔

وہ چونک گئی "کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس رقم کو کہاں استعمال کروں؟"

"تم بھی خوامخواہ ہی پریشان ہو جاتی ہو۔" آفتاب عالم نے ملائمت سے کہا "تین لاکھ روپے بھی بھلا کوئی رقم ہوتی ہے، لوگ تو کھڑے کھڑے تین کروڑ روپے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ اسے خرچ ہی کیا جائے۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"بھئی اس رقم سے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لو۔"

رضوانہ کو فوزیہ کا مشورہ یاد آیا۔ اس نے بھی سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے کی بات کی تھی۔ اسے ایک مرتبہ پھر خود پر ناز محسوس ہونے لگا کہ اسے اتنا مخلص اور ہمدرد شوہر ملا تھا۔ کتنا خیال تھا اسے رضوانہ کا اور اس کے مفاد کا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں سیونگ سرٹیفکیٹ ہی خریدوں گی۔"

آفتاب عالم نے کہا "تم کل میرے ساتھ ہی چلنا۔ پہلے ہم نیشنل سیونگ سینٹر چلیں گے۔ سرٹیفکیٹ خریدنے کے بعد میں تمہیں گھر ڈراپ کر کے آفس چلا جاؤں گا۔"

دوسرے روز حسبِ پروگرام رضوانہ نے تین لاکھ روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لیے۔۔۔ اور نامزدگی کے خانے میں آفتاب عالم کا نام لکھوا دیا۔ یہ بظاہر ایک معمولی سی بات تھی لیکن اس کے پس پردہ آفتاب عالم کا غیر معمولی منصوبہ آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کی جانب گامزن تھا۔

کچھ عرصے کے بعد آفتاب عالم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے اپنے اور رضوانہ کے نام سے ایک ٹرمل بیمہ پالیسی خرید لی۔ یہ میاں بیوی کی مشترکہ پالیسی تھی جو آٹھ لاکھ روپے کی مالیت کی تھی۔ کسی ایک فرد کی حادثاتی موت کے نتیجے میں دوسرے فرد کو آٹھ لاکھ روپے کی رقم مل جاتی۔

پھر رفتہ رفتہ آفتاب عالم کے رویّے میں تبدیلی آنے لگی۔ اب ان کی شادی کو آٹھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آئے دن ان کے درمیان معمولی نوعیت کی نوک جھوک ہونے لگی۔ رضوانہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ آفتاب عالم کے رویّے میں سرد مہری کا عنصر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اسے کام کی زیادتی سمجھی کیوں کہ آفتاب عالم اب رات گئے ہی دفتر سے لوٹتا تھا۔ پھر رضوانہ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ اس کا شوہر شراب بھی پیتا تھا۔ پیتا تو وہ عرصہ دراز سے تھا لیکن رضوانہ کے علم میں یہ بات اب آئی تھی۔

آہستہ آہستہ میاں بیوی میں کشیدگی بڑھتی گئی اور نوبت مار پیٹ تک آ پہنچی لیکن ایک بات تھی کہ بہرحال کسی نہ کسی طرح آفتاب عالم اپنا روپے کی معافی مانگ لیتا تھا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کرواتا تھا۔ رضوانہ مطمئن ہو جاتی۔

فوزیہ کو اپنی بہن کی ازدواجی زندگی کی اتنی اچھی خبریں تو ملتی رہتی تھیں لیکن رضوانہ نے کبھی اسے دل کا احوال نہیں سنایا تھا۔ رضوانہ نے ایک طرح سے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ جانے کیوں، وہ آفتاب عالم کی ہر زیادتی برداشت کر کے بھی اس کے ساتھ رہنے پر خوش تھی۔ وہ اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی تھی۔

اسی دوران میں خلیق الزماں کو کویت کی ایک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ پہلے وہ خود کویت پہنچا پھر کچھ ہی عرصے بعد اس نے بیوی اور بچوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ ان لوگوں کا رضوانہ سے رابطہ محض ٹیلی فون پر رہ گیا تھا اور وہ بھی کبھی کبھار۔ آفتاب عالم اپنے گھر میں ان کی آمد کو پسند

نہیں کرتا تھا اس لیے وہ خود ہی احتیاط کرتے تھے۔ یہی احتیاط انہوں نے ٹیلی فون کے سلسلے میں بھی ملحوظ رکھی ہوئی تھی۔

پندرہ فروری کو جب خلیق الزماں کو معلوم ہوا کہ گزشتہ سال چوبیس دسمبر کو رضوانہ چھت سے گر کر حادثاتی موت کا شکار ہوگئی تھی تو وہ اپنی بیوی فوزیہ اور بچوں کے ہمراہ فوراً یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کا خیال بلکہ یقین تھا کہ رضوانہ کو اس کے شوہر آفتاب عالم نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے اس یقین کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے بڑی تگ و دو بھی کی تھی اور اس کی "تگ و دو" کی بنا پر ہی میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

○☆○

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز کوئی دو ماہ بعد ہوا۔ میرے استغاثے کے جواب میں آفتاب عالم نے اپنے وکیل کی مدد سے جواب دعویٰ دائر کردیا تھا۔ میں نے استغاثہ کے گواہوں میں چار افراد کے نام پیش کیے تھے۔ نمبر ایک، خاکروب مائیکل جس نے سب سے پہلے رضوانہ کی لاش دیکھی تھی۔ نمبر دو، دودھ والا محمد اسحاق جو مائیکل کے بعد سب سے پہلے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ نمبر تین، ملزم آفتاب عالم کا سامنے والا پڑوسی اشفاق حسین اور نمبر چار، بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہنے والا سعید بخاری۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔

استغاثہ کی جانب سے پہلا گواہ خاکروب مائیکل پیش ہوا۔ اس نے مقدس کتاب پر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر بیان دیا "میں گزشتہ دو سال سے اس علاقے میں صفائی وغیرہ کا کام کررہا ہوں۔ وقوعہ کے روز میں حسبِ معمول جب اس گلی میں پہنچا تو تین گلی کے بیچ میں کسی کو سوتے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں جھاڑو لگاتے ہوئے جب ذرا قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت دو چند ہوگئی کہ وہ کوئی عورت تھی۔ سردی کے موسم میں کسی عورت کو گلی میں سوتے دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔ میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دودھ والا اپنی سائیکل پر گلی میں داخل ہوا۔ میں نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلالیا پھر اس عورت کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی عورت کو دیکھ چکا تھا۔ نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ پہچان بھی چکا تھا۔ دودھ فروش محمد اسحاق نے مجھے بتایا کہ وہ عورت اس بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر رہتی تھی۔ ساتھ ہی اس نے بلڈنگ کی جانب اشارہ بھی کیا۔ ہم دونوں نے مل کر شور مچایا تو دائیں بائیں کی کھڑکیوں سے کچھ افراد جھانکنے لگے۔ اس کے فوراً بعد ہی دودھ والا اس بلڈنگ میں داخل ہوگیا جس جانب اس نے اشارہ کیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس عورت کے گھر والوں کو اطلاع دینے جارہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس عورت کا شوہر آنکھیں ملتے ہوئے وہاں پہنچ گیا پھر اپنی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہی اس نے رونا شروع کردیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔"

مائیکل کا بیان ختم ہوا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔ میں نے پوچھا "مسٹر مائیکل! ابھی آپ معزز عدالت کو بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ جب آپ وقوعہ کے روز حسبِ معمول صفائی کے لیے ملزم کی گلی میں داخل ہوئے تو آپ نے کسی کو گلی میں سوتے ہوئے دیکھا تھا بعد ازاں جب آپ اس کے قریب پہنچے تو انکشاف ہوا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ کیا میں نے ٹھیک کہا ہے؟"

"جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔" مائیکل نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"مسٹر مائیکل!" میں نے اگلا سوال کیا "آپ نے یہ بھی بیان دیا ہے کہ ملزم اطلاع ملنے پر آنکھیں ملتے ہوئے گلی میں پہنچا تھا اور اس نے اپنی بیوی کی لاش کو دیکھ کر رونا شروع کردیا تھا۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ عورت لاش میں تبدیل ہوچکی تھی؟"

مائیکل نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے آفتاب عالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "جناب، اس شخص نے روتے ہوئے خود ہی اس بات کا ذکر کیا تھا۔"

"کس بات کا؟"

"ملزم نے وہاں پہنچتے ہی واویلا مچانا شروع کردیا تھا۔" مائیکل نے بتایا "یہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا بے وقوف میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا تھا کہ اتنی صبح چھت پر نہ جایا کرو۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک روز تمہیں ضرور کوئی حادثہ پیش آجائے گا۔۔۔ اور بالآخر وہی ہوا۔ تم جان گنوا بیٹھی ہو۔"

میں نے پوچھا "مسٹر مائیکل، آپ نے ملزم کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ملزم کی بیوی رضوانہ کو گلی میں پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کیا اس وقت آپ کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ مرچکی تھی؟"

"نہیں جناب، اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔" مائیکل نے جواب دیا "بالکل ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی اطمینان سے کروٹ کے بل سو رہا ہو۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ نے اس اطمینان سے لیٹی ہوئی

عورت کے اردگرد کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی؟"

"میں آپ کا سوال نہیں سمجھا۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے کہ کوئی خون وغیرہ۔"

اس نے نفی میں جواب دیا "وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

میں نے پوچھا "اس عورت یعنی ملزم آفتاب عالم کی بیوی رضوانہ نے کس قسم کا جوتا پہن رکھا تھا؟"

"وہ پاؤں سے ننگی تھی۔"

"اس کے جسم پر کیسا لباس تھا؟"

مائیکل نے بتایا "وہ پھول دار شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔"

"اور دوپٹا؟"

"دوپٹا مجھے نظر نہیں آیا۔"

"اس کے علاوہ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "کیا اس نے موسم کی مناسبت سے کوئی سویٹر وغیرہ پہن رکھا تھا؟"

"نہیں جناب، کچھ نہیں۔"

میں نے معنی خیز نظروں سے جج کی جانب دیکھا "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب۔" پھر میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وکیل صفائی نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ وہ گواہوں کے کٹہرے کے پاس پہنچا اور گواہ مائیکل سے سوال کیا۔

"مسٹر مائیکل، آپ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے گھر سے کس وقت نکلتے ہیں؟"

مائیکل نے جواب دیا "صبح پانچ بجے کے قریب۔"

"کیا آپ وقوعہ کے روز بھی پانچ بجے ہی گھر سے نکلے تھے؟"

"جی ہاں، کم و بیش یہی وقت تھا۔"

وکیل صفائی نے سوال کیا "آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ جب آپ میرے مؤکل کی گلی میں داخل ہوئے تو آپ نے عین گلی کے وسط میں کسی کو لیٹے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔" مائیکل نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"اور وہ چوبیس دسمبر کی صبح تھی؟"

"بالکل وہ چوبیس دسمبر کی ہی صبح تھی۔" مائیکل کے جواب میں قطعیت کی واضح جھلک تھی "اور اس روز منگل کا دن تھا۔ یہ دن اور تاریخ مجھے اس لیے بھی یاد رہ گئے ہیں کہ اس سے اگلے روز کرسمس تھا۔"

"بہت خوب۔" وکیل صفائی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "استغاثہ کے گواہ کی یادداشت کی داد دینا پڑے گی۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست معزز گواہ کا تمسخر اڑانے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔"

"میں نے کسی کا تمسخر نہیں اڑایا جنابِ عالی۔" وکیل صفائی نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بلکہ گواہ کی یادداشت کی داد دی ہے۔"

جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ کو کس بات پر اعتراض ہے بیگ صاحب؟"

"مجھے بات پر نہیں، انداز پر اعتراض ہے یور آنر۔" میں نے نہایت ہی مؤدب لہجے میں کہا "میرے فاضل دوست گواہ کی یادداشت کی داد دیں لیکن داد کے انداز میں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "یور آنر، بعض اوقات ایک ہی لفظ اپنی ادائیگی کے سبب مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً "شاباش" کا لفظ کسی کارنامے پر خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی کوتاہی یا نالائقی کی مذمت کے لیے بھی۔ ہر دو صورت میں اس لفظ کی ادائیگی کا انداز جدا ہوگا۔ میرے فاضل دوست معزز گواہ کی یادداشت کو سراہ تو رہے ہیں لیکن ان کا انداز استہزائیہ ہے جو کسی بھی طور مناسب نہیں ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے فاضل دوست۔" وکیل صفائی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں آپ کے معزز گواہ کی عقل پر ماتم کررہا ہوں۔"

اس کے انداز نے مجھے چراغ پا کردیا تاہم میں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اتنا کہا "لیٹس کیچ پلیز۔"

جج نے ہمیں آپس میں الجھتے ہوئے دیکھا تو کہا "عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔"

وکیل صفائی گواہ مائیکل کی جانب متوجہ ہوگیا "مسٹر مائیکل، کیا آپ جانتے ہیں کہ دسمبر کے مہینے میں صبح پانچ بجے چار سو اندھیرا ہوتا ہے؟"

"جی ہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کے باوجود بھی آپ نے گلی کے وسط میں کسی کو لیٹے ہوئے دیکھ لیا تھا؟"

مائیکل نے تحمل سے جواب دیا "بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔۔۔ اور اس کی دو وجوہات تھیں۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وکیل صفائی کس

بات پر اچھل کود مچا رہا تھا۔ میں نے اس کے غیر شائستہ رویے کی بنا پر دل میں فیصلہ کرلیا کہ موقع ملنے پر میں اسے خوب رگڑوں گا۔

وکیل صفائی نے پوچھا "اور وہ وجوہات کیا تھیں؟"

"پہلی وجہ تو یہ تھی کہ نہ کورہ گلی میں ہر الیکٹرک پول کے ساتھ اسٹریٹ لائٹ موجود ہے۔" مائیکل کا جواب فوراً بخش تھا "اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر گلی میں اسٹریٹ لائٹ کی روشنی نہ بھی ہوتی تو میں بہ آسانی پوری گلی میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا "کیا آپ گھر سے انفنی ڈارک آئی لینس لگا کر جھاڑو دینے نکلتے ہیں؟"

مائیکل نے متحمل لہجے میں جواب دیا "وکیل صاحب! اگر میں آپ کے سوال کے جواب میں یہ کہوں کہ آپ کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہ رہا ہے تو یہ توہین عدالت ہوگی اس لیے میں ایسا کہنے سے گریز کروں گا۔"

وکیل صفائی بل کھا کر رہ گیا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے وکیل صفائی کو دیکھا۔ جج نے گواہ مائیکل کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا "آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ اگر گلی میں اسٹریٹ لائٹ موجود نہ ہوتی تو پھر آپ کس طرح گلی میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتے تھے؟"

"جنابِ عالی!" مائیکل نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "بات بہت معمولی سی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں بلاشبہ پانچ بجے ہی گھر سے نکلتا ہوں اور اس بات میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ اس وقت گہرا اندھیرا ہوتا ہے لیکن میں صرف ایک گلی کی صفائی نہیں کرتا ہوں۔ میرے پاس خاصا بڑا علاقہ ہے۔ میں جب صفائی کرتے ہوئے وقوعہ والی گلی میں پہنچتا ہوں تو سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا ہوتا ہے یعنی اس وقت صبح کے تقریباً چھ بج چکے ہوتے ہیں۔" پھر اس نے وکیل صفائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا "ذہین وکیل صاحب یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ وقوعہ کے روز یعنی چوبیس دسمبر کو سورج ٹھیک سے طلوع ہوا ہوگا!"

وکیل صفائی کھسیاہٹ میں بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔ مائیکل جیسا پڑھا اعتماد اور عقل مند گواہ میری نظر سے پہلے نہیں گزرا تھا۔ اس نے اپنے مدلل جواب سے وکیل مخالف کو لاجواب کردیا تھا۔

مائیکل کے بعد استغاثہ کا دوسرا گواہ دودھ فروش محمد اسحاق گواہی کے لیے پیش ہوا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد جو بیان دیا وہ تقریباً مائیکل کے بیان سے ملتا جلتا تھا۔ صفحات کی تنگی کے باعث میں اس کی تفصیل میں جانے کے بجائے براہِ راست جرح کا حال بیان کرتا ہوں۔

میں نے محمد اسحاق سے پوچھا "اسحاق صاحب! آپ نے ابھی بیان دیا ہے کہ آپ نے رضوانہ کو گلی میں پڑے ہوئے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ کیا آپ اسے پہلے سے جانتے تھے؟"

محمد اسحاق کی عمر لگ بھگ بتیس سال تھی۔ وہ ایک گٹھا ہوا جوان تھا۔ اپنے ڈیل ڈول سے وہ کوئی پہلوان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وضع قطع سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی کرخت مزاج کا شخص ہوگا لیکن اپنے حلیے کے بالعکس وہ خاصا شائستہ اور نرم خو تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"جناب! میں مرحومہ کو تقریباً دو سال سے جانتا تھا۔"

"یعنی جب سے وہ اس بلڈنگ میں آئی تھیں؟"

"جی ہاں، بالکل۔" محمد اسحاق نے جواب دیا "پہلے آفتاب صاحب ایک لیٹر دودھ لیتے تھے پھر جب ان کی شادی ہوگئی اور رضوانہ صاحبہ اس گھر میں آگئیں تو میں انہیں دو لیٹر دودھ دینے لگا تھا۔"

"آپ ملزم کو کب سے جانتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تین، ساڑھے تین سال سے۔"

میں نے استفسار کیا "آپ کتنے عرصے سے گلی میں دودھ سپلائی کررہے ہیں؟"

اس نے بتایا "تقریباً آٹھ سال سے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ملزم آپ سے دودھ نہیں لیتا تھا۔ یعنی تین یا ساڑھے تین سال سے پہلے؟"

"جی ہاں، پہلے وہ اس گلی میں نہیں رہتا تھا بلکہ اس کی پہلی بیوی فیروزہ بیگم رہتی تھیں جو دودھ نہیں لیتی تھیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "کیا ملزم نے رضوانہ سے پہلے کسی اور عورت سے بھی شادی کررکھی تھی؟"

"جی ہاں، فیروزہ بیگم ایک بیوہ خاتون تھیں۔" محمد اسحاق نے بتایا "وہ کافی عرصے سے بیوگی کی زندگی بسر کررہی تھیں پھر پتا چلا کہ انہوں نے آفتاب عالم نامی ایک شخص سے شادی کرلی ہے۔ اس کے بعد ہی ملزم اس گھر میں آکر رہنے لگا تھا۔"

میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ گواہ محمد اسحاق سے یہ سوالات پوچھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ حقائق عدالت کے ریکارڈ پر آجائیں۔ میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ گواہ کے جوابات سن کر کٹہرے میں کھڑا ملزم آفتاب عالم بے

چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے گواہ سے پوچھا "آپ نے ابھی بتایا ہے کہ مرحومہ رضوانہ سے قبل ملزم کسی فیروزہ بیگم نامی خاتون کا شوہر رہ چکا تھا۔ فیروزہ بیگم کا کیا ہوا؟"

"اصل بات تو میں نہیں جانتا جناب لیکن سنا ہے کہ باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے ان کے کپڑوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور وہ جل کر مرگئی تھیں۔"

اس کے بعد میں نے محمد اسحاق سے چند ایسے سوالات پوچھے جن سے گواہ مائیکل کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی، پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

میرے بعد وکیل صفائی جرح کے لیے آگے بڑھا لیکن دو چار رسمی اور غیر اہم سوالات کے بعد اس نے جرح موقوف کردی۔ اس کے انداز سے بددلی ہویدا تھی۔ فوری طور پر یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ اس کی عدم دلچسپی کی وجہ کیا ہوسکتی تھی۔ اس کا سارا جوش و خروش اچانک جھاگ کے مانند بیٹھ گیا تھا۔ شاید یہ اس کی کوئی چال تھی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

○☆○

مظہر سیشن کورٹ کے اسی کمرے کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ اور ملزم آفتاب عالم کا پڑوسی اشفاق حسین کھڑا تھا۔

اشفاق حسین کی عمر چوالیس پینتالیس سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اشفاق حسین اس بلڈنگ میں گزشتہ بیس سال سے رہ رہا تھا۔ وہ ایک سلجھا ہوا اور بردبار شخص نظر آتا تھا۔

اشفاق حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد نہایت ہی مختصر سا بیان دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس کی نظر میں آفتاب عالم کوئی معقول شخص نہیں تھا۔ اس کے گھر سے اکثر و بیشتر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں، خاص طور پر جب سے اس نے نئی شادی کی تھی اس کے بعد سے اس گھر کی ہنگامہ آرائیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ اس نے ایک دو مرتبہ ملزم کے ضعیف والد مشرف حسین کو بھی اس سلسلے میں ٹوکا تھا جس نے ملزم کو سمجھانے کا وعدہ کیا تھا۔

اشفاق حسین کا بیان ختم ہوا تو میں سوالات کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے پوچھا "اشفاق حسین صاحب! ماشاءاللہ آپ اس بلڈنگ میں کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ وہاں کے دیگر مکینوں کے بارے میں آپ کو خاصی معلومات ہوں گی؟"

"میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں جناب۔" اشفاق حسین نے بتایا "دوسروں کی ٹوہ میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔ ہماری بلڈنگ میں زیادہ تر لوگ کرائے دار ہیں اس لیے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "اشفاق صاحب، میں آنے جانے والے کرائے داروں کی بات نہیں کررہا ہوں۔ آپ کی طرح کچھ اور لوگ بھی اس بلڈنگ میں اپنے ذاتی فلیٹوں میں رہتے ہیں اور سال ہا سال سے رہ رہے ہیں۔"

"ہاں ایسا تو ہے۔"

"اشفاق صاحب، ملزم آفتاب عالم آپ کا پڑوسی تھا۔ آپ دونوں کے فلیٹوں کے دروازے تقریباً آمنے سامنے ہیں۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ آپ کو سامنے والے فلیٹ سے اکثر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں؟"

اشفاق حسین نے اثبات میں جواب دیا "اکثر و بیشتر میں اس قسم کی آوازیں سنتا رہتا تھا اور خصوصاً رات میں بلکہ رات گئے کہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ رات کو دیر تک جاگنے کے عادی ہیں؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" اس نے بتایا "میں دراصل رات کو خاصی دیر تک دکان کھلی رکھتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ طارق روڈ کی رونق رات گئے تک برقرار رہتی ہے۔ میں کپڑے کی ایک دکان چلاتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "اشفاق صاحب، ملزم آفتاب عالم کو آپ کے پڑوس میں آباد ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"یہی کوئی تین، ساڑھے تین سال۔"

"آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ خاص طور پر جب سے ملزم نے نئی شادی کی تھی، اس کے بعد سے اس گھر میں ہنگامہ آرائی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم کی دوسری بیوی کوئی جھگڑالو عورت تھی؟"

"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا؟"

وہ بولا "درحقیقت بات یہ ہے کہ مرحومہ رضوانہ سے پہلے ملزم آفتاب عالم فیروزہ بیگم کا شوہر تھا۔ ان دونوں کی شادی لگ بھگ ایک سال تک رہی پھر وہ حادثاتی موت کا شکار ہوگئیں۔ مرحومہ فیروزہ بیگم کا ہمارے ہاں آنا جانا بھی تھا اس لیے ہمیں کافی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں لیکن

رضوانہ کے سلسلے میں ملزم نے خاص طور پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اسے آس پڑوس میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے میں کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ دونوں میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔"

اشفاق حسین نے خاصا الجھا ہوا جواب دیا تھا' میں نے ذرا مختلف زاویے سے سوال کیا "اشفاق صاحب' آپ تو فیروزہ بیگم کے خاصے پرانے پڑوسی تھے اور آپ کے بقول' ان سے آپ کے گھریلو مراسم بھی تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فیروزہ بیگم نے ملزم آفتاب سے کن حالات میں شادی کی تھی؟"

وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی "مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔ میرے فاضل دوست ایک غیر متعلق موضوع کو بیچ میں لا کر خوا مخواہ عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یور آنر' جو معاملہ اس وقت غیر متعلق نظر آرہا ہے' آگے چل کر وہ انتہائی متعلق ہو جائے گا اس لیے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ وکیل صفائی کو میری جرح میں مداخلت سے باز رکھے۔"

وکیل صفائی نے کہا "جناب عالی' وکیل استغاثہ کو اپنے استغاثے تک محدود رہنا چاہیے۔ میرے مؤکل کے ماضی کو کرید کر وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بیگ صاحب' آپ اپنے سوالات کو مرحومہ رضوانہ اور ملزم آفتاب عالم تک محدود رکھیں۔"

"آل رائٹ یور آنر۔" میں نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں کہا پھر اشفاق حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"اشفاق صاحب!" میں نے جج کی ہدایت کے مطابق سوال کیا "آپ کا بیان ہے کہ ملزم کے گھر سے اکثر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ کیا وقوعہ کی رات بھی آپ نے اس نوعیت کی کچھ آوازیں سنی تھیں؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے وقوعہ کی رات ایسی آوازیں سنی تھیں۔" اشفاق حسین نے جواب دیا "اس رات میرے سر میں درد تھا اور میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم خاصی دیر سے گھر آیا تھا' تقریباً دو بجے کے بعد۔ اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔"

"دیٹس آل یور آنر۔" میں جرح ختم کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وکیل صفائی نے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا "اشفاق حسین صاحب' کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ دوسرے کے گھر کی باتیں سننا سنگین ترین اخلاقی جرم ہے؟"

"جی ہاں' میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کے باوجود بھی آپ اپنے پڑوسی کے اندرونِ خانہ لڑائی جھگڑے کو بڑی توجہ سے سنتے رہے ہیں۔"

اشفاق حسین نے با اعتماد لہجے میں کہا "وکیل صاحب لگتا ہے' آپ نے میرے جوابات پر غور نہیں کیا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے باری باری پہلے جج کو اور پھر مجھے دیکھا' اس کے بعد وکیل صفائی کی جانب مڑتے ہوئے کہا "وکیل صاحب' میں نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ میں خاص طور پر کان لگا کر اپنے پڑوسی کے گھر کے جھگڑے کو سنا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لڑائی جھگڑے کی آوازیں خود بخود میرے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ اس میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا اس لیے میں کسی اخلاقی جرم کا مرتکب نہیں ہوا ہوں۔"

وکیل صفائی نے پوچھا "اشفاق صاحب' آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات میرا مؤکل دو بجے کے بعد گھر لوٹا تھا اور آتے ہی اس نے اپنی بیوی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا تھا۔ آپ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں نہ تو کچھ ثابت کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی کچھ جھٹلانا چاہتا ہوں۔" اشفاق حسین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "یہ کام آپ وکیل صاحبان کا ہے۔ میرا تو بس اپنا فرض پورا کر رہا ہے۔ آپ لوگ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے' میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کے سوال کا درست جواب دوں گا۔"

وکیل صفائی نے دو تین مزید سوالات پوچھ کر جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد استغاثہ کا چوتھا اور آخری گواہ سعید بخاری پیش ہوا۔ سعید بخاری کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس چھتیس کے درمیان لگایا۔ وہ مذکورہ بلڈنگ کے فرسٹ فلور کے ایک فلیٹ کا رہائشی تھا اور کرائے دار تھا۔ وہ اکہرے بدن کا مالک ایک منحنی سا شخص تھا۔ اس نے بھاری مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں جو اس کے سوکھے چہرے پر چپکے ہوئے گالوں پر بوجھ محسوس ہوتی تھیں۔

سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے بڑا سنسنی خیز بیان دیا جس کا سب سے اہم حصہ یہ تھا کہ وقوعہ کی شب پچھلے پہر اس نے ملزم آفتاب عالم کو اپنے دروازے کے سامنے

سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس سیکنڈ فلور پر اپنے فلیٹ میں چلا گیا تھا۔

میں نے اس گواہ پر نہایت مختصر سی جرح کی۔ میں نے پوچھا "سعید بخاری صاحب' کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وقوعہ کی رات پچھلے پہر آپ نے جس شخص کو اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا' وہ ملزم آفتاب عالم ہی تھا؟"

سعید بخاری نے جواب دیا "میں یہ بات اتنے ہی وثوق سے کہہ سکتا ہوں جتنے وثوق سے یہ کہ میں اس وقت سٹی کورٹ کے ایک کمرے میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا "بخاری صاحب' ذرا سوچ کر بتائیں۔ جب آپ نے ملزم کو اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے دیکھا تو اس وقت اس کے ساتھ اور کون تھا؟"

"کوئی اکیلا ہی تھا اور اس نے اپنے کندھے پر کچھ اٹھا رکھا تھا۔"

"وقت کیا ہو گا؟"

وہ کچھ سوچ کر بولا "یہی کوئی پانچ' سوا پانچ بجے ہوں گے۔ ابھی فجر کی اذانیں نہیں ہوئی تھیں۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔" میں نے اپنی جرح ختم کر دی۔

وکیل صفائی جیسے تاب کھاتے ہوئے سعید بخاری کے کٹہرے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کچھ دیر تک کینہ توز نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر زہریلے لہجے میں سوال کیا۔

"بخاری صاحب' آپ نے جھوٹ بولنے کی کیا قیمت وصول کی ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" میں نے وکیل صفائی کے سوال پر احتجاجی لہجے میں کہا "وکیل مخالف معزز گواہ پر رشوت کا الزام عائد کر رہے ہیں۔"

"یہ الزام نہیں' حقیقت ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے لیٹس کے عالم میں کہا "کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ گواہ کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔ منشیات فروشی اس کا پیشہ ہے۔"

"یہ سراسر بہتان تراشی ہے۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "عدالت مفروضوں پر یقین نہیں کرتی۔ اپنی بات کی سچائی کے لیے ٹھوس ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔"

"وکیل صاحب!" جج نے وکیل صفائی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ کے پاس اپنے مؤقف کا کوئی ٹھوس ثبوت یا مدلل جواب ہے۔ کیا آپ عدالت میں یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ سعید بخاری گواہ کے معیار پر پورا نہیں اترتا؟"

"جناب عالی۔" وکیل صفائی نے اٹکتے ہوئے جواب دیا "وہ بات دراصل یہ ہے کہ گواہ میرے مؤکل کا دشمن ہے اس لیے اس کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔"

"اس دشمنی کی نوعیت کیا ہے؟" جج نے استفسار کیا۔

"گواہ منشیات فروش ہے۔ میرے مؤکل نے اسے اس دھندے سے باز رہنے کی تلقین کی تھی اس لیے وہ میرے مؤکل کا دشمن ہو گیا۔"

"آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟" جج نے میری جانب دیکھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ میرے فاضل دوست کے دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" جج نے پوچھا۔

"وہ اس طرح جناب عالی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کہ مذکورہ بلڈنگ کے تین چار مکین اس وقت عدالت میں موجود ہیں۔ معزز گواہ کے بارے میں ان کی رائے لی جا سکتی ہے۔"

جج کو میری تجویز پسند آئی چنانچہ یہی کیا گیا۔ فیصلہ سعید بخاری کے حق میں ہوا۔ جج نے سوالیہ نظروں سے وکیل صفائی کو دیکھا "اب آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا گواہ کے معزز ہونے میں اب بھی آپ کو کوئی شبہ ہے؟"

وہ بدستور اپنی ڈھٹائی پر قائم رہا "ممکن ہے' یہ لوگ گواہ کی اصلیت سے واقف نہ ہوں!"

"لگتا ہے' وکیل صفائی کے پاس پوچھنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔" میں نے بروقت چوٹ کی "اسی لیے وہ فضول باتوں میں الجھ کر معزز عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

وکیل صفائی نے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورا' جج نے کہا "وکیل صاحب' آپ گواہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟"

وکیل صفائی' سعید بخاری کی جانب متوجہ ہو گیا "سعید صاحب' آپ نے اپنے وکیل کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ قبل از اذانِ فجر' آپ نے اپنے دروازے کے سامنے سے وقوعہ کی رات میرے مؤکل کو گزرتے ہوئے

دیکھا تھا جس نے اپنے کندھے پر کچھ اٹھا رکھا تھا؟"

"بالکل درست' میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"کیا آپ اس بات کی وضاحت کریں گے کہ میرے مؤکل نے اپنے کندھے پر کیا اٹھا رکھا تھا؟"

"میں اس سلسلے میں معذرت خواہ ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں نے وہ سارا منظر اپنے دروازے کے آئی گلاس کی مدد سے دیکھا تھا۔" سعید بخاری نے جواب دیا "میں پوری وضاحت کے ساتھ نہیں دیکھ سکا تھا۔"

"آپ اس وقت دروازے کے آئی گلاس سے آنکھ لگائے کس قسم کی کارروائی میں مصروف تھے؟"

سعید بخاری نے عام سے لہجے میں جواب دیا "کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہماری گلی میں اکثر رات گئے تک اوباش قسم کے لڑکے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں اور مختلف قسم کی شرارتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ وقوعہ کی رات کوئی من چلا میری ڈور بیل پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے بیل بجتی' میں اٹھ کر دیکھتا لیکن دروازے پر کسی کو نہ پاتا۔ اسی کوفت میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ آخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے سوچا' کیوں نہ میں آئی گلاس سے آنکھ لگا کر واچ کروں۔ کم از کم اس طرح یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ نابنجار ہے کون۔ میرا ارادہ تھا کہ میں دوسری صبح اس شرارت زادے کو پیار سے سمجھاؤں گا۔ میں اسی خبیث کے انتظار میں تھا کہ میں نے ملزم کو کندھے پر کچھ اٹھائے ہوئے گزرتے دیکھا' ایک منٹ سے بھی پہلے وہ واپس لوٹ گیا تھا اور واپسی کے وقت اس کا کندھا خالی تھا۔"

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ جج پوری دلچسپی سے سعید بخاری کے انکشافات سن رہا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جو نکتہ میں جج کے علم میں لانا چاہتا تھا' وہ واضح ہو چکا تھا۔

وکیل صفائی نے جرح ختم کی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور آنر' اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس واقعے کے سابق انکوائری افسر سرفراز شاہ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یو آر پرمیٹڈ۔" جج نے اجازت دے دی۔

آئی او سرفراز شاہ کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔ وہ صحت مند جسم کا مالک ایک خوش شکل شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی موجود تھی۔ پولیس کی وردی اس کے بدن پر خوب جچ رہی تھی۔

میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا "سرفراز شاہ صاحب! اگر میں آپ کو صرف شاہ جی کہہ کر مخاطب کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

وہ زیر لب مسکرایا "مجھے سب "شاہ جی" ہی کہتے ہیں۔ آپ بھی کہہ لیں جناب۔"

میں نے کہا "شاہ جی' چوبیس دسمبر کی صبح مرحومہ رضوانہ کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا' آپ اس واقعے کے تفتیشی افسر تھے۔ غالباً وقوعہ کا نقشہ بھی آپ ہی نے تیار کیا تھا؟"

"جی ہاں' مشیر نامہ وغیرہ میں نے ہی تیار کیا تھا۔"

میں نے پوچھا "شاہ جی' آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

اس نے جواب دیا "اس وقت آٹھ بجنے والے تھے۔"

"جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مرحومہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی؟"

"جی ہاں' میں نے اسے دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔" اس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "شاہ جی' کیا یہ سچ ہے کہ مرحومہ رضوانہ کے پاؤں میں جو نائم کی کوئی چیز نہیں تھی؟"

اس نے مضطرب نظروں سے مجھے دیکھا' پھر اس نے لہجے میں کہا "شاہ جی' ہر سوال کا جواب اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیجئے گا کیونکہ آپ نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا تھا۔ ابھی تک وہ تفصیلات آپ کے ذہن اور پولیس کے کاغذات میں موجود ہوں گی۔"

چند لمحے کی سوچ بچار کے بعد اس نے جواب دیا "ہاں' یہ سچ ہے کہ مرحومہ اس وقت پاؤں سے ننگی تھی۔"

"اور اس کے سر یا گردن وغیرہ میں دوپٹا بھی نہیں تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "جی ہاں' دوپٹا بھی نہیں تھا۔"

"کوئی سویٹر وغیرہ؟"

"ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔"

میں نے اگلا سوال کیا "مرحومہ رضوانہ کی لاش گلی کے وسط میں اس طرح پڑی تھی جیسے وہ کروٹ کے بل سو رہی ہو؟"

"جی ہاں' وہ اسی پوزیشن میں تھی۔"

"کیا اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش ہے کہ یہ واقعہ چوبیس دسمبر کی صبح پیش آیا تھا؟"

"نہیں' شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" وہ خاصا الجھ

گیا تھا "پولیس کے ریکارڈ پر وہ دن اور تاریخ درج ہے۔"

میں نے ذرا مختلف زاویے سے سوال کیا "شاہ جی' آپ جس وقت جائے وقوعہ پر پہنچے' کس قسم کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔"

وہ میرا سوال سن کر گڑبڑا گیا پھر سرسری سے لہجے میں جواب دیا "ظاہر ہے' میں اپنی وردی پہنے ہوئے تھا۔"

"کیا اس وردی میں سویٹر بھی شامل تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا "اس روز اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی۔" اپنی بات ختم کرتے ہی وہ چونک گیا پھر ہراساں نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی سنگین غلطی کر چکا ہو۔

میں نے اس کو سوچنے کا موقع دیے بغیر سوال کیا "شاہ جی' پولیس رپورٹ کے مطابق یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ مرحومہ رضوانہ اپنے فلیٹ کی چھت پر سے نیچے گر کر ہلاک ہو گئی تھی؟"

"جی ہاں میں کیا شک ہے؟" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "شاہ جی' آپ کو معلوم ہے کہ مرحومہ رضوانہ کا فلیٹ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر تھا؟"

اس نے پریشانی سے مجھے دیکھا "جی ہاں' مجھے معلوم ہے۔"

میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا "یور آنر' کسی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کی چھت سے زمین کا فاصلہ اتنا کم بھی نہیں ہوتا کہ وہاں سے گرنے والے کو خراش تک نہ آئے جب کہ شواہد سے پتا چلتا ہے کہ مرحومہ کے سر میں صرف ایک چوٹ کا نشان تھا حالانکہ اتنی بلندی سے گر کر تو ان کی ہڈیوں کا سُرمہ بن جانا چاہیے تھا' ان کی کھوپڑی کا پاش پاش ہو جانا بھی بعید از امکان نہیں تھا لیکن وہاں تو صورت حال یہ تھی کہ مرحومہ کی کلائی میں موجود کانچ کی چوڑیاں بھی محفوظ رہیں۔"

اچانک وکیل صفائی بیچ میں کود پڑا "مجھے اعتراض ہے جناب عالی' وکیل استغاثہ تو چوڑیوں کا ذکر اس طرح کر رہے ہیں جیسے یہ خود موقع پر موجود تھے۔"

"میں موقع پر موجود نہ سہی لیکن میرے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جو میرے بیان کی سچائی کے لیے کافی ہوں گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایسے کون سے ثبوت ہیں آپ کے پاس؟"

"میرے محترم' آپ خوا مخواہ اپنی توانائی ضائع نہ کریں۔" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا "وقت آنے پر میں وہ ثبوت بھی معزز عدالت میں پیش کر دوں گا۔ فی الحال آپ خاطر جمع رکھیں اور عدالتی کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔" پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' عدالت کا وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں آج ہی تفتیشی افسر سرفراز شاہ صاحب پر اپنی جرح مکمل کر لوں۔"

جج نے وکیل صفائی کو مداخلت سے باز رہنے کی تاکید کی اور مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے تفتیشی افسر سے سوال کیا۔

"شاہ جی' کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی سیکنڈ فلور کی چھت سے نیچے گلی میں گرے اور اس کے جسم پر خراش تک نہ آئے' اس کی ہڈی پسلی سلامت رہے اور اس کی کلائی میں موجود کانچ کی چوڑیاں تک محفوظ رہیں؟"

اس نے جھلاہٹ انداز میں جواب دیا "مرحومہ رضوانہ کو بھی اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر وہ سب اندرونی چوٹیں تھیں۔ اور یہ کہ معجزے بھی تو ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر اس کی چوڑیاں نہیں ٹوٹ سکیں تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ تفتیشی افسر خاصا نروس ہو رہا تھا۔ جج پوری توجہ سے اس کے جواب سن رہا تھا اور اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

میں نے کہا "شاہ جی' چلیں میں آپ کی بات سے اتفاق کر لیتا ہوں۔ مرحومہ کی کلائی میں موجود چوڑیاں معجزاتی طور پر ٹوٹنے سے محفوظ رہیں لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ اسے اچھی خاصی اندرونی چوٹیں بھی آئی تھیں۔ کیا آپ نے لاش کا پوسٹ مارٹم کروایا تھا؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا "لاش کا پوسٹ مارٹم تو نہیں ہوا تھا۔" اس نے گھبراہٹ آمیز انداز میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"ہم نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں سوال کیا "شاہ جی' آپ نے قتل کی ایک واردات کو حادثے کا رنگ دینے کے لیے ملزم آفتاب عالم سے کتنی رشوت وصول کی تھی؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" اس کے لہجے میں کمزور سا احتجاج تھا۔

"ہم نے قسمیہ سے کوئی رشوت نہیں لی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسناتے

ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ ملزم کو مرحومہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے پچاس ہزار روپے کی ایک موٹی رقم وصول کی گئی تھی؟"

وکیل صفائی نے اعتراض جڑ دیا "یور آنر! میرے فاضل دوست' آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود ہے کہ میرے مؤکل نے پولیس کو کوئی بھاری رقم بطور رشوت دی ہو؟"

میں نے تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست' رشوت ثبوت کے ساتھ لی اور دی نہیں جاتی۔ یہ بات تو آپ بھی بخوبی جانتے ہوں گے۔"

جج نے مجھے ہدایت کی "بیگ صاحب' آپ اپنے سوالات میں سے رشوت کا ذکر حذف کرکے جرح جاری رکھیں۔"

میں نے جج کی ہدایت کے بموجب اے ایس آئی سرفراز سے سوال کیا "شاہ جی' آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو آپ نے سرکاری وردی کے اوپر سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ وجہ آپ نے یہ بتائی ہے کہ مذکورہ روز اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

وہ کمزور سی آواز میں بولا "میں نے یہی جواب دیا تھا۔"

میں نے پوچھا "آپ نے اس بات کی بھی تصدیق کی ہے کہ جائے وقوعہ پر ملنے والی مرحومہ رضوانہ کی لاش کے پاس سینڈل' دوپٹا یا کوئی سویٹر وغیرہ نہیں پایا گیا تھا؟"

"ہاں' ایسی کوئی چیز وہاں نہیں پائی گئی تھی۔"

"شاہ جی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ جس موسم میں آپ جیسا صحت مند انسان گرم وردی کے اوپر سویٹر اور پاؤں میں لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھا اسی موسم میں ایک کمزور عورت اپنے فلیٹ کی چھت پر ننگے سر اور ننگے پاؤں صرف ایک پھول دار شلوار قمیص میں کس طرح چلی گئی۔ آپ کی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے؟"

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "یہ تو آپ اسی سے جاکر پوچھیں۔"

"تھینک یو اسسٹنٹ سب انسپکٹر صاحب۔" میں نے تشکر آمیز نظروں سے سرفراز شاہ کو دیکھا۔ اس وقت میرے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

وہ سٹ پٹا گیا "آپ کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہیں؟"

"آپ کے زریں مشورے کا۔" میں بدستور مسکرا رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں!" اس کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

میں نے کہا "شاہ جی' آپ کے حکم کے مطابق اب میں ہر بات مرحومہ ہی سے پوچھوں گا۔"

اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں دیوانہ ہوگیا ہوں۔ لکنت آمیز لہجے میں سوال کیا "مرحومہ آپ کے سوالات کا جواب کیسے دے گی؟"

"میں اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کراؤں گا!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے نئی تاریخ دے کر عدالتی کارروائی ملتوی کردی۔ آج کی ساعت خاصی سود مند ثابت ہوئی تھی۔ خلیق الزماں اور فوزیہ میری کارکردگی سے مطمئن تھے۔

○☆○

ایک بات کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا اور وہ یہ کہ میرے استغاثے کے جواب میں ملزم آفتاب عالم نے اپنے وکیل کی مدد سے جو جوابِ دعویٰ دائر کیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ مرحومہ رضوانہ حادثاتی موت کا شکار ہوئی تھی۔ وقوعہ کے روز وہ چھت پر کبوتروں کے لیے باجرہ ڈالنے گئی تھی کہ اچانک پاؤں پھسل جانے سے وہ نیچے گلی میں گر موت سے ہمکنار ہوگئی۔

پولیس نے اس کیس کی فائل کو داخلِ دفتر کرنے سے پہلے جو سرسری سی رپورٹ تیار کی تھی وہ بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ ملزم آفتاب عالم اور پولیس والوں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کبھی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کرایا جاسکتا ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق آفتاب عالم نے کلیم ڈپارٹمنٹ کے مطالبے پر پولیس کو پچاس ہزار روپے کی بھاری رشوت دے کر مرحومہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا تھا تاہم ابھی اسے کلیم کی رقم نہیں ملی تھی اور وہ عدالت میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔ البتہ تین لاکھ روپے مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ وہ کیش کروا چکا تھا۔

آئندہ دو پیشیوں پر کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ ملزم کی صفائی میں اس کے والدین کا بھی بیان ہوا تھا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

ملزم کے والد مشرف حسین نے بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا' وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ نمازِ فجر کے لیے وہ قبل از اذان ہی گھر سے نکل جاتا تھا۔ جب وہ مسجد سے واپس لوٹا تو گلی میں جمِ غفیر کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بعد ازاں اسے معلوم ہوا کہ اس کی بہو چھت سے گر گئی تھی۔

مشرف حسین کی بیوی حسینہ بیگم نے بیٹے کی پردہ پوشی کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ نماز فجر ادا کر رہی تھی تو اس نے اپنی بہو کو چھت کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت ملزم آفتاب عالم اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور مشرف حسین حسبِ معمول مسجد میں تھا۔ حسینہ بیگم نماز سے فارغ ہونے کے بعد دینی کتب کے مطالعے میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر سے ایک شور اٹھا پھر پتا چلا کہ اس کی بہو رضوانہ کو کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔ وہ چھت سے گر کر جاں بحق ہوگئی تھی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے سے پیشتر ایک نہایت ہی اہم کام کرلینا ضروری سمجھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک اخبار نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! یہ اس شہر سے شائع ہونے والے ایک معیاری اخبار کی ایک کاپی ہے۔ جو پچیس دسمبر کو شائع ہوا تھا۔ اس میں مرحومہ رضوانہ کو پیش آنے والے حادثے کی تفصیلات موجود ہیں اور مرحومہ کی تصویر بھی دی گئی ہے۔"

جج نے میرے ہاتھ سے اخبار لے کر نشان زدہ حصے کا سرسری جائزہ لیا پھر والہانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر' اگرچہ کسی اخبار کے تراشے یا خبر کو عدالت میں پیش کرنے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے لیکن میں ایک خاص امر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔"

جج خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گراف برآمد کرکے جج کی جانب بڑھا دیا اور کہا "جنابِ عالی' یہ فوٹو گراف متعلقہ اخبار کے دفتر ہی سے حاصل کیا گیا ہے اور یہ وہی فوٹو گراف ہے جس کی فلم اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ چونکہ فوٹو گراف میں مرحومہ کی تصویر زیادہ واضح ہے اس لیے میں یہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔"

میں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

"جنابِ عالی' اس فوٹو گراف میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات نظر آرہی ہے کہ مرحومہ کے جسم پر ایک پھول دار شلوار قمیص کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ جوتے' نہ دوپٹا اور نہ ہی کوئی سویٹر وغیرہ۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے اور معزز عدالت کی توجہ کی متقاضی بھی۔

"علاوہ ازیں' مرحومہ کی کلائی میں موجود چوڑیاں بھی کوئی دوسری ہی کہانی بیان کرتی نظر آتی ہیں پھر لاش جس انداز میں زمین پر پڑی ہوئی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ کم از کم چھت سے گرنے والا کوئی شخص اس پوزیشن میں نیچے نہیں آسکتا۔

"یور آنر' میں نے معزز عدالت کی توجہ جن امور کی جانب مبذول کرائی ہے اس کی تصدیق گواہ مائیکل اور انکوائری افسر سرفراز شاہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔

"جنابِ عالی' ان واقعات اور شواہد کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرحومہ رضوانہ کی موت چھت سے گرنے کے باعث واقع نہیں ہوئی۔ اس کی موت کسی اور جگہ واقع ہوئی ہے اور بعد ازاں اس کی لاش کو گلی میں ڈال دیا گیا ہے تاکہ یہ ایک حادثاتی موت ظاہر ہو جبکہ حقیقت اس کے بالکس ہے۔"

میں نے ایک لمحے کو رک کر حاضرینِ عدالت کے چہروں کا جائزہ لیا پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"یور آنر! حقیقت یہ ہے کہ مرحومہ رضوانہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔ اور اس کا قاتل... اس کا شوہر آفتاب عالم ہی ہے۔"

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے کو وکیل صفائی کی چیخ نما آواز نے توڑا "آئی آبجیکٹ یور آنر۔" وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا "میرے فاضل دوست حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ میرا مؤکل انتہائی معصوم اور بے گناہ انسان ہے۔ وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میرے فاضل دوست' میں آپ کے اس معصوم مؤکل کی "معصومیت" کو راز نہیں رہنے دوں گا۔ اس معصوم نے ماضی میں بھی اپنی معصومیت کا اچھا خاصا مظاہرہ کیا تھا جب فیروزہ بیگم کچن میں جل کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔"

وکیل صفائی کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے کچا ہی چبا ڈالتا۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔

"جنابِ عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد مرحومہ رضوانہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم کے احکامات جاری کرے تاکہ اس کی موت کا وقت اور سبب

معلوم ہو سکے۔"

انکوائری افسر نے کم زور سا احتجاج کیا "جناب عالی! اب تو قبر میں شاید اس کی ہڈیاں ہی بچی ہوں۔"

میں نے کہا "آئی او صاحب! یہ ہڈیاں بہت کام کی چیز ہوتی ہیں۔ شاید میڈیکل اور پوسٹ مارٹم کے بارے میں آپ نے بھی معلومات حاصل کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی ورنہ یہ بات نہ کہتے۔ یہ ہڈیاں جو بظاہر معمولی سی نظر آتی ہیں' لیبارٹری تجزیے کے دوران میں پکار اٹھتی ہیں کہ۔۔۔ کچھ سمجھ میں آئی بات؟" میں نے سرفراز شاہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے۔

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایت کی کہ جلد از جلد مرحومہ کے پوسٹ مارٹم کے انتظامات کیے جائیں پھر عدالتی کارروائی کو جاری رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "بیگ صاحب' کیا آپ ملزم پر جرح پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد کریں گے؟"

میں نے کہا "یہی مناسب رہے گا یور آنر۔"

پھر عدالت برخاست ہو گئی۔

○☆○

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ خاصی سنسنی خیز تھی۔

اس رپورٹ کی رو سے مرحومہ رضوانہ کی موت چوبیس دسمبر کی صبح دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سر کے پچھلے حصے میں لگنے والی وہ چوٹ تھی جو کسی نوک دار ٹھوس چیز سے ٹکراؤ کے نتیجے میں لگی تھی۔ وہ کسی سخت چیز کا کنارہ بھی ہو سکتا تھا۔ میڈیکل ایگزامنر کے انکشاف نے آفتاب عالم اور اس کے خیر خواہوں کے جھوٹ کی قلعی کھول دی تھی لیکن اس موقع پر ملزم آفتاب عالم نے عجیب و غریب رویے کا مظاہرہ کیا۔

میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لیے اس کٹہرے کی جانب بڑھا جس میں ملزم آفتاب عالم کھڑا تھا۔ میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"آفتاب عالم' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بیزاری سے بولا "میں اس سلسلے میں کسی خیال آرائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"سٹر آفتاب عالم!" جج نے اسے سرزنش کی "وکیل صاحب کی بات کا سیدھا جواب دو۔"

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا "آفتاب عالم' آپ کی بیوی کی موت چوبیس دسمبر کی صبح دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟"

"میں اس وقت سو رہا تھا۔" اس نے جواب دیا "اس لیے اتفاق کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کی ڈھٹائی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا "آپ نے استغاثہ کے جواب میں جو لمبا چوڑا بیان دیا ہے وہ عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس کے مطابق آپ نے کہا تھا کہ آپ کی بیوی علی الصباح کبوتروں کا باجرہ اور پانی رکھنے چھت پر گئی تھی کہ پاؤں پھسل جانے سے وہ نیچے آن گری۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "آپ یہ بیان دے رہے ہیں کہ تم اس وقت سو رہے تھے۔ آپ کی کون سی بات کو درست مانا جائے؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل صفائی اپنے مؤکل کی مدد کو دوڑا "میرے مؤکل نے یہ کہا ہے کہ وہ دو اور تین بجے کے درمیان سو رہا تھا' یہ نہیں کہا کہ وہ علی الصباح سو رہا تھا۔ میرے فاضل دوست 'علی الصباح کا مطلب ہے کہ کم و بیش صبح چھ بجے کا وقت بمطابق چوبیس دسمبر۔"

"تھینک یو مائی ڈیئر کونسلر۔" میں نے چڑ کر معصوم تشکر کے جذبات سجاتے ہوئے کہا پھر آفتاب عالم سے مخاطب ہو گیا۔

"آفتاب عالم' آپ وقوعہ کی صبح دو اور تین بجے درمیان سو رہے تھے۔ یہی وہ وقت ہے جب آپ کی بیوی سر میں لگنے والی شدید چوٹ کے سبب اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ ظاہر ہے' آپ تو اس وقت سو رہے تھے اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں جانتے ہوں گے مگر آپ کا کہنا یہ بھی ہے کہ آپ کی بیوی علی الصباح چھت سے پھسل کر نیچے گلی میں آن گری تھی۔ کوئی مردہ کس طرح چھت پر جا کر کبوتروں کے دانے پانی کا انتظام کر سکتا ہے۔ ذرا اس کی وضاحت کریں گے؟"

وہ بری طرح الجھ چکا تھا' جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا "آپ ایک ہی بات گھما پھرا کر پوچھ رہے ہیں۔"

"آپ جواب دینے میں کوئی حرج محسوس کرتے ہیں؟"

"میں نے کہہ دیا نا کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تھا' اس وقت میں گہری نیند میں تھا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے عدالت کو بیان دیتے وقت دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔"

"یہ بات مجھے میری والدہ نے بتائی تھی کہ رضوانہ کبوتروں کے لیے دانہ پانی رکھنے چھت پر گئی تھی۔" وہ جز بز ہو کر بولا "میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "آپ کی والدہ نے اپنے بیان میں بھی یہ بات بتائی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس انسان کی موت دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہو چکی ہو وہ چھ بجے کے قریب چھت پر کس طرح جا سکتا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا "آفتاب عالم' کیا تم اس عدالت کو بتاؤ گے کہ تمہاری بیوی اس سے پہلے بھی کبوتروں کے لیے خورونوش کا سامان رکھنے چھت پر جاتی رہی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا "حادثے سے پہلے وہ کئی روز سے یہ کام کر رہی تھی۔"

"علی الصباح۔"

"ہاں۔"

میں نے پوچھا "اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"اسے کسی 'بابا' نے بتایا تھا کہ اگر وہ چالیس روز تک طلوع آفتاب سے پہلے پرندوں کے کھانے پینے کا انتظام کرے گی تو اس کی گود ہری ہو جائے گی۔"

"آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ تذبذب کا شکار نظر آیا' میں نے وضاحت طلب کی۔

"میرا مطلب رضوانہ سے شادی سے ہے۔"

اس نے جواب دیا "کم و بیش دو سال۔"

"آپ کی کتنی اولادیں ہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

میں نے پوچھا "رضوانہ سے شادی کرنے کی کوئی خاص وجہ؟"

وکیل صفائی اپنا حق استعمال کرتے ہوئے بولا "آبجیکشن یور آنر۔ وکیل استغاثہ غیر متعلق گفتگو کر کے میرے مؤکل کو الجھانا چاہتے ہیں۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے جناب عالی۔" میں نے جج کو دیکھتے ہوئے کہا "اس کیس میں اگر ملزم آفتاب عالم اور اس کی بیوی مرحومہ رضوانہ کا ذکر غیر متعلقات میں شمار ہوتا ہے تو پھر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔"

جج نے وکیل صفائی کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی تاکید کی۔ میں نے آفتاب عالم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

وہ منمنایا "آپ اپنا سوال دہرائیں۔"

"رضوانہ سے شادی کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

اس نے الٹا سوال کر دیا "کیا شادی کرنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "شاید آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔" ایک لمحے کی تاخیر سے میں نے اضافہ کیا "چلیں میں وضاحت کیے دیتا ہوں۔۔۔ آفتاب عالم! آپ ماشاء اللہ سے خاصے وجیہ و شکیل ہیں۔ آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور امیر و کبیر لڑکی مل سکتی تھی پھر آپ نے ایک واجبی سی شکل کی معمولی لڑکی کا انتخاب کیوں کیا؟"

اس نے جواب میں ایک چھوٹی سی جذباتی تقریر کر ڈالی جس کا لب لباب یہ تھا کہ دل کے معاملات میں شکل و صورت اور مال و دولت نہیں دیکھی جاتی۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات رقم ہیں جب والیان سلطنت نے معمولی لڑکیوں کی خاطر تاج و تخت کو ٹھکرا دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو اپنی سیکریٹری سے سچا عشق ہو گیا تھا؟"

"اور مجھے اس بات پر فخر ہے۔"

میں نے کہا "آفتاب عالم' کیا آپ کو یاد ہے کہ تین چار سال قبل آپ فیروزہ بیگم پر بھی مرتے تھے۔ بڑا طوفانی عشق ہو گیا تھا آپ کو ان سے۔ پہلے آپ فیروزہ بیگم کی کمپنی میں ایک معمولی ٹائپسٹ تھے' پھر اکاؤنٹنٹ بنے۔ اکاؤنٹنٹ سے منیجر اور بالآخر اپنی باس فیروزہ بیگم کے شوہر بن گئے۔ فیروزہ بیگم کی حادثاتی موت کے بعد آپ بلا شرکت غیرے ان کے گھر اور کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کمپنی کے مالک ہو گئے۔"

وہ عجیب سے لہجے میں بولا "آپ کو اعتراض کس بات پر ہے وکیل صاحب؟"

"مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو بس معزز عدالت کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے افلاطونی عشق سے مجبور ہو کر پہلے اپنی باس اور عمر میں دو چار سال بڑی فیروزہ بیگم سے شادی رچائی۔ اس کی عبرت ناک موت کے بعد آپ کو خاصا مالی استحکام حاصل ہوا۔ اس کے بعد آپ نے اپنی سیکریٹری سے دوسری شادی کی اور اس کی حادثاتی موت بھی آپ کے لیے خاصی سود مند ثابت ہو رہی ہے۔ کیا اس کو محض ایک اتفاق سمجھا جائے؟"

"اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

میں نے اچانک سوال کیا "آفتاب عالم! کیا یہ سچ ہے کہ آپ عنقریب ایک اور شادی کرنے والے ہیں۔۔۔ تیسری شادی!"

وہ چونک گیا "آپ سے کس نے کہہ دی یہ بات؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی ہونے والی تیسری بیوی کا آپ کے گھر آنا جانا ہے؟"

"پتا نہیں، آپ کون سی کہانی سنا رہے ہیں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا "ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا "آفتاب عالم، اس لڑکی کا نام انیلا واسطی ہے اور وہ انشورنس کمپنی کے کلیم ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہے۔ آپ دونوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ جیسے ہی آپ کو کلیم کی رقم ملے گی، آپ دونوں شادی کرلیں گے لیکن اس مقدمے کی وجہ سے کلیم کی رقم کھٹائی میں پڑ گئی۔ انیلا واسطی کا دعویٰ ہے کہ آپ اس سے بھی بڑا سچا عشق کرتے ہیں جیسا فیروزہ بیگم اور رضوانہ سے کرتے رہے ہیں؟"

"تو آپ دن رات میری جاسوسی میں لگے رہتے ہیں؟" اس نے غصیلی نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے کہا "آپ اسے جاسوسی کے بجائے میری باخبری کہیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ ایک کامیاب وکیل کو یہ سب کرنا پڑتا ہے۔"

وکیل صفائی نے کہا "اگر میرا مؤکل عشق پیشہ ہے تو وکیل استغاثہ کو کیا تکلیف ہے؟"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے میرے عزیز دوست۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا "میں معزز عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ ملزم آفتاب عالم کو یہ عشق بہت راس آتے ہیں اور ہر شادی اس کے مال و جائداد میں اضافہ کرتی ہے۔ مرحومہ رضوانہ کی موت سے ملزم کو تقریباً گیارہ لاکھ روپے کا فائدہ پہنچنے والا تھا۔ تین لاکھ وہ وصول کرچکا ہے۔ مزید آٹھ لاکھ حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک طرف تو پولیس کو پچاس ہزار روپے کی رشوت پیش کرکے رضوانہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور دوسری جانب کلیم ڈپارٹمنٹ کی ملازمہ انیلا واسطی کو محبت کا سبز باغ دکھا کر اس کا بھرپور تعاون حاصل کرلیا لیکن۔۔۔"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جج جو گہری دلچسپی سے میرا مؤقف سن رہا تھا، فوراً بول اٹھا "لیکن کیا؟"

"لیکن یہ جنابِ عالی کہ انیلا واسطی ملزم کی اصلیت سے آگاہ ہو چکی ہے اس لئے اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق جب سے یہ کیس عدالت میں لگا ہے، انیلا نے پلٹ کر کبھی ملزم کی خبر نہیں لی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں آفتاب عالم؟"

آفتاب عالم نے کوئی جواب نہیں دیا، خجالت آمیز نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور جج کی بھرپور توجہ حاصل کرنے کے بعد کیس پر میری گرفت خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ اب میں نے براہِ راست آفتاب عالم پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

میں نے پوچھا "آفتاب عالم! مرحومہ رضوانہ سے شادی کے ایک سال بعد آپ نے ایک خاصی بھاری بیمہ پالیسی خریدی تھی۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"بیمہ پالیسی خریدنا قانوناً کوئی جرم نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا "اور آپ جس پالیسی کا تذکرہ کررہے ہیں وہ ہم میاں بیوی کی مشترکہ پالیسی تھی۔ کاروباری لوگ انکم ٹیکس بچانے کے لئے عام طور پر بیمہ پالیسی خریدتے ہی ہیں۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

میں نے اگلا سوال کیا "آفتاب عالم، وقوعہ کی رات آپ کتنے بجے گھر آئے تھے؟"

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "جیسے روز آتا تھا۔"

"اور روز کتنے بجے آتے تھے؟"

اس نے بتایا "دس گیارہ بجے۔"

"آفتاب عالم!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "آپ کے پڑوسی اشفاق حسین نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ تقریباً دو بجے واپس لوٹے تھے؟"

"وہ سراسر جھوٹ بولتا ہے۔"

"کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ نے اس روز گھر آتے ہی اپنی بیوی سے جھگڑا شروع کردیا تھا؟"

"ہاں، یہ بھی جھوٹ ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا "اور یہ بات بھی آپ کو اشفاق حسین ہی نے بتائی ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ اس بات سے تو انکار نہیں کریں گے کہ رضوانہ سے اکثر آپ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور کئی دفعہ نوبت مارپیٹ تک پہنچ گئی تھی؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "وہ کون سا گھر ہے جہاں میاں بیوی میں نوک جھوک نہیں ہوتی۔"

"میں معمولی نوک جھوک نہیں، مارپیٹ کی بات کررہا ہوں۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"آپ کا دل چاہے، سمجھتے رہیں۔" وہ بے پروائی سے

بولا۔

"آفتاب عالم!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "کیا یہ سچ ہے کہ انیلا واسطی کچھ عرصہ پہلے تک آپ کے گھر آتی جاتی تھی؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا، میں نے پوچھا "آپ کو یہ بات تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوگی کہ ایک دو مرتبہ انیلا واسطی رضوانہ کی موجودگی میں بھی آپ کے گھر میں آئی تھی؟"

"شاید ایک آدھ بار ایسا ہوا تھا۔" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

میں نے تیز آواز میں استفسار کیا "اور یہ بات رضوانہ کو سخت ناگوار گزری تھی۔ بعد میں اس نے آپ سے جھگڑا بھی کیا تھا۔ وہ کسی طرح آپ کے اور انیلا واسطی کے مراسم سے آگاہ ہوگئی تھی اور اس بات پر خاصی برہم تھی؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔" وہ ڈھٹائی سے مکر گیا۔

میں نے پوچھا "وقوعہ والی رات آپ دونوں میں کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"رضوانہ میرے دیر سے آنے پر خفا تھی۔"

"آپ کتنی دیر سے آئے تھے؟"

"میں رات گئے واپس لوٹا تھا اور۔۔۔" وہ چونک اٹھا۔ اچانک اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تھی۔ وہ مدد طلب نظروں سے اپنے وکیل کو دیکھنے لگا۔

میں نے وکیل صفائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا "آپ رات گئے گھر لوٹے تھے اور رضوانہ نے اس پر واویلا مچایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آپ انیلا واسطی کے ساتھ۔۔۔"

میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ اس نازک موقع پر وکیلِ صفائی نے اپنی فیس حلال کرنے کی کوشش کی۔

"آبجیکشن یور آنر!" اس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہا۔ "وکیلِ استغاثہ ٹریک سے ہٹ رہے ہیں۔ انیلا واسطی کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے فاضل دوست انیلا واسطی اور میرے مؤکل کے تعلقات سے کیا ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟"

جج نے استفساریہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "جنابِ عالی، ملزم میرے سوال کے جواب میں کچھ دیر پہلے بتا چکا ہے کہ وہ حسبِ معمول وقوعہ والی رات دس گیارہ بجے تک گھر پہنچ گیا تھا۔ اب اس کا کہنا ہے کہ وہ رات گئے گھر آیا تھا۔ ملزم کے بیان میں واضح تضاد موجود ہے۔ میں انیلا

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں

مرزا امجد بیگ کی یادداشتیں

ریٹائرڈ ڈی ایس پی ایک صحافی کی ڈائری

شیطان صفت

دستِ انتقام

سبز قدم

اسیرِ ہوس

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم موڑ و نکات

زن، زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی پیشہ ورانہ زندگی کے پیچیدہ کیسوں کی روداد

جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

قیمت فی کتاب ۴۰ روپے، ڈاک خرچ ۱۶ روپے، چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز ❁ پوسٹ بکس نمبر ۲۳، رمضان چیمبرز، نزد دفتر اخبار جنگ، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی ۲۴۰۰

واسطی کے ذکر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ملزم اول نمبر کا جھوٹا ہے۔ اس نے کئی بار بیان بدلنے کی کوشش کی ہے۔"

جج نے نفرت آمیز نظروں سے آفتاب عالم کو گھورا پھر پوچھا "تمہارے کون سے جواب کو درست سمجھا جائے؟"

"جو آپ بہتر سمجھیں جناب۔"

اس جواب نے جج کو غصے میں مبتلا کر دیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا "یہ عدالت کا مذاق ہے۔ میرے سوال کا درست اور واضح جواب دو ورنہ میں توہین عدالت میں تمہیں جیل بھیج دوں گا۔"

آفتاب عالم نے تھوک نگل کر حلق تر کیا پھر بولا "جناب عالی! وقوعہ کی رات میں واقعی خاصی دیر سے گھر پہنچا تھا۔ تقریباً دو بجے کے بعد۔"

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ میں نے کٹہرے میں موجود آفتاب عالم سے پوچھا۔

"تمہارے فلیٹ کے عین نیچے فرسٹ فلور پر کون رہتا ہے؟"

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور جواب دیا "منشیات فروش سعید بخاری۔"

"اپنے جواب کو وکیل صاحب کے سوال تک محدود رکھو۔" جج نے ایک مرتبہ پھر اسے جھاڑ پلائی۔ وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "آفتاب عالم، سعید بخاری کے بقول، وقوعہ کے روز فجر سے پہلے، تم اس کے دروازے کے سامنے سے گزر کر نیچے گئے تھے اور تمہارے کندھے پر بھی کچھ لدا ہوا تھا۔"

میرا سوال پورا ہونے سے پیشتر ہی وہ بول اٹھا "میرے کندھے پر تو کچھ بھی نہیں تھا۔" اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

میں نے کہا "چلو مان لیتے ہیں کہ تمہارے کندھے پر کچھ بھی نہیں لدا ہوا تھا۔ اب اتنا تو بتا دو کہ تم رات کے آخری پہر اپنے فلیٹ سے کیوں نکلے تھے؟"

"میرا جی گھبرا رہا تھا۔" وہ لرزاں لہجے میں گویا ہوا "میں نے سوچا ذرا تازہ ہوا میں دو چار لمبی لمبی سانسیں لوں۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "لیکن سعید بخاری کا تو کہنا ہے کہ تم ایک منٹ سے بھی پہلے واپس اوپر چلے گئے تھے؟"

اب آفتاب عالم کے چہرے پر زردی کھنڈ چکی تھی۔ اس کی آواز سے بھی نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا "وہ بات یہ ہے کہ باہر اس وقت اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی اس لئے میں جلد ہی واپس چلا گیا تھا۔"

میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا "آفتاب عالم، تم کچھ دیر پہلے مجھے بتا چکے ہو کہ وقوعہ کی رات پچھلے پہر تم گہری نیند سو رہے تھے اور اس دوران میں جو واقعات پیش آئے، تم ان سے قطعی بے خبر تھے بلکہ بعد میں تمہاری والدہ نے تمہیں اس بارے میں بتایا تھا۔ اب تمہارا بیان ہے کہ تم تازہ ہوا میں گہری سانسیں لینے کے لئے فلیٹ سے نیچے اترے تھے۔ تمہارے کون سے بیان کو درست تسلیم کیا جائے؟"

اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ کٹہرے کی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے تابڑ توڑ سوالات شروع کر دیے۔

"آفتاب عالم! کیا تم اس عدالت کو بتاؤ گے کہ علی الصباح تمہاری بیوی چھت پر جانے سے پہلے جوتا پہننا کیوں بھول گئی؟"

اس نے رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا لیکن میں اس موقع پر کسی رو رعایت کا روادار نہیں تھا۔ میں نے پوچھا "اور سردی کے اس موسم میں وہ سویٹر تو کیا، سر پر دوپٹہ بھی بھول گئی۔ تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟"

وہ نحیف سی آواز میں منمنایا "میں اب آپ کے کس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا "یور آنر، ساری صورت حالات روز روشن کے مانند معزز عدالت کے سامنے عیاں ہو چکے ہیں۔ اب اس کیس کا کوئی پہلو ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ ملزم آفتاب عالم اپنی بیوی کا قاتل ہے۔ اس نے معزز عدالت کے سامنے متعدد جھوٹ بولے ہیں اور بار بار اپنا بیان بدلا ہے جو اس کے مجرم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔"

میں نے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب عالی، ملزم لالچی فطرت کا مالک ایک زر پرست انسان ہے۔ اس نے سیونگ سرٹیفکیٹ اور بیمہ پالیسی کی بھاری رقم حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا پھر اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے کے لئے اسے گلی میں پھینک دیا۔ علاوہ ازیں اس نے پولیس کی مٹھی گرم کر کے انہیں سرسری تفتیش کے بعد فائل کو داخل دفتر کرنے پر آمادہ کر لیا اور کام پکا ہو جانے کے بعد بیوی کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا۔

"ملزم بخوبی اس بات سے آگاہ تھا کہ یہاں مرحومہ کا کوئی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا۔ اس کی چھوٹی بہن اور والدہ بھی ملک سے باہر تھے اس لئے اسے اپنے کام میں آسانیاں ہی آسانیاں نظر آئیں۔ وہ بڑی حد تک اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ عنقریب اسے انشورنس کی رقم ملنے ہی والی تھی کہ اس کی سالی فوزیہ اور ہم زلف خلیق الزماں نے یہاں آ کر اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس طرح ملزم کا منصوبہ فلاپ ہو گیا۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جج سے درخواست کی "جناب عالی! میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ ملزم آفتاب عالم کو پولیس کسٹڈی میں دے کر از سر نو اس کیس کی تفتیش کروائی جائے۔ علاوہ ازیں پولیس کو ہدایت کی جائے کہ وہ جلد از جلد اپنی تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔

"یور آنر، اب تک کی عدالتی کارروائی نے صورت حالات کو واضح کر دی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے وقوعہ کی تفصیلات کی پوری کر دی ہے۔ ملزم نے جس طرح میری جرح کے جواب میں بار ہا یوٹرن لیا ہے، وہ عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکا ہے۔ اس کے مجرم ہونے میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں، میں معزز عدالت سے میں درخواست کروں گا کہ اس مقدمے کا جلد از جلد فیصلہ سنایا جائے۔"

پھر میں نے اس درخواست کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! مدعیہ فوزیہ اور ان کے شوہر خلیق الزماں کافی عرصے سے یہاں ہیں۔ خلیق الزماں کئی مرتبہ اپنی چھٹی بڑھوا چکے ہیں۔ اس مقدمے میں تاخیر ان کی ملازمت پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جج تھوڑی دیر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں مطمئن تھا کہ اپنے حصے کا کام میں نے بحسن و خوبی نمٹا دیا تھا۔ آفتاب عالم نے جس طرح بار بار پینترا بدلا تھا اور میرے سوالات کے غیر اطمینان بخش جواب دیے تھے، ان سے وہ جج کی نظروں میں مشکوک ٹھہر چکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جج اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ نمودار ہوا اور آ کر اپنی کرسی پر براجمان ہوا پھر اس نے ملزم آفتاب عالم کو حوالۂ پولیس کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ اس نے خاص طور پر پولیس کو ہدایت کی تھی کہ عرصہ سات یوم کے اندر اندر چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہم عدالت کے کمرے سے نکلے تو فوزیہ نے پوچھا "بیگ صاحب، آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ مردود آپ اپنے جرم کا اقرار کر لے گا؟"

میں نے کہا "پولیس والے یہ کام کروانا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اس نے تو پہلے بھی پولیس کو بھاری رشوت دے کر خرید لیا تھا۔" فوزیہ نے اپنے دلی خدشات کا اظہار کیا "کیا وہ اب ایسا نہیں کر سکتا؟"

"اب یہ ممکن نہیں رہا۔" میرے بجائے خلیق الزماں نے کہا "بیگ صاحب نے بھری عدالت میں جس طرح سابق تفتیشی افسر سرفراز شاہ کو رگیدا ہے اور بعد ازاں ملزم کے کرتوتوں کی نقاب کشائی کی ہے اس کے پیش نظر پولیس اب کوئی کچا ہاتھ نہیں ڈالے گی۔"

میں نے کہا "موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب پولیس پوری کوشش کرے گی کہ وہ ملزم سے اقبال جرم کروائے ورنہ خود ان کے پھنسنے کے امکانات روشن ہیں۔"

اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ میں ایک دوسری عدالت کی طرف جانے لگا تو برآمدے کے ایک سرے پر مجھے ملزم کے ضعیف والدین کھڑے نظر آ گئے۔ میں غیر ارادی طور پر ان کے قریب چلا گیا۔

مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ خوفزدہ نظر آنے لگے۔ میں نے بوڑھے مشرف حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بزرگوار، میرے محتاط اندازے کے مطابق آپ کی عمر ستر کا ہندسہ عبور کر چکی ہے۔" پھر میں نے حسینہ بیگم کی طرف دیکھا "اور خاتون، آپ بھی کسی طور ساٹھ سے کم کی نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ دونوں نے حج بھی کر رکھا ہے اور خاصے دیندار ہیں۔"

وہ دونوں سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگے، میں نے کہا۔ "اس عمر میں آپ کو اس جہان کے بجائے اس جہان کی فکر کرنا چاہیے۔ یہاں کی بہ نسبت وہاں کا فائدہ آپ کے لئے زیادہ اہم ہے۔ اپنے مجرم بیٹے کو بچانے کے لئے آپ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ اس کی حمایت میں جھوٹ بول کر آپ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس کا سزا سے بچنا اب ممکن نہیں رہا۔"

ان کے چہروں پر ندامت کے آثار ابھر آئے۔ میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ اس ندامت میں ایک بے زبان سا کرب بھی شامل تھا جو ظاہر ہے، ان کے بیٹے کے انجام سے

متعلق تھا۔ وہ بیٹا جس کی زندگی کے دن گنے جا چکے تھے۔
میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

○☆○

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کردیا۔
ملزم آفتاب عالم نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا۔ اس نے پہلے پولیس کو اور پھر عدالت میں جو اقبالی بیان دیا اس کا خلاصہ یہ تھا۔
انشورنس کمپنی کی ملازمہ انیلا واسطی کو اس نے پوری طرح اپنے چنگل میں پھانس رکھا تھا اور عنقریب وہ شادی کرنے والے تھے تاہم مرحومہ رضوانہ کو ان کے عزائم کی خبر مل گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ رضوانہ اس کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیدا کرتی، آفتاب عالم نے اسے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح وہ دہرا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ایک طرف اسے رضوانہ سے نجات مل جاتی اور دوسری جانب وہ پالیسی کی رقم حاصل کرلیتا۔
آفتاب عالم نے رضوانہ کو ٹھکانے لگانے کے کئی منصوبے بنائے اور بگاڑے حتیٰ کہ اس وقت اس کی مشکل آسان ہوگئی جب رضوانہ نے باقاعدگی سے چھت پر جاکر کبوتروں کے لئے دانے پانی کا انتظام کرنا شروع کردیا۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ چپکے سے دھکا دے کر رضوانہ کو چھت سے نیچے گرا دے گا۔ وہ سمجھتی ہیں طرح کہ رضوانہ کو بھی اس سازش کا احساس نہیں ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ اچانک پاؤں پھسل جانے سے وہ گر گئی تھی۔
آفتاب عالم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے پچیس دسمبر کا دن منتخب کیا تھا لیکن وقوعہ کے روز جب وہ گھر آیا تو رضوانہ نے حسب معمول اس سے لڑائی جھگڑا شروع کردیا پھر بات اتنی بڑھ گئی کہ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی اسی دوران میں آفتاب عالم نے فیصلہ کیا کہ یہ اچھا موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے چنانچہ اسی ہاتھا پائی کے دوران میں اس نے رضوانہ کا سر اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا پھر زوردار انداز میں بیڈ کے کنارے سے اس کے سر کو ٹکرا دیا۔
بیڈ کے کنارے اور رضوانہ کے سر کے درمیان تصادم خاصا شدید ثابت ہوا، رضوانہ کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔
شور کی آواز سن کر آفتاب کے والدین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ملازمہ شہناز ان دنوں اندرون سندھ اپنے گھر والوں سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں صرف گھر کے افراد ہی تھے۔
عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ حاجی مشرف حسین نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ رضوانہ کے وجود میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے چنانچہ سب سر جوڑ کر اس مسئلے کا حل سوچنے لگے۔ آفتاب کے مکارانہ ذہن نے چھت سے گرنے والا آئیڈیا پیش کیا جس پر سب نے اتفاق کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، آیا، اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔
بوڑھے مشرف حسین نے اس معاملے کو راز رکھنے اور بیٹے کی حمایت کے سلسلے میں اپنی بیوی حسینہ بیگم کو بھی ایک مخصوص بیان رٹوا دیا تھا جو سراسر آفتاب عالم کے حق میں جاتا تھا۔
ممکن تھا کہ یہ معاملہ دب دبا ہی جاتا اگر خلیق الزماں اور فوزیہ اس سلسلے میں خصوصی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے اور مظلومہ و مرحومہ رضوانہ کے قاتل شوہر کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے پاکستان نہ آتے۔
ملزم کے اقبال جرم کے بعد سارا کیس حل ہوگیا تھا۔ آئندہ دو تین پیشیوں میں بس رسمی سی عدالتی کارروائی ہونی اور عدالت نے آفتاب عالم کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت سزائے موت سنادی۔
فیروزہ بیگم ایک بیوہ اور رتن تنہا عورت تھیں اور شوہر کی وفات کے بعد تو وہ بالکل ہی اکیلی رہ گئی تھی چنانچہ جب آفتاب عالم نے بہ آسانی اسے اپنے جال میں پھنسا لیا اگر فیروزہ کا کوئی والی وارث موجود ہوتا تو ممکن تھا اس کے جل مرنے کے بعد کوئی عدالتی کارروائی کی جاتی۔
آفتاب عالم نے بڑی خوبصورتی سے اپنی دوسری بیوی رضوانہ کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن اس کی قسمت بُری کہ عین وقت پر وہ پھنس گیا۔ یہ قسمت و شوق سے تو نہیں کہی جاسکتی تھی کہ فیروزہ کے جل کر جاں بحق ہونے میں بھی آفتاب عالم کا ہی ہاتھ تھا لیکن اس کی لالچی اور حریص فطرت کے پیش نظر یہ بات بعید از امکان بھی نہیں تھی۔
بہرحال وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ جس دولت کی خاطر اس نے اپنی معصوم بیوی کے خون میں ہاتھ رنگے تھے وہ اس کے کسی کام نہ آسکی اور نہ ہی اس عورت (انیلا واسطی) نے پلٹ کر اس کی خبر لی جس سے شادی رچانے کے لئے وہ رضوانہ کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔
دولت کے حصول کے لئے اندھا دھند بھاگنے اور اس دوڑ میں بُرے بھلے کی تمیز کھو دینے والوں کا بالآخر یہی انجام ہوتا ہے۔

(تحریر: شمام)

انعام یافتہ شعر

عدیل اکمل ——— خیابان حافظ روڈ، کراچی
بیدل لباسِ زیست بڑا دیدہ زیب تھا
ہم نے ہی اس لباس کو الٹا پہن لیا

شہزاد عزیز چوہدری ——— شورکوٹ منڈی
دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفیٰ کے بعد

مبارک علی طاہر ——— جعفرآباد
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر وزندیق

[illegible] ——— [illegible]
اپنا کردار کوہِ موسم سے بچائے رکھنا
ٹوٹ کر پھول [illegible] واپس نہیں آتی خوشبو

محمد اعوان ——— آزاد کشمیر
یہی بہت ہے کہ قائم رہے وفا کا بھرم
کوئی کسی کا ہوا ہی ہے عمر بھر کے لیے

محمد احمد آکاش ——— صادق آباد
یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھرنا مجھے گویائی دے

[illegible] علی ——— لاہور
جی کہتے چپ ہر روز نیا زہر پیا ہے
مجھ سے بھی تو پوچھے کوئی تو کیسے جیا ہے

[illegible] عمران خالد ——— جلال پور شریف ضلع جہلم
دکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا

[illegible] ——— الخاص سعودی عرب
تمہیں بھلانا ہی تو اپنی دسترس میں نہیں
وہ اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے!

[illegible] احمد ذکاء الرحمٰن بھلدوان ——— مظفرگڑھ
اب اس بہار کو کس نام سے پکاریں ہم
کہ شاخ شاخ پہ خنجر سجائے جاتے ہیں

عبدالمتین شاہد ——— فیصل آباد
وہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا
تو اٹھا سکا نگاہیں نہ بتا سکا زباں سے

نازیہ مبارک نزدی ——— نوشہرہ کینٹ
بے سکونی سی بے سکونی ہے
زندگی اضطراب ہو جیسے

ظفر حسن شکرانی ——— ملتان
سکوں دیا ہے زمانے کو اپنے لفظوں نے
عجیب بات ہے خود ہی کو ہم ہنسا نہ سکے

سی کے حسن جعفری ——— پنڈی بھٹیاں
کہاں سے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

صمد رحمانی ——— دیوان شوگر ملز
رستوں کو دھواں شہروں کو سنسان نہ کرتے
کرنا ہی تھا یہ کام تو انسان نہ کرتے

عظمت ظہیر ——— ضلع کرک
اپنے چراغ اوروں کے گھر میں جلاؤ یوں
یوں روشنی سے پیار کیا ہے کبھی کبھی

احمد رضا ——— چکوال
ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگِ راہ
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

محمد عدنان صدیقی ——— اسلام آباد
مے سے توبہ کی ستمگر نے غضب ہے اس وقت
جب کہ تیار مرا خاک سے پیمانہ تھا

شائستہ زرین ——— کراچی
عزتِ نفس ہی سرمایہ تھا اس جاں کا شکیب
لوگ چھینے لیے جاتے ہیں ردائوں کی طرح

مزمل عباس ——— ملتان
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مرمر کے جیے جانے کا

ریحانہ علی ——— ماتلی
سورج رہے گواہ کہ آفاق کے عوض
ہم نے دیارِ یار کی مٹی قبول کی

قلب عباس ساجد ——— میانوالی
دنیا میں پھر وہ کام کے قابل نہیں رہا
جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

ایم رضا شاد ——— پنڈی بھٹیاں
بعد تھا جو بچھڑنے پر، ملا تھا یوں کبھی ہم سے
کہ جیسے ٹوٹ کر پیاسا گرے پانی کے برتن پر

زیڈ ایچ شاہ ——— کوٹلہ جہانگیر ضلع خوشاب
کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

ملک محمد اشفاق انجم ——— بہاولنگر
ہر خار کو کرتا ہوا سیراب لہو سے
آیا ہے بہت دور سے یہ قافلہ پا دیکھ

ڈاکٹر سلمان خان سواتی ——— انارکلی لاہور
یہی تو دکھ ہے کہ گلشن میں عمر بھر کانٹے
گلوں کے ساتھ رہے اور بہار کو ترسے

شکیل احمد محبوب ——— سرگودھا
سوچتے کب ہیں لوٹنے والے
یہ وطن خود کفیل ہے کہ نہیں

کاشف وسیم مہر ——— گوجرانوالہ
چرچے تری معصوم نگاہی کے بہت تھے
الزام تو آنا تھا ہی بے ادبوں پر

سیدہ طیبہ قصور ——— گجرات
کہنے کو میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں
امجد مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں

علی زمان نازش، افتخار عظیم، ہری پور
وہ ایک درد بنا زندگی کا سرمایہ
جسے پرو نہ سکے آنسوؤں کے تار میں ہم

عاصم سعید جھنڈیر ——— روہیلانوالی
رنج سہنے کی مرے دل میں تب و تاب کہاں
اور یہ بھی ہے کہ پہلے سے وہ اعصاب کہاں

طاہر منصور مفتی ——— گوجرانوالہ
مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

راجہ ای ——— سوسائٹی سانگھڑ
ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ہمدرد ہزاروں
شاید مری بستی میں اداکار بہت ہیں

ام شیخ ——— پنڈی بھٹیاں، حافظ آباد
سیف امید کے سہارے بھی
کتنے بے اعتبار ہوتے ہیں

امجد شاہین امجد ——— پنڈی بھٹیاں
کبھی پتھر کی لکیریں بھی مٹا کرتی ہیں
کتنے سادہ ہیں تیرا نام مٹانے والے

محمد انور کھوکھر ——— گولارچی سندھ
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں ڈھل نہیں سکتی

رانا محمد اشرف ——— لاڑکانہ
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

سید طارق علی شاہ بخاری، کھاریاں کینٹ
نگاہوں کے تصادم سے یہ کیسا انقلاب آیا
ادھر آنکھوں نے جرات کی ادھر رخ پر نقاب آیا

محمد الیاس خان اظہر وفائی ——— ننڈو محمد خان
شفا دیتا ہے زخموں کو تمہارا مرہمی ہونا
مگر جو دل پہ چلتے ہیں وہ آرے بھی تمہارے ہیں

محمد مظہر فریدی، محمد عاصم فریدی، حافظ روبانہ، فیصل آباد
اس کی یادوں کی جڑیں ہیں روح کے پاتال میں
جب بھی اس کو بھولنا چاہوں وہ یاد آنے لگے

ارشد نوید شانی ——— محمد ڈھکی
کچھ محفلوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کم تر جاتی

شان زہرا سابر ——— اقبال ٹاؤن لاہور
منور کون پیاسا اٹھ گیا اس صحنِ عالم سے
کہ جس کو ڈھونڈنے کے واسطے بادل چلے آئے ہیں

ظہیر احمد بدر ——— غریب وال جہلم
بس ایک تیرے بچھڑنے کی دیر تھی
سٹ کے آگیا لمحوں میں کرب صدیوں کا

ایم اکرم ساقی ——— گوجرانوالہ
سورج میں لگے دیتے فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں پھر کیا کفر کی برہمنی ہے

محمد شبیر احمد باجوہ ——— شیخوپورہ
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے پختہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

ڈاکٹر صابر علی حیدری ——— پنڈی بھٹیاں
نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ مقدر تھا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں

ماجد اکبر لاشاری، بلوچ، محراب والہ احمد پور شرقیہ
پچھلے برس تھا وعدہ تجھے کھو نہ دوں گا
اب کے برس دعا ہے ترا سامنا نہ ہو

افشین کامران ——— حیدر آباد، کراچی
اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی
تو سنگِ آستانِ کعبہ جگمگا جبینوں سے

حمید سائیں ——— ٹنڈو آدم
اس سے نہ ملوں میں تو مجھے چین نہ آئے
مجھ سے نہ ملے وہ تو اسے کچھ نہیں ہوتا

زہت اینق ——— کراچی
ہیں دلیلیں ترے خلاف مگر
سوچتا ہوں تری حمایت میں

اورنگ زیب بھٹی ——— مسقط عمان
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے کوئی
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

ڈاکٹر محمد عرفان، راجہ شوکت، گوجر خان
تم آؤ رنگ وصال شب کا نظر میں سارا گلال بھر لیں
پھر اس سے آگے تو شامِ غم ہے، طویل برسوں کا رتجگا ہے

ساجد عباس اعوان ——— حافظ آباد شٹی
چھلکتے اشکوں سے بجھی آنکھیں نہ چمکایا کرو
کانچ کے ٹکڑوں سے اپنا دل نہ بہلایا کرو

بلال طالب ——— اسکندر آباد
مجھڑا تو اک جہان تعلق اجڑ گیا
جس جس سے رابطے تھے اسی کے سبب سے تھے

صاحب زادہ احسان احمد زبیر ——— بہاولپور
تمہیں کس بات کا غم ہے وہ اتنا پوچھ لیں ہم سے
وہ اتنا پوچھ لیں ہم سے تو پھر کس بات کا غم ہے

ذوالفقار احمد اعوان ——— ایبٹ آباد
ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مرجائے گا

عبدالرحمن تارڑ ——— گوجرانوالہ چھاؤنی
تک بکے نہ تھے تو کوئی پوچھتا نہ تھا
خرید کر ہمیں انمول کردیا

ابوبکر صدیق ——— کراچی
ہاتھ اٹھائے ہیں اگر لب پہ دعا کوئی نہیں
کی عبادت بھی تو جس کی جزا کوئی نہیں

ابراہیم قمر ——— نوبہ نیک سنگھ
بگڑ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ابوالحکم ——— گھارو
خدا کرے کہ ترے حسن کو زوال نہ ہو
میں چاہتا ہوں تجھے یونہی عمر بھر دیکھوں

ابوذر ——— سیالکوٹ
لیکن شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
محض درد کی دولت کو عام کرتا ہے

ابوذر واثق پرویز ——— میرپور آزاد کشمیر
ہمارے خفتہ مقدر کو جاگنا تو ہے
بتا کیا ہے ترا انتظار اور سہی

جاوید اقبال اعوان ——— کمرانہ پیر غازی، گجرات
خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

محمد مظہر فریدی، محمد عاصم فریدی، حافظ روبانہ صدف، ٹوبہ ٹیک سنگھ
ہر دور میں کچھ اور ہیں سچائی کے معیار
یہ بات الگ، زہر کی تاثیر وہی ہے

عبدالقیوم ناصر ——— دلی پور بروڑا ایک ۱۷۵
غم کے سنجوگ اچھے لگتے ہیں
مستقل روگ اچھے لگتے ہیں

جہانگیر احمد راجپوت ——— ہوسٹری ٹاؤن
ایک خواہش ہے تجھے خود سے زیادہ چاہوں
میں رہوں یا نہ رہوں میری وفا رہ جائے

زاہد حسین احمد حسین، محمد اقبال، گارڈن ٹاؤن پمپ کراچی
بڑے خلوص سے مانگی تھی روشنی کی دعا
بڑھا کچھ اور اندھیرا چراغ جلنے سے

بشیر احمد قوتیر ——— الظفر بوطہیی
جاتی ہے کسی جھیل کی گہرائی کہاں تک
آنکھوں میں تری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن

ملک عبدالقدیر ناچ ——— بہاولپور
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

کشور ——— پیر بابا ضلع بونیر
فریاد کررہی ہے یہ ترسی ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

سید صداحسین کاظمی ——— فیصل آباد
وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھودیے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنھیں خاک چھان کر

شاراحمد راجپوت ——— واہ شہر
تونے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ

ارشد علی مغل ——— جمانیاں ضلع خانیوال
ہماری جان پہ دہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

کوپن محفلِ شعر و سخن
برائے شمارہ اپریل ۹۹ء

نام _____

پتہ _____

اقلیم علیم

ایک نوجوان کی خود نوشت جو اپنوں کے ہاتھوں برباد ہو کر منزل کا نشان کھو بیٹھا تھا۔ اُن نوجوانوں کی داستانِ عبرت جن کی پرورش رشوت کے مال سے ہوئی تھی۔ زر پرستوں کا احوال جنہیں سونے چاندی کی خیرہ کن چمک نے بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ موت کے اُن سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں زہر پلا رہے ہیں۔

سسپنس کا ایک تہہ در سلسلہ، مدہوشوں کو بیدار کرنے کی ایک عبرت کے لیے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

لاہور میں ہی جائے پیدائش ہے۔ اپنے والد صاحب کی وفات اور سوتیلی ماں کے مظالم پر میں نے گھر اور شہر چھوڑ کر کراچی میں پناہ لی تو یہاں جہانگیر، داؤد اور ثور سے دوستی ہوئی اور ہم چاروں بے روزگاری سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں منشیات فروشوں کی ایک بھیانک عالمی تنظیم شی کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان لوگوں نے ملٹی سمال ہیروئن کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لئے پاکستان میں چرس کا بحران پیدا کر کے ہیروئن کو فروغ دیا اور قدم جمانے کے بعد پاکستان کے خلاف ہر محاذ پر خفیہ کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ ان ہی دنوں سلطان شاہ مجھ سے آ ٹکرایا اور بعد میں میرا دستِ راست ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ ہی لائیڈ کی ملک دشمن سرگرمیوں نے مجھے شی سے بغاوت پر مجبور کر دیا اور شی نے بھی لائیڈ میرے لہو کا پیاسا بن گیا۔ میں نے ملک میں اور ملک سے باہر ان کی خفیہ اور دہشت گردی کی کارروائیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ میرا لگایا ہوا بم زخم ان کو استعمال میں اضافہ کرتا تھا مگر وہ میرا بال بھی بیکا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قومی سفارت کے اہم ترین منصوبوں کے تحفظ میں مجھے آئی خان نے بہت مدد فراہم کی۔ وہ بے پروا اور معصوم کے بھیس میں جاپانیوں کی ایک ایسی پراسرار فارمیشن کا سربراہ تھا جسے انٹیلی جنس کی دنیا میں ڈریگن فورس کہا جاتا تھا۔ شی لائیڈ کی بیٹی ویرا بھی ابتدائی دنوں کے بعد حلیف بن گئی۔ ویرا میری دوست تھی مگر غزالہ ایک مدت سے میری محبت تھی۔ حالات کی ستم ظریفی کہ ہم دونوں کو مکاؤ میں ڈون کو اغوا کرنے کی ایک خوفناک مہم پر مجبور ہونا پڑا۔ غزالہ شادی سے پہلے بھی بہت بھلے وقت میں حوصلہ مندی سے میرا ساتھ دیتی چلی آ رہی تھی۔ دوسری طرف امریکا میں راس ایلیزابتھ ایک سیاسی دہشت گرد اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر شی کے بے انداز دولت اور سائل پر قابض ہو کر انہیں ایوانِ اقتدار میں مخصوص تنظیم کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ صدارتی انتخابات میں گھرے ہوئے امریکی حکمراں کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مہم لائیڈ پراسرار انداز میں ہلاک کر دیا گیا اور راس ایلیزابتھ نئے صدر کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے پیداواری ذرائع پر قبضہ کرنے کا منصوبہ لے کر پاکستان پہنچ گیا۔ ساتھ ہی وہ پاکستان کی اہم شخصیات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے لگا۔ میں نے

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لگانے لگا کر اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوششوں میں ناکام رہا۔ رفتہ رفتہ وہ میرے حصار میں آتا چلا گیا اور آخر کار میں نے کشمیر روڈ کے ایک مکان میں اسے اپنا قیدی بنالیا۔ اس نے اپنے کی نشان دہی کرنے والا سا گاہی بردھاتی ہوا زخمی قیدی تھا۔ وہ ایک اصیل مگھن مقابلہ تھا۔ راس الیذا کو پکڑ کیا گیا مگر اس کا ساتھی جان دیرا کو اغوا کر کے لے گیا۔ اس نے دیرا کو مجھ سے فون پر بات کرنے پر مجبور کیا۔ وہ دیرا کی رہائی کے بدلے راس الیذا کی آزادی کا طلب گار تھا۔ اسی دوران میں مجھ کو کسی نہ سا کو اغوا کے لئے جانے میں کامیابی حاصل کرلی مگر وہ کشمیری کے عالم میں مرگیا۔ ہم جان کی پرواہ کئے بغیر راس الیذا کی آزادی کا طلب گار تھا۔ اسی دوران میں مجھ کو لوگوں نے سا کو اغوا کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ فون نمبر کے حوالے سے وہ پتا معلوم ہوگیا۔ ہم پوری احتیاط اور تیاریوں کے ساتھ اس تاریک اور ہلا پور میں مکان میں پہنچے تو گھر خالی تھا۔ اس کی مدد کے لئے دوسرا میرا ایک اور ساتھی آیا۔ میری دانست میں وہ بازارِ حسن میں پروان چڑھتے والا ایسا بے ضرر لڑکا تھا جو نادان عاشق میں مبتلا تھا۔ سی نے بتایا تھا کہ جن راس الیذا کا تو ہی ہوگا۔ اول خان اسے اپنے آدمی کے قابو کر شہر بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی جان کو خطرہ تھا۔ سی نے ہمارے اس کمین گاہ میں روپوش تھا۔ سی نے ہمارے کے بعد راس الیذا کا ساتھی مرنے سے بچ گیا۔ اسے ایک فون نمبر دے کر اپنی حالت کی خبر کرنے کو کہا تھا۔ اس فون پر بات کرنے والے گورے نے اسے اس خالی مکان کا رخ کرنے کی ہدایت کی تھی اس لیے وہ یہاں موجود تھا۔ سی نے جب یہ بھانپ لیا کہ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے تو اس نے اپنی جان بخشی کے عوض سا کا آخری پیغام ہمرا دیا تھا۔ اول خان نے اسے ایک ٹیلر ماسٹر سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب یہیں کام کا انتظار تھا۔ سی سے ملاقات کے لئے آتا تھا۔ جان آتا ہوا نے اسے پھانپ لیا۔ اس دوران میں یہیں پر انداز ہو گیا تھا کہ جان نے جس سفارت کار کے گھر پناہ لے رکھی ہے، اس کا کار کی اسی مکان سے علق ہے۔ جان کو بے بس کرنے کے بعد ہم نے اس سفارت کار کو مرکھ کے مکان میں بلوالیا۔ وہ ایک امین پند اور شریف آدمی تھا۔ دیرا کو اس کی رضامندی کے ساتھ اس شہر اور ہمارے حوالے کرنے پر تیار ہوگیا کہ جان کو چھوڑ دیا جائے۔ اس چوہدے کے بعد ہم کھرنج گئے۔ جان ہمارے بہترین نشانہ تو کہ سارے کا اور علی الدا کے پہلے ہی دم توڑ گیا جبکہ وہ سفارت کار ہماری وجہ سے دہل میں تھا۔ سی کے مرنے کے ہوئے الفاظ ٹیلر ماسٹر سے ایسے ذہن میں محفوظ رہے تھے۔ اول خان نے بتایا کہ راس الیذا امریکیوں کے لیے بہت اہم ہے۔ وہ ایسا کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرسکتے ہیں اس کا قصہ جلد پاک ہوجانا چاہیے۔ اول خان کے ساتھ ہم چار وں آدمی اس وقت سے بے خبر اپنے خوفناک عزائم کے ساتھ اسٹیشن فوری کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہاشمی چادر مٹھیال کے قصبہ میں خیال زور پکڑتا چلا گیا کہ راس الیذا کے جسم میں کوئی چپ سوار رہا ہو گا جس کی مدد سے اسٹیشن فوری کی نشاندہی کی جاسکتی تھی۔ اول خان نے اپنے دوست کمانڈر سعید سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ امریکن نیوی کے سمندل میں تکنیکی اندازہ لگانے پر واز کرنے والا ایک ہیلی کاپٹر لاپتا ہے جس میں چار افراد سوار تھے۔ اندازہ تھا کہ یہ راس الیذا کی ہائی جیکی کی مہم پر نکلا تھا۔ دیرا نے راس الیذا پر تشدد کرکے جب یہ اگلوا لیا کہ وہ ایک ہیلی کاپٹر لایا ہے تو اس نے بتایا کہ یہ ایک خوفناک دہشت گرد ہے اور اسے اغوا کرنے کا مقصد پاکستان کی اہم ایٹمی تنصیبات کی معلومات حاصل کرنا ہے۔ دیرا نے اسے ہائی جیک کرنے کا منصوبہ بتایا تھا۔ اول خان نے ہیلی کاپٹر کے ایندھن کے ٹینک کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اول خان کی جھاگ نما ذہانت کے سامنے راس الیذا کی ہائی جیکی کی مہم پر نکلا تھا۔ دیرا نے راس الیذا پر تشدد کرکے جب یہ اگلوا لیا کہ وہ ایک ہیلی کاپٹر لایا ہے تو اس نے بتایا کہ یہ ایک خوفناک دہشت گرد ہے اور اسے اغوا کرنے کا مقصد پاکستان کی اہم ایٹمی تنصیبات کی معلومات حاصل کرنا ہے۔ دیرا نے اس کے ہائی جیک کرنے کے

نکالیا۔ اول خان نے سنسنی سے ریوالور جھٹکا تو وہ شرمندہ ہو کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اسی وقت فون پر جمالگیر نے اطلاع دی کہ اس کی دکان کے باہر وہ بدمعاش موجود ہیں۔ اول خان اور سلطان شاہ کو گھونل کی تلاش میں جیور ناوہ روانہ کر کے میں ایس پی ایف کے تھوی کے ساتھ جمالگیر کی مدد کو پہنچ گیا۔ ان میں سے ایک بدمعاش کالو مکرانی کمی نانے میں جمالگیر کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب وہ جمالگیر کے ذریعے میرا کھوج لگا کر انعام کی بھاری رقم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں بدمعاشوں کو انٹیشن فورٹ لے آئے جہاں ان پر تشدد کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ میرے قتل پر ہونے والی فائرنگ میں وہ لوگ بھی کرائے کے بدمعاش کے طور پر موجود تھے۔ گھونل راجوانی ایک بار پھر اول خان کو چکما دے کر نکل گیا۔ اس نے اسلام آباد پہنچتے ہی بنگلہ گھڑا کیا۔ بالآخر ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں اس کیس کو دبانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اول خان نے اس صورت حال سے مایوس ہو کر میرے مشورے پر اپنے اسلام آباد کے تعاون کی کسی بھی صورت گھونل پر ہاتھ ڈالنے کی ہدایت کردی۔ اول خان کے مشورے پر میں سلطان شاہ کے ساتھ اسلام آباد چلا گیا۔ یہاں کا سب منصوبہ بندی کے ذریعے ہم نے گھونل کو اس کے بہت پناہ چوری سلام کے گھر سے اغوا کے آزاد قائی علاقے میں پہنچایا۔ گھونل کے سلسلے میں اچانک حالات ہمارے موافق ہوگئے۔ کالو مکرانی کے بیان نے اسے مشکوک بنا دیا تھا۔ قانون کے ذریعے اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اس کی واپسی کا فیصلہ کیا گیا۔ گھونل کا پشت پناہ چوہدری سلام ہمیں کے کاروبار میں ملوث تھا جس کے نتیجے میں ہماری توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ اسی دوران میں اول خان نے کراچی سے فون کر کے بتایا کہ کالو مکرانی کو ناممکوم حملہ آوروں نے گولیاں مار دیں۔

اب آپ، زیر واقعات ملاحظہ کیجیے

کالو مکرانی، گھونل کے خلاف ہمارا اکلوتا اور مضبوط گواہ تھا۔ ایس ٹی ایف والے اس بار سوخ مجرم کو قانون اور انصاف کے تقاضوں سے ماورا کوئی سزا دینے کے لیے تیار نہیں تھے جب کہ گھونل کو کسی بھی عدالت سے سزا یاب کرانے کے لیے اس کے خلاف گواہوں کی موجودگی ضروری تھی۔

اول خان کی زبان سے کالو مکرانی پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی خبر سن کر چند ثانیوں کے لیے میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھونل اپنے ہونٹوں پر زہر میں بجھی ہوئی ایک طنزیہ مسکراہٹ لیے، دور کھڑا انگوٹھا دکھا رہا ہو۔

"اسے ہلاک کرنے والے کون لوگ تھے؟" ابتدائی ذہنی جھٹکے سے سنبھل کر میں نے پوچھا۔

"وہ مرا نہیں، بری طرح زخمی ہوا ہے۔" اول خان نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس پر فائرنگ کا ذکر کیا تھا۔ ایک گولی اس کی گردن میں لگی ہے۔ دوسری بازو میں پیوست ہوئی ہے۔ دو موٹر سائیکلوں پر سوار حملہ آور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔"

"اس کی حالت تشویش ناک تو نہیں ہے؟" میں نے متفکرانہ لہجے میں پوچھا۔

"ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی سرتوڑ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔" اول خان کی آواز گمبھیر تھی۔ "گردن میں لگنے والی گولی ریڑھ کی ہڈی تک پہنچنے والے اعصاب کو بس چھوتی ہوئی گزری ہے۔ ان اعصاب اور عضلات کو ذرا بھی زیادہ نقصان پہنچتا تو وہ گولی لگتے ہی ہلاک ہو سکتا تھا۔"

وہ تفصیل خاصی تسلی بخش تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اول خان کے آخری فقرے بہت امید افزا تھے۔

"کالو مکرانی کو پولیس سے سی آئی اے کی تحویل میں منتقل کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟" قیدی کی زندگی کی امید پیدا ہوتے ہی میرے ذہن میں دوسرے نکات سر ابھارنے لگے۔

"کالو مکرانی کی جان کی حفاظت کے لیے یہ ہدایت براہ راست آئی جی نے جاری کی تھی۔"

وہ ابتدا سے ہی خود کو گھونل کا خیر خواہ ثابت کرتا چلا آرہا ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کالو مکرانی کو راستے سے ہٹانے کی سازش میں وہ بھی شریک تھا۔"

"میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ اس سے بھی ذرا بڑھ کر میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آئی جی نے اس کو ایک ہدایت براہ راست میرے ایس ایچ او کے چنگل سے نکالا ہے۔ کیپٹن تفتیش سی آئی اے کو منتقل ہوتے ہی تفتیشی افسر بھی بدل گیا۔" اول خان بولا۔

"یہ بہت دور کی بات ہوتی۔ پہلی اور بنیادی کوشش کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اسے لاک اپ سے نکال کر کھلی فضا میں لایا گیا جہاں پہلے سے موجود حملہ آوروں نے گھات لگا کر اس پر گولیاں برسا دیں۔ اسے اچانک اور مہلک حملے میں اس کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔"

"واقعات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ اب کوئی بھی ان سے چشم پوشی کر کے سارا الزام اپنے سر لینے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس خوشامدی آئی جی نے اپنے کسی اعلیٰ افسر کو خوش کرنے کے لیے معمول کے مطابق اس کے ٹیلی فون کے مطابق عمل کیا ہوگا۔ یہ اندر کی کہانی ہو سکتی ہے۔ کاغذوں پر اس واقعے کی پوری ذمے داری آئی جی پر ہے۔"

"پھر اس کے خلاف کیا کارروائی ہوئی؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال اس کا ہیڈ کوارٹرز میں تبادلہ کر دیا گیا ہے۔" اول خان کی آواز دھیمی تھی۔

"صرف تبادلہ؟" میں حیرت اور غصے کے عالم میں تقریباً چیخ پڑا۔ "ایک بڑے مجرم کے ساتھ سازش میں شرکت کے ثبوت کے بعد محض تبادلہ کرنا تو ایک مذاق ہے۔"

"بڑے عہدوں پر فائز بیوروکریٹس کو آج تک اس سے بڑی سزا نہیں دی جا سکتی۔" اول خان نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "آپس کی پیشہ ورانہ رقابتوں کے باوجود سرکاری افسروں کی برادری کسی مافیا کی طرح منظم اور مربوط ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پورے حقائق سامنے آنے کے بعد اسے معطل کر کے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی جائے۔ ابھی یہی کافی ہے کہ وہ صوبے میں اپنے اقتدار اور اختیار سے محروم ہو کر ایک بند دفتر میں جا بیٹھا ہے۔"

"پولیس بڑے مجرموں اور قوم کا سارا مال ہڑپ کر جانے والے مگرمچھوں پر اوپر والوں کی اجازت کے بغیر ہاتھ نہیں ڈال سکتی، عدالتیں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے قاتلوں کو سرے روز پھانسی کی سزا نہیں سنا سکتیں، زور دولت کے ان کی نوازیوں اور مفاد پرستیوں پر سزا نہیں دی جا سکتی تو پھر ہم کس دیواروں سے اپنے سر ٹکرا رہے ہیں؟" میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"یہ چھوٹی بڑی مچھلیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو فرسودہ ہو جانے کے باوجود ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر ساری گراریاں خراب ٹھریکسان ہو چکی ہیں۔ ان میں کہیں بھی صرف ایک نئی گراری ڈال دی گئی تو شور کے ساتھ ہی سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ پورا سسٹم بیٹھ جائے گا۔ تم ان چکروں میں مت پڑو۔"

"حیرت ہے، تم مجھے ان جیسا بن جانے کا مشورہ دے رہے ہو۔" میری بات ادھوری رہ گئی۔

"سسٹم میں وہی کچھ برقرار رہتا ہے جو اس سے مطابقت رکھتا ہو۔" اول خان میری بات کاٹ کر بولا پڑا۔ "باقی سب کچھ اس چکی میں پس کر بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔"

"اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر ایس ٹی ایف کے وجود کا جواز کہاں تلاش کروں گا۔"

"اسپیشل سیکیورٹی فورس محض اس لیے زندہ اور فعال ہے کہ یہ سسٹم میں شامل نہیں ہے۔ اس سے باہر رہ کر کام کرتی ہے۔ اپنے فیصلوں کے لیے پوری طرح خود مختار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا سربراہ بھی سلطنت کے کسی ایک ذمے دار کو جواب دہ ہوگا۔"

"کیا اس سسٹم کو ایس ٹی ایف کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا؟" میں نے پوچھا۔

وہ تلخی سے ہنس پڑا۔ "اس سے ملوکیت بلکہ آمریت کی بُو آتی ہے جو مغربی دنیا کو ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ وہ صرف جمہوری معاشروں کی پشت پناہی کرتی ہیں۔"

"تاکہ ان کو اپنی سازشوں کے لیے آسانی سے تیار ایندھن اور مواد ملتا رہے؟"

"ان باریکیوں کو تم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے! میں تو ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔"

"مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے دشمنوں سے کہیں بڑھ کر ہمارے اپنے دشمن ہیں۔ ہر ایک حسب توفیق ہماری کوششوں کو سبوتاژ کرنے میں لگا ہوا ہے۔"

"ڈینی! تم یقین کرو کہ تم خوش نصیب ہو۔" اس نے مجھے دلاسا دیا۔ "موجودہ حالات میں تم نے جتنی تیزی سے اور جو کچھ نتائج حاصل کیے ہیں، وہ حیران کن ہیں۔"

"کالو مکرانی زخمی ہو کر اسپتال پہنچا ہوا ہے۔ اب ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا؟"

"گھونل کو آزاد علاقے سے واپس لا کر قانون کی تحویل میں دینا ہمارا پہلا ٹارگٹ ہے۔" اس کا لہجہ پُرعزم تھا۔ "کالو مکرانی کا بیان ریکارڈ پر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور عدالت میں کھل کر اپنے بیان کی توثیق کرے گا۔"

"میں حیران ہوں کہ گھونل کے معاملے میں تم قانون کی دُم سے کیوں لٹکے ہوئے ہو؟" میں نے جھلا کر کہا۔ "اس سے پہلے ہم کئی مجرموں کو جہنم واصل کر چکے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ کلفٹن پر ہمارے فلیٹ پر شب خون مارنے

دل دل پاکستان

ملکہ کوہسار مری اور ملک کے جنت نظیر شمالی علاقہ جات کی سیر کے پروگرام مارچ تا ستمبر ۹۹ء

تفصیلات کے لیے ۵۰ روپے کا منی آرڈر یا پوسٹل سرٹیفکیٹ بھیجیں۔ جہلم سے شازیہ محمود اور سکھر کے طارق مکمل پتہ بھیجیں اور دیگر شائقین بھی خیال رکھیں کہ نام پتہ مکمل تحریر کرنا ہے۔

صدر انٹرنیشنل ٹورسٹ کلب ۸۲۵/آر سیکٹر ۹ نارتھ کراچی _____ کراچی ۷۵۸۵۰

فون نمبر _____ ۶۳۵۹۶۱

والوں میں سے دو کو ہم نے ٹھکانے لگایا' چار کو تمہارے آدمیوں نے مارا تھا۔"

"وہ مسلح تھے اور گولیاں برسا رہے تھے۔۔۔" اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کی بات اڑا دی۔ "ہم نے نہتے مگر خطرناک غداروں کو بھی مارا ہے!"

"میں مانتا ہوں' تم سے بحث نہیں کر رہا۔" اپنے لہجے سے وہ معذرت خواہ محسوس ہو رہا تھا۔ "کھٹول کے بارے میں اوپر سے کچھ ہدایت ہے۔ یہ حساس سیاسی معاملہ بن سکتا ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کھٹول پورے ملک میں اور خاص طور پر سندھ میں ایک مقبول اقلیتی لیڈر ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ایک افواہ سے بھی ہو رہا ہے۔"

"وہ افواہ کیا ہے؟" اس کی بات سن کر میں غیر ارادی طور پر سوال کر بیٹھا۔

"سنا ہے کہ کھٹول کے خلاف کالو کرانی کے بیان کے اجرا اور پھر اس کے اغوا کو امریکی حکومت نے انتقامی کارروائی قرار دیتے ہوئے پاکستان سے احتجاج کیا ہے۔"

"یہ ہمارا انتقامی اور اندرونی معاملہ ہے۔ امریکا اسے انتقامی کارروائی کیسے قرار دے سکتا ہے؟"

"میں اس افواہ کی تصدیق کی کوششوں میں لگا ہوا ہوں۔ وزارت خارجہ کے پٹارے سے خبریں ذرا مشکل سے ہی نکلتی ہیں۔ اگر یہ افواہ سچ ثابت ہوئی تو کل کلاں کو انسانی حقوق اور انفرادی آزادیوں کے حوالے سے بھی کسی مہم کا آغاز ہو سکتا ہے۔"

"انہوں نے یقینی طور پر یہی کہا ہوگا کہ کھٹول نے اپنی ایف آئی آر میں ڈینی کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس رپورٹ کے نتیجے میں ڈینی کی تلاش کی مہم کو تقویت ملی ہے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے اب پاکستان میں کھٹول کو زیادتیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس وقت کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن گمان یہی ہوتا ہے۔ کل پیش آنے والے تمام واقعات آج کے اخبارات میں رپورٹ ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ امریکیوں کو کل ہی پتا چل گیا تھا کہ کھٹول کے گرد گھیرا تنگ ہو چکا ہے۔"

"اب بات سمجھ میں آئی۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "کسی کو پہلے ہی شبہ ہو چکا ہے کہ کھٹول کو مارا گیا تو اسے امریکی انتقامی قتل قرار دے کر شدید احتجاج کریں گے۔"

"احتجاج سے بات آگے بڑھ گئی ہے۔ کھٹول کے آدمی از خود کالو کرانی پر ناکام قاتلانہ حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ گہری سازش اونچے پیمانے پر تیار کی گئی ہے۔ اس میں اہم ترین کردار آئی جی کا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ناوا لسنگی میں سازشی عناصر کا آلۂ کار بنا ہو۔ اس بات کا تعین بعد میں ہوتا رہے گا۔ سارا کھیل اس کے حکم نامے کے بعد شروع ہوا۔"

"تمہارا نکتہ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ میری تلاش کے سلسلے میں امریکی سراغرساں پہلے ہی کراچی آئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب انہوں نے اپنی توجہ کھٹول کی طرف مبذول کر دی ہو۔"

"یہ امکان میرے ذہن میں آ چکا ہے۔" اول خان نے میری تائید کی۔

"بس' اب کالو کرانی کی حفاظت کرتے رہو۔ اسپتال میں اس پر دوبارہ کوئی قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے۔ یہ امریکی جس کے پیچھے لگ جاتے ہیں' اسے پاتال میں بھی زندہ نہیں چھوڑتے۔"

اول خان سے وہ طویل گفتگو ختم ہوئی تو سلطان شاہ بول پڑا۔ "یہ بتاؤ کہ ہماری دیسی سی آئی اے اور امریکی سی آئی اے کی کارکردگی میں اتنا فرق کیوں ہے؟"

"ان ناموں پر نہ جاؤ۔ دونوں کے ڈھانچے یکساں ہیں۔" میں نے سگریٹ سلگا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ اٹک گیا۔

"انہوں نے دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچایا ہوا ہے' ہمارے والے نکے نکے کے اچکوں کو مار مار کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ آخر یہ کب ان کی سطح تک پہنچیں گے؟"

میں نے غصے اور بے بسی سے اسے گھورا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا۔ "تم ملک سے باہر کی ہوا لگا کر فر فر انگریزی ضرور بولنے لگے ہو لیکن تمہاری معلومات صفر سے کچھ ہی زیادہ ہیں۔"

"کیا میرے سوال کا معلومات سے بھی کوئی تعلق ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"امریکا میں یہ ادارہ سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کہلاتا ہے اور وفاق کے تحت کام کرتا ہے۔ ہمارا ادارہ کریمنل انویسٹی گیشن ایجنسی ہے۔ یہ صوبائی سطح پر صرف جرائم کی تفتیش تک محدود رہتا ہے۔ اس سے باہر کے معاملات دوسرے ادارے سنبھالتے ہیں۔"

"حد ہو گئی۔" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ "میں

ہر بار ہی یہ موازنہ کر کے کڑھتا رہتا تھا۔"

"بے خبری اس قسم کے احساسِ کمتری کا سبب بنی رہتی ہے۔ کچھ پڑھتے پڑھاتے بھی رہا کرو۔"

"مار دھاڑ سے فرصت ملے تو پڑھنے کا دھیان بھی آئے۔ جب ہر طرف سکھ چین کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں تو تم خود کوئی مسئلہ تلاش کر لیتے ہو۔۔۔"

"شاید کھٹول کے غنڈوں کو میں نے فلیٹ پر مدعو کیا تھا؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ آئے تھے' چھ آدمی گنوا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ فلیٹ تم ہو گیا مگر کھٹول تمہارے دماغ پر اس بری طرح سوار تھا کہ تم نے کالو کرانی کو پکڑ لیا۔"

"اسے میں نے نہیں پکڑا' جہانگیر نے پکڑوایا تھا۔ اس کے ناکام عشق کا نتیجہ میرے کھاتے میں مت ڈالو۔" میں نے اسے یاد دہانی کرائی۔

"اول خان سے تم پیر روکھی اور افواہوں کے بارے میں کیا باتیں کر رہے تھے؟" اس نے متجسس لہجے میں اچانک ہی موضوع بدل دیا۔

ٹیلی فون پر ساری گفتگو اس کی اور اکبر رانا کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ ان دونوں کو وہ تفصیل جاننے کا پورا حق حاصل تھا۔ میں نے انہیں کراچی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

"کھٹول کا مذہب جو بھی ہو' اس کی شہرت پاکستانی ہے۔ وہ ایک پاکستانی ہو کر تمہارا بدترین دشمن ثابت ہو رہا ہے جب کہ جینی امریکی لڑکی ہے۔ وہ تمہارا ایسا دم بھرتی ہے کہ اس نے تمہارا غلط خاکہ بنوا کر کھٹول کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔" سلطان شاہ بولا۔

"گاؤں' شہر' قبیلے اور ملک باہمی پہچان کے لیے ہوتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں ان کی مخالفت نہیں ہے مگر اس بنیاد پر کسی کو کسی پر افضل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم سب انسان ہیں۔ ہر جگہ اچھے اور برے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کھٹول ایک بدترین اور غدار پاکستانی ہے جب کہ جینی ایک مہربان اور نرم دل امریکی لڑکی ہے۔" میں نے

فلسطین کی جنگِ آزادی میں شامل ایک پاکستانی جاں باز کی ناقابلِ فراموش جدوجہد
جب آنکھیں آبِ نم پوش ہوئیں ..... جب خونِ جگر برفاب ہوا
جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی
علی یار خان کی سرگزشت
مجاہد
کتابی صورت (گیارہ حصوں میں مکمل) میں تیار ہے
قیمت فی حصہ -/50 روپے ..... ڈاک خرچ -/16 روپے
گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف /450 روپے
رعایت حاصل کرنے کے لئے پوری رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23
رمضان چیمبرز۔ بلیو ریا اسٹریٹ (نزد دفتر اخبار جنگ) آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ 74200

جواب دیا۔

"تم اعتراف جرم کر رہے ہو۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "ویرا کو یہی شکوہ ہے کہ جینی ایس کی دوست ہونے کے باوجود تم پر ضرورت سے زیادہ مہربان تھی۔"

"تم نرے الو ہو۔ میں نے مہربان ہونے کا تذکرہ کسی ذو معنی مفہوم میں نہیں کیا تھا۔"

"یہ تم جانو۔ ایک جوان، خوبرو اور آزاد خیال عورت کے مہربان ہونے کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے۔ ویرا اس سے واقف ہے۔ ہو سکے تو تم اسے دوسرے معنی سمجھا دینا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں آپس میں اتنے بے تکلف ہو۔" اکبر رانا نے ہم دونوں کے درمیان ہونے والی وہ گفتگو سن کر خوشگوار لہجے میں کہا۔ "کام کے وقت ڈسپلن اور فاضل اوقات میں مکمل مساوات ایس ٹی ایف کا بنیادی اصول ہے۔ اسی طرح افسروں اور ماتحتوں کے درمیان حیرت انگیز مفاہمت پیدا ہوتی ہے جس کے نتائج کارکردگی پر اچھا اثر ڈالتے ہیں۔"

"تم نے گجرات میں چوہدری سلام کی سرگرمیوں کی خبر سنادی، کراچی میں کالو کے زخمی ہونے کی خبر سنا لی۔ اب یہ بتاؤ کہ کھٹول کب آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کی واپسی کا پیغام دیا جا چکا ہے۔ تم ناشتا کر لو پھر ہمیں پیرودھائی کی طرف جانا ہوگا۔"

"افغان مہاجروں کے امدادی کیمپ میں؟" سلطان شاہ نے چونک کر سوال کیا۔

"آدم خان وہیں ملتا ہے۔ اس سے تازہ ترین پوزیشن معلوم ہو سکے گی۔"

"کیا اس کیمپ میں فون نہیں ہے؟" سلطان شاہ کے پاس اگلا سوال تیار تھا۔

"ان لوگوں کو وسیع رینج میں کام کرنے والے مفت کے لاسلکی آلات میسر ہیں تو وہ فون کے بکھیڑوں میں کیوں پڑیں؟ ان کے بیشتر مفادات آج بھی افغانستان کی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ وہاں سے مسلسل رابطے کے لیے طاقتور وائرلیس سیٹ مؤثر رہتے ہیں۔"

"جب سے یہ عقدہ کھلا ہے کہ پاکستان میں ہیروئن اور ہتھیاروں کی بھرمار افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد شروع ہوئی ہے، مجھے مظلوم اور بے بس افغانوں سے بھی خوف آنے لگا ہے۔ یہ تباہ کن لعنتیں ہم پر مسلط کرنے والے کوئی بھی رہے ہوں، افغان اپنی مجبوریوں کی وجہ سے آلۂ کار بنے ہیں۔" سلطان شاہ نے بے لاگ انداز میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"پیرودھائی جانے سے ڈر رہے ہو تو تمہارے ساتھ جبر نہیں کیا جائے گا۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں وہ سنگین موضوع ٹال دیا۔ "ہم دونوں آدم خان سے مل لیں گے۔"

"تم میری بات کو منفی رنگ دینے کی کوشش..." سلطان شاہ نے احتجاج کرنے کی کوشش کی مگر میں نے درمیان سے ہی اس کی بات اڑا دی۔

"اس موضوع پر اب تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گے۔ ہم اس بحث میں الجھ گئے تو دوسری اہم تر باتوں کو بھول بیٹھیں گے۔"

ناشتے کے دوران میں اکبر رانا باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کراچی سے نکلنے والے روزنامے کا بھی مطالعہ کرتا رہا پھر اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے بولا۔ "یہ اخبار واقعی منفرد اور مختلف ہے۔ اس میں صرف خبریں ہیں، چٹخارے دار مال مسالا نہیں ہے۔"

مختصر سے وقفے میں حاصل ہونے والی معلومات کو جس طرح یکجا کر کے کھٹول کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا تھا، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ نامہ نگار کی اپنی قلمی محنت کے پیچھے کوئی باخبر ذہن بھی کارفرما تھا جس نے کڑیاں ملا کر کہانی مکمل کی تھی۔

اسلام آباد کی کشادہ شاہراہ پر میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے اکبر رانا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "اول خان کی مدد کے بغیر اتنی سرعت سے یہ خبریں نہیں بن سکتی تھیں۔ وہ کراچی میں بیٹھ کر بھی پوری طرح ہماری مدد کر رہا ہے۔"

"کھٹول کے خلاف الزامات کی فہرست آ چکی ہے۔ اگر کل امریکا کے کسی احتجاج کی تصدیق ہو جاتی ہے تو ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ امریکا کو ایک پاکستانی ملزم سے کیوں ہمدردی ہو رہی ہے۔ میرے خلاف ان کے اشتہاری مواد کی صحت پر بھی شبہ کیا جائے گا۔"

"عام لوگ اپنے رہن سہن میں امریکیوں کی لاشعوری یا دانستہ نقالی کے باوجود اس سے نالاں نظر آتے ہیں۔ یوں رائے عامہ مزید ہموار ہوگی۔" کمانڈر اکبر رانا نے جواب میں کہا۔

میں بے اختیار ہنس دیا۔ "امریکا صرف ان ہی خطوں میں رائے عامہ کا احترام کرتا ہے جہاں وہ اس کے حق میں ہوتی ہے۔ مخالفانہ رائے عامہ کو وہ بے رحمی سے مسترد کر کے حکمرانوں سے جوڑ توڑ کرنا شروع کر دیتا ہے۔"

"غنیمت ہے کہ ابھی تک یہاں ایسے کسی جوڑ توڑ کا

وقار پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

آغاز نہیں ہوا ہے۔" اس نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اندرون خانہ جنم لینے والی کہانیوں سے ہم لوگ بے خبر رہتے ہیں۔ تم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔"

"معاشرے کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے کرپشن کے ناسور کے باوجود یہاں قومی حمیت باقی ہے۔ اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ امریکا تمہارے معاملے میں بے بسی کا شکار ہے اور تم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اخباری اشتہاروں سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔"

"دوسری صورت میں ان کا کوئی بھی نمک خوار میری گردن ان کے ہاتھوں میں دے سکتا تھا۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسلام آباد کی خوبصورت اور پُرسکون شاہراہ پر ایک طویل سفر طے کر کے ہم پیرودھائی سے ذرا پہلے واقع افغان مہاجرین کے امدادی کیمپ میں پہنچ گئے۔

وہ پراسرار سا دفتر بظاہر ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھا جہاں دو میزوں اور تین افراد کے سوا کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا البتہ وہ چھوٹا سا دفتر عقبی دروازے کے ذریعے کسی اور کمرے سے بھی منسلک تھا۔ اس دروازے سے جنگجو... نظر آنے والے مسلح افراد کی آمدورفت جاری تھی۔ وہ لوگ دفتر کے دو نفری عملے سے رسمی علیک سلیک کرتے ہوئے یوں گزر رہے تھے جیسے ان سے کوئی رسمی سا تعلق ہو۔

دفتر میں بیٹھا ہوا معمر شخص کمانڈر اکبر رانا کو پہچانتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنی میز کے پیچھے سے نکل کر باہر آیا اور گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کا دیکھا دیکھی دوسرے شخص کو بھی کرسی سے اٹھنا پڑا۔ اس کی نظروں میں استعجابیہ اجنبیت رچی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔

معانقے سے فارغ ہو کر اکبر رانا نے میرا اور معمر افغان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے ساتھی کرنل جمال دستی ہیں اور یہ آدم خان کے خصوصی نائب ملابدر ہیں۔"

ملابدر اپنی عمر کے باوجود پُرجوش اور مخلص شخص نظر آ رہا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر وہ اسے نظرانداز کر کے مجھ سے لپٹ گیا۔ میری پسلیوں کے گرد اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ چند ثانیوں کے لیے مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں چند خیرمقدمی اور تہنیتی کلمات ادا کرنے کے بعد ملابدر نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

اپنی کرسی پر واپس جاتے ہوئے اس نے پشتو میں اپنے ساتھی کو جلدی جلدی ہدایات دیں۔ اس گفتگو میں دو بار استعمال ہونے والا صرف "ٹرانسمیٹر" کا لفظ ہی میرے پلے پڑ سکا۔ وہ ملابدر کی بات سن کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر کھلنے والے دروازے میں غائب ہو گیا۔

ہم دونوں کو دفتر میں پڑے ہوئے گندے اور فرسودہ صوفوں پر بٹھانے کے بعد ملابدر نے پشتو میں اکبر رانا کو کچھ بتانا شروع کر دیا۔ اکبر رانا خاموشی سے تفہیمی انداز میں سر ہلاتا رہا۔

وہ خاموش ہوا تو اکبر رانا نے کہا۔ "کرنل صاحب پشتو نہیں جانتے۔ ان کے سامنے ہم اردو میں بات کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

ملابدر دھیمے سے ہنسا۔ "خو، تم جانتی... ام کا اردو....."

"کوئی فکر مت کرو۔ اردو کسی بھی لب و لہجے میں بولی جائے، سمجھنے والے مفہوم سمجھ جاتے ہیں۔" اکبر رانا نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

اکبر رانا کی وہ بات خاصی بے وزن تھی۔ لب و لہجہ اور صحیح تلفظ ہی تو زبان کی جان ہوتا ہے۔ میں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں انگریزی جیسی بین الاقوامی زبان کی ایسی درگت بنتی دیکھی تھی کہ کسی انگریز کے سامنے کوئی فرنچ، جرمن یا اطالوی انگریزی بولنے کی کوشش کر رہا ہے اور انگریز حیرت سے دیدے پھاڑے یوں اس کا منہ تک رہا ہے جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی اجنبی زبان بول رہا ہو۔

انگریزی میں باہمی افہام و تفہیم کے اس عذاب سے گزرنے کے لیے بہتیرے انگریز یورپ کی دوسری زبانیں بھی جانتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر اپنی اس مہارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذہن پر زور ڈالنے کی ساری ذمے داری فریق ثانی پر ڈال دیتے ہیں۔

کسی جرمن کی غوں غاں میں ڈوبی ہوئی ہولناک انگریزی کو سمجھنے سے زیادہ آسان یہ ہوتا ہے کہ انگریز خود جرمن زبان بول کر اپنے مخاطب کو امتحان میں ڈال دیں۔ اس سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جرمنوں کے من میں سوئے ہوئے فوق البشر کی انا کو تسکین ملتی ہے، دوم یہ کہ ٹوٹی پھوٹی جرمن زبان میں کہے ہوئے فقروں سے مفہوم اخذ کرنے کی ساری ذمے داری خود ان کے سر آ جاتی ہے۔

مگر میں مجبور تھا۔ پشتو سے یکسر نابلد ہونے کی وجہ سے اپنا بوجھ ملابدر پر منتقل نہیں کر سکتا تھا۔

"وہ آج دوپہر کے بعد کسی بھی وقت پنڈی پہنچ جائے

گا۔" ملا بدر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں تذکرہ تانیث میں کوئی ناروا فرق روا رکھے بغیر کہا۔ "میرا آدمی اندر ٹرانسمیٹر پر بات کرنے گیا ہے۔ وہ زخاخیل کیمپ والوں سے بات کرکے صحیح پوزیشن بتا سکے گا۔"

"قیدی کس حال میں ہے؟" میں نے پہلی بار ملا بدر سے براہِ راست سوال کیا۔

"الحمدللہ، بہت اچھا ہے۔ بس اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ اسے بہت تنگ کر رہا ہے۔ زخاخیل کے بڑے حکیم نے اس کا پلاسٹر اتار کر دیسی جڑی بوٹیوں اور پہاڑی سلاجیت کا لیپ چڑھا دیا ہے، دو چار دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ملا بدر نے آگاہ کیا۔

"زخاخیل والوں سے تمہاری بات کب ہوئی تھی؟" اکبر رانا نے پوچھا۔

"قیدی کے پہنچنے کے بعد انہوں نے خود رابطہ کیا تھا یا پھر تمہارا پیغام ملنے کے بعد میں نے ان سے بات کی تھی کہ وہ مہمان قیدی کو کہیں ڈال کر پولیٹیکل ایجنٹ کو مخبری کرا دیں۔"

ہم وہیں بیٹھے ملا بدر سے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں اندرونی دروازے سے ہر عمر کے بارہ تیرہ اور لحیم شحیم مردوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں سے بیشتر کے شانوں پر ہلکے اونی کمبل یا چادریں پڑی ہوئی تھیں جو ہتھیاروں کو چھپانے سے کہیں بڑھ کر نمایاں کر رہی تھیں۔ ان ہی میں سے کسی نے تام چینی کی کیتلی میں کھولتا ہوا قہوہ پیالیوں سمیت لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔

افغان مہاجرین کے لیے قائم کیا ہوا وہ امدادی کیمپ راولپنڈی اور اسلام آباد کے سنگم پر ایک مختصر سے قبائلی خطے کا سماں پیش کر رہا تھا جہاں ہر سو بے تکلفی اور بے فکری کا راج نظر آ رہا تھا۔

"اندر سے کون لوگ آ جا رہے ہیں؟" گرم قہوے کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد میں وہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"یہ سب روسیوں کے ستائے ہوئے مظلوم مہاجرین ہیں۔" ملا بدر نے دکھی آواز میں بتایا۔ "ان کی فصلیں ٹینکوں نے روند ڈالیں یا بموں نے جلا ڈالیں۔ توپوں نے گھر مسمار کر دیے۔ ہر سینے میں اپنے کئی کئی پیاروں کے لہو کے داغ پوشیدہ ہیں اور یہ یہاں فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"فاقہ کشی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھے ان میں سے کسی کے چہرے پر فاقہ کشی کی کوئی علامت نہیں دکھائی دی۔"

"پہاڑوں کی گود میں پلنے والے، ہم لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ سردی اور برف باری میں موسم کے تیور بگڑ جائیں تو عام حالات میں بھی ایک روز کا راشن چار چار روز چلا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے کیمپوں میں بس دو تین وقت کا فاقہ ہوتا ہے پھر کہیں نہ کہیں سے رسد آ ہی جاتی ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ مغربی دنیا دل کھول کر افغان مجاہدوں کی مدد کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ شروع کی بات ہے، اتنی امداد مل رہی تھی کہ ہم سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ فالتو سامان پشاور کی منڈی میں کوڑیوں کے دام پھینک دیا جاتا تھا۔" ملا بدر کی آواز بتدریج مغموم ہوتی جا رہی تھی۔ "ہم نے بچے ہوئے روسیوں سے چھینے ہوئے ہتھیار تک بیچے ہیں مگر اب وقت بدل چکا ہے۔"

"وقت وہی ہے۔ پہلے تم روسیوں سے لڑ رہے تھے، اب ان کے ایجنٹوں سے لڑ رہے ہو۔"

"ایجنٹ ہم جیسا ہوتا ہے۔ اسے پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب تک ببرک کارمل کا سفید ریچھ میدان میں تھا، ہم اس کے خلاف یکجا تھے۔ اسے مار بھگانے کے بعد ہم سب پورے صدقِ دل سے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہر حریف خود کو حق بجانب اور مخالف کو گمراہ قرار دے رہا ہے۔"

"یہ مہاجرین صرف اپنے ہتھیار ہی بیچ دیں تو نہ صرف اپنی فاقہ کشی دور کر سکتے ہیں بلکہ اپنے گھروں کو بھی دوبارہ آباد کر سکتے ہیں۔" میں نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہتھیار پٹھان کا زیور ہوتا ہے۔ خالی پیٹ کوئی نہیں ٹٹولتا، ہتھیار سے خالی شانے کو ہر ایک حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔" ملا بدر کہنے لگا۔ "یہ خود بھی اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے ہیں، بہت سے آبائی زمینوں پر جا کر دوبارہ واپس آئے ہیں کیونکہ وہاں سب کچھ برباد ہو چکا ہے۔ مہنگائی کا طوفان ہے اور ضروریاتِ زندگی ناپید ہو چکی ہے۔ سکے کی ایسی ناقدری میں گزارہ ناممکن ہو چکا ہے۔"

"مگر وہ اپنی زمین ہے، یہاں کی غریب الوطنی اور فاقہ کشی سے وہاں کی زندگی زیادہ بہتر ہو گی۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔ "یہاں کے حکمران ہم پر مہربان رہے ہیں۔ ان کے برادرانہ رویّے کی وجہ سے ہم نے خود کو یہاں کبھی بے وطن نہیں سمجھا، یہ ہماری سرزمین ہے۔ ہر افغان مہاجر کے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ موجود ہے۔ ان کاغذوں

کے سہارے کراچی یا عرب ریاستوں میں نوکری حاصل کر کے روزی کمانا ہر افغان نوجوان کا خواب بن چکا ہے۔ ساری جیبیں بھری ہوں تو آدمی دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنا گھر بنا سکتا ہے۔ خالی جیب اور خالی پیٹ افغان سے آسودہ حال مہاجر ہونا کہیں بہتر ہوگا۔"

ملا بدر کے آخری فقرے میں گہرا فلسفہ پنہاں تھا۔ آزادی کی جن تحریکوں کو باہر سے مدد فراہم کی گئی' وہ ماضی میں صرف کاغذی نعروں تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ ہجرت کے حوالے سے ملنے والی عالمی رعایتوں کے ذریعے ایسی تحریکوں کے رہنما اور مہاجرین ہر سہولت سے فیض اٹھانے کے بعد خوش حال ہو کر دنیا بھر میں آباد ہوتے چلے گئے۔ ایسے نام نہاد مہاجرین کا مفاد ایک نکتے میں مرکوز تھا کہ حالات جوں کے توں رکھے جائیں۔ اسٹیٹس کو کے تحت وہ اپنی مظلومیت کی کہانیاں سنا کر عالمی ہمدردیاں بٹورتے رہیں' دوسری طرف خوش حال ملکوں میں حصولِ تعلیم' کاروبار اور معقول ملازمتوں کے ذریعے اپنی جڑیں مضبوط کرتے رہیں۔

ملا بدر مجھے کچھ ایسی ہی کہانی سنا رہا تھا۔ افغانوں کو دنیا بھر سے مالی اور اخلاقی امداد ضرور ملی تھی مگر ان کو شہریت حاصل کرنے کی بے مہار آزادی صرف پاکستان نے ہی فراہم کی تھی۔ رشوت دیے بغیر شناختی کارڈ یا پاسپورٹ بنوانے والے ایک حقیقی پاکستانی کو نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' اعتراضات دور کرنے کے لیے بار بار دفتروں کے دھکے کھانے پڑتے ہیں لیکن افغان پناہ گزینوں کو ملنے والی مراعات کا ذکر ملا بدر خود کر رہا تھا۔

ناخواندہ اور نیم خواندہ افغان مہاجرین اپنے نسلی مزاج کے اعتبار سے تند خو اور جنگ جو تھے۔ مکمل پاکستانی شناخت حاصل کرنے کے بعد وہ دنیا کے جس خطے میں پہنچتے تھے' اپنی کسی بھی غلطی کی پاداش میں ایک پاکستانی کے طور پر سزایاب ہوتے تھے۔

یہ مفت کی وہ بدنامی تھی جو افغان پناہ گزینوں کو ملنے والی مراعات اور چشم پوشیوں کے نتیجے میں پاکستان کو حاصل ہو رہی تھی۔

غیر قانونی ہتھیاروں کی خرید و فروخت کا ذکر ملا بدر کر چکا تھا۔ افغانوں کے ذریعے ملک میں پھیلنے والے ہیروئن کے بھیانک سیلاب کا میں خود عینی شاہد تھا۔

میں نے ملا بدر کے لیے اپنے دل میں حسد در قابت کی ہلکی سی آنچ محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اس سودے میں پاکستان کو کیا کچھ حاصل ہوا ہے؟"

ملا بدر نے اپنے سر کو منفی جنبش دیتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "شاید کچھ بھی نہیں..... اتنا ضرور ہوا ہے کہ اب دنیا بھر میں لوگ پاکستان کے نام اور محلِ وقوع سے واقف ہو گئے ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کی خاصی لمبی سرحد مشترک ہے۔"

"پاکستان میں ہیروئن' ہتھیاروں اور جرائم کی افزائش کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"دیکھو' کہیں آگ بھڑکتی ہے تو اس کی تپش دور تک پھیلتی ہے جہاں آگ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔" ملا بدر نے پُرخیال آواز میں کہا۔ "کہیں جنگ چھڑتی ہے تو وہاں سے کردار اور اخلاق جیسی روایات سب سے پہلے رخصت ہوتی ہیں۔ یہ اثرات پاکستان پر بھی پڑے ہیں۔ تم ٹھنڈے دل سے سوچو تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ ہم سفید ریچھ کے سامنے سینہ سپر نہ ہوتے تو اس کے ٹینک ہمارے گھروں کو روندتے ہوئے پاکستان میں گھس آتے۔ افغانستان بندرگاہ سے محروم اور خشکی سے گھرا ہوا ملک ہے۔ روس کی بندرگاہیں خراب موسم کی وجہ سے نصف سال موسم میں بند رہتی ہیں۔ انہیں تمہاری جنوبی ساحلی پٹی کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ ان کے ذریعے پورے سال دنیا کے ساتھ تجارت کر سکیں۔ اپنوں کا لہو دے کر ہم نے تمہارا دفاع کیا ہے۔ ہماری اس عظیم قربانی کا صلہ تمہارے حکمراں دے رہے ہیں۔"

وہ بات وہیں رہ گئی۔ ملا بدر کا ساتھی ٹرانسمیٹر پر زخاخیل والوں سے بات کر کے لوٹ آیا اور پشتو میں جلدی جلدی رپورٹ دینے لگا۔

"دو مراحل طے ہو چکے ہیں۔" اس کے خاموش ہونے پر اکبر رانا مجھے اس کی رپورٹ کا خلاصہ سنانے لگا۔ "کھٹومل پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے پشاور پہنچایا جا چکا ہے۔ وہاں وہ ہمارے لوگوں کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ اصولی طور پر اسے دوپہر کی پرواز سے اسلام آباد پہنچ جانا چاہیے۔"

وہاں آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ لیکن ملا بدر سے ہونے والی گفتگو نے میرے دل و دماغ میں بہت سے نئے اور چبھتے ہوئے سوالات پیدا کر دیے تھے جن کے جواب کسی بھی صورت میں خوشگوار نہیں ہو سکتے تھے۔

قہوے کی مزید ایک ایک پیالی ختم کر کے ہم ملا بدر سے رخصت ہو گئے۔

"اگر کھٹومل کو کسی پرواز سے آج ہی اسلام سے یہاں پہنچنا ہے تو اب تک تمہارے پاس کوئی نہ کوئی اطلاع پہنچ جانی چاہیے تھی۔" میں نے راستے میں اکبر رانا سے کہا۔

"اصولی طور پر اسٹیشن کو مطلع کیا جانا چاہیے تھا مگر تم بھول رہے ہو کہ اسلام آباد میں اسٹیشن نائن کے ساتھ ہمارا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پشاور والوں نے وہاں خبر دے دی ہو۔" اس نے بتایا۔

"تو کیا ہیڈ کوارٹرز والوں کی اپنی بھی فیلڈ فورس ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہے۔ اپنے فیلڈ اسٹاف کے بغیر ہیڈ کوارٹر اسٹیشن نائن کا محتاج ہو کر رہ جاتا۔ وہ اپنے طور پر چھوٹی بڑی کارروائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اکثر ہم نے ان سے مدد بھی لی ہے۔"

دو بجے ایس ٹی ایف کے چیف کا فون آیا۔ اس کی کال میں نے ریسیو کی اور وہ تعارف کے بغیر میری آواز پہچان کر بولا۔ "تم نے اسلام آباد میں قدم رکھتے ہی میری مصروفیات میں بے حساب اضافہ کر دیا ہے۔"

"مجھے ملوث نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہر لمحے مصروف رہتے ہو۔" میں نے ہنس کے جواب دیا۔

"ایسی مسلسل مصروفیت کبھی کبھار ہی پیدا ہوتی ہے ورنہ روٹین کے معمولات میں ہی دن گزر جاتا ہے۔" دوسری طرف سے اس کی آواز آئی۔ "شاید اول خان نے تمہیں امریکیوں کے سخت ردِعمل کے بارے میں بتا دیا ہوگا؟"

"بتایا تھا مگر وہ پر یقین نہیں تھا۔ ان کے احتجاج کی تصدیق ہونی باقی تھی۔" میں نے کہا۔

"تصدیق ہو گئی ہے۔ ان کا پہلا اور سخت مراسلہ کراچی میں کالو مکرانی اور قاسم کی گرفتاری کے بارے میں جاری کیے جانے والے پریس ریلیز کے حوالے سے آیا تھا۔ انہوں نے کالو مکرانی کے بیان کو جھوٹ کا پلندہ اور کھٹومل کے خلاف منظم سازش قرار دیا تھا۔"

"تو کیا کوئی دوسرا مراسلہ بھی آیا ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"واشنگٹن اور اسلام آباد کے درمیان وقت کے فرق کی وجہ سے انہیں صبح سویرے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ذرا سی دیر پہلے کھٹومل کو چوہدری سلام کے گھر سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ اپنے دوسرے مراسلے میں امریکی حکومت نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تشخص کے حوالے سے مذہبی آزادی اور رواداری کا شور مچا کر کھٹومل کے خلاف سازشوں کے تسلسل پر احتجاج کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہیومین رائٹس کمیشن کے سربراہ نے بھی کھٹومل کی فوری بازیابی اور کسی عدالت میں پیشی کا پُرزور مطالبہ کیا ہے۔"

"ہماری جانب سے اس بارے میں کیا قدم اٹھایا گیا ہے؟" اس کے خاموش ہو جانے پر میں نے پوچھا۔

"اوپر تلے ملنے والے ان دو مراسلات نے وزارتِ خارجہ میں کھلبلی مچا دی ہے۔" ایس ٹی ایف کے چیف نے بتایا۔ "ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔"

"تمہاری رپورٹ ہی انہیں کسی فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گی۔" میں نے کہا۔

"میں مسلسل اوپر والوں کو بریف کر رہا ہوں۔ کھٹومل کو اس وقت چکلالہ کے ملٹری انٹیلیں پر موجود ہونا چاہیے۔ وہاں سے اسے اسٹیشن نائن پہنچایا جائے گا۔"

"شاید حفاظتی وجوہ کی بنا پر اسے ملٹری انٹیلیں پر لایا گیا ہے!" میں نے رائے زنی کی۔

"نہیں، پی آئی اے کی پرواز رات سے پہلے میسر نہیں تھی۔ اسے آرمی کے ایک ہیلی کاپٹر سے یہاں لایا گیا ہے۔ اس کی آنکھوں پر مسلسل سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہیں۔ ابھی تک اسے پتا نہیں چل سکا کہ وہ کن لوگوں کی تحویل میں ہے۔"

"گڈ! یہ سب پروگرام کے مطابق جا رہا ہے۔ اس سے باز پرس مکمل ہوتے ہی ہم اسے اور کالو مکرانی کو منظرِ عام پر لے آئیں گے۔ اس کے اقبالی بیان کے بعد امریکیوں کے احتجاج کی غبارے کی ساری ہوا خود بخود خارج ہو جائے گی۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"تمہارا نام ان کے اعصاب پر ایک خوف کی طرح طاری ہے۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے تمہارے خلاف کھٹومل کو اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اچانک غائب ہونے پر ہیومین رائٹس کمیشن تک کو میدان میں لے آئے ہیں۔"

"یہ قدرت کے کھیل ہیں جو نیارے ہوتے ہیں۔ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ محض ایک یا دو افراد امریکا کے باخبر اور فعال اداروں کی ناک کے نیچے گیپ اور ڈیوڈ اسٹارز کے چیتھڑے اڑا کر یوں حفاظت سے باہر نکل آئیں گے....."

"ان ہی واقعات کے تسلسل میں یہاں تم نے کھٹومل پر ہاتھ ڈال دیا۔" اس نے میری بات درمیان سے اچک کر کہا۔ "تمہاری یہ ساری کامیابیاں ایک مضبوط نیٹ ورک کی نشاندہی کرتی ہیں۔ تمہیں بے دست و پا کر کے وہ اس نیٹ ورک کو توڑنا چاہتے ہیں۔"

میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرا نیٹ ورک میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ دراصل کھٹومل سے تصادم کی بنیاد اسی وقت

پڑ گئی تھی جب میرے ساتھی نے اپنے فلیٹ کے گرد منڈلاتے ہوئے دو مشتبہ افراد کے گھٹنے توڑے تھے۔ بعد میں ان ہی میں سے ایک نے کھٹومل کا نام لیا تھا۔"

"تمہارا ہر آدمی اپنی ذات میں ایک مکمل نیٹ ورک ہے۔" وہ بولا۔ "کھٹومل کے ساتھ ہونے والی پیش رفت سے مجھے باخبر کرتے رہنا۔ یہ مسئلہ یکایک ہی بہت سنگین اور اہم ہو گیا ہے۔"

ایس ٹی ایف کے چیف سے گفتگو ختم ہونے کے تقریباً نصف گھنٹے بعد آہنی باڈی والی ایک بند جیپ میں فورس کے تین مسلح جوان کھٹومل کو اسٹیشن نائن لے آئے۔

متوسط قامت اور جسامت والے اس خطرناک سیاست داں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ٹوٹا ہوا داہنا بازو اس کے پہلو میں جھول رہا تھا۔ ایس ٹی ایف کا ایک آدمی بایاں ہاتھ تھام کر اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔

میں برآمدے میں کھڑا وہ عبرتناک منظر دیکھتا رہا۔ کھٹومل کو پاکستان کے حوالے سے صرف دولت ہی نہیں، سیاسی شہرت اور نیک نامی بھی ملی تھی، جو شاید اسے راس نہیں آسکی تھی۔

پتا نہیں کہ کھٹومل اور امریکیوں کے گٹھ جوڑ میں بھارتی قونصل خانے کا کوئی کردار تھا یا وہ براہِ راست امریکیوں کے لیے کام کر رہا تھا۔ صورتِ احوال ان میں سے جو بھی رہی ہو، کھٹومل نے اپنی تقدیر پر اپنے ہاتھوں سے غداری کی ان مٹ مُہر ثبت کر لی تھی۔

"پتا نہیں تم کون لوگ ہو!" میرے کانوں میں کھٹومل کی بڑبڑاہٹ آئی۔ "کچھ بولتے ہو نہ سنتے ہو۔ بابا! میں اِدھر اُدھر کیوں گھمایا جا رہا ہوں؟" اس کی آواز حسبِ معمول دھیمی اور پُرسکون تھی۔

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر دھیرے سے کہا۔ "کھٹومل! سیدھے چلے آؤ، ذرا سی دیر میں تمہارا سارا تجسس دور ہو جائے گا۔ تم کسی غیر کے پاس نہیں، اپنوں میں ہو۔"

میری آواز سنتے ہی کھٹومل کے قدم ڈگمگا گئے۔ "تت... تم ڈینی ہو؟" میری آواز پہچانتے ہی اس کا اعتماد رخصت ہو گیا اور زبان پر لکنت طاری ہو گئی۔

میری باری آچکی تھی۔ میں نے اس سے کھیلنا شروع کر دیا اور کہا۔ "خدا سے نہیں تو اپنے بھگوان سے ہی ڈرو۔ میں تمہارا اپنا شنکر ہوں۔ مجھے ڈینی جیسے آدمی کا نام نہ دو۔"

میری زہریلی آواز نے اس کے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ "میں دھوکا نہیں کھا سکتا... تم ڈینی ہی ہو۔ تم نے شنکر کو مارا اور اب اسی کا نام لے کر مجھے ڈرا رہے ہو۔"

"دھوکا نہیں، یہ آواگون کا چکر ہے، کھٹومل۔ شریر ڈینی کا ضرور ہے مگر اس میں آتما تمہارے شنکر کی ہے۔ اسی لیے میں نے تمہاری آنکھوں پر کالی پٹی بندھوا دی ہے کہ کہیں تم مجھے دیکھ کر ڈر نہ جاؤ۔ ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ بھاگنا تمہارے لیے عذاب بن جائے گا۔"

میرا اندازہ تھا کہ اس بار وہ ضرور بدحواس ہو جائے گا لیکن اس کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ کشاں کشاں برآمدے کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ رکنے یا بھاگنے کی کوشش کرتا تو اسے ناکام بنانے کے لیے ایس ٹی ایف کے تین کارندوں نے اسے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔

اسٹیشن نائن کا انٹروگیشن سیل اسلام آباد کی اسی عمارت کے تہ خانے میں واقع تھا۔ برآمدے کے چند زینے چڑھنے اور راہداری سے گزرنے کے بعد جب اسے دوبارہ سیڑھیوں کی موجودگی کی اطلاع دی گئی تو وہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "اب تم مجھے کسی تہ خانے میں لے جا کر میرے اوپر تشدد کرو گے۔ میں تم کو بتا دوں کہ تمہاری یہ کوشش بے سود ثابت ہو گی۔"

"ہم عدم تشدد کے حامی اور اہنسا کے پجاری ہیں۔" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "اچھا ہوا کہ تم نے ہمیں اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ ہم کچھ نہیں کریں گے۔ بس تمہارا ٹوٹا ہوا داہنا ہاتھ بغل کے جوڑ سے الگ کریں گے تاکہ تم کو اس عذاب سے نجات مل جائے۔"

وہ سیڑھیاں اترتے اترتے ذرا سا لہرایا پھر بولنے لگا۔ "یہ بھی کر دیکھو... تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

متوقع خطرات اس کے سامنے تھے۔ وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر اپنی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اس جیسے سرد اور متحمل مزاج افراد اگر سختی کے ساتھ اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر لیں تو روایتی تشدد کے ذریعے انہیں مجبور کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

میں نے آنکھ سے اکبر رانا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں طے کر کے تہ خانے کے مہیب کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں چھت سے لٹکتے ہوئے چند آہنی کنڈوں، زنجیروں، رسیوں، برقی آلات اور ایک آہنی کرسی کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے دہشت ٹپکتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہو لیکن آٹھ فٹ اونچی چھت والے اس زیرِ زمین کمرے کی ساخت کچھ اس وضع کی تھی کہ اس سے ہیبت ٹپکتی تھی۔ لیکن میری دانست میں کھٹومل کے لیے وہ ساخت غیر اہم ثابت ہوتی۔

تہ خانے میں اسٹیشن نائن کے دو اہل کار پہلے سے موجود تھے۔ شاید کھٹومل کو لانے والوں کی ڈیوٹی اسے نیچے پہنچانے کے بعد ختم ہوجاتی اور وہ اسے ان دونوں کے حوالے کرکے ہیڈ کوارٹرز کی طرف واپس روانہ ہوجاتے۔

"اس کی آنکھوں پر سے بلائنڈ فولڈ ہٹائے بغیر اوسط درجے کے دو تین برقی جھٹکے دینے ناگزیر ہیں۔" میں نے آہنی کرسی پر نگاہیں جما کر کہا۔

"اس کی ذہنی یکسوئی ایسی غیر متوقع اذیت سے شاید ختم ہوجائے گی۔" اس نے میری تائید کی۔ "اسے الیکٹرک چیئر سے ہی باندھ دیا جائے گا۔ کرسی میں دوڑائے جانے والے کرنٹ کو ہم اپنی مرضی سے کم و بیش کرسکتے ہیں۔"

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ دھیمے دھیمے قریب آرہی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہی اسٹیشن نائن والوں نے قیدی کو سنبھال لیا۔ اسے لانے والے تینوں افراد وہیں سے لوٹ گئے۔

اکبر رانا نے انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں کھٹومل کو اسی کرسی کی طرف لے آئے۔ ان میں سے ایک کی ہدایت پر جوں ہی کھٹومل کرسی پر بیٹھا، خود کار کنڈوں نے کھٹاک کھٹاک کی آواز کے ساتھ اس کی دونوں پنڈلیوں اور کلائیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

زخمی بازو کی کلائی پر کلپ کی گرفت ہوتے ہی کھٹومل نے کرسی سے اٹھنے کی ناکام اور غیر اضطراری کوشش کی اور ہلکی سی کراہ کے ساتھ دوبارہ اسی میں گر گیا۔ اٹھنے کی کوشش میں سارا زور اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر منتقل ہوگیا تھا۔

اکبر رانا دیوار گیر ریگولیٹر پر کرنٹ سیٹ کررہا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے ایک بٹن پر اپنی انگلی رکھی، بورڈ پر ایک سرخ گولا روشن ہوگیا اور تہ خانے کی بند فضا کھٹومل کی بھیانک غیر ارادی چیخ سے گونج اٹھی۔

سرخ دائرہ لمحہ بھر روشن رہ کر بجھ گیا۔ لمحاتی شاک مکمل ہوچکا تھا۔

کھٹومل وہ جھٹکا سہہ لینے کے بعد گجراتی زبان میں زور زور سے کچھ بولنے لگا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود کلامی کے ذریعے خود کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

اکبر رانا اسٹیشن نائن کا سربراہ تھا اور اپنے ہتھیاروں کے بہترین استعمال سے بخوبی واقف تھا۔ میرے اشارے پر اس نے بورڈ پر کچھ چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد دوبارہ بٹن دبایا۔

ایک مرتبہ پھر سرخ دائرہ روشن ہوگیا اور تہ خانہ کھٹومل کی وحشت ناک چیخوں سے لرزنے لگا۔ آہنی بندھنوں نے اسے بے بس کیا ہوا تھا۔ وہ کرسی میں کئی سیکنڈ تک ماہی بے آب کی طرح تڑپتا اور چیختا رہا۔ آخر سرخ روشنی غائب ہوگئی اور کھٹومل ... جس حال میں تھا نڈھال سا اسی حالت میں بیٹھا رہ گیا۔

اس کا چہرہ پسینے میں بھیگنے لگا تھا۔ داہنے بازو کے زخموں کا منہ دوبارہ کھل گیا تھا۔ اس کی اچھل کود کے نتیجے میں ان زخموں سے خون بہنا شروع ہوگیا تھا۔

"ڈینی! تم... پکے سؤر کے... بچے... بچے ہو۔" وہ رک رک کر کراہا۔

"کھٹومل! اپنی زبان پر قابو رکھو۔ تیسرا جھٹکا اس سے زیادہ طویل ہوگا۔" میں نے غرا کر اسے تنبیہہ کی۔ "یہ یاد رکھو کہ جب تک تمہاری آنکھوں پر سیاہ پٹی موجود ہے، تمہاری زندگی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ یہ پٹی اترنے کے بعد تمہیں اسی برقی کرسی پر بھون دیا جائے گا۔"

"یہ ظلم ہے... بربریت ہے۔" وہ بے بسی سے حلق کے بل چیخ پڑا۔

"ہر ظالم اپنے کیے کی سزا پانے پر یہی کہتا ہے۔ زبان کھولو ورنہ طاقت ور برقی رو تمہیں جلا کر کوئلہ بنا دے گی۔ کوئلے کے کھٹومل کو کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

کھٹومل کسی مرکھنے بیل کی طرح منہ کھول کر ہانپتا اور میری بات سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے کے کئی ثانیوں بعد بھی وہ نہ بولا تو مجھے اپنی بات جاری رکھنی پڑی۔

میں نے اکبر رانا کے آدمیوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کرخت آواز میں حکم دیا۔ "یہ مردود مرنا ہی چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں سے بلائنڈ فولڈ اتار دو۔"

ایک شخص کے ہاتھ فوراً ہی کھٹومل کی پسینے میں بھیگی ہوئی پیشانی سے جا لگے۔

کھٹومل کے لیے وہ ملک الموت کے ہاتھ کا لمس تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹک کر پوری قوت سے کہا۔ "دور رہو اور پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟"

"اسے ایک مہلت دے دو!" میں نے اکبر رانا کے ماتحت سے کہا پھر اپنے قیدی سے مخاطب ہوگیا۔ "کھٹومل!

امریکیوں کے لیے تم کب سے کام کر رہے ہو؟"

"یہ مجھ پر جھوٹا الزام ہے۔ میں کسی کے لیے کوئی کام نہیں کرتا۔ میرے ایک اشارے پر لوگوں کی قسمتیں بدل جاتی ہیں۔ مجھے کسی کے لیے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہمیں بھی یہی پریشانی ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے تم کس مجبوری کے تحت ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہو؟ وہ تمہیں کیوں بلیک میل کر رہے ہیں؟"

"یہ جھوٹ ہے۔ یہ بہتان ہے۔ میں ایک معزز سیاست داں ہوں۔ میں نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

"تم نے ڈینی کے خلاف ڈکیتی اور قتل کی جھوٹی ایف آئی آر کیوں درج کرائی تھی؟"

"ڈینی کے خلاف؟" اس نے ہذیانی لہجے میں دہرایا۔ "تم پھر مکر رہے ہو کہ تم ڈینی ہو۔"

"اس لیے کہ میں ڈینی نہیں ہوں۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "ڈینی تمہارا کوئی خواب ہو سکتا ہے۔ ہمارا تعلق قانون کے محافظوں سے ہے۔ جو پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دو۔"

"وہ رپورٹ جھوٹی نہیں تھی۔" وہ سخت اور غصے بھرے لہجے میں اپنی بات پر اڑ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جس وقت تمہاری گھر ڈکیتی نہیں بلکہ ہڑبونگ کرنے کے لیے لوگ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے آئے، تمہارے کرائے کے قاتل کلفٹن میں ایک فلیٹ کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا لیکن میں نے کئی گھنٹے گزرنے کے بعد رپورٹ درج کرائی تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ کلفٹن میں کوئی مقابلہ ہوا ہے جس میں چھ آدمی مارے گئے ہیں۔ اس واقعے میں ڈینی ملوث تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسی نے کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے گھر کا رخ کیا ہو گا۔"

"کھوٹو مل! زیادہ بک بک مت کرو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ اذیت ناک برقی جھٹکے کھانے کے باوجود اس کی ذہنی حالت ابتر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کلفٹن کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے بہت احتیاط سے الفاظ استعمال کیے تھے۔ بھول کر بھی اس خونیں تصادم کی ذمے داری قبول کرنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بہت سی کڑیاں مل چکی ہیں۔ کراچی میں کیماڑی کے ایک شراب خانے کے مالک نے بتایا ہے کہ اس کے عقبی دفتر میں تم بالم سے ملے تھے۔ بالم تمہارا نمک خوار تھا۔ لڑائی میں وہ مارا گیا۔ دوسرے لوگوں کو اسی نے کرائے پر لیا تھا۔"

"بب... بالم!" وہ خوفزدہ انداز میں ہکلایا۔ "میں کسی بالم کو نہیں جانتا۔"

"بالم اور جانی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "یہ دونوں تمہارے پالتو غنڈے تھے۔"

"وہ دونوں مر چکے ہیں۔ اب ان کا ذکر بے سود ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ جانی بھی مارا گیا تھا؟" مجھے فصیل میں شگاف ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔

اس نے کرسی میں ہلکی سی جنبش کی پھر بولا۔ "اخباروں میں سب کچھ آ گیا تھا۔"

میں نے فضا میں ہاتھ لہرا کر اکبر رانا کو اشارہ کیا۔ اس نے سوئچ دبایا۔ کرسی میں برقی رو دوڑتے ہی کھٹو مل بُری طرح بلبلانے لگا۔ اس پر اعصابی شکست و ریخت کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔

اکبر رانا کو قیدی کی ناگزیر ضروریات کا پورا اندازہ تھا۔ اس نے بجلی کی بچت والے کام لیتے ہوئے اس بار محض ایک مختصر سے جھٹکے پر اکتفا کیا تھا۔

"ہم تمہیں سسکا سسکا کر یوں ہی انسانی روسٹ میں تبدیل کر دیں گے۔" میں نے اپنے لہجے میں سفاکانہ سرد مہری سموتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کان کھول کر یہ بھی سن لو کہ تمہارا شراکت دار چوہدری سلام بھی ہمارے ہاتھ آ چکا ہے۔ اس نے تم سے کہیں زیادہ عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ فرار کے راستے مسدود پاتے ہی اس کی زبان چل پڑی تھی۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے ایک بے ساختہ آواز بر آمد ہوئی۔ "وہ بتا چکا ہے تو پھر تم مجھ سے کیا سننا چاہتے ہو؟ میں نے کچھ نہیں کیا، میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

"چوہدری سلام ہیروئن کی کھیپ اسلام آباد سے گجرات لے جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔" میں نے سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہوئے اگلا وار کیا۔ "اس نے ہمیں اپنے اور تمہارے تعلق کی کہانی سنائی ہے۔ تم اپنے اور امریکیوں کے رشتے کی کہانی سناؤ گے۔"

"میری آنکھیں کھول دو۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں تم سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند باتیں کرنی چاہتا ہوں۔"

"ہمیں ہمارے دشمن صرف ڈراؤنے خواب میں دیکھتے

ہیں۔ کھلی آنکھوں سے ہم کو شناخت کرنے والوں پر یہ زمین تنگ ہوجاتی ہے۔ اپنی جان کی امان چاہتے ہو تو پٹی بندھی رہنے دو اور جو کہنا چاہتے ہو، کہہ ڈالو۔ آنکھیں بندھی رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"میں اپنے اور تمہارے فائدے کی بات کرنی چاہتا ہوں۔ مجھ پر آیا ہوا بُرا وقت ٹل جائے گا اور تمہارے بھی دن پھر جائیں گے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بولتے رہو۔ میں سن رہا ہوں۔" اس کی خاموشی پر میں نے لقمہ دیا۔

"کیا میں پورے اعتماد اور راز داری کے ساتھ زبان کھول سکتا ہوں؟"

"یہاں کوئی اجنبی نہیں ہے۔ تم پوری بے تکلفی سے اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہو۔"

"میں نے اس ملک میں زندگی بھر بہت کچھ کمایا ہے۔ میں تمہاری خوشنودی کے لیے ایک بڑی رقم سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔" اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔

"میرے صبر کا امتحان مت لو۔ ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کرڈالو۔" میں نے اسے ٹوکا۔

"تم قیمت بتاؤ۔ میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے بھول جاؤ گے اور میں اس قیمت کو ایک کاروباری خسارہ سمجھ کر ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔ تم لوگ یقیناً سرکاری ملازم ہو۔ ایک ڈیڑھ کروڑ کی رقم تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی زندگی بدل سکتی ہے۔"

"تم اپنی آزادی کی بہت کم قیمت لگا رہے ہو۔ ڈیڑھ کروڑ کے بارے میں ایک آدمی ضرور سوچ میں پڑ سکتا ہے مگر ہم چار ہیں۔ ہمارے....."

"دس کروڑ" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے اضطراری لہجے میں بولی لگائی۔

وہ رشوت کی پیشکش کررہا تھا۔ تہ خانے میں کہا ہوا ہر لفظ ایک حساس سسٹم کے ذریعے مقناطیسی فیتے پر ریکارڈ ہورہا تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ کھٹومل کی مزاحمت کی ہر قوت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اور وہ ہمارے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ آزمانے پر تل گیا تھا۔

"نہیں کھٹومل..... اتنی چھوٹی رقم میں ہم اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرسکتے۔"

"مجھے معلوم ہے..... سب معلوم ہے۔" وہ بے چین ہوا جارہا تھا۔ "ہر شخص کے اصولوں کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ سستے اصول آسانی سے بک جاتے ہیں۔ تمہاری بولی میری حیثیت سے زیادہ ہوئی تو میں تمہاری زیادتیاں سہتا رہوں گا ورنہ تمہارا منہ بند کردوں گا۔ بولو، کیا مانگتے ہو!"

"سچ..... سچ کے سوا کچھ نہیں۔ امریکیوں کے لیے تم کب سے اور کیا کام کررہے ہو۔" میں نے سرد اور اٹل لہجے میں اسے سنگین حقائق کی دنیا میں واپس کھینچ لیا۔

مایوسی کے عالم میں اس پر ایک مرتبہ پھر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

بے ضمیر اور جرائم پیشہ لوگوں کو اپنی زندگی بہت عزیز ہوتی ہے۔ اسی کو رنگین اور پُرتعیش انداز میں گزارنے کے لیے وہ جرائم کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ کھٹومل کو جب یہ اندازہ ہوگیا کہ جھوٹ اور پیسے کے زور پر وہ ہمارے چنگل سے نہیں نکل سکے گا تو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس کی کہانی کا حیرت انگیز اور بنیادی پہلو یہ تھا کہ اس کے سیاسی و سماجی جرائم کا بھارتی سفارت کاروں سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی اڑان بہت اونچی تھی۔ اس نے براہِ راست امریکیوں سے مراسم استوار کیے تھے۔ ان سے دوستی بڑھانے کی سرتوڑ کوششوں میں اس سے جابجا کئی لغزشیں بھی ہوئیں جن کی غلط تشہیر اس کی سماجی اور گھریلو زندگی تباہ کرسکتی تھی۔ یہ امریکی سفارت کاروں کے گرد پھیلے رہنے والے ایجنٹوں کی کارکردگی تھی کہ کھٹومل کی زندگی کے وہ کمزور لمحے کہیں نہ کہیں محفوظ کرلیے گئے تھے۔

بین الاقوامی سازشوں کے ایک لگے بندھے معمول کی طرح کھٹومل نے بھی ایک چھوٹا کام کرکے اس دلدل کے سرے پر پہلا قدم رکھا تھا اور پھر ہر بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ وہ اس دلدل میں دھنستا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس امریکی فرمائشوں سے گریز کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔

جن دنوں میں امریکا میں بلیک ڈیڈ اور جینی کے تعاون سے امریکی مفادات کو زک پہنچا رہا تھا، امریکی قونصل خانے کے ویزا افسر نے کھٹومل کو میرے کسی قریبی ساتھی کے اغوا پر مامور کیا تھا۔ میرا کلفٹن والا فلیٹ پہلے سے ان لوگوں کی نگاہوں میں تھا۔ کھٹومل نے اپنے آدمی میرے پیچھے لگادیے۔

کھٹومل کے آدمی پہلے سلطان شاہ کے ہاتھوں زخمی ہوئے پھر گلشن اقبال میں ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کا وہ عبرت ناک انجام کھٹومل کے لیے اشتعال انگیز ثابت ہوا اور اس نے بالم کو میرا فلیٹ تباہ کرکے وہاں موجود ہر شخص کو ہلاک یا اغوا کرنے کے مشن پر مامور کردیا۔

اس کے بعد کے واقعات ہمارے سامنے تھے۔ میں نے

کھٹول سے یہ بھی اگلوا لیا کہ اس نے اپنی ایف آئی آر میں میرا نام امریکی قونصل خانے کے ویزا افسر کے ایما پر ڈالا تھا۔

وہ کھٹول کی کہانی کا ایک رخ تھا جس کا براہ راست میری ذات سے تعلق تھا۔ اس بارے میں اس کی زبان سے نکلی ہوئی تمام تر جزئیات ریکارڈ کرنے کے بعد میں نے چوہدری سلام کا قصہ چھیڑ دیا۔

چوہدری سلام سے کھٹول کی شناسائی زیادہ پرانی نہیں تھی اس لیے وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ کسی زمانے میں چوہدری سلام مومو مستری کے نام سے لاہور کی ایک فٹ پاتھ پر اپنا موٹر ورکشاپ چلاتا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات اس وقت ہوئی جب مومو مستری اپنے ماضی سے پیچھا چھڑا کر چوہدری سلام کے نام سے پاکستان کے سیاسی اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔

ایک ممتاز اقلیتی رہنما ہونے کی بنا پر سندھ میں کھٹول کو کئی شراب خانوں کے پرمٹ ملے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چوہدری سلام کو اپنی مالی استعداد بڑھانے کے لیے دولت کمانے کے آسمان نسخوں کی تلاش تھی۔ ایک نعرے باز سیاسی کارکن اور سفید پوش بدمعاش ہونے کی وجہ سے وہ بہت سے رہنماؤں کا منہ چڑھا تھا۔ اس نے پنجاب میں شراب خانوں کے پرمٹ لینے شروع کر دیے۔

بنیادی طور پر وہ سرکاری اجازت نامے شراب کے پرمٹ پر غیر مسلموں کو فروخت کے لیے جاری کیے جاتے تھے۔ ان دکانوں میں سے نوشی کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ ایک کھلا راز تھا کہ ملک بھر میں بیشتر دکانوں پر مے خواروں کو پینے کے لیے شراب فراہم کی جاتی تھی اور پرمٹ کے بغیر مسلمانوں کو بلیک بھی کی جاتی تھی' یہی دو دھندے ان دکانوں کی خطیر آمدنی کا ذریعہ تھے۔

مے فروشی میں مشترکہ مفادات کی بنا پر ان دونوں میں مراسم کی داغ بیل پڑی۔ دونوں واقف تھے کہ اس کام میں قانون شکنی کے بغیر کچھ آمدنی نہیں تھی۔ اس موضوع پر باہمی اعتماد میں اضافہ ہوا تو چوہدری سلام نے کھٹول کو ہیروئن فروشی کا آغاز کرنے کی تجویز دی۔

چوہدری سلام کے پاس جملہ ذرائع موجود تھے مگر سرمایہ نہیں تھا۔ کھٹول کے پاس سرمائے کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ ہیروئن فروشی کے اسرار و رموز سے ناواقف تھا۔ دونوں میں شراکتی کاروبار کی ابتدا ہو گئی۔

چوہدری سلام نے قلیل سی مدت میں اس کام کے ہیر پھیر سے اتنا مال بنا لیا کہ اگلے انتخابات میں کارکنوں کی بھرپور نفری کے ساتھ میدان میں کود پڑا۔ شرافت' دھونس' دھمکی اور سرمائے کے ملے جلے استعمال سے وہ کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو ہی گیا۔ اسمبلی میں پہنچنے کے بعد اس نے بیوروکریسی کے اہم مہروں سے اپنے تعلقات بڑھانے شروع کر دیے جن سے کھٹول بھی حسب ضرورت فیض یاب ہوتا رہا۔ کراچی میں پیش آنے والے نامساعد حالات سے کھٹول کی گلوخلاصی کے لیے چوہدری سلام نے اپنے ان ہی تعلقات سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ کھٹول کے اعترافات کا خلاصہ تھا۔ اس کی کہانی میں ایسے کئی پردہ نشینوں کے نام بھی آئے تھے جو پورے ملک کو چونکا سکتے تھے۔ بیوروکریسی اور سیاست کے میدان میں انتہائی نیک نام لوگوں کے وہ کرتوت میرے لیے حیران کن تھے۔

میں نے اکبر رانا سے نظروں ہی نظروں میں تبادلۂ خیال کیا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ اس کے چلے جانے کے بعد وہ کھٹول کو الیکٹرک چیئر کے بندھنوں سے آزاد کرنے کے ساتھ ہی بلا ہتھ فولڈ سے بھی رہا کروا دیں۔

"کھٹول کے اعترافات میرے لیے اب ناقابل یقین ہیں۔" یہ خانے کے زینوں پر اکبر رانا نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ "اگر وہ ان اعترافات سے منحرف نہیں ہوتا تو امریکی ایک مرتبہ پھر اپنا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ انہیں تمہارے خلاف نئے سرے سے کوئی محاذ کھولنا ہوگا۔"

"اس کی کتھا سن لینے کے بعد تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟" میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

"چیف کو کھٹول کے بارے میں بریفنگ دینے کے ساتھ ہی مجھے چوہدری سلام کی گرفتاری کی اجازت بھی حاصل کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایجنٹ کنٹرول کے نام آنے کے بعد وہ گرفتاری کے خوف سے سرحد پار کر کے کسی پڑوسی ملک میں روپوش ہو جائے۔"

"گڈ' یہ کام سب سے زیادہ ضروری ہے۔" میں نے اس کی بھرپور تائید کی۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد میں سگریٹ سلگا کر تھکے ہوئے انداز میں بستر پر دراز ہو گیا۔ اکبر رانا فون پر اپنے چیف سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

تین عورتیں ایک کہانی

ڈاکٹر محمد عابد الرحمٰن

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا واسطہ بد سے بدتر بُرے لوگوں سے پڑتا رہتا ہے۔ یوں وہ شخص معاشرے کو دیوانیا قرار دے کر خود بھی مایوسی و بیزاری میں مبتلا ہو جاتا ہے... اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اچھے لوگ زیادہ نظر آتے ہیں اور آدمی اس خوش کن احساس سے سرشار رہتا ہے کہ دنیا سے ابھی اچھے لوگ ختم نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اچھے لوگوں کے اچھے رویوں کی کئی کہانیاں آپ نے پڑھی ہیں۔ ذرا یہ مختلف کہانی پڑھ کر دیکھیے۔ اس کہانی کے تمام کردار معاشرے کے نمائندہ شوخیں لیکن بھرحال پائے ضرور جاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ بھی کسی ایسے کردار سے واقف ہوں! اور پھر یہ بھی ہے کہ ہر شخص بہتر جانتا ہے کہ اسے کن حالات میں کیا فیصلہ کرنا ہے!

مختلف حالات سے دوچار مختلف طبقات کے افراد کے یکساں فیصلوں کا احوال

غریب عورت

ہائی وے کے کنارے اس چھپر ریستوران کے سامنے بڑی سی ایک کار آکر رکی اور اس میں سے دو نوجوان لڑکے اور دو لڑکیاں اتریں۔ شاید گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان کے جسم اکڑ گئے تھے اور وہ کچھ کھانے پینے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں بھی سیدھے کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے صرف بوتلوں کا آرڈر دیا

اور واقعی ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگے لیکن اس مقصد کے لیے درحقیقت وہ اپنے آپ کو اور بھی آڑا ٹیڑھا کر رہے تھے۔ کوئی انگڑائی لے رہا تھا' کوئی ترچھا ہو رہا تھا اور کوئی رکوع کی سی حالت میں جا رہا تھا۔ لڑکیاں جینز اور کچھ عجیب و غریب قسم کی شرٹوں میں تھیں۔ آڑی ترچھی ہونے سے ان کی جوانیاں کچھ اور نمایاں ہو رہی تھیں۔ چھپر ریستوران میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ ترچھی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے اور کچھ علی الاعلان گھور رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مزدور تھے۔ قریب ہی ایک جگہ ایک کارخانے کا تعمیراتی کام چل رہا تھا۔

کولڈ ڈرنکس ختم کرتے ہی ایک نوجوان نے ادائیگی کی اور وہ چھپر میں موجود بھانت بھانت کے لوگوں کی طرف ذرا بھی توجہ دیے بغیر فوراً ہی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد چھپر میں چارپائیوں اور بے ہنگم سی میز کرسیوں' بینچوں پر بیٹھے ہوئے مزدوروں میں ان کے بارے میں تبصرے شروع ہوئے۔

ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا احمد یار خان ایک آنکھ دبا کر اپنے ساتھی رب نواز سے مخاطب ہوا "کیوں رب نواز! کیسی قیامت کی نشانیاں تھیں؟"

رب نواز کے کچھ بولنے سے پہلے شفیق گنجا بول اٹھا "کیا ظالم جوانی تھی اس لال شرٹ والی کی۔ بالکل ریما لگ رہی تھی۔"

شفیق گنجے نے ریما کی صرف ایک ہی فلم دیکھی تھی اور بلا تاخیر اسے دل دے دیا تھا اور اس کے خیال میں اس کا دل ابھی تک ریما ہی کے پاس تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اسے ہر جوان اور خوش شکل لڑکی ریما لگتی تھی۔

رب نواز نے بڑے مدبرانہ انداز میں کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ایک پاؤں اٹھا کر سامنے والی ٹیڑھی میڑھی بینچ پر رکھتے ہوئے بولا "ارے۔ ان آج کل کی دیسی انگریز لڑکیوں کی جوانیاں کیا خاک جوانیاں ہیں۔ کھوکھلی جوانیاں ہیں یہ۔!" یہ کہہ کر اس نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا اور نہ جانے کیوں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ ان لڑکیوں کی جوانی کو کھوکھلا قرار دے کر شاید اس نے اپنی گم گشتہ جوانی کا صدمہ کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کی بات سن کر ایک طرف بیٹھے ہوئے خدا بخش کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح نوراں کا خیال لپکا۔ نوراں کو دور سے ہی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جوانی کھوکھلی ہرگز نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ خدا بخش ایک کچی بستی میں رہتا تھا اور نوراں اس بستی کی چلتی پھرتی قیامت تھی۔ خدا بخش کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی سڑی بسی آبادی میں رہنے والی اور اتنی غربت میں زندگی گزارنے والی' تین بچوں کی ماں ایسے دل لینے والے سراپا کی مالک کیسے ہو سکتی تھی؟ مگر بس۔۔۔ نوراں ایسی ہی تھی۔ اب کوئی کیا کر سکتا تھا؟

خدا بخش کے مکان سے ایک مکان چھوڑ کر اس کا مکان تھا۔ اس کا شوہر بھی تھا جو ایک سال سے بیمار تھا۔ صحیح طور پر پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کیا مرض تھا۔ شاید وہ مرض نہیں' ایک کنواں تھا جسے نوراں محنت مزدوری کر کے پاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

خدا بخش کا ڈھائی کمروں کا ایک نیم پختہ مکان تھا جس میں وہ ماں باپ کے انتقال کے بعد سے تنہا رہ رہا تھا اور اس کی عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ کچھ عجیب سے اتفاقاتِ زمانہ کے تحت آج تک اس کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ قدرت کی مزید ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے مکان کے دروازے کے عین قریب کارپوریشن والوں نے ایک نلکا نصب کر دیا تھا۔ اس نلکے سے زیادہ تر عورتیں ہی پانی بھرنے آتی تھیں اور ان میں نوراں بھی ہوتی تھی۔

پانی عام طور پر اس وقت آتا تھا جب خدا بخش مزدوری سے واپس آ چکا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا کہ نوراں سب سے آخر میں آتی اور نل پر اکیلی ہوتی۔ خدا بخش چھپ چھپ کر ایسے موقعوں کا انتظار کیا کرتا اور دروازے کی جھری میں آنکھ لگا کر دیکھتا رہتا کہ بات کرنے کا کوئی موقع نکلے۔ یوں بھی گلی میں کبھی کبھار ٹکراؤ ہونے پر گہری گہری نظروں سے نوراں کو دیکھنا اور اپنی مونچھیں پھڑپھڑاتے ہوئے مسکرانا خدا بخش کا معمول تھا لیکن اس ہرجائی نوراں نے کبھی اتنا بھی نہ کیا کہ ایک اچٹتی سی نظر اس کی چوڑی چھاتی' لمبے قد اور ورزشی بازوؤں پر ہی ڈال لیتی۔ کمبخت آنکھ اٹھا کر ہی نہیں دیکھتی تھی۔

نل پر ایک بار اسے اکیلی دیکھ کر خدا بخش نے بڑے اشتیاق سے دروازہ کھولا اور چوکھٹ پر کھڑے ہو کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "بادشاہو! کبھی ہم پر بھی نظر ڈال لیا کرو۔ غلام ہیں تمہارے۔"

نوراں نے اپنی کٹورا سی آنکھوں سے پلکوں کی جھالر اٹھائی اور کرختگی سے بولی "غلامی کر جا کے اپنی کسی ہوتی سوتی کی۔۔۔ میرے سے زیادہ بکواس کی تو ناک منہ برابر کر دوں گی۔"

خدا بخش کا عشق ایک پھٹکار میں ٹھنڈا ہونے والا نہیں تھا کیونکہ اس کی عمر تیس سے اوپر اور صحت بہت اچھی تھی۔ اس

نے ہمت نہ ہاری اور موقع میسر آتے ہی ایک آدھ فقرہ جڑ دینا اپنا معمول بنائے رکھا مگر نوراں کا لہجہ نہ بدلا۔

وہ شروع گرمیوں کی ایک ناخوشگوار سی رات تھی۔ اپنے گھر کے صحن میں لوہے کی چارپائی پر لیٹے لیٹے خدا بخش کا جسم اینٹھا جا رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ اچانک دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ دستک اتنی ہلکی تھی کہ پہلے تو خدا بخش نے اسے اپنا واہمہ سمجھا۔ جب دوبارہ کسی نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ اٹھا اور دروازے کے قریب جا کر اس نے پوچھا "کون ہے؟"

"کھولو۔" ایک سرگوشی سی ابھری اور خدا بخش کا دل یک لخت کنپٹی میں آ کر دھڑکنے لگا اور اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سہمی ہوئی سی نوراں یکدم اس کے بازوؤں میں آ گئی۔ خدا بخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دھندلی سی چاندنی میں اسے نوراں کی آنکھوں کے کنول کاجل کے ڈوروں سے سجے نظر آئے لیکن اس کا گورا چہرہ کچھ ستا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ آنگن میں بچھی چارپائی پر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ آج گویا نوراں کچھ کہے بغیر ہی سراپا سپردگی تھی۔ خدا بخش گلے شکوے کرتا رہا اور وہ ہونٹوں پر بے عنوان سی مسکراہٹ لیے سنتی رہی۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔ یکایک جیسے سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ نوراں کو آج جیسے کسی بھی بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں کمرے سے نکلے تو نوراں کی نگاہیں کسی انجانے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں جبکہ خدا بخش گویا ہواؤں میں اڑا جا رہا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے کندھا ملائے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے نوراں نظریں جھکا کر انگلی پر آنچل لپیٹتے اور کھولتے ہوئے بولی "خدا بخش! مجھے چار سو روپے چاہئیں۔"

خدا بخش کے لیے یہ اتنی معمولی رقم نہیں تھی لیکن اس وقت تو وہ نوراں کی فرمائش پر پھڑک کر جان بھی دے سکتا تھا۔ شاہانہ انداز میں بولا "میری جان! تیرے لیے تو پوری عمر کی جمع پونجی حاضر ہے۔ چار سو روپے کیا چیز ہیں۔"

وہ جلدی سے اندر گیا اور آٹے کے ڈبے میں چھپائی ہوئی تھیلی میں سے چار سو روپے نکال لایا۔ روپے نوراں کو دیتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا "پھر کب ملو گی؟"

"جب بھی موقع ملا" نوراں کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"ہاں۔ تمہیں اس مریل مردود سے کہاں فرصت ملتی ہے جو چارپائی پر پڑا ہے اور تمہاری جان نہیں چھوڑتا" خدا بخل جل کر بولا۔ نوراں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا "ویسے اب کیا حال ہے اس کا؟"

"اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں لکھ کر دی تھیں۔ اور کہا تھا اگر یہ نہ آئیں تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ گھر میں ایک پیسہ نہیں اور دوائیں میں نے پوچھی تھیں۔ لگ بھگ چار سو کی آئیں گی۔ بہت مجبور ہو گئی تھی۔ اسی لیے تو آئی تھی تیرے پاس۔ ورنہ میں تو تیری شکل پر تھوکتی بھی نہیں۔"

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر رخصت ہو گئی۔ خدا بخش کی ٹانگوں میں گویا جان نہ رہی اور اونچی فضاؤں سے وہ دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ ایک معذور آدمی کے مقابلے میں وہ ایک بار پھر سو نمبر ہار گیا تھا۔

متوسط عورت

حمیرا کو شروع شروع میں تو حیرانی ہوئی پھر یہ حیرانی، تشویش میں بدلتی چلی گئی۔ اس کا شوہر اعجاز نئی پڑوسن مسز حمید کے ہاں اس اہتمام سے جانے لگا تھا جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دعوت پر جا رہا ہو۔ کپڑے بدلتا، بال بناتا، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بار بار گالوں پر ہاتھ پھیر کر دیکھتا، پرفیوم لگاتا۔ وہ پہلے نہایت کفایت شعاری سے صرف خاص خاص موقعوں پر ہی لگاتا تھا۔

کہنے کو وہ مسز حمید کے کمپیوٹر پر اپنے دفتر کا کچھ فاضل کام نمٹانے جاتا تھا لیکن حمیرا سوچے بغیر نہ رہ پاتی کہ کیا کمپیوٹر پر کام کرنے کے لیے یہ سارا اہتمام ضروری تھا؟

مسز حمید چند ماہ پہلے حمیرا کے پڑوس میں آئی تھیں۔ شروع شروع میں تو حمیرا کو محلے میں ان کا اضافہ خوش گوار محسوس ہوا تھا لیکن اب اس کے محسوسات کچھ بدل چکے تھے۔ مسز حمید کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ فراخ دل بہت تھیں۔ حمیرا نے لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی گھرانوں کی عورتوں میں بھی ان جیسی فراخ دلی نہیں دیکھی تھی۔ محلے پڑوس کے کئی گھروں میں روزانہ کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی خاص چیز، کوئی نہ کوئی نئی ڈش بھیجتے رہنا تو ان کا معمول ہی تھا لیکن آئے دن کسی نہ کسی کے ہاں۔ اور خصوصاً حمیرا کے ہاں کوئی چھوٹا موٹا تحفہ ضرور بھیج دیتیں۔ کبھی کوئی کلون، کبھی باہر کا صابن، کبھی کوئی کھلونا، کبھی کوئی اور چیز۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا ایک بہت پیارا بھتیجا باہر تھا اور وہ انہیں اس قسم کی چیزیں ان کی ضرورت سے زیادہ

بھیجتا رہتا تھا۔

اس کے علاوہ ان کے گھر میں بھی دنیا جہاں کی ہر چیز موجود تھی اور وہ کبھی کوئی چیز مستعار دینے سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس گلی میں شفٹ ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی پاس پڑوس میں بہت مقبول ہوگئی تھیں۔ حمیرا پر تو خصوصاً وہ بہت مہربان تھیں لیکن اب حمیرا سوچ میں پڑ گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اس کے بجائے اس کے ہینڈسم شوہر پر مہربان تھیں؟

وہ خود تو بیوہ تھیں لیکن ان کے انداز و اطوار بیواؤں والے نہیں تھے۔ خوب بنی ٹھنی رہتی تھیں۔ پہناوا بھی خوب تھا۔ خوش شکل بھی تھیں۔ حمیرا کے اندازے کے مطابق کم از کم پینتیس کی تھیں لیکن پچیس کی نظر آتی تھیں۔ ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ صرف بچوں کی خاطر جی رہی تھیں ورنہ شاید شوہر کے ساتھ ہی مر چکی ہوتیں لیکن ان کے طور طریقوں سے کچھ ایسا لگتا تھا کہ ان کی خواہش تھی، انہیں دیکھنے والا ہر مرد ان پر مرنے لگے۔

اعجاز کا ان کے ہاں آنا جانا یوں شروع ہوا کہ ان کے ہاں ایک عدد کمپیوٹر بھی مع پرنٹر موجود تھا جو بقول ان کے، مرحوم شوہر کی نشانی تھا جس پر اب ان کے دونوں چھوٹے بچے کبھی کبھار کمپیوٹر گیمز کھیلتے رہتے تھے۔ ان کا مرحوم شوہر ان کے بیان کے مطابق ان کے لیے اتنا کچھ چھوڑ گیا تھا کہ زندگی آسودہ حالی سے گزر رہی تھی۔ انہیں فکرمند ہونے یا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک بار جبکہ وہ حمیرا اور اعجاز کے ہاں آئی ہوئی تھیں اور باتوں باتوں میں کوئی ذکر نکلا تو اعجاز نے اپنے ایک دفتری پریشانی کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کے گھر میں کمپیوٹر ہوتا تو وہ اس وقت فلاں کام نمٹا لیتا۔ مسز حمید ایسے موقعوں پر بات سنی اَن سنی کرنے والی نہیں تھیں۔ وہ فوراً بول اٹھیں کہ ان کے ہاں جو کمپیوٹر موجود تھا وہ اگر اعجاز کے کسی کام آسکے تو انہیں خوشی ہوگی۔

یوں سلسلہ چل نکلا۔

رفتہ رفتہ تقریباً روزانہ ہی اعجاز کے گھر پر دفتر کے اضافی کام کے سلسلے میں کمپیوٹر کی ضرورت پڑنے لگی۔ وہ روزانہ ہی کوئی ڈسک اور کچھ فائلیں اٹھائے چلا آرہا ہوتا تھا۔ مسز حمید کا حمیرا کے ہاں آنا جانا تو برائے نام رہ گیا لیکن اعجاز تقریباً روزانہ ہی دو تین گھنٹے کے لیے حاضری دینے لگا۔ حمیرا نے اس دوران میں اپنی طرف اس کے التفات میں بھی کمی محسوس کرنا شروع کردی۔ یہ بڑی خطرناک علامت تھی۔ اسے اندازہ ہونے لگا کہ مسز حمید کتنی خطرناک عورت تھیں۔ اور ابھی وہ مزید خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔

حمیرا نے دو ایک مرتبہ دبی دبی زبان میں احتجاج بھی کیا کہ دفتر کا کام گھر پہ لانے اور پھر اسے پرائے کمپیوٹر پر کرنے کی تُک تھی۔ اگر دفتر والوں کو فاضل کام بھی کرانے کا شوق تھا تو انہیں اعجاز کو گھر پہ کمپیوٹر کا بندوبست کر کے دینا چاہیے لیکن اعجاز نے ذرا درشت لہجے میں اس پر واضح کردیا تھا کہ پرائیویٹ فرموں میں بعض ملازمتیں کرنا مذاق نہیں تھا۔ اہمیت جتانے اور مقام بنانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ وہ اس فرم میں نیا تھا۔ اگر وہ کارکردگی دکھانے سے فرمائشیں شروع کردیتا تو اس کا پتا صاف ہونے میں دیر نہ لگتی۔ دفتری سیاست ویسے ہی عروج پر تھی۔

حمیرا اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ اس کا کبھی اتنا حوصلہ نہ پڑا کہ جس دوران میں اعجاز، مسز حمید کے ہاں ہوتا تھا اس دوران میں جا کر دیکھنے یا سن گن لینے کی کوشش کرتی کہ وہ بجلی سے چلنے والے کسی کمپیوٹر پر دفتری کام میں مصروف ہے یا گوشت پوست کے کسی کمپیوٹر میں خواہشوں کا ڈیٹا فیڈ کر رہا اور تشنہ ارمانوں کی پروگرامنگ کر رہا ہے۔ ایسا کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی اسے اپنی توہین محسوس ہوتی اس کا مطلب تھا کہ اس میں اتنی بھی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کو صرف اپنا اسیر بنا کر رکھ سکتی۔ اس اعتراف کی حد تک جانے کو اس کا دل نہ مانتا۔

اعجاز کا مہینے میں بیس پچیس دن مسز حمید کے ہاں جانا دینا ایک معمول بن چکا تھا۔ حمیرا کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ نئے طلسم میں پوری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ کچھ نشانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی مدد سے ایک بیوی ایسی بات جاننے میں غلطی نہیں کر سکتی۔ ان کے اپنے بھی دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اعجاز کی اب تو ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں تھی اور تو اور۔۔۔ اب تو گلی کی عورتوں نے بھی اسے آمیزی نظروں سے حمیرا کی طرف دیکھنا شروع کردیا تھا۔

کبھی کبھی اسے غصہ بھی آتا کہ یہ بجلی کیا اسی کے آشیانے پر گرنی تھی؟ پھر اسے احساس ہوتا کہ اتفاق سے گلی میں وہ اس کا شوہر ہی سب سے کم عمر تھے اور گلی کے مردوں میں اس کا شوہر سب سے ہینڈسم اور خوش لباس تھا۔ حمیرا جب اس ناخوشگوار سی خلیج کے بارے میں سوچتی جو دھیرے دھیرے نمایاں ہوتی محسوس انداز میں اس کے اور اعجاز کے درمیان پیدا ہوتی جا رہی تھی تو اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ دنیا اس کی نظروں میں بے رنگ ہونے لگتی اور زندگی اسے بے مقصد نظر آنے لگتی۔

اس نے اس مسئلے پر بہت سوچا۔ بہت سوچا۔ کبھی کبھی تو سوچتے سوچتے اسے اپنے دماغ کی نسیں پھٹتی محسوس ہونے لگتیں۔ بہت سوچنے کے بعد آخر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ اس کا حل قدیر صاحب کے پاس تھا۔ قدیر صاحب پیشے کے اعتبار سے سنار تھے۔ صرافہ بازار میں ان کی خاصی چلتی ہوئی دکان تھی۔ وہ غالباً اُس گلی کے خوش حال ترین آدمی تھے۔ گلی میں جتنے لوگوں کے پاس گاڑیاں تھیں ان میں سب سے عمدہ اور تقریباً نئی گاڑی ان کی تھی۔ ان کا مکان سب سے اچھا تھا۔ گھر قیمتی ساز و سامان سے بھرا ہوا تھا۔ گلی میں کسی کو بھی جب زیور خریدنے یا بنوانے کی ضرورت پیش آتی تھی، وہ قدیر صاحب کی دکان پر ہی جاتا تھا۔

قدیر صاحب کو اللہ نے ہر طرف سے ہی نوازا تھا۔ اچھا گھر بار، بیوی بچے، روپیہ پیسہ سبھی کچھ تھا۔ بس شکل صورت کی طرف سے پورے خاندان کا ہی ذرا ہاتھ تنگ تھا۔ قدیر صاحب خود بھی ناٹے، گہرے سانولے اور قطعی بے کشش سے آدمی تھے۔ ادھیڑ عمر میں موٹاپے نے غلبہ پاکر تقریباً فٹ بال بنا دیا تھا۔ بیوی بچے ان سے بھی گئے گزرے تھے لیکن اب حمیرا کی نظر میں یہ سب باتیں غیر اہم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اہم بات یہ تھی کہ قدیر صاحب کافی پیسے والے آدمی تھے اور حمیرا کو دیکھ کر کچھ زیادہ ہی باچھیں کھلایا کرتے تھے۔

دن چڑھے اعجاز کے دفتر جانے کے بعد اور بچوں کو اسکول بھیج کر حمیرا کبھی کبھی روز مرہ ضرورت کی کوئی چیز یا سبزی گوشت وغیرہ لینے قریبی دکانوں پر جانے کے لیے گھر سے نکلتی تو قدیر صاحب اکثر دکان پر جانے کے لیے تیار گیٹ پر کھڑے نظر آجاتے۔ ان کا نوکر گاڑی صاف کر رہا ہوتا تھا۔ گلی میں زیادہ تر لوگ دفتری قسم کے تھے۔ ذرا جلدی گھروں سے نکل لیتے تھے۔ قدیر صاحب دکان دار تھے اور دکان بھی زیورات کی تھی۔ وہ تقریباً گیارہ بجے ہی گھر سے نکلتے تھے۔

حمیرا کو دور سے ہی آتے دیکھ کر ان کے موٹے موٹے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہونا شروع ہوتی اور بٹن جیسی آنکھوں میں ایک خاص چمک آجاتی جو لحہ بہ لحہ تیز ہوتی چلی جاتی۔ حمیرا یہ سب دیکھ لیتی تھی لیکن بظاہر وہ انجان بنی سر جھکائے ان کے سامنے سے۔ لیکن سڑک کے دوسری طرف سے گزرتی چلی جاتی۔ قدیر صاحب متوقع سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہتے لیکن وہ شناسائی کے اظہار کے لیے ان کی طرف دیکھنے یا سر کو خفیف سی جنبش دینے کی بھی زحمت نہ کرتی۔

دل ہی دل میں اسے غصہ بھی آتا کہ اس کی قدردانی کے لیے کیا یہی بے ہنگم شخص رہ گیا تھا۔ اب وہ ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی۔ مانا کہ اعجاز چٹانہ پٹاخہ قسم کی مسز حمید کی طرف پھسل گیا تھا جو عمر میں شاید حمیرا سے ذرا بڑی ہی تھیں لیکن حمیرا کے خیال میں یہ اس کے اپنے حسن و کشش کو ناپنے کا پیمانہ نہیں تھا۔ مو تو ویسے ہی بیوی سے رسی تڑا کر بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈتا تھا۔ اور مسز حمید تو خاصا خوب صورت اور دو کا بہانہ تھیں۔

کافی دنوں کی ذہنی ریاضت کے بعد حمیرا کی حکمت عملی وضع ہو گئی۔ گلی سے گزرتے وقت حمیرا نے ان کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرانا اور سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ سلام کرنا شروع کر دیا۔ قدیر صاحب تو ریشہ خطمی ہو گئے۔ ہر بار ایسا ہوتا تھا کہ جواب دینے سے پہلے وہ وہیں گیٹ پر ہی پھڑک کر پھاند دیں گے۔

پھر ایک دن حمیرا اچانک ان کی دکان پر جا پہنچی۔

زیورات تو اس کے پاس عرصے سے نہیں تھے۔ شادی کے ڈھائی تین سال بعد اعجاز کی بے روزگاری اور گھر میں مسلسل دکھ، بیماری کی وجہ سے ان پر ایک ایسا دور بھی آیا تھا جب حمیرا کے زیورات بک گئے تھے۔ شادی کے تھوڑے بہت ہی زیورات تھے۔ ان کے بکنے کے بعد اب تک دوبارہ بنانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ حمیرا کے پاس سونے کی تین چار ہی سی انگوٹھیاں اور ٹاپس کی ایک معمولی سی جوڑی تھی جو وہ ہی دھلوانے اور پالش کرانے کے بہانے آئی تھی۔

قدیر صاحب اسے دیکھ کر جتنے خوش نظر آرہے تھے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ حمیرا نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ ان کا اکلوتا سیلز مین ایک گاہک کو شیشے میں اتارنے میں مصروف تھا اور اس کلاگاہکوں کا دھیان کسی اور طرف نہیں تھا۔ قدیر صاحب کو حمیرا کی آمد کا مقصد جان کر کیا کچھ مایوسی ہوئی۔ تاہم باچھیں بدستور کھلی رہیں۔

"ارے۔ میں تو سمجھا تھا، آج آپ نے کچھ خریداری وغیرہ کے سلسلے میں ہمارے اس کباڑ خانے کو عزت بخشی ہے۔" قدیر صاحب انکساری کے ریکارڈ توڑنے پر تلے ہوئے تھے۔

"ہماری ایسی قسمت کہاں۔" حمیرا نے شوکیس میں رکھے تھوڑے سے زیورات کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ڈاکوؤں کے ڈر سے آج کل سنار شوکیسوں میں زیادہ زیور نہیں رکھتے تھے۔ بعض تو بالکل ہی نہیں رکھتے تھے۔ چار چھ چیزیں رکھ کر کام چلاتے تھے۔ صرف گاہک کی فرمائش پر اس کی ضرورت کے مطابق کسی محفوظ مقام سے کچھ نکال کر دکھاتے تھے۔

زندگی زندگاں کے لیے ایک نہ مٹنے والی گزیدہ کی خوں رنگ سرگزشت

بابر زماں خان کی آپ بیتی، جگ بیتی

اُس جوانِ رعنا کے زندگی کا رویّہ مختلف تھا

اُن کے لیے جن کے سینے دُھواں دیتے ہیں

آنسوؤں، آہوں، امنگوں اور حوصلوں کی داستان

عبرت اثر، حیرت انگیز و ناقابل فراموش

ہر جمعہ پر جو دلوں کی دھڑکن بنے کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے

قیمت فی حصہ ۱۲ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کتابیات پبلی کیشنز ● پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

وقار عظیم پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

حمیرا حسرت زدہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "سفید پوش لوگ ہیں۔ تنخواہ میں گزارہ ہی مشکل سے ہوتا ہے۔ کرائے کا مکان ہے۔ اتنی گنجائش کہاں نکلتی ہے کہ زیور بنوائیں۔"

"یوں دل چھوٹا نہ کریں اور ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کو کیا پتا آپ کا یہ حسرت بھرا لہجہ کسی کے دل پر قیامت ڈھا سکتا ہے۔ اس دکان کو اپنی ہی سمجھیں۔ جس چیز کو دل چاہے اٹھا لیجئے۔ وہ آپ کی ہو جائے گی۔ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ جب گنجائش ہو تب دے دیجئے گا۔ قسطوں میں دینے ہوں قسطوں میں دے دیجئے گا۔ میری طرف سے زندگی میں کبھی تقاضا نہیں ہوگا" قدیر صاحب نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ لہجہ قربان جانے والا تھا۔

"جی نہیں۔ ادھار لینے کے ہم قائل نہیں۔" حمیرا کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ ابھر آئی "اعجاز آج کل اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔ اگر کچھ رقم جمع ہو گئی تو پھر سوچوں گی۔"

"ہاں۔ اوور ٹائم تو واقعی لگا رہے ہیں۔" قدیر صاحب کے ہونٹوں پر کچھ اور طرح کی مسکراہٹ ابھر آئی "میں سارا دن گھر سے باہر رہتا ہوں لیکن گلی محلے کی خبریں بہرحال ملتی رہتی ہیں۔ اعجاز صاحب واقعی آج کل اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔ مسز حمید کے ہاں۔!"

حمیرا کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ وہ بہرحال اتنے گدھے نہیں تھے جتنے صورت سے نظر آتے تھے۔ آخر کاروباری آدمی تھے لیکن پھر حمیرا نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔ ایک طرح سے یہ اچھی ہی بات تھی۔ کاروباری آدمی سے سودا طے کرنا آسان ہوتا تھا۔

قدیر صاحب گویا اس کی تحقیر ہوتی رنگت سے ذرا گھبرا کر بولے "معاف کیجئے۔ یونہی ذرا زبان پھسل گئی۔ لعنت بھیجئے۔ گھروں کی بات گھروں پر ہی رہنے دیجئے۔ اس وقت ہم بازار میں بیٹھے ہیں۔ میری بات کو مذاق مت سمجھئے گا۔ قسم سے۔ خلوص سے کہہ رہا ہوں۔ جو چیز پسند ہو اٹھا لیجئے۔ بیس تیس ہزار کی کوئی بات نہیں۔"

"اور اگر چیز اس سے بھی زیادہ قیمتی کی ہو جائے تو۔؟" اس نے دل پر جبر کر کے ذرا شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

فرطِ مسرت سے قدیر صاحب کی بٹن جیسی آنکھیں تقریباً بند ہو گئیں۔ قدیر صاحب کی آنکھیں بٹن جیسی سہی لیکن وہ آنکھوں آنکھوں میں بھی سودا طے کرنے کے ماہر تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ عورت جب چاہے آنکھوں کی زبان بھی سمجھ لیتی ہے اور جب نہ چاہے تو اس کے آگے دل چیر کر رکھ دینا بھی بے کار ہوتا ہے۔ صبح سے شام تک کی نہایت سلیس اور عام فہم تقریر کو بھی وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی انجان بن جاتی ہے۔

"قیمت اس سے زیادہ ہو جائے تب بھی کوئی بات نہیں۔" وہ شاہانہ لہجے میں بولے "خوشی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس شوکیس میں سے اگر کچھ پسند نہ ہو تو دکان کے اوپر کمرا ہے۔ اصل مال وہاں رکھا ہے۔ چلئے۔ چل کر دکھاتا ہوں۔ وہاں ضرور آپ کو کچھ نہ کچھ پسند آجائے گا۔"

"بعض اوقات تو چیز پسند نہ ہونے کے باوجود خریدنی پڑ جاتی ہے" حمیرا بولی۔

"شاید۔" قدیر صاحب نے مبہم انداز میں اتفاق کیا "لیکن ہم پسند کے قائل ہیں۔ چیز پسند ہو تو پھر قیمت نہیں دیکھنی چاہیے۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیلز مین سے انہوں نے اپنی طرف کے کاؤنٹر کا بھی خیال رکھنے کو کہا۔ اس نے بے توجہی سے سر ہلا دیا اور قدیر صاحب حمیرا کے ساتھ باہر آگئے۔ دروازے کے قریب سے ہی تنگ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ اوپر قدیر صاحب نے دہرا حفاظتی بولٹ [illegible] کشادہ کمرا تھا۔ چاروں طرف الماریاں تھیں۔ ایک کونے میں کاریگر کے بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ چھوٹی مشینیں اور اوزار بھی سجے ہوئے تھے۔ ایک ہیڈ بھی لگا ہوا تھا جو شاید کاریگر کے آرام کرنے کے لیے تھا۔ کاریگر اس وقت نہیں تھا لیکن اس وقت تک حمیرا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ قدیر صاحب خود بھی کچھ کم کاریگر نہیں تھے۔

وہ چاروں طرف گھڑکیوں پر سجے ہوئے دیوزیروں کا جائزہ لینے کے بعد ان کی طرف مڑتے ہوئے گہری سانس لے کر بولے "بات دراصل یہ ہے کہ مجھے زیورات کی [illegible] نہیں۔"

"تو پھر۔؟" قدیر صاحب ذرا حیران ہو کر بولے اور حمیرا نے انہیں بتا دیا کہ اسے کس چیز کی ضرورت تھی۔

کافی دیر بعد جب وہ سیڑھیاں اتر کر جلدی سے ایک رکشے میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوئی تو اس نے قدیر صاحب کی دکان سے کوئی زیور نہیں لیا تھا اس کے باوجود اس کا پرس پہلے سے بھاری تھا۔

اس کے تیسرے دن اعجاز جب بن ٹھن کر مسز حمید کے ہاں جانے لگا تو حمیرا اس کی راہ میں حائل ہوتے ہوئے مٹھاس سے بولی "اب تمہیں محض کمپیوٹر کی وجہ سے آج دن مسز حمید کے ہاں جانے اور ان کا احسان لینے کی ضرورت نہیں رہی۔"

قہقہے ہی قہقہے
اُردو کے تفریحی ادب کا ایک نیا رُخ
طنز و مزاح سے بھرپور ہلکے پھلکے رومانی ناول
آپ کے جانے پہچانے مشہور ادیب اشرف نعمانی کے قلم سے
فقط کی مرغی
قیمت ۲۰/- روپے
حکیمی ٹیکسی
قیمت ۲۰/- روپے
آپ کے سر پر
قیمت ۲۰/- روپے
بے وقوف
قیمت ۲۰/- روپے
شرارت
قیمت ۲۰/- روپے
بی وی کی تلاش
قیمت ۲۰/- روپے
اُلّو کی دُم
قیمت ۲۰/- روپے
مسٹر بداری
قیمت ۲۰/- روپے
اور سہی...
قیمت ۲۰/- روپے
یہ کتابیں اس وقت کے لیے ہیں
جب آپ بور ہو رہے ہوں
بور ہونا چھوڑیں، مسکرانا سیکھیں
تمام کتابیں آج ہی منگا لیں
ڈاک خرچ فی کتاب ۱۶ روپے۔ رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ وی پی ارسال نہیں کیا جاتا۔ پورے سیٹ کی قیمت ۲۵۰/- پیشگی ڈاک خرچ
کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس ۲۳ رمضان چیمبرز بلیو ایریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ۴۴۲۰۰

"کیوں؟" اعجاز نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس پر تمہیں مجھ کو شاباش دینی چاہیے۔۔۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم شاباش نہیں دو گے۔"

"کیسا کارنامہ۔۔۔؟" اعجاز کی حیرانی الجھن میں ڈھل گئی۔

"اب زیادہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش مت کرو اور صاف صاف بات کرو۔"

"صاف صاف بات اصل میں کچھ یوں ہے کہ تم مجھے خرچے کے لیے جتنے بھی پیسے دیتے ہو' ڈیڑھ سال سے میں نے اس میں سے کچھ بچت کر کے ایک کمیٹی ڈالی ہوئی تھی لیکن تمہیں نہیں بتایا تھا۔ کمیٹی ابھی چل رہی ہے۔ کچھ عرصے اور چلے گی لیکن میرا نمبر نکل آیا ہے اور میں نے اس سے بالکل ویسا ہی کمپیوٹر پرنٹر سمیت خرید لیا ہے جیسا مسز حمید کے ہاں ہے۔ معمولی سا استعمال شدہ ہے لیکن تقریباً نئے جیسا ہی ہے۔ اب یہ محتاجی ختم ہو گئی۔ تم دفتر پر جتنی چاہو دھاک بٹھا سکتے ہو۔"

دفتر پر دھاک بٹھانا تو بعد کی بات تھی' فوری طور پر تو چند سیکنڈ کے لیے کچھ یوں لگا جیسے اعجاز کا دل بیٹھ گیا ہو۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ آنکھیں یکدم بجھ سی گئیں۔ حمیرا اس کی وجہ سمجھتی تھی لیکن اسے امید تھی کہ یہ عارضی پژمردگی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ اب وہ سختی سے بھی اعجاز کو مسز حمید کے ہاں جانے سے باز رکھ سکتی تھی۔

اس کی روح گویا بے پناہ سکون اور اطمینان کی لہروں کے درمیان ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کی نظریں یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے اپنی محبت پر ڈاکا نہیں پڑنے دیا تھا!

امیر عورت

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رضا بے تحاشا پینے لگا تھا مگر یہ لت اسے شادی کے کافی عرصے بعد پڑی تھی۔ وہ عیاش نہیں تھا۔ بلانوشی بھی اس کی نظر میں عیاشی نہیں تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ اس میں حالات سے ٹکر لینے یا پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ بہت جلد ہار مان لیتا تھا۔ سہل پسند تھا۔ پریشانیوں کا ایک دور مسلسل شروع ہوا تو دھیرے دھیرے وہ شراب اور سلیپنگ پلز کا محتاج ہو گیا۔

ارم اس کی پریشانیوں میں شریک تھی اور جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ اس نے بھی کیا تھا لیکن کچھ عرصے سے گویا تقدیر بالکل ہی مخالفت پر اتری ہوئی تھی۔ اس دور میں جبکہ لوگ چیزیں بلیک کر کے راتوں رات ہزار پتی سے کروڑ پتی بن رہے تھے' وہ ہولناک رفتار سے پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ پہلے اس کی انڈسٹری دوالیا ہوئی۔ پھر شیئرز میں بھاری نقصان ہوا۔ پھر امریکیوں نے پی سی سی آئی پر شب خون مارا تو اس کے چند کروڑ ڈوب گئے۔ یہ اس کی آخری پونجی تھی۔

آخر ارم کے والدین نے اس کی مدد کی اور اس نے کاسمیٹکس کی چھوٹی سی نئی انڈسٹری لگائی۔ اس کاروبار میں پہلے سے زیادہ بجٹ پبلسٹی کا تھا۔ زیادہ سرمایہ تو اس شعبے میں چلا گیا۔ المناک کا حال یہ ہوا کہ کیمسٹوں کی غلطی سے سارا کیا کرایا مال دکانوں پر جا کر سوکھ گیا۔ ابھی انہوں نے صرف پیسٹ اور بیوٹی کریم متعارف کرائی تھیں۔ دونوں پروڈ اس بری طرح فلاپ ہوئیں کہ رضا کو خود بھی اپنے آپ شرم آنے لگی۔

یہ حالات تو اپنی جگہ تکلیف دہ تھے ہی۔ لیکن ان بھی زیادہ ارم کے لیے خود اپنے والدین کے رویے کس تکلیف تھے۔ دراصل شادی سے پہلے بھی ارم کے والدین کی را رضا کے بارے میں کچھ اچھی نہیں تھی۔ ان کے خیال رضا ایک قطعی بے صلاحیت نوجوان تھا۔ کسی بھی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے والدین میں ملنے والی صنعت و تجارت کو سنبھال سکے گا۔ اس کرنا تو دور کی بات تھی' ارم کے والدین کو اندیشہ تھا کہ وہ برقرار بھی نہیں رکھ سکے گا۔ اس کا بیڑا غرق کر دے گا۔ بعد حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کا تجزیہ درست ہی تھا لیکن وہ چارے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹی کی ضد کے آگے مجبور ہو تھے۔ ارم کا رضا پر دل آ گیا تھا۔ ارم کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔

وہ لاکھوں میں ایک قسم کی لڑکی تھی۔ ایسی شمع جس کی روشنی بہت دور دور تک جاتی تھی اور بہت دور دور سے پروانے کھنچے چلے آتے تھے مگر ارم نے ان سب کی طرف آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کی نگاہِ انتخاب صرف اور صرف رضا پر ٹھہر کر رہ گئی تھی۔

ارم کے والدین کئی پشتوں سے دولت مند چلے آ رہے اور کامیاب صنعت کار تھے۔ انہیں دولت کے استحصال کا تھا۔ ان کے رہن سہن میں سلجھاؤ' معمولات میں توازن مزاج میں ایسی متانت تھی جو نو دولتیوں کے حصے میں کم ہی تھی۔ ارم کی شخصیت کی تعمیر اسی متوازن ماحول میں ہوئی اس نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ حسن بھی خدا نے

فرماں بردار بیٹی

اُنیسویں صدی میں امریکا میں ماہر امراض دماغ کے طور پر ڈاکٹر ایس ویئر چل ایک بڑا نام تھا۔ وہ فلاڈلفیا میں رہتے تھے۔ موسم سرما میں ایک روز کئی گھنٹے مسلسل سرد جگہ میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ بے حد تھکے ہوئے تھے اور شام کے وقت اپنے گھر کی کرسی پر بیٹھے آرام کر رہے تھے کہ ان کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

کھٹکے سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اُٹھ کر باہر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی ہوئی کانپ رہی ہے۔ انتہائی سرد موسم میں اس نے پرانے سے کپڑوں کے اوپر صرف ایک بوسیدہ شال اوڑھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے ان سے درخواست کی کہ وہ چل کر اس کی ماں کو دیکھیں جس کی حالت بے حد خراب ہے۔

ہمدرد ڈاکٹر فوراً اپنا بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ چل دیے۔ لڑکی برف سے ڈھکی سڑکوں پر ڈاکٹر کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں ایک قدیم عمارت تک لے آئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر ڈاکٹر اوپر آئے جہاں انہوں نے ایک بیمار عورت کو بستر مرگ کے عالم میں پایا۔ ڈاکٹر کو اس کی صورت کچھ مانوس سی لگی۔ عورت کو ہوش آیا تو ڈاکٹر کو بھی یاد آ گیا کہ وہ اس کے گھر کی ملازمہ رہ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے تشخیص کی کہ اسے نمونیا ہے۔ انہوں نے مریضہ کو دوائیں دیں اور اس کی بیٹی کی خوب تعریف کی جس نے اتنے خراب موسم میں ماں کی جان بچانے کے لیے کئی میل دور جا کر انہیں اطلاع دی۔

وہ عورت کچھ حیران ہوئی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر رُندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ اس کی بیٹی تو ایک ماہ قبل انتقال کر چکی ہے۔ ڈاکٹر کو یقین نہیں آیا تو عورت نے بتایا کہ لڑکی کی شال اور جوتے چھوٹی الماری میں رکھے ہوئے ہیں' وہ خود دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نے الماری کھول کر دیکھا' وہاں ویسی ہی شال رکھی تھی جیسی انہوں نے اس لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ الماری میں رکھی ہوئی شال گیلی تھی اور جوتے بھی اور یوں طور پر اس رات کسی نے اسے استعمال نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر کو اس کے بعد وہ لڑکی کبھی نظر نہیں آئی۔

ے عطا کیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی تنگدلی اور رکھ کھاؤ میں وہی خاندانی وقار اور ٹھہراؤ شامل تھا جو اسے اور بھی زیادہ پُرکشش بنا دیتا تھا۔

وہ اگر نہایت معمولی سے لباس اور ہوائی چپلوں میں بھی ی عام سی دکان پر خریداری کر رہی ہوتی تب بھی کوئی سمجھ دار رکھنے والا آدمی بتا سکتا تھا کہ وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ بس شوہر کے انتخاب میں ذرا مار کھائی تھی۔ ارم کے دین نے رضا کے بارے میں اس کی ضد دیکھ کر اسے سمجھایا بجھایا تھا لیکن آخر کار ہتھیار ڈال دیے تھے۔

شادی کے بعد کے چند برسوں میں جب پے در پے ناکامیوں کے بعد رضا کے حالات خراب ہوئے تو ارم کے والدین نے معقول حد تک مدد بھی کی مگر اس سے آگے ان کی صول پرستی اور سخت مزاجی کی سرحدیں شروع ہوتی تھیں۔ اور پھر ان کی دوسری اولادیں بھی تھیں۔ وہ رضا کے ڈوبتے ے جہاز کو بچانے کے لیے انہیں سمندر میں دھکا نہیں دے تھے۔ خود کو فلاش نہیں کر سکتے تھے۔

ارم کو معلوم تھا۔ اور آج بھی اس کا پختہ یقین تھا کہ رضا ایک سلجھا ہوا' باکردار اور محنت کرنے والا شوہر تھا۔ کاروبار کے ان میں بھی مستعد تھا۔ لیکن تقدیر واقعی کوئی چیز ہے۔ اور پچھلے چند برسوں سے اس کی تقدیر ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہی تھی۔

اپنے مخدوش مستقبل کے خوف اور اپنا کاروباری مقام کھو دینے کی اذیت سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے شراب کا سہارا لیا۔ اس کے باوجود نیند نہ آتی۔ چنانچہ وہ خواب آور گولیاں کھاتا۔

"اب میرے سامنے ایک آخری موقع ہے۔" ایک روز اس نے ارم کو بتایا "ہالینڈ کی ایک اچھی فارماسیوٹیکل کمپنی کا ڈیلی گیشن یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ اپنے چار برانڈ یہاں بھی متعارف کرانا چاہتے ہیں جو دنیا میں بہت چلتے ہیں۔ یہاں بھی یقیناً ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں گے۔ ای میل اور فون کے ذریعے تو میرے ان کے ساتھ مذاکرات کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری کمپنی کی سابق ناکامیوں کو زیادہ نہیں کھنگالا اور روپے پیسے کے معاملے میں بھی ان کی ڈیمانڈز زیادہ لمبی چوڑی نہیں ہیں۔ ہم کھینچ تان کر کچھ بندوبست کر ہی سکتے ہیں۔ ابھی مقامی مقابلے باز بھی اتفاق سے میری جڑیں کاٹنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر یہ ڈیلر شپ مل جاتی ہے تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ چند برسوں میں ہمارے سارے نقصانات پورے ہو جائیں گے اور ہم دونوں ہاتھوں سے کمائیں گے۔"

ارم بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس سلسلے میں مرحلہ وار وہ اسے پہلے بھی بتاتا رہا تھا۔ پھیکی سی مسکراہٹ

کے ساتھ وہ بولا "دعا کرو۔"

"کیا تمہیں شک ہے کہ میری دعائیں تمہارے ساتھ نہیں ہیں؟" ارم بھی مسکراتے ہوئے بولی "لیکن آج کل شاید میری دعاؤں کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ بہرحال۔ گھبراؤ نہیں۔ کاروبار میں اتار چڑھاؤ تو آتے رہتے ہیں۔"

ایک عرصے سے اسے تسلیاں دینا ہی ارم کا کام رہ گیا تھا۔ رضا کی پھیکی مسکراہٹ اور اترا اترا سا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے اب بھی خود پر اعتماد نہیں تھا لیکن کوئی امید بھی جو اسے سنبھالا دے رہی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "کل شام سات بجے شیرٹن میں چیمبر آف کامرس کی طرف سے ہالینڈ کے وفد کے اعزاز میں ڈنر ہے۔ سارا کام وفد کے سربراہ مسٹر ڈیلیان فیکو کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی ہاں یا نہ پر ڈیلرشپ کا انحصار ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا' جیبیں ٹٹول کر ایک مڑا تڑا کارڈ نکالتے ہوئے بولا "کارڈ مسٹر اینڈ مسز کے نام ہے' تم چلو گی؟"

"ہاں۔ ضرور!" ارم نے جواب دیا۔

دوسرے روز وہ رضا کے ساتھ شیرٹن کے بینکوئٹ ہال میں موجود تھی۔ سادہ مگر خوب صورت لباس میں نہایت ہلکے اور بہت ہی سلیقے کے میک اپ کے ساتھ وہ ملکوتی حسن کی مالک اور نہایت باوقار نظر آ رہی تھی۔ غیر ملکیوں کی نظریں بھی اس کا طواف کر رہی تھیں۔ وفد کے سربراہ مسٹر ڈیلیان فیکو تو مشتاق حسن کے بڑے ہی مداح معلوم ہوتے تھے۔ وہ تو تقریب کے آخری مراحل میں اپنی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر پھرے جا رہے تھے۔ انگریزی وہ روانی سے بولتے تھے اور ارم کے سراپا کی انہوں نے بڑی تفصیلی تعریف کی تھی۔ وہ ایک بڑی کمپنی کے وائس پریذیڈنٹ تھے لیکن ان میں کچھ شاعرانہ جراثیم بھی معلوم ہوتے تھے۔ رضا نہ جانے کہاں اور کن لوگوں کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔

دوسرے دن جبکہ رضا آفس میں تھا' ارم نے گھر سے شیرٹن فون کیا اور مسٹر فیکو کے کمرے کا نمبر ملانے کے لیے کہا جو مسٹر فیکو گزشتہ شام خود بصد اشتیاق اسے دے چکے تھے۔ اس نے مسٹر فیکو سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے کمرے میں تنہا تھے اور آئندہ ایک گھنٹے تک ان کے تنہا ہی رہنے کا امکان تھا؟ اور یہ کہ کیا ان کا کسی کے ساتھ کوئی اپائنٹمنٹ تو نہیں تھا؟ جواباً اسے مسٹر فیکو کے مشتاقانہ لہجے سے اندازہ ہوا کہ اگر ان کا کوئی اپائنٹمنٹ تھا بھی تو وہ انہوں نے فوری طور پر کینسل کر دیا تھا۔

چند لمحے بعد ارم نے ریسیور رکھا اور تیار ہونے لگی۔ خاص اہتمام سے تیار ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر تنقیدی انداز میں آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور طمانیت سے مسکرا دی۔ اس کی رنگت بھی سرخ و سفید تھی اور اس کے بالوں میں بھی سنہرا پن جھلکتا تھا مگر اس کے ساتھ مشرقیت کی جو آمیزش تھی اس کی کشش بڑی قیامت خیز تھی۔ اور پھر اس کا سراپا۔!

ہر قدم پر ایک فتنہ جگاتی وہ باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھی اور شیرٹن کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس کے دو دن بعد رضا باہر سے گھر آیا تو گاڑی سے اترنے کے بعد گویا رقص کرتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور خوشی انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایک عرصے بعد ارم نے اس میں نوجوانی والا جوش و خروش اور چلبلا پن دیکھا تھا۔

اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندا تھا۔ انہیں لہراتے ہوئے وہ بولا "مل گئی ڈیلرشپ۔۔۔ بس۔۔۔ سمجھو۔۔۔ اب برے دن گزر گئے۔۔۔ درحقیقت مجھے ایسے ہی کسی بریک تھرو کی ضرورت تھی۔ میں خوا مخواہ ہی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔۔۔ ہاتھ پاؤں کیا مار رہا تھا یوں سمجھو ایک مار رہا تھا۔ کامل ایسا کوئی معرکہ میں نے پہلے مارا ہوتا!"

ارم مسکرا دی۔ اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ معرکہ کس نے مارا تھا لیکن اس کے لیے بس یہی خوشی کافی تھی کہ اس نے رضا کا مستقبل بچا لیا تھا اور آج وہ اسے اترا اترا کر دیکھ رہی تھی۔

رضا اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر رقص کے انداز میں چکر دینے لگا۔ آج تو وہ واقعی ایک بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ پھر اس سے بھی بڑی اور غیر متوقع خوشی اسے اس وقت ملی جب رضا نے اعلان کیا "آج سے میری شراب نوشی ختم۔۔۔ تم دیکھو گی اب میں بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ناکامیوں کو بھلانے کا سارا تھی اور اب میں ایک کامیاب انسان ہوں۔۔۔ کامیاب انسان۔۔۔!"

ارم نے آہستگی سے خود کو چھڑایا اور صوفے پر بیٹھ کر پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کیا واقعی ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے؟ مگر کون سی عورت۔؟

(قارئین ان کہانیوں کے سلسلے میں اپنی غیر جانبدارانہ رائے ضرور بھیجیں)

ڈاکٹر آتھر دو طرفہ سڑک کے درمیان بنے ہوئے تنگ مگر طویل پارک میں ایک بینچ پر بیٹھا چوک کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس کا دوست پولیس لیفٹیننٹ کریور بھی اس کے قریب آ بیٹھا۔ وہ غالباً گشت پر تھا۔ دونوں طرف کی سڑکوں پر ٹریفک سکون سے رواں دواں تھا۔ کوئی ہڑبونگ اور تیز رفتاری نہیں تھی۔ ایک زیادہ بھی نہیں تھا۔ چھوٹا سا وہ شہر مجموعی طور پر ہی پُرسکون معلوم ہوتا تھا۔ چوک میں چند موسیقار اپنا چھوٹا سا اسٹیج تیار کر رہے تھے۔ وہ ہر شام وہاں کھڑے ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اپنے اردگرد جمع ہو جانے والوں اور راہ گیروں کو وہ مفت میں اپنے فن سے محظوظ کرتے تھے۔

"ہمارا شہر بہت اچھا اور پُرسکون ہے۔۔۔" ڈاکٹر آرتھر نے اپنے دوست لیفٹیننٹ کریور کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

اس علاقے کے ایک باسی کا احوال جہاں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے

اپنے علاقے کے سکون اور امن و امان پر نازاں وہ لوگوں کے خیالات۔ ایک پولیس افسر تھا۔ اسے جدید شہر تھا کہ کیسے اس کا محکمہ ہی ختم کر دیا جائے دوسرا ڈاکٹر تھا اور امریکیوں کی آمد سے متفکر۔ وہ امریکیوں اور جرائم کو لازم و ملزوم سمجھتا تھا۔

بچاؤ

روبینہ رشید

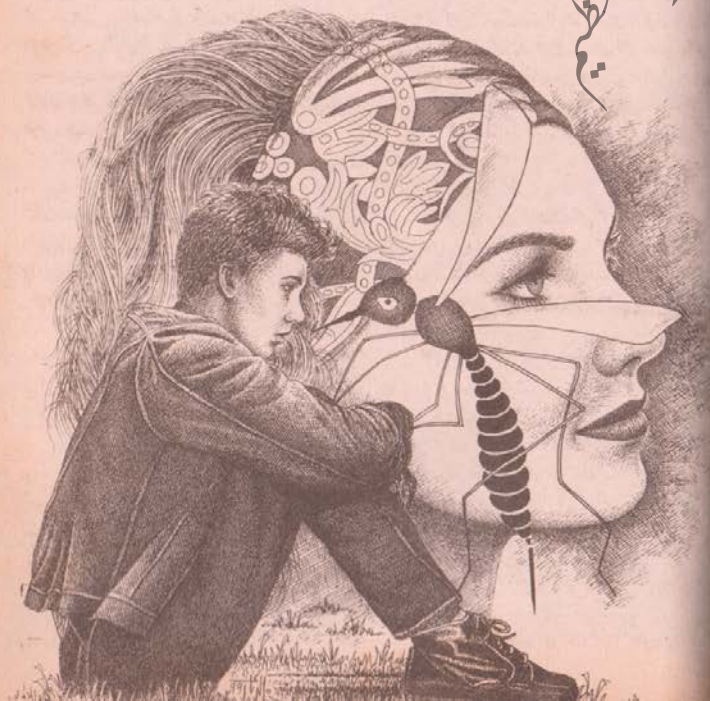

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"بے شک....." لیفٹیننٹ نے اس کی تائید کی "جرائم تو یہاں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پولیس کا محکمہ گویا محض نمائش کے لیے قائم ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے دھڑکا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا محکمہ ختم ہی نہ کردیا جائے۔"

"لیکن اب یہاں کافی تعداد میں امریکی آتے جارہے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ جرائم بھی لے آئیں گے۔ ہوسکتا ہے تمہاری زندگی سے یہ سارا آرام و سکون رخصت ہوجائے جو تمہیں اس وقت حاصل ہے۔" ڈاکٹر بولا۔

"ہم اس کے لیے بھی تیار رہیں گے۔" لیفٹیننٹ نے عزم سے جواب دیا۔

چند لمحے دونوں دوست خاموشی سے سگریٹ نوشی کرتے رہے پھر لیفٹیننٹ بولا "سنا ہے آپ کے امریکی دوستوں کا ایک جوڑا جو پچھلے دنوں یہاں آیا ہوا تھا' زرد بخار کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلا گیا ہے۔ خاصی افسوسناک خبر تھی یہ۔"

ڈاکٹر آرتھر نے متاسفانہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ "میں ان دونوں میاں بیوی کو اپنا دوست تو قرار نہیں دے سکتا لیکن بہرحال..... یہ ایک افسوسناک واقعہ تھا۔ وہ ان جنگلات کی سیاحت کے لیے جانے پر تلے ہوئے تھے جہاں کچھ تاریخی عمارتوں کے کھنڈرات موجود ہیں۔ انہیں بہت منع کیا گیا۔ خطرات سے آگاہ کیا گیا لیکن وہ وہاں جانے کی ضد پر قائم رہے۔ خود میں نے بھی انہیں اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہاں کا سب سے بڑا خطرہ تو زرد بخار ہی ہے جو مچھروں کی وجہ سے پھیل رہا ہے۔" لیفٹیننٹ کریور بھی افسوس سے بولا۔ "حکومت کو یا تو وہاں مچھروں کے خاتمے کے لیے بھاری رقم مختص کرنی چاہیے یا پھر سیاحوں کے اس طرف جانے پر پابندی لگادینی چاہیے۔ یہ پھر بھی جنگلی جانوروں کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔ پہلے تو کبھی وہاں زرد بخار کا نام تک نہیں سنا تھا۔"

"اوپر سے شہر میں ڈاکٹروں کے پاس زرد بخار سے بچاؤ کی دوائیں بھی نہیں ہیں حالانکہ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ ایسی دوائیں جلد درآمد کی جائیں گی اور ڈاکٹروں تک پہنچائی جائیں گی۔" ڈاکٹر نے شکوہ کیا۔

اچانک لیفٹیننٹ کریور نے پہلو بدل کر آرتھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ تم نے واقعی ان میاں بیوی کو جنگلات کی طرف جانے سے منع کیا تھا اور خطرات سے خبردار کیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے ان کی ہمت افزائی کی ہو اور زرد بخار کے خطرے کو بھی معمولی قرار دیا ہو..... کیونکہ میں نے سنا ہے....."

ڈاکٹر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "تم نے یقیناً کچھ افواہیں سنی ہوں گی..... کچھ اڑتی اڑتی باتیں سنی ہوں گی۔ اس سے پہلے کہ تم اس قسم کی افواہوں سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو' میں تمہیں اصل بات بتادیتا ہوں۔ سارا قصہ سنادیتا ہوں تاکہ تم غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔"

کریور سنبھل کر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تین سال کے لیے امریکا گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات سینورا جولیا مارٹن سے ہوئی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جو زرد بخار کا شکار ہوکر مری ہے۔ اس وقت یہ جولیا مارٹن نہیں بلکہ جولیا رابرٹس ہوا کرتی تھی۔ تم موت سے پہلے اسے دیکھ چکے ہو کہ وہ کتنی خوب صورت عورت تھی۔ کئی برس پہلے وہ اس سے بھی کچھ زیادہ خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ کم عمری کی اپنی بھی ایک خوب صورتی ہوتی ہے۔ وہ جہاں سے گزرتی تھی' مرد مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تھے۔

"میں نے بھی ایک بار مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی زلفوں کا اسیر ہوگیا۔ تمہیں معلوم ہے میں ایک دیانتدار اور با وجیہہ آدمی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت میں خود بھی آج سے زیادہ خوبصورت اور پُرکشش آدمی تھا تو امید ہے تم اسے مبالغہ آرائی یا خوستائشی نہیں سمجھو گے۔ وہ بھی مجھ پر مہربان ہوگئی اور اپنے طرزِ عمل سے اس نے مجھے کچھ عرصے کے لیے یقین دلادیا کہ اس کی زندگی میں بس میں ہی میں تھا اور وہ میں ہی میں تھی۔ صرف اسے ہمیشہ کے لیے پانے کی خاطر میں نے امریکا میں ہی مستقل رہائش اختیار کرنے اور وہیں پریکٹس کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

"مگر پھر رفتہ رفتہ مجھے پتا چلا کہ اس کے تو اور بھی کئی چاہنے والے تھے جن پر اس کی نظرِ عنایت بھی تھی۔ یہ حسین عورت چلتر کی دیوی پرانی کہانی ہے۔ میں نے اس قسم کی بہت سی کہانیاں سنی ہوں گی۔ اپنے انہی چاہنے والوں میں سے مارٹن نامی ایک شخص سے اس نے شادی کرلی۔ اس میں سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں تھی کہ وہ دولت مند تھا۔

ظاہر ہے یہ ایک سیدھی سادی کاروباری شادی تھی۔ جولیا نے اس کے بارے میں پہلے سے مجھے کوئی اشارہ تک نہیں دیا۔ زحمت نہیں دی اور یکدم یوں قطع تعلق کرلیا جیسے ہم میں کبھی آشنائی ہی نہیں تھی۔ اس نے رسماً مجھے الوداع کہنے کا بھی تکلف نہیں کیا۔ میں اپنے دل شکستہ کے ٹکڑوں کو سنبھالے واپس آیا اور اسے بھلانے کی کوشش کرنے لگا جس میں دھیرے دھیرے کامیاب بھی ہوگیا۔ ان باتوں کو چار برس گزر چکے ہیں۔"

"پھر جولیا اور مارٹن سیاحت کے لیے یہاں آئے اور اچانک تمہاری ان سے ملاقات ہوگئی" کریور ہربڑاتے کے سے انداز میں بولا۔

"اسے اتفاق بھی نہیں کہا جاسکتا....." ڈاکٹر سانس لے کر بولا "تمہیں معلوم ہے میرا چھوٹا بھائی رولف مقامی ہوٹل میں منیجر ہے اور وہ شہر کا سب سے شاندار ہوٹل ہے۔ ایک ماہ قبل اس نے میرے سامنے باتوں باتوں میں اعتراف کیا کہ وہ ہوٹل میں قیام کرنے والی ایک نہایت حسین اور معصوم عورت کے عشق میں گرفتار ہوچکا تھا جو ایک نہایت ہی سخت اور فضول قسم کے آدمی سے بیاہی ہوئی تھی۔ مارٹن کے بارے میں تو چلو اس کی رائے کو ٹھیک کہا جاسکتا تھا کہ وہ نہایت فضول آدمی تھا لیکن جولیا کو معصوم کہنا اس کی بے خبری اور بہت ہی بڑی ستم ظریفی تھی۔

"میں نے اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی لیکن جب آدمی کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوتا ہے تو اس کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آتا۔ دوسرے روز اس نے ہوٹل کی لابی میں مجھے اس جوڑے سے ملوادیا۔ اس نے اپنے اصل جذبات کو پوشیدہ رکھتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں تعارف کرایا۔ وہ اس کے ہوٹل میں ٹھہرنے والے ممتاز امریکی تھے اور میں شہر کا ممتاز ڈاکٹر تھا۔ اس قسم کی قیافتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جولیا نے ظاہر کردیا کہ وہ رسمی سے انداز میں مجھے پہلے سے جانتی تھی تاہم اس نے اپنے اجڈ اور خردماغ سے شوہر کو یہ اندازہ نہیں ہونے دیا کہ میں درحقیقت کبھی اس کی بیوی سے کس حد تک شناسا ہوا کرتا تھا۔ اس کے نزدیک میں بس ایک ڈاکٹر تھا جس کی خدمات کی کسی وقت ضرورت پڑسکتی تھی۔

"میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جولیا میرے خیالات پڑھ رہی تھی۔ اسے معلوم ہوچکا تھا کہ مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی وہ اپنے شوہر کے ساتھ کیا کررہی تھی بلکہ مجھے فکر صرف اس بات کی تھی کہ اس کے عشق میں مبتلا ہوکر میرے بھائی کا کیا حشر ہوگا۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ رولف کیسا وجیہہ اور خوب صورت نوجوان ہے لیکن وہ بالکل سادہ دل اور معصوم ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جولیا جیسی شاطر عورت کے جال میں پھنسنے اور پھر جلد یا بہ دیر ٹھکرائے جانے کے صدمے سے اس کا کیا حال ہوتا..... وہ کیا کر گزرتا۔ میں تو اس صدمے سے سنبھل گیا تھا لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ایک جذباتی نوجوان ہے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ جولیا اس پر رحم کھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی شیطنت اور ایک تحکم کا چیلنج تھا۔ وہ گویا مجھ سے کہہ رہی تھی تم اپنے بھائی کو میری شخصیت کے سحر سے بچاسکتے ہو تو بچا کر دکھاؤ۔"

فیروپائرین (رجسٹرڈ)
قائم شدہ 1976

★ فیروپائرین دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کردیتی ہے
★ فیروپائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگنا بند کردیتی ہے
★ فیروپائرین پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کرکے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے
★ فیروپائرین مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کرکے ورم اور سوزش اتارتا ہے
★ فیروپائرین مسوڑوں سے خون نکلنا بند کرکے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے
★ فیروپائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا بنانے کا سبب بنتے ہیں
★ فیروپائرین منہ میں گندگی اور بدبو دور کرکے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے
★ فیروپائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔

تیار کردہ:- فیر لیبارٹریز O/1084 غازی روڈ راولپنڈی۔ (051-72471)

"اس کا شوہر بھی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔" لیفٹیننٹ دھیمی آواز میں بولا "میں نے افواہیں سنی ہیں کہ یہاں آنے وقت وہ اپنے ملک سے کچھ قیمتی نوادرات چوری کروا کے اسمگل کر کے لے آیا تھا اور وہ اس نے کہیں ٹھکانے بھی لگا دیے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ یہاں سے جاتے وقت بھی وہ ایسی ہی کچھ ممنوعہ چیزیں لے جاتا۔ سنا ہے اس کی دولت مندی کا اصل راز یہی تھا۔ اس قسم کے کاموں میں جہاں اسے دشواری پیش آتی تھی وہاں بھاری رشوت سے راستہ صاف کر لیتا تھا۔"

"ممکن ہے۔۔۔ بہرحال مجھے اس بات سے زیادہ غرض نہیں تھی" ڈاکٹر بولا "میں نے تنہائی میں اپنے بھائی کو اس عورت کے بارے میں بتایا۔ اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہنس دیا۔ اس پر میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر میں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں چرچ میں جا کر اس کے لیے دعا بھی کی۔

"شاید یہ میری دعا ہی کا نتیجہ رہا ہو کہ دو دن بعد جولیا اور مارٹن نے جنگلات کے دورے کا پروگرام بنا لیا۔ زرد بخار کے بارے میں انہیں خبردار کر دیا گیا تھا۔ وہ میرے پاس آئے کہ میں انہیں زرد بخار کے علاج کے انجکشن دے دوں۔ وہ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس بھی جا چکے تھے مگر انجکشن نہیں ملے تھے۔ حفاظتی اور احتیاطی انجکشن بھی دستیاب نہیں تھے۔ میں بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میرے پاس بھی وہ انجکشن نہیں تھے۔ تاہم میں نے انہیں یہ مشورہ ضرور دیا کہ وہ وہاں نہ جائیں، میں صرف یہی کر سکتا تھا۔"

"یہ مشورہ دے کر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا" لیفٹیننٹ بولا "ورنہ تم اپنی زبان بند بھی رکھ سکتے تھے، اپنے بھائی کی خاطر۔"

"میں بہرحال ایک ڈاکٹر ہوں۔۔۔" آرتھر بولا "میں نے نہ صرف انہیں روکنے کی کوشش کی بلکہ جب میری توقع کے مطابق انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں نے انہیں ایک اور مفید مشورہ بھی دیا۔۔۔ اور وہ یہ کہ وہ اپنے ساتھ مچھروں کو بھگانے والی وہ دوا لیتے جائیں جو جسم کے کھلے حصوں پر مل لی جاتی ہے تو مچھر قریب نہیں آتے اور کاٹ نہیں پاتے۔ یہ بھی ایک طرح سے زرد بخار سے بچاؤ کا طریقہ تھا۔ اگر انجکشن دستیاب نہیں تھے اور ان کا جانا ضروری تھا تو یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت میں نے ہی انہیں وہ دوا تیار کر کے دی۔"

"کیا وہ کسی دکان سے نہیں خرید سکتے تھے؟" لیفٹیننٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارے شہر کے بارے میں ان کی رائے بہت خراب ہو چکی تھی۔ ان کے خیال میں یہ ایک گھٹیا اور پسماندہ شہر تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ان دکانوں سے انہیں گھٹیا اور غیر مؤثر دوا جعلی دوا مل جائے چنانچہ جب میں نے پیش کش کی کہ وہ دوا میں تیار کر دیتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کے خیال میں ایک اعلیٰ کوالیفائڈ ڈاکٹر کی تیار کردہ دوا بھروسے کے قابل ہو سکتی تھی۔ اس نے یہ حکم بھی دیا کہ اس دوا میں کسی قسم کی خوشبو یا بدبو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ دوا کی تیاری کے عوض وہ اچھی خاصی رقم بھی دینے کے لیے تیار تھا۔ میں اس پیشہ ورانہ پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ آخر میں ایک غریب ملک کا ڈاکٹر ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ اس میں تو شک نہیں۔۔۔ ہمارا ملک بے حد غریب ہے" لیفٹیننٹ نے اس سے اتفاق کیا۔

"لیکن افسوس کہ میری تیار کردہ وہ دوا بھی انہیں مچھروں سے نہیں بچا سکی۔۔۔ یا شاید انہوں نے بے پروائی برتی یعنی دوا سرے سے استعمال ہی نہیں کی۔۔۔ یا پھر صحیح طرح استعمال نہیں کی۔ زرد بخار سے موت ان کا مقدر ٹھہری" ڈاکٹر آرتھر نے افسوس زدہ لہجے میں کہا اور گہری سانس لی۔

"ان کی موت ایک افسوس ناک حادثہ تھی لیکن اس میں تعمیر کا بھی پہلو ہے کہ تمہارے بھائی کی زندگی بچ گئی" لیفٹیننٹ بولا۔

"ہاں۔۔۔ یہ تو درست ہے" آرتھر نے تائید کی۔

اسی دوران میں ایک بچہ کون آئس کریم کھاتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا۔ اس کی تھوڑی سی آئس کریم زمین پر گر گئی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر دیکھا پھر باقی آئس کریم کھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا "مچھر" پکڑ کرنے والی آئس کریم پگھلنے سے پگھل رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کچھ دیر میں پانی تو زمین میں جذب ہو جائے گا اور باقی 121 کا ہر ذرہ کچھ ہی دیر میں کیڑے مکوڑے چٹ کر جائیں گے۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن پر کیڑے مکوڑے لپک کر آتے تھے۔ اسے ان چیزوں کے بارے میں بھی معلوم تھا جن پر مچھر لپک کر آتے تھے۔۔۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر بولا "ہمارا شہر کتنا اچھا اور پُرسکون ہے۔"

"بے شک" لیفٹیننٹ نے تائید کی "جرائم تو یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

سینڈرا پیرس بعض حلقوں میں وائٹ کوئین کے نام سے مشہور تھی۔ اس وقت وہ ریکور کے پان پیسفک ہوٹل کی لابی کے مرمریں فرش پر کچھ اس طرح متحرک تھی جیسے کوئی بلی اپنے شکار کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس کی عمر پینتیس سے اوپر مگر چہرے پر نوجوانی کی تازگی و معصومیت تھی۔ چاندی جیسے سفید چمکیلے بالوں میں گھرا ہونے کی وجہ سے یہ چہرہ اور بھی اجلا اور بھی روشن دکھائی دیتا تھا۔

بعض لوگوں کو اس پر شوبزنس کی شخصیت کا گمان گزرتا تھا۔ یہ گمان حقیقت سے کچھ ایسا بعید بھی نہیں تھا۔ مختصر عرصے کے لیے وہ ایکٹرس بھی رہی تھی مگر پھر اس کی دلچسپی کچھ زیادہ منافع بخش کاموں میں بڑھ گئی تھی۔

اس وقت اس نے درحقیقت ریمنڈ ڈیلا کو لفٹ سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا اور وہ اسی کی طرف لپکی تھی۔ سینڈرا نے راستے میں اسے جا لیا۔

"ہیلو۔۔۔" وہ اپنے لہجے میں تمام تر دلکشی اور شیرینی سموتے ہوئے بولی "میں سینڈرا پیرس ہوں۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں لیکن شاید تمہیں یاد نہ ہو۔"

وہ ایک دراز قد عورت تھی لیکن ڈیلا اس سے بھی چند انچ لمبا تھا۔ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہی مسکرا کر بولا "میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔ ہماری ملاقات مونٹی کارلو میں ہوئی تھی۔۔۔ اور یہ کچھ ایسی پرانی بات بھی نہیں ہے۔ پچھلے موسم بہاری

محبوب چور کا تازہ ترین کارنامہ

جو شہرت اور محبت بنک ویلوٹ کو حاصل ہوئی، کسی دوسرے چور کے حصے میں نہ آسکی۔ موصوف کی وجہ شہرت معمولی اور بے وقعت اشیا چرانا ہے۔ اس بار اُسے سال گرہ کیک پیس سے موم بتیاں اُڑانے کا مشن سونپا گیا ہے۔۔۔ اور اس کی ساتھی حسب روایت ایک بڑے اور خطرناک کام میں ہاتھ ڈال بیٹھی ہے۔ ذرا پڑھ کر دیکھیے کہ ہوا کیا!

موم بتیوں کی چوری

طاہر پرویز

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کی توبات ہے..." ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "اگر تمہیں کوئی اور مصروفیت نہیں ہے تو ناشتا میرے ساتھ کرو۔"

"ضرور... ضرور... ناشتے کی تو ویسے بھی میری زندگی میں خصوصی اہمیت ہے۔" سینڈرا مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ زندگی کے اہم ترین معاملات ناشتے سے پہلے نمٹانے کی قائل تھی۔

ناشتے کے لیے وہاں بوفے کا بھی انتظام تھا اور مینیو دیکھ کر بھی آرڈر دیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے بوفے کا انتخاب کیا اور اپنی اپنی پلیٹیں لے کر ایک میز پر بیٹھنے کے بعد سینڈرا نے پوچھا "تم وینکوور میں کیسے نظر آرہے ہو؟ مجھے یاد پڑتا ہے مونٹی کارلو میں ہماری ملاقات کے دوران میں تم نے بتایا تھا کہ تم اسلحے کے ڈیلر ہو۔ کیا اپنے کام کے سلسلے میں یہاں آئے ہو؟"

"ہاں... اسلحے کا ڈیلر تو میں اب بھی ہوں لیکن اب یہ تجارت نزاد و سرسبز رہ گئی ہے۔ بڑے بڑے ملکوں نے اب آپس میں امن و امان کی پالیسی اپنالی ہے۔ اب مجھ جیسے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے آرڈرز پر گزارہ کرنا پڑتا ہے جن میں مسائل زیادہ ہوتے ہیں اور منافع کم۔"

سینڈرا نوالہ چباتے ہوئے بولی "کبھی اس قسم کے معاملات میں میں بھی کافی مددگار ثابت ہوا کرتی تھی۔ اب بھی شاید میں تمہارے کچھ کام آسکوں۔"

"کس طرح؟ میرے حریفوں پر اپنے حسن کا جادو چلا کر...؟" ڈیلا نے وضاحت چاہی۔

"میں تو ان کا جہاز چوری کرنے... یا یوں سمجھو کہ اغوا کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

ڈیلا ایک لمحے کے لیے ساکت ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا پھر گویا بے پروائی کے اظہار کے لیے قہقہہ لگا کر بولا "تم یقیناً مذاق کررہی ہو۔"

سینڈرا ایک سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے بولی "میرے مذاق کرنے یا سنجیدہ ہونے کا دارومدار تم پر ہے۔"

ڈیلا نے محتاط سے انداز میں ادھر ادھر دیکھا پھر نیچی آواز میں بولا "میرا خیال ہے ہمیں یہاں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"ناشتے کے بعد ہم چہل قدمی کرتے ہوئے بندرگاہ کی طرف جاسکتے ہیں اور راستے میں بات کرسکتے ہیں۔" سینڈرا نے تجویز پیش کی۔

○☆○

عین اس وقت وہاں سے ایک ہزار میل دور، ریٹو میں نک ویلٹ ایک متوقع کلائنٹ کے ساتھ ناشتا کررہا تھا۔ کلائنٹ ایک عورت تھی اور اس کا نام مونیکا بلانک تھا۔ نک اسے اپنے پیشے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا "میری عمومی فیس تیس ہزار ڈالر ہے۔ اگر کچھ غیر معمولی یا غیر متوقع اخراجات ہوجائیں تو وہ بھی کلائنٹ کے ذمے ہوتے ہیں۔ میں بے وقعت یا نہایت معمولی قیمت کی چیزیں چراتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے مسٹر ویلٹ!" مونیکا بلانک نے اطمینان سے کہا۔ وہ کیلی فورنیا کے پرانے دولت مند خاندانوں میں سے کسی کی فرد معلوم ہوتی تھی جنہوں نے اپنی زیادہ تر دولت تیل کی تجارت سے کمائی تھی۔

اس کا پس منظر، میک اپ، رکھ رکھاؤ اور ہیروں کی انگوٹھیاں دیکھ کر نک کا دل چاہا تھا کہ کم از کم اس کے لیے اپنی فیس دگنی کردے۔ وہ چالیس سے اوپر کی معلوم ہوتی تھی لیکن بظاہر اپنی عمر کم کرنے کی کوششوں میں کامیاب معلوم ہوتی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں آدھی فیس پیشگی ادا کردوں گی۔"

"آپ کیا چیز چوری کرانا چاہتی ہیں؟" نک نے پوچھا۔

وہ کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد بولی "ایک برتھ ڈے کیک کی موم بتیاں۔"

"ایک مرتبہ میں نے سالگرہ کا پورا کیک... موم بتیوں سمیت چرایا تھا۔" نک نے بر سبیلِ تذکرہ کہا "لیکن آپ کو صرف موم بتیاں چاہئیں؟"

"ہاں... صرف موم بتیاں۔" مونیکا نے تصدیق کی۔

"ان کے ساتھ کوئی قیمتی چیز تو منسلک نہیں ہے۔" نک نے دریافت کیا "کہیں ان پر ہیرے موتیوں والے تحفے چپکے ہوئے..."

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں..." وہ مسکراتے ہوئے بولی "میری معلومات کے مطابق وہ بالکل عام سی موم بتیاں ہیں۔ ایک درجن والے پیکٹ میں آتی ہیں اور ایک پیکٹ تقریباً ایک ڈالر کا ملتا ہے۔ ان کے ساتھ کوئی اور چیز منسلک نہیں ہے۔"

"اس وقت وہ کہاں ہیں؟" نک نے دریافت کیا۔

"اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کل شام وہ کہاں ہوں گی۔ کل شام میں اپنی سوتیلی بیٹی لس کی سالگرہ کے موقع پر ایک پارٹی دے رہی ہوں۔ سالگرہ کی یہ تقریب گرٹروپورٹ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں ہوگی جس کا نام "فرائزڈ ان" ہے۔ میری سوتیلی بیٹی کی پچیسویں سالگرہ ہے اور میں نے اس میں تقریباً مہمانوں کو مدعو کیا ہے جن میں بیشتر لس کے حلقۂ احباب ہی کے لوگ ہیں۔ ڈنر کے بعد رقص و موسیقی کا پروگرام بھی ہے۔ اسی وقت کیک بھی پیش کیا جائے گا۔"

"لس آپ کے شوہر کی پہلی بیوی سے ہے؟" نک نے دریافت کیا۔

مونیکا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "میرا شوہر بلانک اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ پانچ سال قبل وہ موٹر بوٹ لس کی ایک رالی کے دوران میں بوٹ سے گر کر ڈوب گیا تھا اور اس کی لاش بھی بڑی مشکل سے ملی تھی۔ بہرحال میں نے اس کی زندگی میں ہی اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی بچی کو اپنی حقیقی بیٹی سمجھ کر پالوں گی... اور میرا خیال ہے میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہے۔"

"اس طرح کے حادثے میں باپ کے سائے سے محروم ہونے کی وجہ سے لڑکی کو توبہ صدمہ پہنچا ہوگا؟" نک نے خیال ظاہر کیا۔

"اس سے زیادہ صدمہ تو مجھے پہنچا تھا کیونکہ وہ قرضوں کا ایک انبار چھوڑ گیا تھا۔ لس کو سر پر حال مالی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے دادا اس کے لیے برسوں پہلے ایک ٹرسٹ بنا کر چھوڑ گئے تھے جس کی وجہ سے اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور اس کا مستقبل بھی محفوظ ہے۔ مجھے البتہ ٹیکس ڈپارٹمنٹ والوں سے بڑی طویل جنگ لڑنا پڑی۔"

"لس کی اصل ماں کہاں ہے؟" نک نے دریافت کیا۔

"وہ نیویارک میں ہے۔ پہلے تو وہ کبھی کبھار لس سے ملنے آجاتی تھی لیکن کافی عرصے سے نہیں آئی۔ لس نے ہی مجھ سے فرمائش کی تھی کہ اس کی سالگرہ کے موقع پر میں اسے بھی مدعو کروں۔"

"آپ نے سالگرہ کے کیک کی موم بتیاں کیوں چوری کرانا چاہتی ہیں؟" نک نے پوچھا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ تم چوری کے مقصد کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے۔" مونیکا بولی۔

"کبھی کبھی میں متجسس ہوجاتا ہوں۔"

وہ ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "اس میں ایڈوانس آدھی فیس موجود ہے۔ مجھے امید ہے صرف اسی سے ہمارے تجسس کی تسکین ہوجائے گی اور تمہیں اس قسم کے سوالوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" نک نے مسکراتے ہوئے کہا اور لفافہ جیب میں رکھ کر چھوٹی سی ایک نوٹ بک نکالتے ہوئے بولا۔ "سالگرہ کی تقریب "فرائزڈ ان" میں ہے... یہ ہوٹل کیا ائرپورٹ کے بالکل قریب واقع ہے؟"

"ہاں۔" مونیکا نے جواب دیا "تم چاہو تو کام انجام دیتے ہی واپسی کی فلائٹ بھی پکڑ سکتے ہو۔"

"تجویز تو اچھی ہے..." نک نے سر ہلایا پھر پوچھا "کیک کس وقت مہمانوں کے سامنے لایا جائے گا؟"

"ڈنر کے بعد... ساڑھے آٹھ بجے کے قریب۔" مونیکا نے جواب دیا "لس کی حقیقی ماں کیک کا انتظام کررہی ہے۔ اس نے درخواست کی تھی کہ کیک لانے اور مہمانوں کے سامنے پیش کرنے کا موقع اسے دیا جائے۔ یہ اس کے لیے ایک اعزاز ہوگا۔ ظاہر ہے ہم انکار نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ کچن سے کیک ٹرالی پر رکھ کر وہی اس ہال میں لائے گی جہاں مہمان موجود ہوں گے۔"

"اسی موقع پر مجھے موم بتیاں چوری کرنی ہیں۔ اس کا مطلب ہے مجھے تیاری کے لیے کچھ زیادہ وقت نہیں ملے گا۔" نک سوچتے ہوئے بولا۔

"ایک بات اور..." مونیکا بولی "کسی کو چوری کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ کیک مہمانوں کے سامنے آنے سے پہلے اس کی موم بتیاں چوری ہوچکی ہیں۔"

نک ضروری باتیں اپنی نوٹ بک میں درج کرتے کرتے رک گیا "یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ میں کیک مہمانوں کے سامنے جانے سے پہلے اس کی موم بتیاں چرالوں اور مہمانوں کو اس بات کا پتا نہ چلے؟"

"اسی کام کا تو میں تمہیں معاوضہ دے رہی ہوں۔"

○☆○

وینکوور میں اپریل کی وہ صبح خاصی سرد اور کہر آلود تھی۔ سینڈرا پیرس اور ریمنڈ ڈیلا ٹھٹھرتے ہوئے بندرگاہ کے اس حصے کی طرف جارہے تھے جہاں لانچیں لنگر انداز ہوتی تھیں۔

"مجھے معلوم ہے تم لاطینی امریکا اور مشرق بعید میں کئی گروہوں کو ہتھیار فراہم کررہے ہو..." سینڈرا کہہ رہی تھی "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مرکز نامی ایک شخص تمہارے کاروبار کے لیے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔ یہ شخص چند سال قبل نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا ہے اور چھوٹے ہتھیاروں کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کا باپ بھی یہی علاقے میں..."

"تمہیں تو کافی معلومات ہیں۔" ڈیلا نے تبصرہ کیا۔

جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے کی دوا

فربینا

فربینا جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے کی یونانی دوا ہے، جو قدرتی طور پر ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں بازو، کمر، کولہے، گردن، کندھے اور چہرے کے گالوں پر گوشت میں اضافہ کر کے جسم بھرا بھرا، خوبصورت، موٹا تندرست بنادیتی ہے۔
فربینا شروع کرنے سے پہلے اپنا وزن نوٹ کرلیں اور ایک ماہ تک فربینا کی خوراکیں کھاتے رہیں ایک ماہ بعد اپنا وزن دوبارہ چیک کریں تو آپ کو فرق صاف نظر آجائے گا۔ مکمل طور پر قدرتی اجزا سے تیار کردہ قطعی بے ضرر یونانی مرکب قیمت -/۳۵۰ روپے وزن ایک کلو جو ایک ماہ کی مکمل خوراک ہے۔
ایک خط لکھ کر بذریعہ V.P منگوائیں۔

حکیم ارشد لیبارٹریز پوسٹ بکس 2608 اسلام آباد

"لیکن مرکم کے بارے میں دوسرے لوگوں کی طرح میری معلومات بھی کم ہیں۔ اس کا ماضی دھند میں چھپا ہوا ہے۔ صحیح معنوں میں تو کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس شخص کا تعلق کس قوم اور کس ملک سے ہے۔ اس کے بارے میں مجھ جیسے چند افراد کو بھی بس یہی معلوم ہے کہ اس نے حال ہی میں ایک پرانا روسی کارگو طیارہ خریدا ہے۔ یہ طیارہ اس نے اسی ہفتے لٹویا میں تیس ہزار ڈالر میں خریدا ہے۔ 'انٹونوف ۲۶' طیارہ ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

ڈیلا مسکرایا "تمہاری معلومات درست ہی ہیں۔ بس ان میں تھوڑا سا اضافہ یہ کرلو کہ کل صبح اس نے جہاز کا قبضہ بھی لے لیا ہے۔"

سینڈرا گھڑی دیکھ کر وینکوور اور لٹویا کے وقت کے فرق سے دل ہی دل میں حساب لگانے کے بعد بولی "تم وہ طیارہ حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

دراز قد ڈیلا ناک سکیڑتے ہوئے بولا "خالی طیارے کا مجھے کیا کرنا ہے۔ طیارہ مجھے اس سامان سمیت چاہیے جو اس پر لدا ہوا ہے۔"

"سامان غالباً چھوٹے ہتھیار ہوں گے؟" سینڈرا نے تصدیق چاہی۔

ڈیلا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "پچھتر پیٹیاں تو بلغاریہ کے بنے ہوئے ہتھیاروں کی ہیں جن میں تین سو کلاشنکوفیں اور ان کے بیس ہزار راؤنڈ بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ نائن ایم ایم کے پندرہ پستول چار ہزار راؤنڈز کے ساتھ ہیں۔ چھاپا ماروں کے لیے دو خصوصی رائفلیں ہیں جن کے ساتھ رات کے اندھیرے میں دیکھنے کی دوربینیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ دو سو راکٹ اور سات راکٹ لانچر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سو ہینڈ گرنیڈ بھی ہیں۔"

"تمہیں تو تمام اعداد و شمار زبانی یاد ہیں!" سینڈرا حیرت سے بولی۔

"اس کھیپ کی فروخت کے اصل بل کی ایک کاپی میرے خصوصی ذرائع سے آج مجھے ہوٹل میں بذریعہ فیکس موصول ہوئی ہے۔ میں اس بل کی بات نہیں کررہا ہوں جو اس کھیپ کی ترسیل کے دوران میں کاغذی اور قانونی کارروائی میں استعمال ہوگا۔ کاغذات کی رو سے اس جہاز میں مشینوں کے پرزے لدے ہوئے ہیں۔ یہ اسلحہ چھوٹی موٹی جنگ شروع کرنے یا کسی جنگ کو جاری رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ "سامان" کل سہ پہر جہاز پر لادا گیا ہے اور اس وقت جہاز پیسفک کو عبور کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف محوِ پرواز ہے۔ آج رات طیارہ ایندھن بھرنے کے لیے یہاں اترے گا اور صبح ناشتے کے وقت سے پہلے جنوب کی طرف پرواز کرجائے گا۔ یہ اندازہ ہے کہ اسلحے کی پیٹیاں پیراشوٹس کے ذریعے جنوبی میکسیکو میں برسرِپیکار گوریلا گروپوں کے لیے گرائی جائیں گی۔

تاہم مرکم جیسے آدمی کے معاملات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

"تمہاری یہاں موجودگی مجھے بتا رہی ہے کہ اس طیارے کے یہاں پڑاؤ کے دوران میں تم کچھ کام دکھانا چاہتے ہو۔" سینڈرا نے خیال ظاہر کیا۔

"میرے ایک ساتھی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ مرکم خود جہاز پر موجود ہے۔" ڈیلا نے بتایا "میں سوچ رہا ہوں کہ اس سے مل کر اسے پارٹنرشپ کی پیشکش کروں۔"

سینڈرا گویا اس تجویز کی مضحکہ خیزی پر ہنستے ہوئے بولی "مرکم نے جہاز بھی خرید لیا ہے۔ اس پر پائلٹ اور دوسرا عملہ بھی بھرتی کرلیا ہے۔ اسلحے کی کھیپ بھی خرید لی۔ اب وہ منزل کی طرف رواں ہے۔ اس مرحلے پر بھلا اسے پارٹنرشپ کی کیا ضرورت ہے.... اور وہ کیوں اس کے لیے رضامند ہوگا؟"

"میرے اندازے اور معلومات کے مطابق اسے اب بھی سرمائے کی کمی کا مسئلہ درپیش ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ اسلحہ اس نے پینسٹھ ہزار امریکی ڈالر میں خریدا ہے اور وہ ایک لاکھ پینسٹھ ہزار میں بکا ہے۔ منافع کے ایک لاکھ ڈالرز میں سے اس نے طیارے کی ادائیگی کی ہے۔ پائلٹ اور دیگر عملے کو معاوضہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی افریقہ میں اسلحے کی پیٹیوں کو پیراشوٹ کے ذریعے گرانے کے انتظامات کیے گئے تھے۔ ان پر بھی اچھا خاصا خرچہ آیا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس سودے میں مرکم کو کچھ زیادہ بچت نہیں ہوئی۔ خطرات کے مقابلے میں منافع بہت کم ہوگا۔"

سینڈرا نے دل ہی دل میں کچھ حساب لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری نظر میں طیارے اور سامان کی کیا قیمت ہے؟"

"طیارہ اور اسلحہ مرکم کو پچانوے ہزار ڈالر میں پڑا ہے۔ پیراشوٹس کے انتظامات پر جو خرچہ آیا ہے اسے جانے دو۔ وہ انتظامات میرے کسی کام کے نہیں۔ میں یہیں کے ائرپورٹ پر.... سفر کے اس مرحلے میں مرکم کو پچاس ہزار ڈالر منافع دے سکتا ہوں۔"

وہ بندرگاہ پر پہنچ چکے تھے جہاں سے ایک لانچ روانہ ہو کر دھند میں مدغم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ سینڈرا چند لمحے خاموشی سے اس طرف دیکھتی رہی پھر بولی "اگر تم ایک لاکھ ڈالر مجھے دو تو میں طیارہ اور سامان تمہیں دلوانے کی تدبیر کرسکتی ہوں۔"

"کیسی پاگل پن کی بات کررہی ہو۔ پچانوے ہزار ڈالر تو طیارے اور سامان پر اصل خرچ آیا ہے اور تم مجھ سے اصل رقم کے علاوہ ایک لاکھ ڈالر فالتو خرچ کرانے پر تلی ہوئی ہو۔" ڈیلا ناگواری سے بولا "اس سے کم خرچ میں تو میں خود معاملہ طے کرسکتا ہوں۔"

"ہوسکتا ہے تم کرلو.... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نہ کرسکو.... لیکن ایک بات طے ہے کہ تمہیں کسی اور گاہک کے لیے اسلحے کے اس جہاز کی ضرورت ہے جو تمہیں ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ڈالر سے

کہیں زیادہ رقم دے رہا ہے جو مرکم نے میکسیکن گوریلوں سے حاصل کی ہے۔"

"تم نے یہ تہیہ کیونکر اٹل فیصلہ کرلیا؟" ڈیلا نے اسے گھورا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہیں پیرا شوٹس والے انتظامات کی ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب ہے تمہیں اسلحے کی پیٹیاں پیرا شوٹس کے ذریعے گرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے تم جہاز کہیں لینڈ کرکے اسلحہ پہنچاؤ گے۔ تم مرکم کو آمادہ کرنے کی کوشش کروگے کہ وہ میکسیکن گوریلوں سے وعدہ خلافی کرے اور اسلحہ ان کے بتائے ہوئے جنگلوں میں گرانے کے بجائے تم سے سودے بازی کرلے۔ مجھے امید نہیں کہ وہ گوریلوں کو ڈبل کراس کرکے دہرا منافع کمانے کے چکر میں تمہارے ساتھ پارٹنر شپ پر آمادہ ہو لیکن اگر تم ایک لاکھ ڈالر مجھے دیتے ہو تو کل صبح ناشتے سے پہلے طیارہ اسلحے سمیت تمہارا ہو جائے گا۔"

ڈیلا مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "خاتون! تمہاری شرائط بہت سخت ہیں لیکن لگتا ہے مجھے تمہارے ساتھ سودا کرنا ہی پڑے گا لیکن میں بہرحال تمہیں ایک خطرے سے خبردار کردوں۔ جہاز پر موجود مرکم غالباً مسلح ہے۔ شاید تمہیں بھی پستول کی ضرورت پڑے۔ چاہو تو مجھ سے لے لو۔ میرے پاس موجود ہے۔"

"نہیں.... مجھے پستول کی ضرورت نہیں...." سینڈرا بولی۔ "بندوق پستول وغیرہ انسان کو ہمیشہ مصیبت میں پھنساتے ہیں۔"

○☆○

نک کو جب معلوم ہوا کہ سالگرہ کا کیک ٹس کی حقیقی ماں لائے گی تو اس نے فرمائش کی کہ اگر اصل وقت سے کچھ پہلے اس کی ملاقات اس خاتون سے کرادی جائے تو بہتر ہے۔

"میں اس کے آتے ہی تمہاری ملاقات اس سے کرادوں گی۔" ٹس کی سوتیلی ماں مونیکا بلانک بولی "اس کا نام ارما فائن ہے اور وہ آج شام چار بجے کی فلائٹ سے نیویارک سے پہنچ رہی ہے۔ تم میرے ساتھ چل کر ائرپورٹ پر اس سے مل سکتے ہو۔ ہم اسے ریسیو کرنے چلیں گے.... بلکہ ہمیں کچھ اور جلدی نکلنا چاہیے تاکہ تم ہوٹل فرائزان کو بھی اندر سے دیکھ لو۔"

اس طے شدہ پروگرام کے مطابق نک نے اس روز دو بجے اپنی کرائے کی کار میں مونیکا بلانک کو اس کے گھر سے لے لیا اور وہ فرائزان جا پہنچے۔ اعلیٰ درجے کے اس ہوٹل کی طرز تعمیر میں کسی گرجا گھر کی جھلک تھی۔ اس کے ریستوران اور پارٹی روم میں بیک وقت دو سو افراد کی ضیافت کے انتظامات موجود تھے۔ مونیکا نے بینکوئٹ منیجر کو بتایا کہ تقریب سے پہلے وہ اپنے اطمینان کے لیے پارٹی روم اور کچن وغیرہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے آئے تھے۔

معائنے کے دوران میں مونیکا نے نک کو پروگرام سے آگاہ کیا۔ "ساڑھے چھ بجے کاک ٹیل کا دور چلے گا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد ڈنر ہوگا۔ کیک کافی بڑا لیکن ایک ہی تہ کا ہوگا اور اس پر گلابی کریم سے "ہیپی برتھ ڈے ٹس" لکھا ہوگا۔ ارمانے کہا تھا کہ وہ خود ہی موم بتیاں لگا کر کیک ٹرالی پر رکھ کر باہر لائے گی۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ٹس کو شاید اس طرح اچھا محسوس ہو۔ کئی سال سے اس نے اپنی حقیقی ماں کو دیکھا تک نہیں۔"

نک نے پکن میں جھانکا۔ اس کا عقبی دروازہ پارکنگ لاٹ میں کھلتا تھا اور پارٹی روم میں کھلنے والے دروازے کے قریب' اندر ہی ایک خوب صورت ٹرالی کھڑی تھی۔ اس کے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کیک لے جانے کے لیے وہی استعمال ہوگی۔

ہوٹل سے نکل کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نک بولا "اگر تم چاہتی ہو کہ موم بتیوں کی چوری کا کسی کو پتا نہ چلے تو مجھے ان کی جگہ دوسری موم بتیاں لگانی ہوں گی اور یہ کام مجھے اس وقت کرنا پڑے گا جب موم بتیاں کیک پر لگ چکی ہوں گی' روشن ہو چکی ہوں گی۔"

وہ سوچتے ہوئے بولی "کیا اس موقع پر تمہیں اتنا وقت مل جائے گا کہ تم جلتی ہوئی موم بتیاں اتار سکو اور ان کی جگہ دوسری موم بتیاں لگا کر روشن کرسکو؟"

"میں نے ایک طریقہ سوچا ہے...." نک بولا "میں ایک فریم تیار کرکے موم بتیاں اس میں پھنسا کر رکھوں گا۔ اس کے ذریعے تمام موم بتیاں بیک وقت کیک پر لگائی جاسکیں گی۔ اس کے بعد وہ بالکل اپنی جگہوں پر تو نہیں لگیں گی جہاں پہلی موم بتیاں لگی ہوں گی لیکن کیک پر آئسنگ کریم جیسی مٹھاس کی موٹی تہ پر یہ فرق کوئی محسوس نہیں کرسکے گا۔ ایک تہ والے کیک پر تو موم بتیاں کہیں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"تم اصل موم بتیاں کیسے اتارو گے اور نئی موم بتیاں جلانے کے لیے تمہیں وقت کیسے ملے گا؟" مونیکا نے دریافت کیا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" نک بولا "اب ہمیں ائرپورٹ چلنا چاہیے۔"

وہ ریونو کے ائرپورٹ پر پہنچے تو نیویارک سے آنے والی فلائٹ پہنچ ہی رہی تھی۔ ارما فائن جہاز سے اترنے والی تیسری مسافر تھی جس سے نک نے اندازہ لگایا کہ وہ فرسٹ کلاس سے آئی تھی۔ وہ پچاس سے اوپر کی ایک خوش شکل اور خوش لباس عورت تھی لیکن اس کی شخصیت اور پہناوے میں مونیکا والا جگر گیلا پن نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس نے گویا مونیکا اور نک کو ایک نظر دیکھ کر ہی ان کے باہمی تعلقات کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلی۔

مونیکا نے بھی یقیناً اس بات کو محسوس کرلیا تھا۔ اس نے جلدی سے صفائی پیش کرنے والے انداز میں تعارف کرایا "ارما! یہ نک ویلوٹ ہیں۔ یہ میرے لیے کام کرتے ہیں۔" کام کی نوعیت کی وضاحت کرنا اس نے گویا ضروری نہ سمجھا۔

"ہیلو نک! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" ارما نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور مصافحے کے انداز نے نک کو بتا دیا کہ وہ اسے ملازم قسم کی چیز بہرحال نہیں سمجھ رہی تھی۔

وہ ایک شاپنگ بیگ اٹھائے ہوئے تھی جس میں گفٹ پیکنگ کے ساتھ ایک ڈبا نظر آرہا تھا جو یقیناً اس کی بیٹی کے لیے تحفہ تھا۔ نک نے گویا اخلاقاً وہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس جتھے کی طرف چل پڑا جہاں مسافروں کو اپنا سامان وصول کرنا تھا۔ مونیکا اور ارما اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ ان کے درمیان رسمی سی گفتگو جاری تھی۔

"میری بیٹی کیسی ہے؟" ارمانے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اچھی سی ملازمت کررہی ہے جو اسے پسند بھی ہے۔ ایک نوجوان سے اس کی ملاقاتیں جاری ہیں۔ شاید وہ جلد ہی ہمیں شادی کی خبر سنائیں۔"

"یہ تو اچھی خبر ہوگی۔ کیا گھر پہ اس سے ملاقات ہو سکے گی؟" ارمانے پوچھا۔

مونیکا کی ڈی دیکھتے ہوئے بولی "وہ اس وقت گھر پہ ٹس کے ساتھ ہی موجود ہوگا۔"

مونیکا کا مکان نما بہت شان دار اور بیتھوی سی ساخت کا تھا۔ نیم دائرے میں پھیلا ہونے کی وجہ سے اس میں سے دور تک کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ نک کو بھی گاڑی اندر لے گیا' ایک ملازم سامان اتروانے کے لیے لپک کر آیا۔ اندر پہنچ کر نک کی ملاقات ٹس سے بھی ہوئی۔ وہ نیلی آنکھوں والی ایک نہایت خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی جس کی جسمانی ساخت اور حرکات و سکنات نے نک کو سینڈرا پیرس کی یاد دلا دی جو کسی حد تک اسی سے ملتے جلتے پیشے میں تھی جو نک نے اختیار کیا ہوا تھا۔ چند ایک موقعوں پر انہوں نے ایک دوسرے سے تعاون بھی کیا تھا۔

ٹس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جس کا نام فرینک ڈیوٹ تھا۔ وہ دونوں اس وقت ٹینس کھیل کر آرہے تھے اور اسی کے لباس میں تھے۔ ٹس یوں اپنی حقیقی ماں سے ملی جیسے ایک آدھ دن پہلے بھی ان میں ملاقات ہو چکی تھی پھر اس نے ماں سے فرینک کا تعارف کراتے ہوئے کہا "شکر ہے آپ سالگرہ کے بہانے آگئیں ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ فرینک کو آپ سے متعارف کرانے کے لیے مجھے ہی اس کو ساتھ لے کر آپ کے پاس آنا پڑے گا۔"

"میں نے آپ کی بڑی تعریفیں سنی ہیں مسز فائن!" فرینک بولا۔

"میں شاید خوش نصیب ہوں کہ میری دو مائیں ہیں اور دونوں ہی مجھ سے پیار کرتی ہیں۔" ٹس' ارما سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"کل کی تقریب کے سلسلے میں اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو بتا دیں۔" نک نے مخلصانہ لہجے میں کہا۔

"کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" ٹس بولی "تمام کام ریستوران نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔"

"سوائے کیک پیش کرنے کے...." اس کی ماں نے تصحیح کی "یہ کام میں خود کروں گی۔"

"بہرحال میں آجاؤں گا۔ اگر کوئی کام ہوا تو مجھے بتا دیجئے گا۔" یہ کہہ کر نک نے اجازت چاہی تاکہ ارما اپنی بیٹی اور ہونے والے داماد سے گھریلو اور بے تکلفانہ ماحول میں بات چیت کرسکے۔ مونیکا اسے چھوڑنے دروازے تک آئی اور بولی "ابھی تک تو سب ٹھیک جارہا ہے۔ کل جب وہ کیک پکن سے باہر لانے کی تیاری کررہی ہوگی اس وقت تمہیں اپنا کام دکھانا ہوگا۔"

"میرا یہی پروگرام ہے۔" نک بولا۔

مونیکا نے دروازہ کھولا اور یک دم گویا اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔ سفید بالوں والا ایک شخص بریف کیس ہاتھ میں لیے سامنے کھڑا تھا۔ وہ دوسرا ہاتھ اٹھا کر کال بیل بجانے ہی والا تھا مگر اس سے پہلے مونیکا دروازہ کھول چکی تھی۔ وہ سنبھلتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی "مسٹر پرکنس! مجھے اس وقت آپ کی آمد کی توقع نہیں تھی۔"

وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے چھوٹے شیشوں کی عینک کے عقب سے بغور اس کی طرف دیکھ کر بولا "میں یہاں قریب ہی ایک جگہ آیا ہوا تھا مسز بلانک! میں نے سوچا دیکھتا چلوں' شاید آپ بھی گھر پہ ہوں۔"

مونیکا نے کچھ اور سنبھل کر تعارف کرایا "نک! یہ میرے وکیل مسٹر پرکنس ہیں۔"

پرکنس نے نک سے مصافحہ کیا اور دوبارہ مونیکا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "میں کل کی رسمی اور قانونی ضابطوں کی کارروائی کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن.... اگر یہ وقت مناسب نہیں ہے تو پھر کسی وقت...."

"ہاں.... یہ وقت بالکل مناسب نہیں ہے۔" مونیکا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی "میری سوتیلی بیٹی اس وقت اندر اپنی حقیقی ماں کے ساتھ موجود ہے۔"

"سوری!" وکیل نے معذرت کی "صبح میری سیکریٹری آپ کو فون کرکے کوئی اور وقت طے کرلے گی۔"

وہ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔ مونیکا ناگواری سے بڑبڑا کر رہ گئی۔ چند لمحے بعد نک بھی اپنی کرائے کی کار میں بیٹھ کر اس ہوٹل کی طرف چل دیا جس میں وہ مقیم تھا لیکن اس ضمن میں اس کی حیرت برقرار تھی کہ پرکنس کس سلسلے میں مونیکا سے بات کرنے اس کے گھر آیا تھا اور مونیکا اس سے ارما کی موجودگی میں بات کرنے کے تصور سے ہی خوف زدہ کیوں ہوگئی تھی؟ نک موم بتیاں چرانے کے طریقے کے بارے میں تو غور کررہا رہا تھا لیکن اس واقعے نے اسے کچھ دوسرے پہلوؤں کے بارے میں سوچنے پر بھی مجبور کردیا۔

○☆○

اس صبح بھی فضا میں کرباتی تھی جب مرکم' وینکوور کے ائر پورٹ پر جہاز سے اتر کر پختہ روش پر مستعدی سے قدم اٹھاتا ائر پورٹ کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ کھلی فضاؤں میں گزرا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے توانائی اور مستعدی عیاں تھی۔ وہ ابھی جہاز سے چند قدم ہی دور گیا تھا کہ اسے رکنا پڑا۔ راستے میں ایک شخص اس کا منتظر کھڑا تھا جسے اس نے فوراً پہچان لیا۔

"تم ڈیمنڈ ڈیلا ہو نا؟" اس نے جلدی سے کہا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا مسٹر مرکم!" دراز قد شخص نے جواب دیا۔

"میرے لیے یہ حیرت کا مقام ہے کہ تم سے یہاں ملاقات ہو رہی ہے۔" مرکم بولا۔

"میں تم سے کاروبار میں پارٹنر شپ کی بات کرنے آیا تھا۔" ڈیلا بولا۔

مرکم ناک سکیڑتے ہوئے بولا "ہم میں بھلا کیا پارٹنر شپ ہو سکتی ہے؟ میں تو تمہیں صحیح طور پر جانتا تک نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے اس طیارے میں کیا لدا ہوا ہے.... بلکہ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ میری جیب میں سودے کی اصل رسید کی کاپی بھی موجود ہے۔" ڈیلا کے نرم لہجے میں دھمکی پنہاں تھی۔

مرکم اس دھمکی سے متاثر ہوئے بغیر بولا "اس قسم کی باتوں میں دلچسپی صرف اس ائر پورٹ کے لوگ لے سکتے ہیں جو میرے جہاز کی اصل منزل ہو گا۔ راستے میں جہازوں کی تلاشی نہیں لی جاتی۔ یہاں جہاز صرف ایندھن لینے کے لیے رکا ہے۔"

ڈیلا نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہیں یہ دھمکی نہیں دے رہا کہ تمہارے سامان کے بارے میں حکام کو مطلع کر دوں گا۔ میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہے تمہارے مالی حالات اس وقت اچھے نہیں.... شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

"میری مالی حالت جلد ہی بہت بہتر ہو جائے گی۔" مرکم نے خشک لہجے میں کہا پھر ایک طرف دیکھتے ہوئے بولا "معاف کرنا.... میرا پائلٹ آ رہا ہے۔ شاید وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

ایک شخص جو روسی بھی ہو سکتا تھا' پائلٹ کی وردی اور یونی فارم میں ان کے قریب آن پہنچا اور بولا "میرا کو پائلٹ بیمار ہو گیا ہے۔ شاید اس کے لیے کھانا نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ہمیں کسی اور کو پائلٹ کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی.... یہ ایک کو پائلٹ موجود ہے۔" اس نے اپنے پیچھے آنے والے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا جس کے بال گھونگھریالے اور سیاہ اور رخساروں پر بڑھے ہوئے شیو کی سی نیلاہٹ موجود تھی۔

"اس کا نام کائل ہینڈرکس ہے۔" اس نے تعارف کرایا۔

مرکم نے نووارد کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے پوچھا "تم نے کتنے گھنٹے پرواز کی ہے؟"

"میرا پرواز کا تجربہ آٹھ سو گھنٹوں کا ہے۔" امیدوار کو پائلٹ نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کبھی انٹونوف ۲۶ اڑایا ہے؟"

"نہیں...." نوجوان نے تسلیم کیا "لیکن میں اس قسم کے بہت سے باربرداری کے جہازوں پر کو پائلٹ رہا ہوں۔"

"میں تمہارے موجودہ کو پائلٹ کو ہی رکھنا پسند کروں گا۔" مرکم نے اپنے پائلٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے ہمیں کم از کم ایک دن انتظار کرنا پڑے گا تاکہ اس کی طبیعت بہتر ہو جائے۔ فی الحال وہ جہاز کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں ہے۔" پائلٹ نے جواب دیا۔

"انتظار تو ہم نہیں کر سکتے...." مرکم نے گویا بہت مجبوری کے عالم میں امیدوار کی طرف دیکھا اور کہا "اچھا.... ٹھیک ہے ہینڈرکس! ہمیں تمہاری خدمات حاصل کرنا ہی پڑیں گی۔"

پائلٹ نووارد کو ساتھ لے کر جہاز کی طرف چل دیا تو ڈیلا بولا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا مرکم!"

"یہ خوش فہمی تمہیں کیونکر ہوئی؟" مرکم ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔

ڈیلا ایک لمحے خاموش رہا۔ جب پائلٹ اور اس کا ساتھی کچھ اور دور چلے گئے تب وہ بولا "مگر تم پارٹنر شپ کے لیے آمادہ نہیں ہو تو ایسا کرو کہ میکسیکن کی دی ہوئی رقم بھی رکھ لو اور میں تمہیں 'سامان' سمیت اس جہاز کے ایک لاکھ ڈالر دے دیتا ہوں۔"

مرکم آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے تمہارے پاس کوئی اور گاہک موجود ہے؟"

"تمہارا خیال درست ہے۔"

"لیکن میں میکسیکن گوریلوں کو ڈبل کراس نہیں کر سکتا۔ وہ میرا پیچھا کریں گے۔" مرکم بولا۔

"دنیا بہت بڑی ہے۔"

مرکم نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "تمہارا گاہک کون ہے؟"

"فی الحال میں یہ بات تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"وہ یقیناً یہ کیمپ تم سے بہت مہنگے داموں خرید رہا ہو گا؟" مرکم نے کریدا۔

"ہاں.... مجھے اس سے تین گنا زیادہ قیمت مل رہی ہے جتنی تمہیں میکسیکن گروپ نے دی ہے۔" ڈیلا نے جواب دیا۔

آخر مرکم ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میرے ساتھ جہاز میں سوار ہو جاؤ۔ راستے میں بات کریں گے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

جہاز پر ایک اور شخص پہلے سے موجود تھا جسے ڈیلا نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ مرکم نے اس کا تعارف مارٹن کے نام سے کرایا اور بتایا کہ وہ سامان کی نقل و حمل کا ذمے دار تھا۔ اس کے چوڑے کندھے بتاتے تھے کہ وہ اس کام کا اہل تھا۔ اسلحے کی پچھتر پیٹیاں سازوسامان کو قابو میں رکھنے والے مخصوص جال میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ان میں پیراشوٹ منسلک کرنے کے لیے کنڈے اور آہنی پٹیاں بھی لگی ہوئی تھیں لیکن ابھی پیراشوٹ جوڑے نہیں گئے تھے۔ ڈیلا کے حق میں یہ اچھا ہی تھا۔ اگر یہ سامان اس کے ہاتھ آ جاتا تو وہ پیراشوٹ علیحدہ کرانے کی زحمت سے بچ جاتا۔

"کیا ہم پرواز کے لیے تیار ہیں؟" مرکم نے پائلٹ سے پوچھا۔

"بس پانچ منٹ اور لگیں گے۔" پائلٹ نے جواب دیا "میں نے اپنے اور ہینڈرکس کے لیے ناشتا جہاز پر ہی منگوایا ہوا ہے۔ تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟"

مرکم نے ڈیلا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا "میں تو ناشتا کر چکا ہوں۔" اس نے کہا پھر نچلی آواز میں سودے کی بات کرو۔ میری جیب میں ایک سوئس اکاؤنٹ کا بیئرر چیک موجود ہے۔"

"ابھی خاموش رہو۔ ہیارہ پرواز کرنے لگے پھر بات کریں گے۔" مرکم بولا۔

انتظار کے لمحات کے دوران میں ڈیلا کچھ مضطرب ہونے لگا۔ وہ جہاز کی خالی جگہ میں ٹہلنے لگا۔ آخر پائلٹ نے اسے ایک طرف عملے کی ایک سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ باندھنے کی ہدایت کی۔ وہ اس ہدایت پر عمل کر چکا تو ہیارے کے انجن بیدار ہوئے اور چند منٹ بعد طیارہ فضا میں تھا۔

ڈیلا کا خیال تھا کہ ہینڈرا اب کچھ کرے گی لیکن اسے طیارے میں کہیں کوئی ہلچل نظر نہ آئی۔ کاک پٹ کا دروازہ بند تھا اور وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مرکم اور مارٹن کی طرف دیکھ کر بولا "میکسیکو تک کا سفر کتنی دیر کا ہے؟"

مرکم مسکراتے ہوئے بولا "پروگرام میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب ہم میکسیکو کے بجائے پہلے یوتاہ اور پھر نوید جا رہے ہیں۔"

اسی لمحے ڈیلا نے مارٹن کا ہاتھ اس کی بغل سے باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ ڈیلا نے بھی بجلی کی سی پھرتی سے اپنی گن نکال لی۔ دونوں بیک وقت ہی فائر کرنے میں کامیاب ہوئے....

○☆○

ٹس کی سالگرہ کے سلسلے میں مہمان "فرائیڈز ان" میں توقع سے کچھ پہلے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ نک ایک جگہ بیٹھ چکا تو اس نے دیکھا کہ اس کے قریب ہی مونیکا کا وکیل پرکنس بیٹھا تھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی سی رہتی تھی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی اس اکڑی ہوئی سی گردن میں ذرا حرکت پیدا ہوئی اور اس نے نک کی طرف دیکھا۔ چھت سے پھوٹتی ہوئی رنگین روشنیاں اس کی عینک کے شیشوں پر منعکس ہو رہی تھیں۔

"کل تم سے مسز بلاک کے گھر کے دروازے پر ملاقات ہوئی تھی...." وہ نک کو پہچانتے ہوئے بولا "لیکن میں یہ نہیں جان سکا کہ تم فیملی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ کیا تم ٹس کے انکل ہو؟"

"فیر رسی انکل سمجھ لیں...." نک نے خوش خلقی سے کہا۔

"میراٹس کی پچیسویں سالگرہ میں شریک ہونا ضروری تھا۔"

وکیل سر ہلاتے ہوئے بولا "اس لڑکی کی زندگی میں آج کے دن کی بڑی اہمیت ہے۔ میری اس فیملی سے شناسائی صرف چند برس کی ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مسز بلاک اور ان کی سوتیلی بیٹی ایک دوسرے سے کافی محبت کرتی ہیں۔ خصوصاً ٹس کے باپ کو تاہو جھیل پر حادثہ پیش آنے کے بعد تو ان میں قربت اور بھی بڑھ گئی۔"

ویٹروں نے میزوں پر کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔ نک نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا کہ ٹس اور اس کا متوقع شوہر فرینک ارسافائن اور ان کے چند دوسرے مہمان موجود تھے جنہیں نک نہیں پہچانتا تھا۔ وہ غالباً رشتے دار تھے۔

سلاد سجائی جا چکی تو نک نے سلسلۂ کلام جوڑا "ٹس کے باپ کو کشتی پر حادثہ پانچ سال پہلے پیش آیا تھا نا؟"

"ہاں...." وکیل نے جواب دیا "گو کہ میری اس وقت اس فیملی سے شناسائی نہیں ہوئی تھی لیکن مجھے یاد ہے کہ اخبارات میں اس حادثے کی خبریں آئی تھیں۔ کئی ہفتوں تک جھیل کو کنگالا جاتا رہا تھا۔ آخر کار ایک مسخ شدہ لاش مل بھی گئی تھی لیکن اس کے ایک مواد کے تجزیے سے ثابت ہوا تھا کہ وہ بلاک نہیں تھا۔"

"میں نے سنا ہے کہ ٹس کے دادا اس کے لیے ایک ٹرسٹ فنڈ قائم کر گئے تھے؟" نک سرسری سے لہجے میں بولا۔

کنس اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹس کے دادا سے بھی میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ سنا ہے کہ وہ بہت خوش حال آدمی تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے اپنی دولت پوتی کے نام چھوڑی۔ بیٹے کے نام چھوڑتے تو شاید وہ اسے ٹھکانے لگا چکا ہوتا یا پھر اس کی حادثاتی موت کی وجہ سے اس پر قانونی جھگڑے کھڑے ہو جاتے۔"

جب مہمانوں کا کھانے پینے کا سلسلہ تقریباً ختم ہو رہا تھا تو نک نے ارما کو اٹھ کر کچن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ یقیناً کیک لانے کے لیے جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ کے توقف سے نک بھی کچن کے دروازے پر جا پہنچا۔ اس نے جھانک کر دیکھا' ارما دو چھوٹے چھوٹے ڈبوں سے موم بتیاں نکال کر کیک پر لگا رہی تھی۔ اس کا اندازہ درست تھا کہ لڑکی کی سالگرہ کی مناسبت سے موم بتیاں گلابی رنگ کی ہوں۔ وہ بالکل عام سی موم بتیاں تھیں۔ کسی کے لیے خطرناک ثابت ہونے والی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

نک اندر چلا گیا اور اس نے ارما کا ہاتھ بٹانے کی پیشکش کی لیکن وہ ہاتھ ہلا کر اسے دور ہی رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اتنے برسوں بعد تو یہ موقع ملا ہے.... یہ کام ماں کو ہی کرنے دو۔"

اس نے موم بتیوں کے خالی ڈبے ایک طرف پھینک دیے اور دیا سلائی جلا کر موم بتیاں روشن کرنے لگی۔ ایک خانساماں بھی کچن میں موجود تھا اور یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ موم بتیاں روشن ہو چکیں تو ارما نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا "ٹرالی کہاں ہے؟"

خانساماں نے بھی اِدھر اُدھر دیکھا اور قدرے حیرت سے بولا۔

"وہ تو یہیں دروازے کے قریب کھڑی رہتی تھی۔"

نک کی توقع کے عین مطابق خانساماں اور ارما دونوں ٹرالی کی تلاش میں چلے گئے۔ نک نے اپنے ہاتھ جلدی سے سنک پر پانی میں گیلے کیے اور نہایت پھرتی سے موم بتیاں اتارتے ہوئے انہیں بجھاتا بھی چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ارما اور خانساماں تھوڑی سی دیر میں ہی ٹرالی اسٹور روم سے ڈھونڈ لائیں گے جہاں نک نے آج شام اسے خود چھپایا تھا۔

نہایت پھرتی سے اس نے موم بتیاں اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈالیں اور کچن کے ایک اونچے شیلف سے ایک فریم اتارا جو وہ تقریب سے پہلے وہاں چھپا گیا تھا۔ اس میں پچیس گلابی عام سی موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے فریم ہی کی مدد سے انہیں کیک پر جمایا اور فریم کھول کر علیحدہ کر لیا۔ کیک پر لگانے سے پہلے ہی وہ انہیں چولھے کی مدد سے روشن کر چکا تھا۔ فریم اس نے واپس اونچے شیلف پر پھینک دیا۔

موم بتیوں کی ترتیب میں تھوڑا سا فرق پڑ گیا تھا لیکن کچھ دیر بعد ارما ٹرالی تلاش کر کے واپس آئی تو وہ بڑی عجلت میں تھی۔ اس معمولی سے فرق کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔ نک نے ہی کیک کاؤنٹر سے اٹھا کر ٹرالی پر رکھا اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے جلدی سے پارٹی روم کی طرف چل دی۔ نک بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا جہاں مہمانوں نے "ہیپی برتھ ڈے" کی مشترکہ آوازوں اور تالیوں کے ساتھ کیک کا "استقبال" کیا۔

ٹس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا بہت اہم دن تھا!

○☆○

انٹونوف ۲۶ اس روز دوپہر سے پہلے رینو کے ائرپورٹ پر اترا۔ پائلٹ نے کنٹرول روم کو مطلع کیا تھا کہ اس کے جہاز پر ایمرجنسی پیش آگئی ہے اس لیے اسے شیڈول کے بغیر اترنے کی اجازت دی جائے۔ لینڈ کرنے کے بعد اس نے جو کہانی سنائی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جہاز کے پانچ افراد پر مشتمل عملے میں سے دو کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں نے گنیں نکال لی تھیں اور اتفاقاً دونوں ہی بیک وقت ایک دوسرے کی چلائی ہوئی گولیوں سے ہلاک ہو گئے تھے۔

دونوں آدمیوں کے نام ریمنڈ ڈیلا اور مارٹن بتائے گئے تھے۔ گو کہ اس وقت تک یہ طے نہیں ہوا تھا کہ واقعہ کس شہر کی فضائی حدود میں پیش آیا تھا اور اس اعتبار سے کہاں کی پولیس کی عمل داری میں آتا تھا تاہم رینو کی پولیس کو اطلاع دے دی گئی تھی اور سراغ رساں سارجنٹ رٹر فوری طور پر تفتیش کے لیے آن پہنچا تھا۔

رٹر ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ اگر اس کی عمر دس سال زیادہ ہوتی تو شاید سینڈرا اپنی وگ اور میک اپ اتار دیتی اور ایک عورت کی حیثیت سے اس سے بات کرتی لیکن اس وقت اس نے... کو پائلٹ ہینڈرکس ہی کی حیثیت میں رہنا بہتر سمجھا۔ رٹر اس سے پوچھ رہا تھا "فلائٹ کا اصل مقام روانگی کون سا تھا مسٹر ہینڈرکس؟"

"فلائٹ شاید مشرقی یورپ کے کسی مقام سے روانہ ہوئی تھی.... شاید لٹویا یا بلغاریہ سے....." ہینڈرکس نے جواب دیا۔ "لیکن میں شروع سے اس فلائٹ پر نہیں تھا۔ میری خدمات وینکوور میں حاصل کی گئی تھیں جہاں ان کا اصل کو پائلٹ بیمار پڑ گیا تھا۔" سینڈرا نہایت عمدگی سے مردانہ آواز میں بات کر رہی تھی۔ اس آواز سے وہ ماضی میں بھی بہت سے لوگوں کو بے وقوف بنا چکی تھی۔

"جہاز پر کس قسم کا سامان لدا ہوا تھا؟"

"غالباً کچھ مشینوں کے پرزے تھے۔" سینڈرا عرف ہینڈرکس نے جواب دیا۔

"اس وقت تو جہاز کا سامان والا حصہ خالی ہے۔" رٹر بولا۔

"گولیاں چلنے کے بعد جہاز نیچے آنے لگا تھا۔ مسٹر مرکم کو اندیشہ محسوس ہوا کہ کوئی گولی طیارے کے کنٹرول سسٹم میں کہیں لگ گئی تھی۔ طیارے کی پرواز صحیح رکھنے کے لیے ہمیں سامان سمندر میں پھینکنا پڑا۔" ہینڈرکس نے جواب دیا۔

"گولیاں کیسے چلیں؟"

"میں نہیں دیکھ سکا کہ واقعہ کس طرح رونما ہوا۔ میں پائلٹ کے ساتھ کاک پٹ میں تھا۔ ہم نے اچانک گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ پائلٹ اینڈروف نے کنٹرول مجھے دے دیا اور یہ دیکھنے باہر چلا گیا کہ کیا ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آکر بتایا کہ ڈیلا اور مارٹن نے ایک دوسرے کو گولی مار دی ہے۔"

سارجنٹ رٹر نے اپنی نوٹ بک کے کچھ ورق پلٹ کر دیکھے اور بولا "مرکم کا کہنا ہے کہ جہاز کی منزل میکسیکو تھی۔ کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں۔"

سارجنٹ چند لمحے اس کی شفاف نیلی آنکھوں میں جھانکتا رہا گویا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اسے ملنے والے جواب کہاں تک صداقت پر مبنی تھے۔ اس نے گویا رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے مزید چند سوالات کیے پھر بولا "ٹھیک ہے مسٹر

ہینڈرکس! اب آپ جاسکتے ہیں لیکن باہر کہیں قریب ہی رہیے گا۔ ابھی مجھے پائلٹ اور مسٹر مرکم سے مزید کچھ سوالات کرنے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد آپ سے بھی مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت پڑجائے۔"

سینڈرا ائرپورٹ کے کنٹرولا ونج میں جا بیٹھی۔ اسے کافی انتظار کرنا پڑا۔ خدا خدا کرکے پوچھ گچھ ختم ہوئی۔ آٹھ بجے کے قریب مرکم اور پائلٹ اینڈروٹ آتے دکھائی دیے۔ انہیں جانے کی اجازت مل چکی تھی لیکن پائلٹ کا خیال تھا کہ وہ آگے روانہ ہونے سے پہلے جہاز کو اچھی طرح چیک کرے گا۔ مرکم اور سینڈرا کے پاس امریکی پاسپورٹ تھے۔ سینڈرا کا پاسپورٹ کاٹل ہینڈرکس کے نام پر تھا۔ وہ دونوں امیگریشن کسٹم کے مرحلے سے گزرے جس کے بعد مرکم نے ذرا دیر کے لیے ایک طرف جاکر کسی کو فون کیا اور واپس سینڈرا کے پاس آگیا۔

"تمہارا اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" سینڈرا نے مردانہ آواز میں ہی پوچھا۔ اس کا لائحہ عمل کیا تھا اور جو سامان وہ اس کے لیے حاصل کرنا چاہتی تھی وہ اس وقت سمندر کی تہ میں کہیں پڑا تھا۔ اس اعتبار سے صورتِ حال اس کے لیے کچھ اچھی نہیں تھی اور وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرچکی تھی کہ جہاز پر واپس نہ جانا ہی اس کے حق میں اچھا تھا۔

"مجھے نک ویلوٹ نامی ایک شخص سے ملاقات کرنی ہے۔" مرکم نے جواب دیا "مجھے اس کو کچھ ادائیگی کرنی ہے۔"

نک ویلوٹ کا نام سن کر سینڈرا ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گئی۔ وہ رینو میں کیا کررہا تھا؟ وہ اسلحے سے بھرا ہوا جہاز چرانے کے کسی منصوبے میں تو ہرگز ملوث نہیں ہوسکتا تھا۔ سینڈرا بظاہر سرسری سے انداز میں بولی "میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔"

مرکم نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر بولا "ٹھیک ہے.... ضرور چلو۔ شاید مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہی پڑجائے۔ اکیلے جانے کی نسبت تمہیں ساتھ لے کر جانا بہتر ہے۔"

○☆○

جب رقص و موسیقی کا دور شروع ہوا تو مونیکا بلانک میزبانوں والی میز سے اٹھی اور چپکے سے ہال عبور کرکے ریستوران کے عقبی دروازے کے قریب تک سے ملی۔ نک وہاں اس کا منتظر تھا۔ وہ نک کو پارکنگ لاٹ میں لے گئی جہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا اور کچھ ہی دور ائرپورٹ کی حدود میں لینڈ کرتے اور ٹیک آف کرتے طیاروں کی بلنکتی بجھتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

نک نے موم بتیاں نکال کر مونیکا کے حوالے کیں جن کے نچلے سروں پر اس وقت بھی کیک کی تھوڑی بہت کریم لگی دکھائی دے رہی تھی "میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔" نک بولا۔

"کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟" مونیکا نے مسکراتے ہوئے موم بتیاں وصول کرنے کے بعد کہا۔

"نہیں.... خاصا آسان کام تھا۔" نک نے جواب دیا۔

"تمہارے معاوضے کی بقایا آدھی رقم بھی جلد ہی پہنچنے والی ہے۔ دراصل جس شخص نے رقم لے کر آنے کی ذمے داری قبول کی تھی اسے غیر متوقع طور پر ائرپورٹ پر کچھ دیر لگ گئی ہے۔" مونیکا نے بتایا۔

"کیا میری فیس تمہارے لیے اتنی زیادہ تھی کہ تم نے کہیں اور سے مالی مدد منگائی ہے؟" نک خوش مزاجی سے بولا۔

"دراصل میرا ایک پارٹنر ہے.... لو.... وہ آہی گیا...." وہ اس طرف دیکھ رہی تھی جدھر سے ائرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک پارکنگ لاٹ کے قریب سے گزر رہی تھی۔ ادھر سے دو آدمی پارکنگ لاٹ میں داخل ہورہے تھے۔ ان میں سے جو دراز قد تھا وہ تو عام لباس میں تھا۔ دوسرا پائلٹ کی سی یونی فارم میں تھا۔ اس کے رخساروں پر گوکہ ہلکی سی نیلاہٹ موجود تھی اس کے باوجود وہ لڑکا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جب ایک الیکٹرک پول کے نیچے سے گزرا تو نک کو اس کا چہرہ صاف طور پر دکھائی دیا اور اسے وہ کچھ مانوس سا محسوس ہوا۔

وہ قریب پہنچے تو بڑی عمر کا آدمی بولا "ہیلو مونیکا!"

"کیا ہوگیا تھا ائرپورٹ پر؟" مونیکا نے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت سناؤں گا۔ یہ ویلوٹ ہے؟" نو دارد نے نک کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں.... اور یہ لڑکا کون ہے؟" مونیکا نے اس کے ساتھ آنے والے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا کو پائلٹ ہینڈرکس ہے۔ کیا نک نے اپنا کام کردیا؟"

مونیکا موم بتیاں اسے دکھاتے ہوئے بولی "ہاں.... کام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کسی کو فرق کا محسوس نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ارانے بھی نہیں۔"

مرکم نے طمانیت سے سر ہلایا اور جیب سے ایک دبیز لفافہ نکالتے ہوئے بولا "یہ رہی میری طرف سے میرے ہم قسم۔"

نک نے لفافہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ریستوران کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک عورت نکل کر ان کی طرف آتے ہوئے بولی "آپ لوگ یہاں کیا کررہے ہیں بھئی؟ میں تو ذرا ایک سگریٹ پینے کے لیے کھلی ہوا میں آئی ہوں۔" وہ ارا فائن تھی۔

"ہم ذرا کچھ نجی گفتگو کررہے تھے ارا!" مونیکا نے جلدی سے مرکم کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ وہ گویا کوشش کررہی تھی کہ ارا کی نظر مرکم کے چہرے پر نہ پڑنے پائے لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ رہی۔ ارا نے مرکم کو دیکھ ہی لیا اور حیرت سے تقریباً اچھلی "خدا کی پناہ.... بلانک....! تم زندہ ہو؟"

مرکم یا بلانک کے حلق سے غراہٹ کی سی آواز خارج ہوئی اور وہ پستول نکال کر اسے نشانے پر لیتے ہوئے بولا "میں ایک بار پھر

تمہیں اپنی زندگی خراب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا...."

عین ممکن تھا کہ وہ ارا کو گولی مار دیتا لیکن ہینڈرکس نے اسی وقت اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک داؤ لگا کر اسے کسی بچے کی طرح زمین پر گرا دیا۔ نک اس داؤ کا مظاہرہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس لمحے اس نے کم روشنی کے باوجود پہچان لیا کہ ہینڈرکس دراصل سینڈرا پیرس تھی۔

○☆○

بہت دیر بعد نک اور سینڈرا کو ہوٹل کے بار میں بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے سینڈرا لیڈیز واش روم میں ہو کر آئی تھی اور جب وہ وہاں سے برآمد ہوئی تو اپنی وگ اتار چکی تھی اور کافی حد تک میک اپ سے بھی چھٹکارا پاچکی تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ اب تم کافی حد تک اپنے اصل روپ میں نظر آرہی ہو۔" نک بولا "تم ایک روسی جہاز پر مرد کے بہروپ میں کیا کررہی تھیں؟"

"یہ بتانے سے پہلے ایک ناممکن کام انجام دینے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ کچھ زیادہ ہی ناممکن ثابت ہوا۔ مرکم کے ایک آدمی نے جہاز میں گن نکال لی تھی اور میرا کائنٹ اتنا احمق ثابت ہوا کہ اس نے بھی گن نکال کر اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ طیارے کو کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس میں سب ہی ہلاک ہوجاتے۔"

"یہ سب پستولوں سمیت جہاز میں کیونکر سوار ہوئے تھے؟" نک حیرت سے بولا۔

"سامان بردار طیاروں کے عملے کی کوئی خاص تلاشی نہیں ہوتی۔ عام ائرلائنوں کے مسافر بردار طیاروں کی بات اور ہے۔ بہرحال پرواز کے دوران میں اپنے کلائنٹ کے مرجانے کی وجہ سے میں کافی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ اگر میں اپنی اصلیت ظاہر کرتی تو شاید مرکم مجھے بھی مار ڈالتا۔ چنانچہ جب وہ اور پائلٹ بحث و تمحیص کررہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے تو میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھی رہی۔ مرکم کا کہنا تھا کہ وہ ایکل جھیل کی طرف پرواز کریں اور لاشیں اس میں گرادیں۔ پائلٹ کی تجویز تھی کہ لاشوں کے بجائے اسلحے کی پیٹیاں سمندر میں پھینک دی جائیں۔ "سامان" پھینکنے کا تو جواز پیش کیا جاسکتا تھا لیکن اگر جہاز سے لاشیں پھینکتے دیکھ لیا جاتا اور بعد میں وہ لاشیں بازیاب بھی ہوجاتیں تو ہم سب کو قتل کے الزام کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس دلیل کے ساتھ پائلٹ کا کہنا تھا کہ اگر ہم خالی جہاز لے کر روس کے ہوائی اڈے پر اتریں اور دونوں آدمیوں کے مارے جانے کا واقعہ سچ سچ بتادیں تو ہمیں زیادہ خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"چنانچہ تم دونوں نے اس کی تجویز پر عمل کیا اور اس کا خیال درست ہی ثابت ہوا۔" نک بولا "ویسے اسلحہ کہاں لے جایا جارہا تھا؟"

"ٹیلا کے خیال میں تو اسلحہ میکسیکن باغی گوریلا گروپوں کے لیے جارہا تھا لیکن درحقیقت مرکم کا منصوبہ جہاز کو پناہ کے قریب ایک خشک پٹی پر لینڈ کرانے کا تھا جہاں سے وہ اسلحہ دائیں بازو کے ایک لڑاکا گروپ کو ڈیلیور کرنا چاہتا تھا۔ میرے کلائنٹ کے پاس ایک اور ریاست میں ایسا ہی گاہک موجود تھا۔ لگتا ہے دنیا میں جنگ و جدل میں مصروف لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی بڑھتی جارہی ہے۔ لوگ کچھ زیادہ ہی تعداد میں پاگل ہونے جارہے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں...." نک نے تائید کی "بہرحال... اس کا مطلب ہے کہ مرکم کو اسلحہ ڈیلیور کرنے کے بعد بہرحال آج شام ریوارڈ ائرپورٹ پر اترنا ہی تھا۔"

"ہاں.... میرا بھی یہی خیال ہے۔" سینڈرا نے تائید کی "لیکن اس سلسلے میں شاید تم مجھ سے زیادہ باخبر ہو۔"

نک نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ اب گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا تو اسے سب کچھ غیر حقیقی سا لگ رہا تھا۔

"میری خدمات اس لڑکی لُس کی سالگرہ کے کیک سے موم بتیاں چرانے کے لیے حاصل کی گئی تھیں لیکن مجھے اس کا مقصد نہیں بتایا گیا تھا...." وہ بولا "مونیکا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ اس کی سوتیلی بیٹی کی پچیسویں سالگرہ تھی۔ اس لڑکی کا باپ ظاہری حالات

قدمیں
اضافہ ممکن ہے
آپ خواہ
مرد ہوں یا عورت
اپنے پستہ قد میں مزید
اضافہ کرکے اپنی شخصیت کو
خوبصورت اور پُروقار
بنانے کے لئے ہمیں اپنے
موجودہ قدری پیمائش اور عمر
کی تفصیل ہمراہ جوابی
لفافہ کے لکھیں اور مفید
معلومات حاصل کریں۔
KAYBEE HOME
پوسٹ بکس نمبر 2535 - کراچی 74600
marksman

کے مطابق تاہو جھیل میں ڈوب کر مرگیا تھا کو کہ اس کی لاش تلاش نہیں کی جاسکی تھی۔ اس وقت اس پر بہت زیادہ قرضے چڑھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اب ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ وہ ڈوبا نہیں تھا۔ اس نے اپنی موت کا ڈراما رچایا تھا اور غالباً ایک لاش کا بھی بندوبست کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس لاش کو اس کی سمجھ لیا جائے گا اور اس کی موت مستند ہوجائے گی لیکن ایک تجزیے کی وجہ سے اس لاش کو اس کی نہیں سمجھا جاسکا تاہم لوگوں کے لیے اسے مردہ سمجھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ یورپ کی طرف فرار ہوگیا اور ایک نئے نام سے اس نے ایک نئی زندگی شروع کردی۔ کسی طرح کچھ رقم بھی اس کے ہاتھ لگ گئی جس سے اس نے اسلحے کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع کردیا۔"

"آج رات کیا ہوا تھا؟ تمہیں وہ موم بتیاں چرانے کے لیے کیوں کہا گیا تھا؟"

"ٹس کی حقیقی ماں ارما فائن' بلانک کی پہلی بیوی تھی۔ اسے کسی طرح پتا چلا کہ اس کی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب منعقد کی جارہی تھی تو اس نے نہ صرف شرکت کی فرمائش کی بلکہ اصرار کیا کہ کیک بھی وہی پیش کرے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ ریستوران کے کچن میں کیک پر موم بتیاں لگا کر مہمانوں کے سامنے لائے۔ مونیکا کے سامنے اسے روکنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا چنانچہ اس نے دوسرا راستہ تلاش کیا اور موم بتیاں چرانے کے لیے میری خدمات حاصل کیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"مونیکا بلانک کے وکیل نے مجھے بتایا کہ ٹس کو آج رات اس کے دادا کے قائم کیے گئے ٹرسٹ فنڈ سے بہت بڑی رقم ملنے والی تھی کیونکہ آج رات وہ پچیس سال کی ہورہی تھی۔ یہاں موجود تمام رشتے داروں اور احباب کی نظر میں وہ آج رات پچیس سال کی ہورہی تھی لیکن ارما فائن کے حساب سے نہیں۔ اور ظاہر ہے ایک لڑکی کی صحیح عمر اس کی حقیقی ماں سے بہتر کون جان سکتا ہے؟ میں نے اسے کیک پر موم بتیاں لگاتے دیکھا۔ اس نے موم بتیوں کے دو پیکٹ کھول کر موم بتیاں کیک پر لگائیں اور خالی پیکٹ کوڑے دان میں پھینک دیے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ سینڈرا کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "وہ پیکٹ بارہ بارہ موم بتیوں کے ہوتے ہیں۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی تھا کہ ارما نے کیک پر چوبیس موم بتیاں لگائی تھیں اور ٹھیک لگائی تھیں۔ ٹس کی سوتیلی ماں کے دعوے کے خلاف ٹس پچیس کی نہیں' درحقیقت چوبیس کی تھی اور ابھی اسے ٹرسٹ فنڈ سے بہت بڑی رقم ملنے میں ایک سال باقی تھا لیکن اس کی سوتیلی ماں اور روپوش باپ کے لیے فوری طور پر رقم حاصل کرنا ضروری ہوگیا تھا اس لیے موم بتیاں چرانے کی غرض سے میری خدمات حاصل کی گئی تھیں کہ کیس کسی کی نظر اس طرف نہ چلی جائے اور یہ جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو کہ ٹس کی وہ چوبیسویں سالگرہ تھی یا پچیسویں؟"

"کیا ٹس کو خود اپنی اصل عمر معلوم نہیں تھی؟" سینڈرا نے پوچھا۔

"ٹس بھی اس منصوبے میں شریک تھی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ اور سوتیلی ماں اس وراثت میں سے کچھ حصہ لے لیں گے لیکن پھر بھی باقی بچنے والی رقم اس کے لیے بہت تھی اور وہ بھی جلد از جلد اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اسی لیے مونیکا نے وکیل بھی نیا مقرر کرلیا تھا جسے زیادہ پرانے معاملات کا علم نہیں تھا۔ مونیکا نے ٹس کے برتھ سرٹیفکیٹ اور ایک آدھ دوسرے کاغذات میں بھی اس کی تاریخ پیدائش تبدیل کردی تھی۔ یہ کام اس نے متعلقہ دفتروں میں کلرکوں کو معمولی رشوت دے کر کرالیا تھا۔"

ایک لمحے کے توقف سے نک نے بتایا "پہلے بھی یہ لوگ ایک بڑی رقم جعل سازی کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرچکے تھے جب بلانک نے اپنی جعلی موت کا ڈراما رچایا تھا لیکن دستیاب ہونے والی لاش چونکہ بلانک کی ثابت نہیں ہوسکی تھی اس لیے مونیکا کو اس کے انشورنس کی رقم نہیں مل سکی تھی۔ اس قسم کی صورتِ حال میں یہاں کے قانون کے مطابق وہ شخص کو سات سال بعد مردہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی بلانک کو قانونی طور پر مردہ قرار دیے جانے میں ابھی دو سال باقی تھے جس کے بعد انشورنس کی رقم بھی مل سکتی تھی لیکن مونیکا اور بلانک میں اب مزید صبر نہیں رہی تھی اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ کم از کم ٹرسٹ والی رقم تو ہتھیا ہی لی جائے.... لیکن انجام وہی ہوا جو اکثر لالچی لوگوں کا ہوتا ہے۔"

"ٹس کا باپ اب کیا کرے گا؟" سینڈرا نے دریافت کیا۔

"بہت سے سوالوں کے جواب دے گا۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو ارما پولیس کو فون کررہی تھی۔ یونیس اس سے دریافت کرے گی کہ اس نے کیوں خود کو پانچ سال سے مردہ ظاہر کر رکھا تھا جبکہ وہ زندہ تھا؟ وہ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ جھیل سے ملنے والی لاش کس کی تھی۔ وہ یہ بھی پوچھیں گے کہ اس نے اپنی سابق بیوی پر پستول کیوں تانا تھا۔ ارما اس پر یہ الزام بھی عائد کرے گی کہ انہوں نے اس کی بیٹی کی تاریخ پیدائش تبدیل کرکے فراڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان سب چکروں سے اگر کسی طرح وہ بچ بھی گیا تو وہ لوگ اسے نہیں چھوڑیں گے جن سے رقم لینے کے بادجود اس نے اسلحہ یوغا نہیں پہنچایا۔ وہ کم از کم اپنی رقم تو واپس لینا چاہیں گے۔"

سینڈرا گہری سانس لے کر بولی "شاید ٹس آئندہ تمہیں اپنی اصل پچیسویں سالگرہ پر مدعو کرے۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

اشتہار دیسی ہی پُرکشش تھا جیسے عام طور پر ہاؤسنگ اسکیموں کے اشتہار ہوا کرتے ہیں۔ فلیٹوں' مکانوں یا بنگلوں کے تقریباً ہر اشتہار میں بے گھر لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ آپ کو جس جنت کی تلاش تھی وہ ہم نے آپ کے لیے تعمیر کردی ہے۔ بس جلدی سے آئیے' بکنگ کرائیے اور اس کے بعد بس یوں سمجھیے کہ پلک جھپکتے میں آپ کا مکان آپ کے قبضے میں ہوگا۔

اشتہار چاہے دو کمروں کے فلیٹ کا ہو لیکن ٹی وی کمرشل میں ڈیفنس یا کلفٹن وغیرہ کے نہ جانے کن کن عالی شان بنگلوں کے بیڈ روم' ڈرائنگ روم اور کچن باتھ وغیرہ آراستہ و پیراستہ حالت میں دکھا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ کا رہن سہن بھی بالکل ایسا ہی ہوسکتا ہے بشرطیکہ آپ ہماری اسکیم میں فلیٹ بک کرالیں۔

یہ اشتہار دیکھنا اور میاں کے کان کھانا فریحہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ ارسلان اب اس کا عادی ہوتا جارہا تھا۔ برسوں سے وہ میاں بیوی کھارادر کے ایک تنگ و تاریک' دو کمروں کے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ ارسلان ایک شپنگ کمپنی میں کلرک تھا اور زندگی بس اسی طرح گزر رہی تھی جس طرح نچلے طبقے کے سفید پوشوں کی گزرتی ہے۔ کفایت سے کھانا' کفایت سے پہننا' کبھی کبھی لنڈے کا سہارا بھی لینا اور ہر کام میں 'کم خرچ بالانشیں' کے اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا۔

بچے سرکاری اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ دفتر آنے جانے کے لیے ارسلان کے پاس ایک مشکیں سی موٹر سائیکل تھی جو دس سال پہلے شادی کے موقع پر اس نے قسطوں پر خریدی تھی کیونکہ شادی کے بعد بیوی کو گھمانے پھرانے کے سلسلے میں اس کے بہت

عمومی مسئلے پر ایک بہت خاص تحریر

ذاتی مکان کی آرزو یوں تو قریباً سبھی کے دل میں ہوتی ہے مگر نوسباشتا جوڑوں کا یہ خصوصی ارمان ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک جوڑے کا فسانہ۔ بیوی کی آنکھوں میں برسوں سے یہ خواب سجا تھا مگر شوہر حقیقت پسند تھا اور حقیقت آشنا بھی۔ پھر حادثہ ہوا کہ شوہر کے دل میں بھی یہ شوق جگہ پا گیا... مگر کون جانتا تھا کہ یہ معاملہ ایسا رُخ اختیار کرلے گا!

ذاتی گھر

محمود احمد مودی

سے خواب تھے جن میں سے بیشتر کی تعبیر ڈھونڈنے کی اس نے پوری پوری کوشش کی تھی حتیٰ کہ ایک ماں بیوی کو شیر خرمہ میں بھی کھانا کھلا دیا تھا مگر اس کے بعد وہ کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کر سکے تھے۔

فلیٹ میں بھی اب تک گزر بسر ہوتی چلی آ رہی تھی۔ کرایہ اس کا واجبی سا تھا۔ ہر سال مالک مکان کرائے میں لمبے چوڑے اضافے کا مطالبہ لے کر آتا تھا۔ کچھ چخ چخ ہوتی تھی۔ آخر کار کچھ لو کچھ دو کے اصول پر سمجھوتا ہو جاتا تھا اور سال بھر کے لیے سکون ہو جاتا تھا۔

فریحہ نے شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی ذاتی مکان کی ضرورت پر زور دینا شروع کر دیا تھا مگر ارسلان ہمیشہ یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا تھا "اپنے شوہر کی اوقات مت بھولا کرو۔ بینک میں صرف چند ہزار روپے پڑے ہیں اور جو صرف تمہاری وجہ سے بچ گئے ہیں۔ اگر تم نہ روکتی رہتیں تو میں انہیں بھی نہ جانے کب کا اڑا چکا ہوتا۔ ان سے تو دو کمروں کا فلیٹ بھی بک نہیں کرایا جا سکتا جب کہ تم مکانوں اور بنگلوں کے خواب دیکھتی ہو۔ میری تو ملازمت بھی کسی ایسے جھگڑے میں نہیں ہے جہاں اوپر کی کمائی کا سلسلہ ہو اور نہ ہی دفتر ایسا ہے کہ جس سے کچھ قرض ملنے کی امید رکھی جا سکے۔ نوکری چلتی رہے یہی غنیمت ہے۔"

بیوی کی آنکھوں میں مایوسی کی پرچھائیاں دیکھ کر بھی وہ بات جاری رکھتا "ایسے حالات میں صرف اشتہارات پڑھ پڑھ کر جان جلانے یا دل دکھانے کا کیا فائدہ؟ جب مقدر میں ہو گا' سر پھاڑے کا ذاتی ٹھکانا بھی میسر آ ہی جائے گا۔ ویسے بھی سر تو چھپائے بیٹھے ہی ہیں۔ یہاں سے کون ہمیں نکال رہا ہے؟"

"انسان فکر کرتا ہے..... کوئی تدبیر کرتا ہے تبھی مقدر بھی ساتھ دیتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے تو کچھ نہیں بن جاتا۔" فریحہ جل کر کہتی۔ بحث وہیں تک چلتی۔ ارسلان لاجواب ہو جاتا تو کان لپیٹ کر ادھر اُدھر کے کسی کام میں مصروف ہو جاتا یا کسی بہانے گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔

مگر اب جبکہ بچے بڑے ہونے لگے تو اندر ہی اندر ارسلان کے دل میں بھی ایک اضطراب سر اٹھانے لگا تھا۔ بچے کھیلنا کودنا' دوڑنا بھاگنا چاہتے تھے جبکہ گھر میں یہ عالم تھا کہ افراد چلتے پھرتے بھی ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ گھر سے باہر انہیں صرف اشد ضرورت کے تحت ہی قدم نکالنے کی اجازت تھی کیونکہ عمارت چھوٹی سی تھی اور عین اس کے گیٹ کے سامنے سے ٹریفک کا سیلاب گزرتا تھا۔ سائیکل اور گدھا گاڑی سے لے کر بڑے بڑے ٹرک' بسیں اور ٹریلر' سبھی کچھ گزرتا تھا اور وہ دوسری منزل پر بیٹھے گاڑیوں کا دھواں پھانکتے رہتے تھے۔

گھر میں بچوں کے لیے کوئی خاص دلچسپیاں نہیں تھیں۔ تنگی' تاریکی اور گھٹن ہی ان کی ساتھی تھی۔ لے دے کے بس ایک چھوٹا سا ریڈیو فی وی تھا۔ جس کے پاس بھی وقت فالتو ہوتا تھا' وہ اپنے پروگرام کی آس لگے کرنی وی اسکرین پر نظر جمائے بیٹھ جاتا تھا۔ کچھ دنوں کی بیٹا پر انہوں نے ڈش اور کیبل سے بھی دور ہی رہنے میں عافیت سمجھی تھی اور بجٹ میں ان چیزوں کی گنجائش نکالنا بھی مشکل ہی لگتا تھا۔ تین بچوں کی موجودگی میں اب ارسلان کو پرائیویسی کی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

اب تو اس کے ذہن میں بھی یہ سوال سر اٹھانے لگا تھا کہ کیا اس کے بچے اسی فلیٹ میں جوان ہوں گے؟ کیا وہ زندگی کی نعمتوں' ہوا' دھوپ' روشنی اور کشادگی کے احساس سے کبھی آشنا نہیں ہو سکیں گے؟ لیکن اسے چونکہ مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا اس لیے اس نے وہی پہلے جیسا طرزِ عمل اپنا رکھا تھا۔ وہی بے فکری' وہی بات کو ہنسی میں اڑا دینا' وہی خوش گمانی' وہی خوش امیدی۔

چھٹی کے دن ان کے ہاں اخبار آتا تھا۔ ارسلان چھٹی کے دن عیاشی کے طور پر دن چڑھے تک سوتا تھا لیکن فریحہ معمول کے مطابق جلدی اٹھ جاتی اور جتنے کام نمٹ سکتے تھے وہ نمٹا کر اخبار کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔ اپنے مطلب کا کوئی اشتہار دیکھتے ہی وہ ارسلان کو ہلا ہلا کر جگانا شروع کر دیتی مگر وہ پوری کوشش کر کے تکیے میں منہ چھپائے لیٹا رہے اور محض ہوں ہاں کر کے کام چلاتا رہے۔

مگر اس روز فریحہ نے حکمتِ عملی بدل لی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ارسلان نماد ھو کر' ناشتا کر کے' فریش ہو کر بیٹھ جائے تو بات چھیڑی جائے۔ وہ بڑے خوش گوار موڈ میں بچوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا' جب فریحہ نے بڑے جچے تلے اور دھیمے لہجے میں کہا "آپ نے آج کے اخبار میں وہ ایک بالکل نئی گزبے کے مکانوں کا بڑا سا اشتہار پڑھا؟ آج تک اس سائز کے مکانوں کے جو بھی اشتہار آئے ہیں' ان میں سب سے زیادہ سستے ہیں۔"

"اف خدایا' پھر وہی مکان۔" ارسلان کو سخت کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی پھر وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا "اے میرے گھر کی غریب ملکہ! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اخبار میں اگر مجھے اشتہار پڑھنے ہی ہوں تو میں صرف "ضرورتِ رشتہ" کا اشتہار پڑھتا ہوں۔ کچھ لطف تو آتا ہے نا..... آس سی بندھی رہتی ہے کہ کبھی جیب میں اگر اتنی رقم ہوئی کہ شادی دفتر جا کر رجسٹریشن کروا سکیں تو ضرور قسمت آزمائی کریں گے۔ 'کوڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی..... دوسری شادی والے..... بچوں والے اور رنڈوے بھی رجوع کریں..... شادی کے بعد کاروبار بھی سنبھالنا ہو گا.....' اس طرح کی کوئی حسین اور فراخ دل امیرزادی ہمیں بھی مل جائے گی۔"

"آپ تو ہر وقت ہر بات کو مذاق میں ہی اڑاتے رہتے ہیں۔"

فریحہ کچھ چڑ کر بولی "اس طرح تو زندگی میں کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔"

"اچھا تم چلو تم ہی بتا دو کہ تم نے اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں کون سا عظیم الشان ترکیب دیا ہے؟" ارسلان بظاہر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ مکانات سب سے سستے ہیں۔" فریحہ نے ایک بار پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔

ارسلان نے پھر اس کی بات کاٹ دی "شہر سے پچاس میل دور ہوں گے۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" فریحہ تیزی سے بولی "اشتہار میں لکھا ہے' شہری حدود سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر۔' اور میں نے نقشہ بھی دیکھا ہے۔ یہ اسکیم زیادہ دور معلوم نہیں ہوتی۔"

"پہلے تو شہری حدود ہی ہمارے گھر سے میلوں دور ہیں اور اس کے بعد دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔ مکانوں کے اشتہاروں میں جب دس منٹ کی ڈرائیو لکھا جاتا ہے تو بعض اوقات اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ 'نائٹ رائیڈر' میں بیٹھ کر ڈھائی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کریں' دو ملکوں میں کہیں بھی رفتار ذرا سی بھی کم نہ کریں تو انشاء اللہ دس منٹ میں منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔"

"آپ کی تو عادت ہے مایوس کرنا..... اور جی بھر کے کرنا۔"

فریحہ بولی "بہرحال اگر یہ اسکیم شہر سے دور ہو تب بھی کوئی حرج نہیں۔ میں تو اللہ سے چاہتی ہوں کہ ہم اس چیخ پیخ' پٹاخوں' ٹریفک' دھوئیں اور گنجان گلیوں سے کہیں دور چلے جائیں۔ نئی اور ملحقاتی اسکیموں میں کم از کم روشنی' ہوا اور سبزہ تو میسر آتا ہے۔ بچوں کو تو احساس ہوتا ہے۔"

پھر اس نے گویا سب سے اہم مسئلے کا حل پیش کیا "آنے جانے کے لیے آپ کے پاس جیسی تیسی موٹر سائیکل تو ہے ہی..... بچوں کے لیے وین یا سوزوکی گلوا دیں گے۔ شہر کے ہر حصے سے گاڑیاں بچوں کو اسکول لاتی لے جاتی ہیں..... اور پھر جب کسی بھی اسکیم میں آبادی بڑھنے لگتی ہے تو ہر طرح کی ٹرانسپورٹ چلنے ہی لگتی ہے۔"

"چلو..... یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب آگے چلو۔" ارسلان نے گلوں کی سانس لینے کی اداکاری کی۔

"آپ اشتہار دیکھیں تو سہی' مکان کتنا خوب صورت اور کشادہ محسوس ہو رہا ہے۔ اشتہار میں تو اسے بنگلا لکھا گیا ہے۔ واقعی بنگلا معلوم ہوتا ہے۔" فریحہ اشتیاق سے بولی۔

"فضائی پرمت جاؤ۔ اشتہاروں میں تو ساٹھ گز کے مکان کو بھی سیر گلگری بنگلا لکھا ہوتا ہے۔ تم اصل..... اور کام کی بات کرو۔ لگ کتنے میں ہے اور ماہوار قسط کتنی ہو گی.....؟" ارسلان نے اخبار اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "اور مکان کی تصویر سے بھی دھوکا مت کھانا۔ یہ محض نقشے سے ماڈل کی تصویر ہوتی ہے مگر اتنی ہوشیاری سے کھینچی جاتی ہے کہ مکان اپنے اصل سائز سے بھی دگنا محسوس ہوتا ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں تشہیر کا کمال۔"

پھر اسے یاد آیا "اور ہاں..... اشتہار میں جو ماہانہ قسط لکھی ہوتی ہے اس سے بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو چلتی ہی رہے گی مگر اس کے علاوہ بھی ہر تیسرے چوتھے مہینے ایک لمبی رقم بھرنی ہو گی جو پے منٹ کے صرف اس شیڈول میں لکھی ہو گی جس پر وہ ہم سے سائن کرائیں گے۔ یہ معمولی سی بات بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے کہ چند معمولی اور آسان قسط لکھی ہوتی ہے اس کے حساب سے تو بیسیوں سال میں بھی پانچ دس لاکھ روپیہ جمع نہیں ہوتا۔ آخر وہ پروجیکٹ کب تک چلتا رہے گا؟"

"میں یہ سب اندازے لگانے کے بعد ہی بات کر رہی ہوں۔" فریحہ تحمل سے بولی "اور پھر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ماڈل بنگلا تیار ہے۔ سائٹ پر آ کر معائنہ کر لیں۔"

"یہ تو خیر انہوں نے اچھا کیا۔ اس طرح شکار آسانی سے پھنسیں گے۔" ارسلان سہلاتے ہوئے بولا۔

فریحہ نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی "بکنگ صرف پچیس ہزار میں ہے اور ماہانہ قسط تین ہزار روپے..... صرف

کھیل کھیل میں
ایجوکیشنل اینڈ انفارمیشن میگزین
میرت انگیز تاریخی واقعات
دلچسپ کہانیاں' نفیس معلومات
ہنسنے مسکراتے لطیفے' بہارِ ٹون
ایک تصویری کہانی' جادو' سیکھنے کی ترکیبیں
اور بہت سے انعامات
معلومات و
رابطہ کے لیے:
کھیل کھیل میں
پوسٹ بکس نمبر 29 کراچی 74200

تین ہزار روپے!"

"بہت خوب! لفظ 'صرف' تو تم ایسے استعمال کر رہی ہو جیسے تم لاکھوں کی اسامی ہو اور اتنی کم رقم طلب کر کے تمہاری توہین کی گئی ہے۔" ارسلان استہزائیہ لہجے میں بولا "شاید تم بھول رہی ہو کہ پچھلے آٹھ سال میں پوری کنجوسی کر کے بھی ہم صرف انیس بیس ہزار روپے بچا پائے ہیں۔ یعنی چھ ہزار تو بکنگ کی رقم سے ہی کم ہیں۔ اس کے بعد تین ہزار روپے ماہانہ قسط کا مسئلہ ہے جبکہ تمہارے شوہرِ نامدار کی کل تنخواہ سارے الاؤنس اور بونس ملا کر ساڑھے آٹھ ہزار ماہانہ بیٹھتی ہے۔ اس میں سے تین ہزار روپے اگر ہم قسط میں دے دیں گے اور ڈیڑھ ہزار روپیہ کرائے میں.... تو باقی رقم میں گزارہ کرنے کے لیے ہمیں دارالامان میں پناہ لینی پڑے گی۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکا "اس کے علاوہ میں نے بے شک آج تک کوئی دڑبا بھی بک نہیں کرایا لیکن مجھے ان کمپنیوں کے بارے میں معلومات ضرور ہیں۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہر تیسرے مہینے نوٹس آجاتا ہے' اب اتنی رقم جمع کرائیے' اب اتنی کرائیے... اس وقت کیا کرو گی؟"

"مجھے تو صرف بکنگ کی فکر ہے۔ اگر آپ کسی طرح بکنگ کا انتظام کرلیں تو قسطیں وغیرہ ہم کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر دے ہی دیا کریں گے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں روکھی سوکھی کھانی پڑے یا کسی بھی طرح گزارہ کرنا پڑے۔" فریحہ کے لہجے میں خوابوں کے خواب بول رہے تھے۔

"ہاں.... اسی طرح تو انسان پھنستا ہے۔" ارسلان ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بکنگ کے پچیس تیس ہزار روپے ڈوبنے سے بچانے کے لیے وہ مزید پانچ سات لاکھ کا بندوبست کرتا ہے خواہ اس کے لیے اسے الٹا لٹکنا پڑے۔ لوگ تو ایسے موقعوں پر بیوی کے زیور بیچ کر بھی کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمہارے پاس تو زیورات بھی برائے نام ہیں۔ بیس پچیس ہزار سے زیادہ کے نہیں ہوں گے۔ ان سے بھی کچھ نہیں بنے گا۔"

"لیجیے.... ابھی مکان بک کرایا نہیں.... اور میرے زیورات پر پہلے ہی نظر رکھ لی۔" فریحہ بولی۔

"میں تو انہیں بچانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن جس کام میں تم ہاتھ ڈال رہی ہو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جس کا مجھے اندیشہ ہے۔ دراصل تم وہ حکایت بھول گئی ہو جس میں بتایا گیا ہے کہ جب جیب میں پیسے نہ ہوں تو دو ٹکے کا اونٹ بھی مہنگا لگتا ہے اور جب جیب میں پیسے ہوں تو ایک لاکھ میں ملنے والا اونٹ بھی سستا معلوم ہوتا ہے۔"

"اچھا اب فضولیات چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ کب ہمیں ماڈل بنگلا دکھانے لے جا رہے ہیں؟" فریحہ گویا بات ختم کرتے ہوئے بولی۔

"اس کا مطلب ہے تم نے اپنی جمع پونجی اور ذہنی سکون داؤ لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" ارسلان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"یوں کہیے کہ میں نے کچھ نہ کچھ بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" فریحہ پُرعزم لہجے میں بولی۔

"کمپنی والوں کو اگر ہماری حیثیت کا اندازہ ہوگیا تو وہ ہمیں ہرگز گھاس نہیں ڈالیں گے۔" ارسلان نے اس کی حوصلہ شکنی کی ایک اور کوشش کی۔

"آپ وہاں جاتے ہی انہیں اپنی حیثیت بتانے مت بیٹھ جایئے گا۔ مجھے بات چیت کرنے دیجیے گا۔ یہ آپ دیکھیے گا.... وہ نہ صرف ہمیں گھاس ڈالیں گے بلکہ بوتلیں بھی پلائیں گے۔" فریحہ اعتماد سے بولی۔

"خواتین کو دیکھ کر تو خیر ویسے ہی لوگوں کی اخلاقیات بہت بلند ہو جاتی ہیں۔" ارسلان سر ہلاتے ہوئے بولا "اور تم سے تو خیر وہ ویسے بھی مرعوب ہو جائیں گے کیونکہ تمہیں دیکھ کر تمہارے اس شوہرِ نامدار کی حیثیت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا.... اور پھر تمہیں بیگمات کی طرح نخوت سے ناک چڑھا چڑھا کر بات کرنا بھی خوب آتا ہے۔ وہ یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

"تو پھر کب کا پروگرام رکھ لیں؟ بچوں کو بھی لے چلیں گے۔ ایک طرح کی آؤٹنگ سی ہو جائے گی۔ ویسے بھی آپ نے بچوں کو کلفٹن لے جانے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ ہم سمجھیں گے کہ آپ نے ہمیں کلفٹن پر تفریح کرادی۔" فریحہ بولی۔

"فرق صرف یہ ہوگا کہ اگر ہم کلفٹن جائیں گے تو شاید خوش خوش واپس آئیں گے لیکن جب مکان دیکھ کر آئیں گے تو ہمارے منہ لٹکے ہوئے اور دل ٹوٹے ہوئے ہوں گے۔ تمہیں معلوم ہے جب انسان کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جسے حاصل کرنے کی شدید تمنا دل میں ہوتی ہے لیکن وہ اسے حاصل کرنے کے معاملے میں خود کو معذور پاتا ہے تو دل شکستگی اس پر غلبہ پالیتی ہے۔"

"مجھے امید ہے ایسا نہیں ہوگا۔" فریحہ کے ہونٹوں پر بہت دیر بعد مسکراہٹ آئی تھی۔

"چلو.... اگر تم کہتی ہو تو چلے چلیں گے۔" ارسلان نے سرِ تسلیم خم کردیا پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "بچے تو سائٹ پر جا کر بور ہی ہوں گے۔ بہتر ہے کہ انہیں کسی روز کلفٹن ہی کی سیر کرادیں۔ مکان دیکھنے صرف میں اور تم موٹر سائیکل پر چلے چلیں۔"

فریحہ بچوں کو تنہا گھر پر چھوڑتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ارسلان گویا اس کے اندیشوں کو پڑھتے ہوئے جلدی سے بولا "بچوں کو ریحانہ کے ہاں چھوڑ دیں گے۔"

ریحانہ' ارسلان کی بڑی بہن کا نام تھا۔ اتفاق سے وہ پیپل والی گلی میں رہتی تھی۔ دو تین بار ضرورت کے تحت وہ بچوں کو ریحانہ ہی کے ہاں چھوڑ کر گئے تھے لیکن فریحہ نے محسوس کیا تھا کہ یہ

داری رہانہ کے لیے بوجھ ہی بنی تھی۔ یہ کوئی ایسی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ رہانہ کے اپنے چار بچے تھے اور مکان اس کا بھی چھوٹا ہی تھا۔ مزید ستم یہ کہ دونوں گھروں کے بچوں میں نچلا بیٹھنے والا کوئی نہیں تھا۔

صرف یہی نہیں' رہانہ کے گھر میں ایک فرد اور بھی چوبیس گھنٹے رہتا تھا اور وہ بھی کسی ضدی بچے سے کم نہیں تھا۔ وہ دراصل ننھے چچا تھے جو صرف نام کے ہی ننھے نہیں' کبھی کبھی اپنی عادات کے لحاظ سے بھی واقعی ننھے میاں لگتے تھے۔

ننھے چچا کی اپنی ایک الگ کہانی تھی۔ وہ فریحہ اور ارسلان کے سگے چچا..... بلکہ کسی بھی اعتبار سے چچا نہیں تھے۔ وہ تو بنگت چچا قسم کی چیز تھے لیکن جنگ میں انہیں کسی نے قبول نہیں کیا تھا' سوائے رہانہ کے۔

دراصل پیشے کے اعتبار سے وہ قصاب تھے اور کسی زمانے میں اسی علاقے میں ان کی گوشت کی دکان تھی۔ ارسلان اور رہانہ جب چھوٹے تھے تب بھی اسی علاقے میں رہتے تھے اور ننھے چچا کی دکان سے گوشت لینے جایا کرتے تھے۔ ننھے چچا کے سامنے ہی وہ چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے اور ان کی شادیاں ہوئی تھیں۔ آج وہ بچوں والے تھے بلکہ بچے بھی کچھ بڑے ہو چکے تھے۔

اس دوران میں ننھے چچا کو بڑھاپے کی خزاں کھا گئی۔ ان کی نظر کمزور ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیروں میں رعشہ آ گیا تھا۔ آنکھیں دھندلا گئی تھیں اور چہرے پر جھریوں کا جال پھیل گیا تھا۔ اونچا سننے لگے تھے۔ دکان چلانے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے رفتہ رفتہ دکان بھی ٹھپ ہو گئی اور آخر کار انہوں نے اسے بند ہی کر دیا۔

شادی انہوں نے کی نہیں تھی اور بظاہر یہی لگتا تھا کہ دنیا میں ان کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ روپیہ پیسہ بھی ان کے پاس..... نظر نہیں آتا تھا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ جو کمایا تھا' کھا لیا تھا۔ رفتہ رفتہ خاصے برے حال میں اِدھر اُدھر رلتے دکھائی دینے لگے۔ کچھ سنکی اور جھکی سے بھی ہو گئے تھے۔ کبھی کسی کے گھر کے سامنے پڑے دکھائی دیتے تو کبھی کسی کے سامنے۔ کبھی کسی نے ترس کھا کر کھانا دے دیا تو کبھی کسی نے بٹھا کر کھلا دیا۔

بہرحال رہانہ کو ان پر ترس آیا اور اس نے اپنے مکان کے چھوٹے سے برآمدے میں ان کی چارپائی ڈلوا دی اور تین وقت باقاعدگی سے انہیں کھانا دینے لگی۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا یہ ہے کہ وہ جوش میں آ کر جذبۂ ترحم سے مغلوب ہو کر کوئی نیکی کر تو گزرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ انہیں گراں گزرنے لگتی ہے۔

ننھے چچا کو اب رہانہ کے گھر میں رہتے ہوئے دو ڈھائی سال گزر چکے تھے۔ رہانہ اور اس کے میاں نے لوگوں کے پاس اٹھتے بیٹھتے بڑبڑانا شروع کر دیا تھا کہ ننھے چچا یوں کرتے ہیں' ننھے چچا یوں کرتے ہیں۔ ننھے چچا نے یہ کہہ دیا' ننھے چچا نے وہ کہہ دیا۔ تاہم کسی طرح کھینچ گھسیٹ کر ساتھ نبھ رہا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے فریحہ بولی "نہیں..... بچوں کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔ نکسی میں چلے جائیں گے۔" کچھ عرصے سے پوری فیملی نے بیک وقت موٹر سائیکل پر لدنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب اس طرح سفر کرنا نہ صرف ارسلان کے بس سے بلکہ موٹر سائیکل کی بساط سے بھی باہر ہو چکا تھا۔

بچے یہ سن کر خوشی سے اچھلنے لگے کہ کسی "ایڈونچر" میں انہیں بھی ساتھ لے جایا جائے گا۔ فریحہ انہیں تیار کرانے لگی اور ارسلان بھی تیار ہونے لگا۔ اسی اثنا میں رہانہ آ گئی۔ دونوں گھروں کے بچوں اور بڑوں میں سے کسی نہ کسی کا روزانہ ایک دوسرے کے گھر چکر لگتا رہتا تھا۔

رہانہ کی پیشانی پر شکنیں دیکھ کر فریحہ بولی "خیریت تو ہے؟ موڈ خراب معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے بھابی! ہمارا موڈ خراب ہونے کی تو عام طور پر ایک ہی وجہ ہوا کرتی ہے۔" رہانہ بدمزگی سے بولی۔

"وہی ننھے چچا؟" فریحہ نے نوید کے سر میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔" رہانہ دھم سے بیڈ پر گرتے ہوئے بولی "ان سے صحیح طرح چلا نہیں جاتا مگر صبح سے برآمدے میں "کنگ مارچ..... کونگ مارچ" کی کوشش کر رہے ہیں۔ پیدل چلنے کو ابھی ان کا جی مچلنے لگتی ہے پھر عابد کسی کام سے گھر سے نکلنے لگتے ہیں تو ضد کرنے لگے کہ مجھے بھی اسکوٹر پر اپنے ساتھ لے چلو۔ اب ایسے گندے حالوں میں رہتے ہیں کہ عابد کو تو ان کے پاس بیٹھنے بھی الجھن ہوتی ہے۔ وہ بھلا انہیں اسکوٹر پر ساتھ بٹھا کر کہاں جاتے۔ حالانکہ ہم ننھے چچا کو نہانے دھونے کے لیے تولیا' صابن اور ہر چیز دیتے ہیں مگر انہیں تو کنگھے سے رہنے کا شوق ہے۔ جب ہم لوگ چھوٹے ہوا کرتے تھے تب تو وہ ایسے ہی میلے کچیلے حلیے میں دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تم نے دیکھا ہم لوگوں کے بچے تو اپنے حلیے کے دکان داروں سے سودا سلف لانا کبھی پسند نہیں کرتے۔"

فریحہ تائید میں سر ہلاتی رہی..... وہ ان کی باتیں سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ رہانہ کو اچھی طرح دل کا غبار نکالنے کا موقع دیا کرتی تھی۔

رہانہ جب دل ہلکا کر چکی تو فریحہ بولی "تمہاری باتیں بھی اپنی جگہ ہیں لیکن مجھے ان پر بھی ترس آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ بیوی نہ بچے' گھر نہ بار..... اور نہ ہی زندگی کا کوئی مقصد۔ میں ان کو دیکھتی ہوں تو بہت دل دکھتا ہے۔ ہمارے گھر میں تو ان کی جگہ فاضل ہوتی تو میں انہیں اپنے پاس رکھ لیتی۔"

"جگہ تو دل میں ہونی چاہیے۔" رہانہ سمجھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"گھر میں جگہ نہ ہو تو دل میں جگہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" فریحہ جلدی سے بولی "ویسے بھی وہ بے چارے اس قسم کی چیز نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جن کے لیے دل میں جگہ رکھنی پڑے۔ انہیں تو بچ بچ گھر ..... اور صرف گھر میں جگہ کی ضرورت ہے۔"

پھر اچانک جیسے فریحہ کو کچھ یاد آیا اور وہ نیچی آواز میں بولی۔ "ویسے کم از کم آج کے لیے میں ننھے چچا سے تمہاری جان چھڑا سکتی ہوں....." فریحہ نے اسے بتایا کہ آج وہ کس مقصد سے اور کہاں جا رہے تھے۔ آخر میں وہ بولی "نکسی میں جانا ہوگا۔ جگہ تو ہوگی۔ تم ننھے چچا کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ بے چارے تھوڑا سا گھوم آئیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔"

"ارسلان تو ناراض نہیں ہوگا؟" رہانہ نے نیچی آواز میں پوچھا۔ ارسلان اس وقت دوسرے کمرے میں تھا۔

"انہیں میں سمجھا لوں گی۔ ویسے ننھے چچا پر تو انہیں بھی ترس آتا ہے۔" فریحہ نے جواب دیا۔

"ترس تو ہمیں بھی بہت آتا ہے۔ ظاہر ہے تبھی تو انہیں گھر میں رکھا تھا۔" رہانہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "لیکن کیا کریں..... کس تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔"

"سمجھ سکتی ہے۔" فریحہ جلدی سے بولی "آج کل تو اپنے سگے بھائی بہنوں کو گھر میں رکھنا آسان نہیں رہا۔ غیروں کو..... اور وہ بھی ننھے چچا جیسی شخصیت کو..... میں رکھنا تو واقعی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ بہرحال تم انہیں بھیج دو۔"

چند لمحے بعد ارسلان بھی اس کمرے میں آ گیا اور رہانہ تھوڑی دیر اس سے گپ شپ کر کے روانہ ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد ارسلان بولا "میں نکسی لے آتا ہوں پھر چلتے ہیں اپنے بچوں کا کہہ دیجیے۔"

"ابھی دیر ٹھہر جائیں ننھے چچا بھی آ رہے ہیں ہمارے ساتھ چلنے کے لیے۔"

"ارے..... تم نے تو پورا جلوس تیار کرنا شروع کر دیا۔ ننھے چچا کیا مستقبل کی اس کالونی میں گوشت کی دکان کھولنے کے ارادے سے جا رہے ہیں؟" ارسلان استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"آپ کو ہتھ ناداج اڑانا ہے' اڑائیں لیکن میں مکان دیکھنے کا ارادہ ترک نہیں کروں گی۔" فریحہ مسکراتے ہوئے بولی "اور اس کے بعد بھی میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گی۔"

"وہ تو ہمیں معلوم ہے جناب کہ ہماری بیگم ارادے کی کتنی پکی ہیں۔ ہماری یہ مجال کہاں کہ ان کا کوئی ارادہ ترک کرانے کی کوشش کریں۔" ارسلان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

تھوڑی دیر بعد ننھے چچا بھی آ پہنچے۔ کہیں جانے کا سن کر شاید انہوں نے خصوصی اہتمام کر لیا تھا اور منہ ہاتھ دھو کر قدرے صاف کپڑے پہن کر آگئے تھے۔

ارسلان ان کا سرتاپا جائزہ لے کر ان کے کان کے قریب..... اونچا زبلند بولا "قسم سے چچا..... آج تو آپ اتنے صاف ستھرے اور اسمارٹ لگ رہے ہیں کہ بس چاہ رہا ہے کہ آپ کی ان لٹکتی ہوئی مونچھوں کو خضاب لگا کر آپ کی شادی کرا دی جائے۔"

ننھے چچا سر جھکا کر متانت سے مسکرا کر رہ گئے۔ ارسلان ان سے اکثر ہی اس قسم کا مذاق کرتا رہتا تھا۔ نتیجہ تھا کہ ننھے چچا بولتے بہت کم تھے۔ جن دنوں وہ دکان کرتے تھے ان دنوں بھی عام قصابوں کے برعکس بہت کم گو تھے۔ اب تو وہ گویا اپنی اور ہی کسی دنیا میں کھوئے رہتے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ نکسی میں سائٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ نکسی جب شہری حدود سے نکل کر ہائی وے پر پہنچی تو یکدم ہی جیسے ان کے گرد سکون سا پھیل گیا۔ چنگھاڑتا ٹریفک اور دھوئیں کا سیلاب پیچھے رہ گیا تھا۔ ہائی وے پر گاڑیاں کم ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی دھوپ خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔ فرفر کرتی ہوا میں ایک خوش گوار خنکی تھی۔

فریحہ کی آنکھوں میں ایسے ہی ایک مکان کا خواب تھا جہاں وہ ان نعمتوں سے محظوظ ہو سکے' انہیں محسوس کر سکے۔ ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے وہ تہ شدہ اخبار مضبوطی سے تھام لیا جس میں مکانوں کا اشتہار چھپا ہوا تھا۔ اگرچہ فی الحال وہ مکان بک نہیں کرا سکتے تھے تب بھی کم از کم خواب دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ ویسے بھی خوابوں پر انسان کا اختیار ہی کب تھا؟

ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ سائٹ پر پہنچے تو شہر کا آخری پلازا بھی کئی میل پیچھے رہ گیا تھا۔ سائٹ پر ایک خاصی آفس بنا ہوا تھا اور صرف ایک ماڈل مکان تیار تھا۔ کچھ مکانوں کی بنیادیں کھدی ہوئی تھیں۔ سیمنٹ ریت کے کچھ ڈھیر اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔

چھٹی کا دن تھا اس لیے کافی لوگ سائٹ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ نکسی سے اتر کر دفتر کی طرف بڑھتے وقت ارسلان نے ننھے چچا سے بہ استہزائیہ لہجے میں پوچھا "کیسی لگ رہی ہے آپ کو یہ جگہ؟"

"بالکل اجاڑ اور بیابان سی ہے..... گھاس اور مٹی کے سوا یہاں کیا رکھا ہے۔" ننھے چچا دھندلائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیمی اور کپکپاتی آواز میں بولے۔

"لیکن ٹریجڈی یہ ہے ننھے چچا....." ارسلان نے آہ بھر کر کہا۔ "کہ ہم لوگ اس ویرانے میں بھی چھوٹا سا مکان خریدنا افورڈ نہیں کر سکتے..... اور وہ بھی قسطوں پر۔"

"کیا نہیں کر سکتے؟" ننھے چچا نے کان پر ہاتھ رکھ کر ارسلان کی طرف جھک کر پوچھا۔

"چھوڑیے بس..... بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔" ارسلان نے ہاتھ ہلا کر بات ختم کرنے کا اشارہ کیا اور وہ آفس میں داخل ہو گئے۔ ایک بلڈنگ ایجنٹ نے لپک کر ان کا استقبال کیا' انہیں کرسیاں پیش کیں اور ان کی فرمائش سے پہلے ہی انہیں مکانوں کے بارے میں تمام تفصیلات بتانے لگا۔ اس نے کئی نقشے ان کے سامنے پھیلا دیے۔ رنگین بروشیر بھی رکھ دیا۔

میاں بیوی نے سب کچھ سمجھا۔ سہلاتے رہے۔ کچھ سوالات کیے، کچھ اعتراضات اٹھائے۔ اچھی طرح تسلی و تشفی کے بعد ایجنٹ نے انہیں ایک لڑکے کے ساتھ ماڈل بنگلا دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ بچے باہر کھلی جگہ میں کھیل کود رہے تھے۔ انہیں زندگی میں پہلی بار کھیلنے کودنے کے لیے ایسی جگہ میسر آئی تھی۔ ننھے چچا دفتر ہی کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ کسی نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کنسٹرکشن کمپنی والوں نے ماڈل بنگلے کو باقاعدہ فرنش کیا ہوا تھا۔ کمروں کی سجاوٹ بھی کی ہوئی تھی۔ پردے تک لگے ہوئے تھے۔ کچن میں ضرورت کی ہر چیز لگی ہوئی تھی۔ پورا امریکن کچن تیار تھا۔ چھوٹا سا ایک مکمل مکان ان کے سامنے موجود تھا جو گویا صرف اپنے مکینوں کا منتظر تھا۔ بڑوں کا بیڈ روم، بچوں کا بیڈ روم، ڈرائنگ روم، چھوٹا سا لاؤنج جس میں ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ چھوٹے سے عقبی برآمدے میں واشنگ مشین تک لگی ہوئی تھی۔

وہ دونوں مکان کا معائنہ کرتے جا رہے تھے اور سحرزدہ ہوتے جا رہے تھے۔ فریحہ نے سرگوشی کی "ہر آرام کا خیال رکھا ہے انہوں نے..... گھر تو اسے کہتے ہیں۔"

"واقعی۔" ارسلان نے تسلیم کیا "ہم لوگ تو دڑبوں میں رہتے ہیں۔" اس کے لہجے سے اب شوخی اور شرارت ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک بے عنوان حسرت در آئی تھی۔ اتنے چھوٹے سے مکان میں گز دو گز کا ایک لان بھی چھوڑا گیا تھا اور اس میں تین چار پھولدار پودے بھی جھوم رہے تھے۔

"روشنی، ہوا اور دھوپ کتنی بھلی لگ رہی ہے۔" فریحہ نے یوں طویل سانس لی جیسے ساری ہوا پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتی ہو۔

ایک لمحے کے توقف سے جب ارسلان بولا تو اس کے لہجے میں حسرت گہری ہو چکی تھی "میں سوچتا ہوں ہمیں یہ ایک سو بیس گز کا..... بہ مشکل چار یا پانچ مرلے کا مکان کتنا کشادہ اور آرام دہ لگ رہا ہے..... ذرا سوچو جو لوگ دو دو ہزار، چار چار ہزار گز یا چار چار آٹھ آٹھ کنال کے مکانوں میں رہتے ہیں انہیں کشادگی کا کتنا احساس ہوتا ہوگا؟"

"نہیں ہوتا ہوگا۔" فریحہ وثوق سے نہایت مدبرانہ انداز میں بولی "انسان کی فطرت میں قناعت نہیں ہے۔ مکان چاہے بیس کمروں کا ہو اور گھر میں افراد دس ہوں وہ پھر بھی کچھ عرصے بعد اسے چھوٹا کہنے لگیں گے کیونکہ ان کی ضروریات اس مکان کی حدود سے باہر نکلنے لگیں گی اور وہ اس سے آگے دیکھنے لگیں گے۔"

"میں تو یہی سوچتا ہوں اور حیران ہوتا رہتا ہوں کہ اتنے بہت سے لوگ اتنے بڑے بڑے گھر کیسے بنا لیتے ہیں؟ سبھی تو خاندانی امیر نہیں ہوتے نا۔" ارسلان بولا۔ اس کی آنکھوں میں فریحہ آج ایسی چیز محسوس کر رہی تھی جو اس نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ مکان دیکھتے ہی اس کے اندر جیسے کوئی شعلہ سا بجھ گیا تھا۔ زندگی کی حرارت دم توڑ گئی تھی۔

"یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔" فریحہ نے گویا ان دائرہ کار انداز میں اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"مقدر اب ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے۔" ارسلان خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا "محنت تو میں بھی کرتا ہوں۔ پارٹ ٹائم کام کے طور پر ایک چھوٹی سی دکان بھی کھول کر چلانے کی کوشش کی تھی جو چل کر نہیں دی۔ آخر ہم کیوں ایک چھوٹا سا مکان بھی نہیں خرید سکتے؟ کیا اس زمین پر ہمارا کوئی حق نہیں؟"

"تم تو غلط سمت میں سوچنے لگے۔" فریحہ جلدی سے بولی "قصور شاید ہم انسانوں ہی کا ہے۔ شاید ہم اپنی حیثیت کو نہیں پہچانتے۔ شاید ہماری حیثیت دو کمروں کے اس چھوٹے سے فلیٹ ہی کی ہو جس میں ہم کرائے پر رہتے ہیں۔ اگر ہم اندرون شہر سے ذرا دور کے کسی علاقے میں ویسا ہی کوئی فلیٹ خریدنے کا ذہن بنا لیتے اور شروع سے ہی کوشش کرتے تو شاید اب تک خرید چکے ہوتے لیکن ہم ایک سو بیس گز کے مکان کے چکر میں ہیں۔ جن لوگوں کی ایک سو بیس گز کے مکان کی حیثیت ہوتی ہے، وہ چار سو گز کے بنگلے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم جیسے لوگوں کی عمریں مختلف چیزوں کا تعاقب کرتے ہی گزر جاتی ہیں۔ چیزیں آگے آگے بھاگتی رہتی ہیں اور ہم پیچھے پیچھے۔"

پھر وہ واپسی کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے بولی "خیر..... ان باتوں کو چھوڑیں..... یہ بتائیں آپ کو مکان پسند آیا یا نہیں۔"

"ظاہر ہے ہم جیسی اوقات کے لوگوں کو تو پسند آ ہی جائے گا۔" ارسلان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "لیکن مسئلہ وہی ہے کہ ہم لوگ صرف دیکھ سکتے ہیں، پسند کر سکتے ہیں، خرید نہیں سکتے۔"

"میں تو یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہوں کہ میرا جو تھوڑا بہت زیور ہے وہ بیچ دیا جائے اور بکنگ کرا لی جائے۔" فریحہ بولی۔

"اونے پونے داموں زیور بیچ کر اور جمع پونجی ملا کر بھی ہم صرف بکنگ ہی کرا پائیں گے اور چند ماہانہ قسطیں دے پائیں گے۔ ان میں سہ ماہی یا ششماہی بڑی قسطیں شامل نہیں ہیں۔ تمہیں چونکہ مالی معاملات کا زیادہ شعور نہیں ہے اس لیے تم صرف بکنگ کو ہی اصل مسئلہ سمجھ رہی ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ بکنگ کراتے ہی مکان ہمارا ہو جائے گا حالانکہ اس کے بعد تین سال تک قسطوں کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے قرضے کی قسطیں شروع ہو جائیں گی۔ یہ اتنا آسان مسئلہ تو نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ بکنگ کھینچ تان کر کرا بھی لی تو کچھ عرصے بعد ہی فائل ہو کر کینسل کرانی پڑے گی اور وہ رقم بھی ڈوب جائے گی کیونکہ لوگ مکان کی کل قیمت کا دس پندرہ فیصد کاٹنے کے بعد رقم کا حساب کرتے ہیں اور وہ بھی پراجیکٹ مکمل ہونے کے بعد..... یوں

یہ ہمیں کچھ واپس کرنے کے بجائے الٹا ہماری طرف کچھ رقم نکال دیں گے۔"

وہ مکان سے نکلے تو بنگلہ ایجنٹ انہیں سامنے سے آتا نظر آیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ وہ مکان دیکھ کر ادھر سے ادھر ہی نکل جائیں گے... اس لیے وہ خود ہی چلا آیا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ اور خوش خلقی سے بولا "آیئے صاحب اب بنگلہ کی کارروائی مکمل کرلیتے ہیں۔ ادائیگی آپ چیک سے کریں گے یا کیش؟"

ارسلان نے ذرا سخت نظروں سے اسے گھورا "آپ کا خیال ہے کہ ہم مکان بک کرانے پر تلے ہوئے ہیں؟"

بنگلہ ایجنٹ کی مسکراہٹ ذرا سٹ گئی لیکن وہ اپنے لہجے کی خوشگواری برقرار رکھتے ہوئے بولا "ظاہر ہے سر! مکتی تو اپنے لہجے کی تقاضا یہی ہے کہ مکان جلد از جلد بک کرالیا جائے کیونکہ اس مندی کا میں اس لوکیشن پر آپ کو ایک ہفتے بعد... مکان نہیں ملے گا۔ ہماری بنگلہ بہت تیزی سے ہو رہی ہے۔ پہلے فیز میں ہم سو مکان بنا رہے ہیں جن میں سے بہتر تک ہو چکے ہیں جب کہ اخبارات میں ہمارا اشتہار چھپتے ہوئے اور ٹی وی پر چلتے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اس سے آپ بنگلہ کی رفتار کا اندازہ لگالیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے..." ارسلان کے لہجے میں نرمی آگئی۔ اس نے فریحہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کا کرب نمایاں تھا جس سے فریحہ کو خوف آرہا تھا۔ وہ ارسلان کی آنکھوں میں یہ کرب دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ جلدی سے ایجنٹ سے مخاطب ہوئی "ہم ذرا سوچ لیں اور مشورہ کرلیں۔ ایک دو دن میں ہم دوبارہ آئیں گے۔" اس کے لہجے میں بھی وہ جوش و خروش اور اشتیاق نہیں رہا تھا جو آتے وقت تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" ایجنٹ نے اسی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر کویا ہمدردانہ مشورہ دیا "آپ چاہیں تو تھوڑی بہت رقم دے کر بھی پکی بنگ کرا سکتے ہیں۔ وہ ایک طرح سے ٹوکن منی ہوگی۔"

"ابھی ہم رقم یا چیک بک نہیں لائے... اگلے چکر میں جب فیصلہ کرکے آئیں گے تبھی سب بندوبست کرکے آئیں گے۔" فریحہ نے جواب دیا۔

انہوں نے واپسی کے لیے اسی ٹیکسی کو روک رکھا تھا جس میں آئے تھے۔ وہ سب ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو ارسلان ایک بار پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا "ہمیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا... کیا حاصل ہوا؟ سوائے اس کے کہ احساسِ محرومی بڑھ گیا..."

فریحہ اب خود بھی کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس نے ادائیگی کا جو طریقہ کار اور شرائط سنی تھیں اس کے بعد مکان اسے واقعی اپنی رسائی سے بہت دور محسوس ہونے لگا تھا۔ بعض معاملات میں قسمت پر شاکر رہنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ارسلان میں ایک طرح کا احساسِ محرومی پیدا ہوگیا تھا جیسے اپنے بچوں اور بیوی کو ایک معقول رہائش فراہم نہ کرنے میں سارا قصور اسی کا ہے' وہ ایک ناکام اور بے کار آدمی ہے۔ فریحہ کو احساس تھا کہ یہ سوچ ایک مرد کے لیے ہرگز اچھی نہیں تھی۔

"آپ تو خوامخواہ ہی مکان کے سلسلے میں حد سے زیادہ سنجیدہ ہوگئے..." وہ مصنوعی ہنسی کے ساتھ بولی "میں تو ویسے ہی معلومات کے لیے آئی تھی۔ یہ کوئی ایسا سنگین مسئلہ بھی نہیں ہے۔ ہم اس وقت بھی کوئی ایسے برے حال میں نہیں رہ رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے لاکھوں انسانوں سے بہتر حالت میں ہیں۔"

ارسلان نے استہزائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا "خود کو اور مجھے طفل تسلیاں دینے کی کوشش مت کرو۔ اس طرح زندگی کی تلخ حقیقتیں بدل نہیں جاتیں۔"

اس نے منہ پھیر لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ فریحہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ارسلان کی حس مزاح یوں ایک دم رخصت ہوسکتی تھی۔ آج تک اسے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ ہر حال میں خوش رہنے والا آدمی تھا۔

ننھے چچا اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس گویا اپنے آپ سے بے خبر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چند لمحوں کی بوجھل سکوت کے بعد ارسلان بولا "ہمیں تو کہیں سے قرض بھی نہیں مل سکتا۔ کسی سے قرض رکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ بینک اور عام لوگ بھی اسے ہی قرضہ دیتے ہیں جس کے پاس پہلے ہی کچھ ہو تاکہ ہے۔ ہم جیسا آدمی لاکھ ارادہ اور نیت کرلے کہ اگر ہمیں قرض مل گیا تو ہر حال میں واپس کریں گے لیکن صرف ارادے اور نیت کو کوئی نہیں دیکھتا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ کے اثاثے دیکھے جاتے ہیں۔"

"ہر حال آپ اسے سر پر سوار مت کریں۔ یہ کوئی زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں ہے۔" فریحہ نے ایک بار پھر اس کا ذہنی بوجھ کم کرنے کی کوشش کی۔

مگر اس قسم کی سب کوششیں رائگاں گئیں۔ اس رات فریحہ کو اس احساس سے مزید پریشانی رہی کہ ارسلان نے زیادہ وقت جاگتے ہوئے گزارا مگر فریحہ کو یہی تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ سو رہا تھا۔

دوسری صبح آفس جاتے ہوئے بھی وہ بجھا بجھا سا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرکے وہ خلافِ معمول یکدم ہی رخصت ہوگیا۔ نہ تو اس نے مڑ کر بالکونی کی طرف دیکھا جہاں فریحہ کھڑی تھی اور نہ ہی ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ دل شکستگی اس کے چہرے پر نقش ہوگئی تھی۔ فریحہ اتنی دور سے بھی اس دل شکستگی کی پرچھائیاں دیکھ سکتی تھی۔

اس دن کے بعد سے گھر میں ایک عجیب سی افسردگی در آئی۔ ارسلان کا چلبلا پن' شوخی' چھیڑ چھاڑ سب ختم ہوگیا۔ بچوں کے ساتھ وہ بچوں ہی کی طرح کھیل کود اور شوخی و شرارت میں لگا رہتا تھا۔ اب وہ معمول بھی چھوٹ گیا۔ ہر وقت وہ جیسے کسی انجانی فکر میں گم رہتا۔

فریحہ اس دن کو کوستی جب وہ ضد کرکے مکان دیکھنے چلی گئی تھی۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ اس کا اشتیاق اس کے شوہر پر ایسا غضب ڈھائے گا تو وہ ادھر کا رخ کبھی نہ کرتی۔ اس دن کے بعد سے اس نے اخباروں میں ہاؤسنگ اسکیموں کے اشتہارات دیکھنے ہی چھوڑ دیے تھے۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا مگر ان کے گھر میں وہ پہلی سی فضا پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی کمی آگئی تھی۔ کچھ رخصت ہوگیا تھا۔ اس تبدیلی کو ننھے چچا جیسے مخبوط الحواس شخص نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ وہ کبھی کبھار رات کا کھانا کھانے ان کے ہاں آیا کرتے تھے۔

ایک رات وہ آئے تو کھانا کھا چکنے کے بعد یک دم گویا مراقبے سے سر اٹھاتے ہوئے بولے "میرا خیال ہے جس دن سے تم لوگ مکان دیکھ کر آئے ہو' اس دن سے خوشی رخصت ہوگئی ہے۔ اچھے بھلے چہکتے رہا کرتے تھے تم لوگ۔"

فریحہ نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ننھے چچا بھی ایسی باتوں کو' ایسی تبدیلیوں کو محسوس کرسکتے تھے۔ اس نے بے بسی آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ارسلان کی طرف دیکھا۔ اس بات کا جواب دینا تو اسی کے اختیار میں تھا۔ ننھے چچا بھی کپکپاتی سی گردن موڑ کر ارسلان کی طرف دیکھنے لگے۔

ارسلان کھنکھار کر بولا "ایسی کوئی بات نہیں ہے چچا... بس یونہی ذرا دل میں ملال سا آگیا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ میرے دادا اور والد ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے۔ سنا ہے وہاں اچھی خاصی جائداد تھی لیکن یہاں آکر معلوم نہیں ان سے کیا غلطیاں ہوئیں کہ کلیم میں بھی کچھ حاصل نہیں کرسکے اور ویسے بھی کچھ نہیں بنا سکے۔ شاید میری طرح وہ بھی صرف دال روٹی ہی کے چکر میں پھنسے رہے ہوں۔ لوگ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے مگر ہم اپنی آسودہ حالی گویا ہمیشہ کے لیے وہیں چھوڑ آئے۔ دادا اور والد کے بعد اب میں گویا تیسری نسل ہوں جس کی کہیں ایک انچ بھی زمین نہیں۔ بے مکانی کا احساس پہلے بھی تھا لیکن اس روز مکان دیکھنے گئے تو یہ احساس شدید ہوگیا۔ یکدم ہی گویا کسی وائرس نے دل و دماغ پر حملہ کردیا۔ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی ذاتی نہ ہو تو گرد و پیش کچھ اپنا اپنا سا نہیں لگتا۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے بوجھل سا سکوت چھا گیا۔ صرف ننھے چچا کی سانسوں کی ہلکی سی خرخراہٹ سنائی دیتی رہی پھر ارسلان ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جس طرح سب کیفیتیں رفتہ رفتہ گزر جاتی ہیں' یہ بھی گزر جائے گی۔ جاتے جاتے ملال چلا ہی جائے گا۔ آتے آتے دل کو قرار آہی جائے گا۔"

ننھے چچا کی ہلتی ہوئی گردن کچھ اور ہلنے لگی پھر وہ دوبارہ مراقبے میں چلے گئے۔

دوسرے روز رات کے کھانے میں فریحہ نے نرگسی کوفتے اور فینی تیار کی۔ یہ دونوں چیزیں ارسلان کو بہت پسند تھیں۔ فریحہ صبح ہی سے پُرتکلف کھانے کے اہتمام میں لگ گئی تھی۔ وہ اس امید پر سب کچھ کر رہی تھی کہ شاید اس طرح ارسلان اپنی افسردگی بھول جائے اور اس کا پرانا موڈ لوٹ آئے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ کئی دن تک گھر میں ضیافت کا سا انداز رکھے گی خواہ مہینے کا بجٹ تلپٹ ہی کیوں نہ ہوجائے۔

اس نے ننھے چچا کو بھی پیغام بھجوادیا تھا کہ اس رات کھانا وہ خاص طور پر انہی کے ہاں کھائیں اور یہ سن کر وہ فوراً ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس روز ارسلان دفتر سے دیر سے آیا۔ جب وہ آیا تو ننھے چچا اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں پہلے ہی سے ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر ارسلان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

دوسرے کمرے میں آکر وہ فریحہ سے بولا "یہ تو اب روز ہی

زندگی بدلنے والی

جوانوں اور مردوں کو ہمیشہ فٹ اور اسمارٹ رکھنے والی، گھر بیٹھے ورزش کی مشینیں موٹاپا خوب کرنے والی جاگنگ سائیکل، جمنازیم مشینیں، بنچ، بار بیل، ویٹ بار، ٹیبل ٹینس، نیز ٹی وی پر دیکھنے جانے والے تمام فٹنس آئٹمز مفت ٹریننگ وڈیو اور بعد از فروخت گارنٹی کیساتھ

بلال برادرس

A-119 سندھی مسلم سوسائٹی نزد طارق روڈ۔ کراچی

فون: 4531961 - 62

88-7-98 marksman

آنے لگے ہیں۔"

"میں نے بلوایا ہے۔" فریحہ جلدی سے نیچی آواز میں بولی۔ "میں نے سوچا آج گھر میں اہتمام سے کھانا پک رہا ہے' وہ بھی کھالیں گے۔ بے چاروں کو اتنا شوق ہے اچھا کھانے کا.... مگر ریحانہ تو اب انہیں بالکل ہی بچا کھچا اور باسی تباسی دینے لگی ہے۔ ننھے چچا نے تو کبھی شکوہ نہیں کیا۔ میں نے خود ہی اتفاق سے دیکھا ہے۔"

"ریحانہ آپا کا یہی حوصلہ کیا کم ہے کہ انہوں نے ان جیسی شخصیت کو گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اس بوجھ اور مفلوک الحالی میں انسان کو اتنا چٹورا بھی نہیں ہونا چاہیے۔" ارسلان ناگواری سے بولا۔

"آہستہ بولے۔ سن لیں گے تو خوا مخواہ بے چاروں کا دل برا ہوگا۔" فریحہ جلدی سے بولی۔

"اونچا سنتے ہیں وہ.... اور اگر سن بھی لیں تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے اگر کوئی چیز ناپسند ہے تو میں اس کا اظہار تو ضرور کروں گا۔" وہ ضدی سے لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں یہ ضد پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ فریحہ جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئی تاکہ اسے مزید بولنے کا موقع نہ ملے۔

کھانے کے دوران میں بھی وہ بار بار ناگوار انداز میں ننھے چچا کی طرف دیکھتا رہا جو سر جھکائے گویا دنیا و مافیہا سے بے خبر کھانے میں مگن تھے۔ وہ کھاتے وقت چپ چپ بھی کرتے تھے اور یہ بات ارسلان کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ فریحہ کو خوف لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ ننھے چچا کو ڈانٹ نہ دے اس لیے وہ بار بار اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کررہی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چل چکا تو ننھے چچا رخصت ہونے کے بجائے کچھ اور پھیل کر آسودہ سے انداز میں کرسی پر پاؤں اوپر رکھ کر آلتی پالتی مارنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ ارسلان کی پیشانی کی شکنیں بڑھ گئیں۔ فریحہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اب ارسلان کوئی سخت بات ضرور کرے گا۔ وہ ویسے ہی شاید ننھے چچا کی موجودگی کی وجہ سے پُرلطف کھانے سے لطف اندوز نہیں ہوسکا تھا۔

اب فریحہ کو اپنی غلطی کا احساس ہورہا تھا۔ اگر وہ ننھے چچا کو گھر بلوانے کے بجائے ان کا کھانا ٹرے میں رکھ کر دیں بھجوادیتی تو اچھا تھا جہاں ان کی چارپائی پڑی رہتی تھی۔

ارسلان.... گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے ننھے چچا سے مخاطب ہوا "چچا! کیا آپ کا ابھی جانے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"کیا کہا بیٹے؟" ننھے چچا نے کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں آپ کا جانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟" ارسلان غصے سے تقریباً چیخ پڑا۔

"نہیں بیٹا! میں چند منٹ اور بیٹھوں گا۔" ننھے چچا اطمینان سے بولے۔ ارسلان کے چہرے کی سرخی گہری ہوگئی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا' ننھے چچا بولے "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"جی..... فرمایئے۔" ارسلان کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔

ننھے چچا کا پوپلا منہ چند لمحے خاموشی سے ہلتا رہا پھر انہوں نے مرتعش مگر مشفقانہ لہجے میں بولنا شروع کردیا "بیٹا' بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کا روگ بن جاتی ہیں۔ پہلے میں جب بھی اس گھر میں آتا تھا تو یہ مجھے خوشیوں کا گہوارہ نظر آتا تھا۔ تم دونوں میاں بیوی اتنے خوش مزاج تھے۔ بچوں کے ساتھ.... مجھ بیت خیال الحواس بوڑھے کے ساتھ.... سبھی کے ساتھ مذاق چلتا رہتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ جس روز سے تم مکان دیکھ کر آئے ہو تمہارے ذہن میں کوئی کانٹا سا اتر گیا جس کی چبھن نے تمہیں سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

"آپ کے لیکچر سے وہ کانٹا تو نہیں نکل سکتا۔" ارسلان اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بولا۔

"ہاں بیٹا' یہ تو مجھے معلوم ہے۔" ننھے چچا گویا اس کے لہجے کا برا منائے بغیر دستور مشفقانہ لہجے میں بولے "کیونکہ تو میں زندگی میں کبھی لیکچر بازی کا قائل نہیں رہا۔ میں تو بس ایک سیدھا سادا جاہل اَن پڑھ سا آدمی ہوں۔ شاید اسی لیے لمبی چوڑی باتوں کے بجائے عمل پر یقین رکھتا ہوں۔ اس وقت بھی میں عمل کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کام کی بات..... جو میں کرسکتا ہوں۔"

وہ سانس درست کرنے کو ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے۔ کمرے میں بوجھل سا سکوت چھا گیا۔ بچے تک خاموش تھے۔ سب ایک ٹک ننھے چچا کو دیکھ رہے تھے۔ آج وہ ایک دم اتنا زیادہ بولتے ہوئے سب کو بہت عجیب لگ رہے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے معمول سے کہیں زیادہ بول رہے تھے بلکہ ان کے لہجے اور انداز.... کلام میں اتنا لیقہ تھا کہ اب ارسلان بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ننھے چچا نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "بیٹا' میں اب تمہیں اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز بتانے جارہا ہوں۔ میں نے جب کاروبار ختم کیا۔ دکان بند کی.... تو میرے پاس چار لاکھ کی جمع پونجی تھی۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ چھڑا چھانٹ اور کفایت شعار ہونے کی وجہ سے میرے اخراجات بہت کم تھے۔ اسی لیے میں نے کم آمدنی کے باوجود چار لاکھ روپیہ جوڑ لیا۔ وہ میں نے اسی وقت گورنمنٹ کی ایک بچت اسکیم میں لگا دیا تھا۔ میں نے اس میں سے کبھی ایک روپیہ بھی نہیں نکالا۔ مجھے معلوم ہے لوگ مجھے اوّل درجے کا کنجوس اور بخیل بھی کہتے ہیں۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ بہرحال میں نے یہ سوچ کر رقم کو محفوظ رکھا تھا کہ دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ زندگی کے بالکل آخری دنوں میں..... جب میرے ہاتھ پاؤں حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں گے اور کوئی مجھے ایک گلاس پانی دینے والا بھی نہیں ہوگا' اس وقت یہ رقم میرے کام آئے گی۔ کوئی کرا کرائے پر لے کر رہ سکوں گا۔ کوئی نوکر رکھ سکوں گا۔ دو دن رات میرا خیال رکھ سکے.... اور اب شاید وہ وقت قریب آرہا ہے۔ جب میری آئے دن کی بیماریوں سے' میرے پیلے پیلے بدن سے..... میرے وجود سے سب بیزار ہوجائیں گے۔ شاید ریحانہ بھی مجھے گھر سے نکال دے گی۔ وہ مجھے جتنا برداشت کرچکی ہے وہی بہت ہے۔"

ان کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یعنی اب اسی رقم کی ضرورت کا مرحلہ آنے والا ہے۔ اتنے برسوں میں وہ رقم بڑھتے بڑھتے تین گنا ہوچکی ہے۔ بارہ لاکھ ہوچکی ہے۔ معلوم نہیں ابھی میری اور کتنی زندگی لکھی ہے۔ ویسے بھی بیٹھے بیٹھے کھاتے رہو تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ میری بچی کھچی زندگی اس رقم کے سہارے اچھے خاصے آرام سے گزر جائے گی جب کہ اب تک تو میں بہت برے حالوں میں بھی گزارے کا عادی رہا ہوں مگر پچھلے دو چار دنوں میں تمہارے ہاں' میرا بیٹھا بھی کچھ کچھ کھرا ہے اس کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ تمہیں اور ریحانہ کو اس رقم کی زیادہ ضرورت ہے۔ ریحانہ کے میاں پر کئی قرض چڑھا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ بہت پریشان ہیں اور پریشانی سے ہوگئے ہیں۔ ریحانہ کا میاں تم سے زیادہ کماتا ہے مگر وہ تم سے زیادہ پریشان ہے....."

ان کے ہونٹ کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔ وہ مجھوں میں تقریباً ڈوبے ہوئے تھے لیکن ارسلان کو اندازہ ہوا کہ وہ ڈائننگ ٹیبل کو گھورتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا "تم میاں بیوی کے ذہن میں جب سے اس مکان کی دھن سمائی ہے تب سے تم بھی بہت پریشان ہو۔ میں نے سوچا ہے وہ رقم تم دونوں بہن بھائیوں یعنی ریحانہ کے اور تمہارے درمیان تقسیم کردوں۔ دونوں کو چھ چھ لاکھ روپیہ دے دوں۔ میں اونچا ضرور سنتا ہوں لیکن لوگوں کے مسائل کو سمجھ سکتا ہوں۔ تھوڑی بہت رقم کا تم خود بھی بندوبست کرسکتے ہو۔ چھ لاکھ یہ ہوجائے گا۔ جتنی دور تم مکان لینے پر تلے ہوئے ہو' اتنی رقم میں تو تمہیں اس کے آس پاس یا اس سے بھی پہلے کسی جگہ پر کمیشت ادائیگی کرکے ایک سوئیں گز کا مکان مل جائے گا اور تم اسی کمپنی کی اسکیم میں کمیشت ادائیگی کرکے قرضہ لیا چاہو تو تمہیں کافی رعایت بھی مل جائے گی اور مکان بھی بہت جلد مل جائے گا۔ تمہارا خواب بھی پورا ہوجائے گا۔ اس گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ ریحانہ کے میاں کا قرض ادا ہوجائے گا۔ وہ بھی شاید پہلے جیسے نظر آنے لگیں میرا کیا ہے..... میں تو خوا مخواہ اب تک زندگی کے آخری دنوں کے بارے میں پریشان رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اتنی لمبی زندگی گزروادی ہے وہاں کچھ دن بھی گزروادے گا۔ ریحانہ اپنے برآمدے سے نکال بھی دے گی تب بھی کوئی اور ٹھکانا مل جائے گا۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے لیکن مجھے یہ اطمینان تو ہوجائے گا کہ میں زندگی میں کسی کے کام آیا تھا۔"

میز کا سہارا لے کر وہ لرزیدہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولے "اس سیونگ اسکیم کی پاس بک میں نے ایک جگہ چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ کل لے آؤں گا۔ اگر تم دفتر سے جلدی آجاؤ تو ہم دونوں چل کر رقم نکلوا لائیں گے۔ کل گیارہ بجے میرے پاس آجانا۔"

وہ دروازے کی طرف چل دیے۔ ارسلان دم بخود بیٹھا تھا۔ انہیں جاتے دیکھ کر وہ جیسے ہوش میں آیا اور لپک کر انہیں روکتے ہوئے بولا "ننھے چچا' آپ بیٹھیں تو سہی..... میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے مت روکو....." ننھے چچا ضدی سے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ "مجھ سے معافی مانگنے کی بھلا تمہیں کیا ضرورت آن پڑی؟ تم نے مجھے کیا تکلیف پہنچائی ہے؟ مجھے تو تم لوگوں سے ہمیشہ کوئی سکھ ہی ملا ہے۔ کبھی کبھار یہاں آکر اچھا کھانا ہی کھا کر جاتا رہا ہوں۔ بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا ہوں.... اور وہ ریحانہ بھی بہت اچھی ہے..... اتنے برسوں تک اس نے مجھ نخطی کو گھر میں رکھا....."

"وہ آئندہ بھی آپ کو رکھے گی چچا....." ارسلان گلوگیر آواز میں بولا "اور اگر کوئی مسئلہ ہوا تو آپ ہمارے ہاں آجائیے گا....."

اور ہاں..... اگر ہم نے واقعی نیا مکان لے لیا تو اس میں ایک کمرا آپ کے لیے ہوگا۔ ہم لوگ زندگی کے آخری لمحے تک ہر دکھ سکھ میں آپ کے شریک رہیں گے۔ آپ کی خدمت کریں گے۔"

ارسلان کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح احسان مندی اور تشکر کا اظہار کرے۔

"ہشت.....!" ننھے چچا نے اب اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلایا "میں تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تم لوگوں کو روپیہ دینے کے بعد میں اس کا صلہ چاہوں گا۔ نہیں..... ہرگز نہیں..... بس تم لوگ میری جو خدمت کرچکے ہو' میرے لیے وہی بہت بڑا تحفہ ہے کیونکہ اس میں کوئی غرض شامل نہیں تھی....." وہ چپلیں گھسیٹتے کمرے سے نکل گئے۔

ریحانہ اور ارسلان میں رقم تقسیم کرنے کے اگلے روز ہی ننھے چچا غائب ہوگئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ ارسلان اور اس کی بیوی اس روز تو انہیں یاد کرکے بہت روئے جس روز وہ اپنے نئے مکان میں شفٹ ہوئے۔

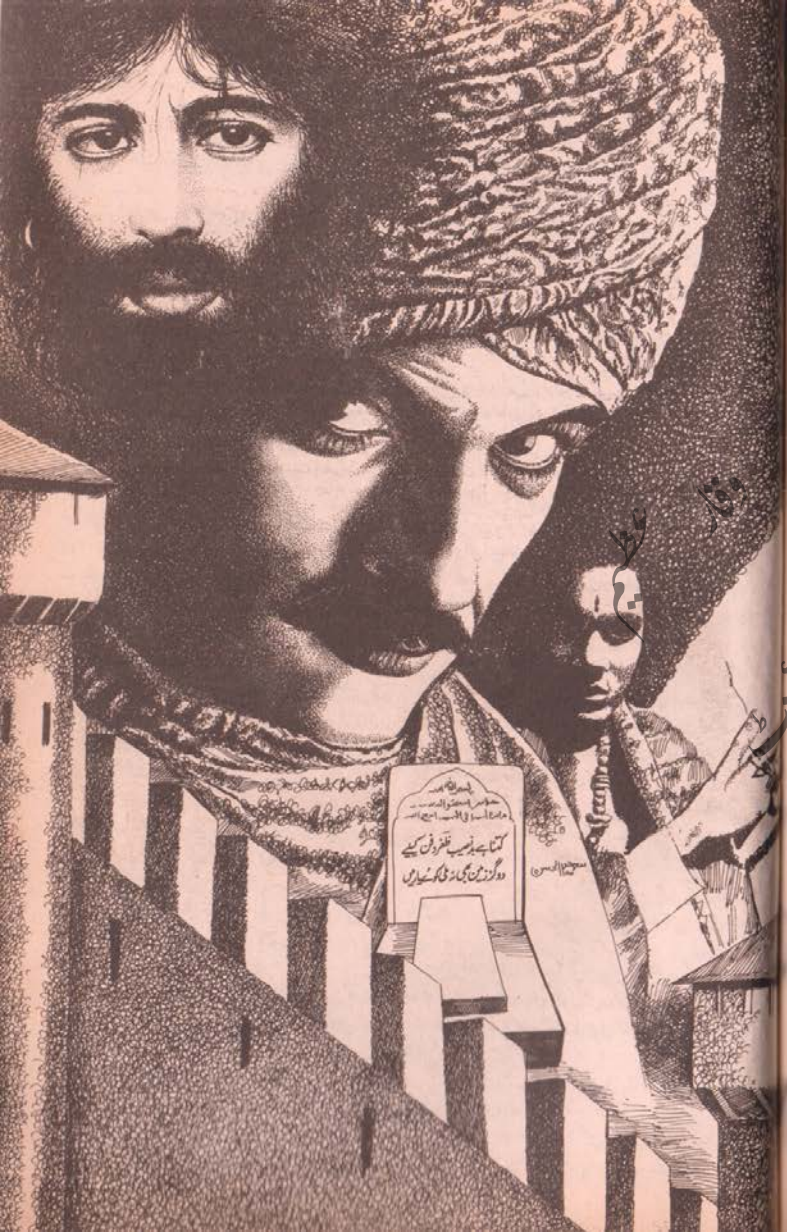

تانوے سال پہلے

ضیا، تسنیم بلگرامی

یہ جس دور کی داستان ہے، اس وقت ہندوستان کے شمالی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے جاگیردار ہوا کرتے تھے۔ یہ انگریزوں سے تعلقات استوار کرنے اور اُن کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے... دوسرے لفظوں میں اپنی تعلقہ داری قائم رکھنے کی کوششوں میں لگے رہتے۔ جن کا اپنے علاقے میں اثر و نفوذ ہوتا اور انگریز جنہیں اپنے لیے کار آمد خیال کرتے، اُن پر ہاتھ رکھ دیتے۔ اسی کے صلے کے طور پر وہ ان جاگیرداروں کو چھوٹ بھی دیتے اور ان کے کرتوتوں سے چشم پوشی کرتے۔ بظاہر اس ذرا سی چھوٹ سے فائدہ اُٹھا کر یہ لوگ بڑے بڑے کام کر جاتے۔ اسی دور اور اسی علاقے سے تعلق رکھنے والی یہ حیرت سامان داستان ایک ایسے شخص کی ہے جو قدرت کی طرف سے ایک حیرت انگیز صلاحیت لے کر پیدا ہوا تھا۔ اُسے اپنی قوت پر اختیار نہیں تھا مگر یہ جب بھی آشکارا ہوتی، سب کو حیرت زدہ کر دیتی۔ اُس کی اس صلاحیت میں دوسروں کے لیے خوشی کا سامان بھی تھا اور پریشانی کا بھی!

صحیح معنوں میں محو کر دینے والے واقعات، کردار اور ماحول کی اس روداد میں اُس دور کے انگریزوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے حالات و واقعات کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے کہ آپ محسوس کریں گے جیسے آپ کے سامنے فلم چل رہی ہے۔

اب ٹھاکر جی جہاں بھی جاتے' اپنے بھتیجے ٹھاکر رتن لال کو ساتھ لے جاتے اور اسے ٹھکرائی کے طور طریقے سکھاتے رہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص منصوبے پر کام کر رہے ہوں۔ جس جس سے ٹھاکر جی کے تعلقات تھے' وہ اس سے اپنے بھتیجے کی ملاقاتیں کروا رہے تھے۔

منشی' پھکو اور دوسرے کارندے سب ہی ٹھاکر رتن لال سے ڈرنے لگے اور اس کا ادب واحترام کرنے لگے۔ بظاہر اس کی یہی وجہ ان سب کی سمجھ میں آتی تھی کہ ٹھاکر جی اپنے بھتیجے کو اپنا داماد بنانے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔

کچھ ہی عرصے میں ٹھاکر رتن لال اتنا چست وچالاک نظر آنے لگا کہ لوگ ٹھاکر جی کے ساتھ ساتھ اس سے بھی ڈرنے لگے۔

ٹھاکر جی کو ایک ہی جھک سوار تھی کہ کسی طرح کرشنا کماری کو واپس لایا جائے۔ وہ شب و روز اس فکر و جستجو میں رہتے۔ شاید اسی لئے وہ اپنے بھتیجے کو اپنا قائم مقام اور نائب بنائے ہوئے تھے۔

رجنی کمار نے اب کوٹھی کے ماحول میں یہ تبدیلی محسوس کر لی تھی کہ اس کی ملاقات ٹھکرائن سے بہت کم ہوتی تھی کیونکہ اب صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اگر ٹھاکر جی کوٹھی میں نہ ہوتے تو ان کا بھتیجا کوٹھی میں موجود ہوتا۔ گویا اب کوٹھی کا ماحول رجنی کمار کے لئے بہت مخدوش ہو گیا تھا۔

ٹھاکر جی نے اچانک زور دینا شروع کر دیا کہ رجنی کمار یہ بتائے کہ وہ جو خطرناک منصوبے بنا رہے ہیں ان میں انہیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوگی۔

رجنی کمار مسلسل خود پر کیفیت طاری کرنے کی کوششیں کرتا رہتا۔ وہ کمرے کو بند کر کے روشنی بجھا کے آنکھیں بند کر لیتا اور ٹھاکر کے سوال کو خود پر طاری کرنے کی کوشش کرتا مگر کئی دنوں تک وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہا۔

آخر ٹھاکر جی نے رجنی کمار کو دھمکی دی کہ اب وہ ان کے کام کا نہیں رہا اس لئے اسے ساتھ رکھنے کا فائدہ؟

رجنی کمار یہ سمجھا کہ شاید ٹھاکر جی اس کو نکال باہر کرنا چاہتے ہیں' کہنے لگا۔ "ٹھاکر جی! میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ آپ کے سوال کا کوئی تشفی جواب مل جائے مگر میری پراسرار مادرائی قوت میرے اختیار میں نہیں ہے۔ جواب ملے گا ضرور لیکن کب' اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "دیکھ رجنی کمار' میں ٹھاکر ہوں اور ٹھکرائی کا یہ خاصہ ہے کہ یہ جس کے پیچھے لگ جائے اس کا شمشان تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میرا تعلق رہے یا بک جائے' میں چتو لال جی اور وکیل کو نہیں چھوڑوں گا اور کرشنا کماری کو حاصل کر کے رہوں گا۔"

ٹھاکر جی کچھ عرصے کے لئے راج نگر چلے گئے۔ وہاں بھی باغ میں ان کی کوٹھی تھی اور ان کے کچھ کارندے موجود رہتے تھے۔ بدری اور مہاراجی یہیں رہتے تھے۔

ٹھاکر جی رجنی کمار کو بھی یہیں لے آئے اور اسے رازداری سے بتایا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ چتو لال جی اور وکیل یہاں خاموشی سے آتے ہیں اور وہ کے واپس چلے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے آدمی لگا دیئے ہیں۔ جس دن بھی یہ دونوں میرے ہتھے لگ گئے' میں دونوں کا کیا کرم کروں گا۔"

رجنی کمار نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "اور ٹھاکر جی' اگر یہ دونوں آپ کے ہاتھوں مارے گئے تو کرشنا کماری جی کا پتا کس طرح چلے گا؟"

ٹھاکر جی سخت غصے میں بھی تھے اور کچھ مایوس بھی' کہنے لگے۔ "پتا نہیں کرشنا کماری کہاں اور کس حال میں ہے اور ان درندوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ..... اگر کرشنا کماری مجھے مل بھی جائے تو کیا وہ اب بھی میرے لائق ہوگی۔"

رجنی کمار خاموش ہو گیا۔

ان دنوں ٹھاکر جی پر ایک وحشت سی طاری تھی۔ رجنی کمار کا کمرا ٹھاکر جی کے کمرے سے ملحق تھا۔ وہ دن میں کئی کئی بار اور رات کو بھی اسی طرح کئی کئی دفعہ رجنی کمار کے کمرے میں جھانکتے رہتے تھے جس سے رجنی کمار بہت زیادہ خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

ٹھاکر جی نے محسوس کر لیا کہ رجنی کمار ان سے خوف کھانے لگا ہے۔

ایک دن صبح صبح رجنی کمار کو ناشتے میں اپنے ساتھ بٹھا لیا اور کہنے لگے۔ "رجنی کمار! تیری وہ پراسرار مادرائی قوت کہاں چلی گئی۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گا کہ بار بار تیرے کمرے میں جھانک کر یہی دیکھتا رہتا ہوں کہ تجھ پر وہ کیفیت طاری ہوئی یا نہیں۔ کہیں تیری قوت تجھ سے چھن تو نہیں گئی؟"

رجنی کمار نے ندامت سے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! میں خود پریشان ہوں۔ اب تو مجھے شرم آنے لگی ہے کہ میں آپ کی حرام کی روٹیاں توڑ رہا ہوں اور کام دھیلے کا بھی نہیں کرتا۔"

اتفاق سے اسی وقت ٹھاکر جی کے کمرے میں منشی کی بیوی داخل ہوئی اور ٹھاکر جی سے پوچھا۔ "سنا ہے آپ کہیں باہر جا رہے ہیں؟"

رجنی کمار ششدر رہ گیا۔ وہ منشی کی بیوی سے نظریں بھی نہیں ملا سکا کیونکہ ٹھاکر جی نظروں ہی نظروں میں دونوں کو تول رہے تھے۔

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "پھکو کی بیوی کہاں چلی گئی؟ اسے بھی بلاؤ۔"

منشی کی بیوی واپس چلی گئی تو ٹھاکر جی نے کہا۔ "رجنی کمار! تو منشی کی بیوی کو یہاں دیکھ کر حیران تو ہوا ہوگا۔"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "نہیں ٹھاکر جی! مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب آپ کے نوکر چاکر ہیں

اور دن رات آپ کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔"

رجنی کمار کے اس جواب سے ٹھاکر جی بہت خوش ہوئے' کہنے لگے۔ "منشی اور اس کے خاندان نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح پھکو اور اس کی گھر والی دونوں ہی میرے بڑے خدمت گزار ہیں۔ میں ان دونوں کو راج نگر میں مکان بنوا کے دے رہا ہوں اور منشی کو کچھ زمین کاشت کاری کے لئے بھی دے دوں گا۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اسی لئے میں اپنے خدمت گاروں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

ٹھاکر جی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی دان بھگتی کے جو قصے بیان کر رہے ہیں اس کی ذرا ذرا سی تفصیل سے رجنی کمار واقف ہے۔

کچھ دیر بعد منشی کی بیوی پھول متی کے ساتھ واپس آئی۔ ٹھاکر جی نے دونوں کو بتایا۔ "اسی باغ میں میں نے تم دونوں کے لئے دو مکانات بنوا دیے ہیں۔ دونوں کی رجسٹریاں بھی تمہارے ناموں سے ہیں' جب چاہو ان میں چلی جاؤ۔"

اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹھاکر جی کا یہ آخری وقت ہو اور وہ اپنا حساب کتاب صاف کر رہے ہوں۔ ان دونوں کو ٹھاکر جی نے ایک ایک فائل تھمائی اور کہا۔ "یہ ہیں تم دونوں کے مکانوں کے کاغذات۔"

اسی رات تقریباً گیارہ بجے رجنی کمار پر دورہ پڑ گیا اور وہ اپنے پلنگ پر ہاتھ پاؤں ڈال کر بے سدھ ہو گیا۔

ٹھاکر جی نے جھانک کر دیکھا اور لپک کر رجنی کمار کے کمرے میں پہنچ گئے اور سامنے کی دیوار پر نظریں جما کے بیٹھ گئے۔

رجنی کمار کے منہ سے جھاگ جاری تھا اور وہ خود بھی پلکیں جھپکائے بغیر دیوار پر دیکھ رہا تھا۔

ٹھاکر جی نے دیکھا کہ دیوار پر وہ خود نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ تھانیدار اور چند سپاہی بھی تھے پھر یہ لوگ چتو لال جی کی حویلی میں داخل ہوئے۔

چتو لال جی نے ٹھاکر جی اور پولیس والوں کو اسی کمرے میں بٹھایا جہاں وہ پہلے بھی ایک بار بیٹھ چکے تھے۔

پتا نہیں تھانے دار کیا کہہ رہا تھا اور ٹھاکر جی نے غصے میں کیا کہا' چتو لال جی نے نہایت شرمندگی سے خوشامدانہ انداز میں ٹھاکر جی کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر ٹھاکر جی نے اپنا ہاتھ روکے رکھا۔

پھر اچانک منظر بدل گیا اور الہ آباد کے وکیل کی کوٹھی نظر آئی۔ اب ٹھاکر جی کے ساتھ انگریز کمشنر بھی تھا اور چتو لال جی بھی ساتھ ساتھ تھے۔ کوٹھی کے باہر سپاہی پہرا دے رہے تھے۔

یہاں بھی باری باری سبھی کے ہونٹ ہلتے رہے لیکن انگریز کمشنر بالکل خاموش تھا۔ وکیل بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ چتو لال بھی کچھ کہہ رہے تھے اور ٹھاکر جی بھی ہتھے سے اکھڑتے نظر آ رہے تھے پھر اچانک یہ منظر بھی بدلا اور ٹھاکر جی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر سفر کرتے نظر آئے مگر ان سارے مناظر میں کرشنا کماری کہیں بھی دکھائی نہ دی۔

یہ عجیب مناظر تھے جن سے ٹھاکر جی کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے تھے۔

تقریباً پندرہ سولہ منٹ تک یہ مناظر نظر آتے رہے اور ٹھاکر جی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

اس کے بعد سلسلہ موقوف ہو گیا۔ ٹھاکر جی رجنی کمار کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

رجنی کمار کافی دیر بے سدھ پڑا رہا۔ اس وقت اس میں پلکیں جھپکانے تک کی سکت نہ تھی۔

اچانک پھول متی ٹھاکر جی کو تلاش کرتی ہوئی رجنی کمار کے کمرے تک پہنچ گئی۔

اسے حیرت تھی کہ ٹھاکر جی چپ چاپ سوئے ہوئے رجنی کمار کے پاس کھڑے ہیں۔ اسے شبہ گزرا کہ شاید ٹھاکر جی رجنی کمار کا سوتے میں کام تمام کر دینا چاہتے ہیں۔

اسے رجنی کمار سے ہمدردی بھی تھی اور دلچسپی بھی' چیختی ہوئی رجنی کمار کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ "ٹھاکر جی! اسے نہ مارنا بھگوان کے لئے۔"

اس چیخ کا رجنی کمار پر بہت برا اثر پڑا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔

ٹھاکر جی نے غضبناک نظروں سے پھول متی کو دیکھا۔ "پاگل ہوئی ہے! یہاں کیوں آ گئی؟"

اسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ ٹھاکر جی رجنی کمار کے پاس نیک نیتی سے کھڑے ہیں۔ اس نے ٹھاکر جی کے دونوں ہاتھ خالی دیکھے تو بڑی حیرت ہوئی کہ ٹھاکر جی آخر رجنی کمار کو کس طرح ماریں گے کیونکہ ان کے ہاتھ میں نہ چاقو تھا' نہ پستول' نہ ڈنڈا۔

اچانک اس کی نظر رجنی کمار پر پڑی جس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور منہ سے جھاگ جاری تھا۔ پھول متی نے نہایت مایوسی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے اس کو زہر دے دیا؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "اب تو یہاں سے جا' میں نے اس کو زہر دیا ہے اور نہ میں اسے ماروں گا۔ یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

پھول متی چلی تو گئی مگر وہ مطمئن نہیں تھی۔

رجنی کمار کو ہوش میں آنے اور طاقت پکڑنے میں پانچ چھ منٹ لگ گئے۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قمیص کے دامن سے جھاگ صاف کیا اور ٹھاکر کو پہلی پہلی خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا پھر جب کچھ زیادہ ہوش آیا تو وہ چارپائی سے اتر کے کھڑا ہو گیا۔

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "کیا حال ہے تیرا؟"

رحمٰنی کمار نے جواب دیا۔ "بہت برا حال ہے۔ اس مرتبہ تو میں اتنا ہلکان ہوا کہ کیا بیان کروں۔"

ٹھاکر جی نے بے چینی سے کہا۔ "اس بار دیوار پر جو کچھ نظر آیا وہ بہت عجیب تھا۔"

رحمٰنی کمار نے بشارت دی۔ "ٹھاکر جی! آپ کو مبارک ہو کہ کرشنا کماری آپ کو بہت جلد مل جائیں گی۔"

ٹھاکر جی نے بے قراری سے کہا۔ "تو کیسی بات کرتا ہے۔ دیوار پر تو کرشنا کماری کہیں نظر نہیں آئی۔"

رحمٰنی کمار نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! وہ سلسلہ تو وقت سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔ اگر کچھ دیر وہ جاری رہتا تو آپ کرشنا کماری تک ضرور پہنچ جاتے۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "وہ سب کیا تھا' کچھ بتاؤ تو سہی۔ چتو لال مجھ سے ہاتھ ملا رہا تھا حالانکہ میں تو اسے دیکھتے ہی قتل کردوں گا۔"

رحمٰنی کمار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔ دو ایک دن میں آپ کی ملاقات چتو لال جی سے ہو جائے گی۔ انہیں اپنے کئے پر شرمندگی ہے اور پھر کشمر صاحب بھی آپ دونوں کے درمیان پڑ گئے ہیں۔ عنقریب آپ چتو لال جی کے ساتھ الہ آباد جائیں گے۔ وہاں آپ کی ملاقات انگریز کشمر سے ہوگی اور چتو لال جی بتائیں گے کہ کرشنا کماری وکیل کے پاس ہے اور وکیل نے کرشنا کماری کو کسی دیہات میں پہنچا دیا ہے۔ آپ وہیں جا رہے تھے کہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔"

ٹھاکر جی اتنا کچھ جان کے زیادہ بے قرار ہو گئے۔ "تو جو کچھ بتاتا ہے وہ ہمیشہ ادھورا رہتا ہے۔ بتاتا کچھ ہے' ہوتا کچھ ہے۔ منشی کے گاؤں میں کسی عورت کے بھائی کے بارے میں تو نے بتایا تھا کہ وہ عنقریب آجائے گا مگر وہاں شہر کی پولیس پہنچ گئی جو اس کے بھائی کو پکڑ کے شہر لے گئی۔ مجھے تو تجھ سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

رحمٰنی کمار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! میں نے کہا تو ہے یہ سب کچھ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ جو کچھ میری ناقابل فہم ماورائی قوت مجھے بتا دیتی ہے' وہی میں آپ تک پہنچا دیتا ہوں۔"

اس واقعے کے تیسرے دن تھانے دار ٹھاکر جی کو تلاش کرتا ہوا قصبے کی باغ والی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ یہاں اس کی ملاقات بدری اور مصرا جی سے ہوئی۔ ان دونوں نے چھپانے کی کوشش کی کہ ٹھاکر جی یہاں نہیں ہیں۔ رحمٰنی کمار نے بھی تھانے دار کو دور سے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ٹھاکر جی کو اطلاع دے دی کہ تھانے دار آگیا ہے' وہ اس سے مل لیں۔

ٹھاکر جی ایک دم تھانے دار کے سر پر پہنچ گئے۔

تھانے دار نے حیرت سے ٹھاکر جی کو دیکھا اور بدری اور مصرا جی سے کہا۔ "تم دونوں تو کہتے تھے کہ ٹھاکر جی یہاں نہیں ہیں مگر ٹھاکر جی تو موجود ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میں نے ان دونوں کو منع کیا تھا کہ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ تم یہ بتاؤ کہ کشمر نے تمہارے پاس کیا پیغام بھیجا ہے؟"

تھانے دار نے حیرت سے پہلے تو ٹھاکر جی کو دیکھا اس کے بعد ٹھاکر جی کے پیچھے کھڑے ہوئے رحمٰنی کمار کو دیکھا اور ٹھاکر جی سے پوچھا۔ "یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میرے پاس آپ کے لئے کشمر کا کوئی پیغام آیا ہے؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "مجھے سب پتا ہے۔ مجھ سے کام کی بات کر۔ اگر چتو لال سے ملوانا ہے تو میں اسی وقت تیرے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

اب تھانے دار کا حال ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ "تو یہ کہئے کہ اس نوجوان نے آپ کو بہت سی باتیں قبل از وقت بتا رکھی ہیں۔"

ٹھاکر جی نے غصے میں کہا۔ "میں چتو لال کو دیکھتے ہی گولی مار دوں گا۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "ٹھاکر جی' آپ ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔" اس کے بعد اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ کشمر کا حکم ہے کہ آپ چتو لال جی سے دوستی کرلیں اور فوراً چتو لال جی کے ساتھ الہ آباد پہنچیں۔ وہاں کشمر آپ دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ٹھاکر جی بہت جزبز تھے۔ تھانے دار کے ہاتھ سے کشمر کا سفارشی خط لے لیا اور اسے پڑھنے لگے۔ اس میں لکھا تھا۔ "ٹھاکر جی! تم تھانے دار کے ساتھ چتو لال جی کی کوٹھی پر آجاؤ۔ میں سے ملو اور دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔ میں الہ آباد میں تم دونوں کا انتظار کر رہا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "یہ انگریز لوگ بھی کیسے غضب کے ہوتے ہیں۔"

وہ اسی وقت رحمٰنی کمار' بدری اور مصرا جی کو ساتھ لے کر چتو لال جی کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔

کوٹھی کا دربان جیسے ان سب کا انتظار ہی کر رہا تھا' چٹاخ کھول دیا اور کہا۔ "سیٹھ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے ان سب کو کوٹھی کی بالائی منزل پر پہنچا دیا۔

کچھ دیر بعد چتو لال جی نادم اور پشیمان نمودار ہوئے اور ٹھاکر جی سے معافیاں مانگنے لگے۔ اپنی زیادتی کا اقرار کیا اور کہا۔ "یہ وکیل بڑا ناہنجار نکلا۔ آپ ذرا صبر و تحمل سے کام لیں' کشمر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کرشنا کماری کو کہیں نہ کہیں سے برآمد کروا دیں گے۔"

اس کے بعد چتو لال جی نے دوستی کا ہاتھ ٹھاکر جی کی طرف بڑھایا مگر ٹھاکر جی نے ہاتھ نہیں ملایا۔

تھانے دار رحمٰنی کمار کو نہایت اشتیاق اور تجسس سے دیکھے جا رہا تھا۔

ٹھاکر جی نے کہا۔ "مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ تو مجھ سے ہاتھ

ملائے گا مگر میں نہیں ملاؤں گا۔ اس وقت تک تجھ سے میری دوستی نہیں ہو سکتی جب تک مجھے میری کرشنا کماری نہیں مل جائے گی۔"

تھانے دار نے سفارش کی۔ "ٹھاکر جی! چتو لال جی شرمندہ ہیں اور کشمر صاحب کی سفارش ہے۔ آپ کو ہاتھ ملا لینا چاہیے۔"

ٹھاکر جی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہاتھ پھر بھی نہیں ملایا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سخت جذباتی دباؤ میں ہوں اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں' بے رخی سے پوچھا۔ "الہ آباد کب چلنا ہو گا؟"

چتو لال نے جواب دیا۔ "جب کہیں' میں چلنے کو تیار ہوں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ کل ہی نکل چلو' ویسے مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔ کشمر سے ملاقات' وکیل سے جھگڑا اور کشمر کے دباؤ پر وکیل کرشنا کا پتا بتا دے گا پھر میں کسی گاؤں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکا چلا جاؤں گا۔"

تھانے دار نے ایک بار پھر رحمٰنی کمار کو غور سے دیکھا اور ٹھاکر جی سے درخواست کی۔ "ٹھاکر جی! کیا ایک رات کے لئے آپ اس نوجوان کو میرے پاس نہیں چھوڑ سکتے؟"

ٹھاکر جی نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' ہرگز نہیں۔" اور پھر وہ چتو لال جی سے مخاطب ہوئے۔ "تو کل ہم الہ آباد جا رہے ہیں۔ تجھ سے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ میں نے بھی کرشنا کماری کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ بس ایک بار میں اسے حاصل کروں پھر تمہاری اور وکیل کی اچھی طرح مزاج پرسی کروں گا۔"

تھانے دار نے ٹھاکر جی کو سمجھایا۔ "ٹھاکر جی! میرے سامنے آپ دھمکی نہ دیں کیونکہ آپ کی یہ باتیں آپ کے خلاف استعمال ہو سکتی ہیں۔"

ٹھاکر جی ایک دم گرم ہو گئے۔ "تو کیا قانون اور ضابطے کی باتیں کرتا ہے۔ تو سوچ سے لکھ لے کہ میں نے تیرے سامنے وکیل اور چتو لال کو قتل کی دھمکی دی۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے اور تجھے بھی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ کرشنا کماری کو پہلے تو چتو لال نے غائب کیا اور پھر اسے وکیل کے حوالے کر دیا اور اب وکیل اسے دینا نہیں چاہتا۔ اگر تو قانون اور تحریرات بند کی بات کرتا ہے تو ان دونوں پر اغوا اور زنا بالجبر کی دفعات لگا اور ان دونوں کو قید کر کے مقدمہ چلا۔"

تھانے دار نے کھسیانے لہجے میں کہا۔ "آپ نے ابھی تک کسی کے خلاف کوئی ایف آئی آر تو کٹوائی نہیں۔ اس کے بغیر میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی کس طرح کر سکتا ہوں۔"

ٹھاکر جی تلملا کے کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "چل میرے ساتھ تھانے اور اسی وقت چتو لال اور وکیل کے خلاف ایف آئی آر درج کر۔"

تھانے دار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! آپ تو بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ میں آپ کے کہنے سے اسی وقت ایف آئی آر درج کر لوں گا مگر اس کے بعد آپ کا یہ مسئلہ بہت پیچیدگی اختیار کر جائے گا۔ یہ کام اس وقت تعلقات اور اثر و رسوخ سے ہو رہا ہے پھر جب قانون بیچ میں آجائے گا تو آپ بیک وقت اپنے چار دشمن پیدا کر لیں گے۔"

ٹھاکر جی نے بدستور مشتعل لہجے میں پوچھا۔ "یہ چار دشمن کون کون ہیں؟"

تھانے دار نے جواب دیا۔ "ایک تو چتو لال جی' دوسرے وکیل صاحب' تیسرے کشمر صاحب اور چوتھا میں خود کیونکہ میں کشمر کا تابعدار ہوں۔ وہ جیسا حکم دے گا میں وہی کروں گا۔"

ٹھاکر جی نے ایک دم سکوت اختیار کیا۔ شاید انہوں نے اپنی اور اپنے مخالفین کی قوت کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ چتو لال جی سے کہا۔ "کل شام تک ہم یہاں سے نکل چلیں گے کیونکہ میں اس معاملے کو بہت جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔" پھر رحمٰنی کمار سے کہا۔ "چل میرے ساتھ۔"

نیچے بدری اور مصرا جی ٹھاکر جی کے منتظر تھے۔ ٹھاکر جی کسی سے کچھ کہے سنے بغیر ہی حویلی سے نکل گئے۔

تھانے دار نے چتو لال جی سے کہا۔ "بڑا ہی بے ڈھب اور غصہ ور آدمی ہے۔"

چتو لال جی نے کہا۔ "صاحب' تعلقے داری کا نشہ ہے۔ پتا نہیں کتنے غیر قانونی کام کئے ہوں گے' کتنوں کو مروا دیا' کتنوں کی زمینوں پر ناجائز قبضے کر لئے' کتنوں کی عزت آبرو لوٹ لی۔ اگر اس کے خلاف ایف آئی آر کٹنے لگے تو پیشیاں بھگتتے بھگتتے زندگی غارت ہو جائے گی اور پیچھا نہیں چھوٹے گا۔"

تھانے دار نے بے بسی سے کہا۔ "ایف آئی آر تو اس وقت کٹتی ہے جب ایف آئی آر کٹوانے والا کوئی ہو۔ گواہی شہادتیں مل جائیں۔ کس کی شامت آئی ہے جو ایسے ظالم شخص کے خلاف ایف آئی آر کٹوائے گا۔"

چتو لال جی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی' ایک نہ ایک دن چھری کے نیچے آئے گی۔"

○☆○

ٹھاکر جی نے اپنے بھتیجے ٹھاکر رتن لال کو ضروری ہدایات دیں۔ "ذرا رعب اور دبدبے سے کام لینے کی عادت ڈال کیونکہ مجھے میری عدم موجودگی میں قانونی اور غیر قانونی بہت سے کام کرنا پڑیں گے۔"

ٹھاکر رتن لال نے اطمینان دلایا۔ "چاچا جی! اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں بھی ٹھاکر ہوں ۔ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے۔"

رتن لال کو رحمٰنی کمار سے خاص چڑ تھی' پوچھا۔ "رحمٰنی کمار آپ کے ساتھ الہ آباد جائے گا یا یہاں رہے گا؟"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "رجنی کمار میرے ساتھ جائے یا یہیں رہے، مجھے اس سے کیا غرض؟"

ٹھاکر رتن لال نے کہا۔ "چاچا جی! میں اس کو کوٹھی کے اندر نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر وہ آپ کے ساتھ نہ جائے اور آپ اجازت دیں تو میں اس کا کوٹھی سے باہر کوئی ٹھکانا کردوں۔"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "میں نے تو اپنے کارندوں والے حصے میں اس کو ایک کوٹھری دے دی تھی مگر وہاں میرے آدمی اس کو بہت پریشان کرنے لگے۔ مجھے بھی اس کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے اس لئے کوٹھی کے اندر جگہ دے رکھی ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں پھاٹک کے برابر ہی باہر اس کے لئے ایک شاندار کمرا بنوا دوں۔ اس طرح یہ کوٹھی سے باہر بھی ہو جائے گا اور آپ سے قریب بھی رہے گا۔"

ٹھاکر جی اپنے بھتیجے رتن لال کو کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد کہنے لگے۔ "ارے واہ! یہ ذرا سی بات اب تک میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ بہت اچھی تجویز ہے۔ جب میں الہ آباد سے واپس آؤں تو رجنی کمار بھوکو تیرے تعمیر کروائے ہوئے کمرے میں ملے۔"

اپنے اس سفر میں ٹھاکر جی نے آٹھ آدمی ساتھ لئے۔ ان میں بدری اور سمراجی بھی شامل تھے۔ منٹی کو بلوا کے خاص ہدایت کی۔ "منٹی جی! میری عدم موجودگی میں میرے بھتیجے رتن لال کا حکم چلے گا۔ تم اسے تعلقے داری کے معاملات سمجھاتے رہو اور خبردار جو رجنی کمار کو اب اپنے گھر لے گئے۔"

رجنی کمار کو سمجھایا۔ "دیکھو رجنی کمار! ٹھاکر رتن لال میرا بھتیجا اور میرا قائم مقام ہے۔ یہ تیرے لئے کوٹھی کے باہر پھاٹک سے ملحق شاندار نیا کمرا تیار کروا دے گا۔ اس وقت تک تو اپنے کارندوں کی کسی کوٹھری میں رہے گا۔ رتن لال سے جھگڑنا مت۔ اگر وہ کوئی الٹی سیدھی بات کرے تو برداشت کرلینا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا تجھ سے دل صاف نہیں ہے۔"

رجنی کمار نے درخواست کی۔ "جب تک آپ باہر رہیں، مجھے راج نگر کی کوٹھی میں رہنے کی اجازت دے دیں۔"

ٹھاکر جی گرم ہو گئے۔ "کیا مطلب! یہ تو نے کیا بات کہی۔ کہیں تو نے تھانے دار سے روپا وصول تو نہیں قائم کرلیا؟ تو راج نگر کی کوٹھی میں نہیں رہ سکتا۔"

رجنی کمار معافی مانگنے لگا۔ "ٹھاکر جی! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی اجازت کے بغیر تھانے دار سے روپے لوں گا تو یہ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ اب میں کبھی راج نگر کی کوٹھی میں رہنے کا نام بھی نہیں لوں گا۔"

ٹھاکر جی جانے لگے تو پھکو نے رتن لال کی نظروں سے بچ بچا کے عرض کیا۔ "ٹھاکر جی۔۔! آپ تو الہ آباد چلے جائیں گے۔ آپ کے پیچھے آپ کا بھتیجا مجھ پر الٹے سیدھے حکم چلائے گا۔ وہ ابھی سے کہہ رہا ہے کہ چاچا جی کی عدم موجودگی میں تو کوٹھی کے اندر قدم بھی نہیں رکھے گا۔ کیا آپ نے کوئی ایسا حکم دیا ہے؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا اور میں جانے سے پہلے رتن لال کو سمجھا دوں گا کہ وہ تجھ پر کوئی ایسا حکم نہ چلائے۔"

ٹھاکر جی چتر لال جی کے ساتھ الہ آباد چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی رتن لال نے رجنی کمار کو حکم دیا۔ "اب کچھ دن تو تعلقے کے کارندوں کے ساتھ کسی کوٹھری میں رہے گا۔ میں تیرے لئے کوٹھی کے باہر پھاٹک سے متصل دو شاندار کمرے تیار کروائے دیتا ہوں۔"

پھر پھکو کو بلا کر بہت ڈانٹا۔ "تو نے میری شکایت چاچا جی سے کردی۔ آخر تو خود کو سمجھتا کیا ہے۔ دو ٹکے کا نوکر اور گمان یہ ہے کہ میرا، ٹھاکر رتن لال کا مقابلہ کرے۔ آخر کو کوٹھی کے اندر تیری دلچسپی کا کون سا سامان ہے جو تو نے چاچا جی سے کوٹھی کے اندر رہنے کی اجازت چاہی؟"

پھکو رتن لال سے ذرا بھی نہ ڈرا اور کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی! آپ تعلقے کے آدمیوں سے بنا کے رکھیں کیونکہ ابھی آپ کو ہم سب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ مجھے کوٹھی کے اندر یا ہر سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

ٹھاکر رتن لال نے ایک دم نرمی اختیار کی اور کہا۔ "سمجھ لیا ہے، تو کوٹھی کے اندر رہے یا باہر۔ مجھے تو واقعی تم تو کوئی بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

پھکو کو رتن لال کے ایک دم نرم پڑ جانے پر حیرت ہوئی۔

اسی وقت رتن لال نے منٹی کو طلب کیا اور اسے حکم دیا۔ "راج مزدور بلواؤ اور کوٹھی کے باہر پھاٹک سے متصل دو شاندار کمرے فوراً تیار کرواؤ۔ ہمارے جو تشی جی مہاراج رجنی کمار اس میں قیام فرمائیں گے۔ ٹھاکر جی کا خیال ہے کہ جب پانچ سات دن بعد وہ واپس آئیں تو اپنے جو تشی جی کو سامنے کمرے میں آرام فرماتے نظر آئیں۔"

پھر رجنی کمار کو بلا کے کہا۔ "جو تشی جی! سنا ہے تم نے پیش گوئی کی تھی کہ اپنے علاقے میں دو سال بارش نہیں ہوگی۔ ایک سال بیت گیا، بارش نہیں ہوئی۔ دوسرا سال بھی بیت جائے گا اور بارش نہیں ہوگی۔ تم تو جوتشی سے زیادہ رشی لگتے ہو۔ کچھ میں بھی پوچھوں گا، بس سچ سچ بتا دینا۔"

رجنی کمار نے عاجزی سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی! جب آپ نے میرے بارے میں کچھ سنا ہوگا تو یہ بھی سنا ہوگا کہ میرا علم نجوم یا جوتش سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو ایک ماورائے عقل پراسرار قوت ملی ہوئی ہے جو مجھے کسی کے بارے میں بھی قبل از وقت کوئی بات یا کئی باتیں بتا سکتی ہے۔ اپنے بارے میں بھی جو آپ پوچھیں گے، اسے بتانے کی کوشش کروں گا کیونکہ یہ طاقت اپنی اختیاری نہیں ہے۔"

رجنی کمار سے یہ ساری باتیں کوٹھی کے اندر والے کمرے میں ہوئیں۔ یہاں چھوٹے ٹھاکر۔۔۔ نے رازداری سے یہ انکشاف بھی کیا۔ "تو نہیں جانتا کہ اپنے چاچا جی کتنے شکی مزاج آدمی ہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ تو جب تک یہاں ہے، کوٹھی کے اندر اسی کمرے میں پڑا رہ مگر ٹھاکر جی کا یہ حکم ہے کہ تیرے لیے کوٹھی کے باہر پھاٹک سے ملحق دو کمرے بنوا دیے جائیں۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی! مجھے کہیں بھی رکھا جائے، کوئی اعتراض نہیں۔ ٹھاکر جی نے منع کیا ہے کہ میں ان کی موجودگی میں نہ تو راج نگر جاؤں اور نہ منٹی جی کے گاؤں۔ تھانے دار نے مجھ سے کئی بار ملنے کی خواہش کی لیکن ٹھاکر جی نے اجازت نہیں دی۔ میں تو ٹھاکر جی کے احکامات کا پابند ہوں۔"

ٹھاکر رتن لال نے نہایت فراخ دلی سے کہا۔ "لیکن تیرے کہیں آنے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تو راج نگر جا یا تھانے دار سے مل، منٹی کے ساتھ اس کے گھر یا گاؤں جا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری طرف سے تو آزاد ہے لیکن ٹھاکر جی کو اس کی اطلاع ضرور ہونی چاہیے۔"

ٹھاکر رتن لال کی خشک اور نرم رویے نے رجنی کمار کو شک و شبے میں ڈال دیا کہ کہیں یہ شخص اس کی آزمائش تو نہیں کر رہا ہے۔

کوٹھی کے باہر پھاٹک سے متصل دو کمروں کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ اس کام کی نگرانی رتن لال خود کر رہا تھا۔

اسی دوران میں پھکو رجنی کمار کو اپنے گھر لے گیا اور پھول متی سے ملاقات کروائی۔

پھول متی بہت خوش تھی کہ اسے راج نگر میں مکان مل گیا تھا اور کاشت کرنے کے لئے پھکو کو دس بیگھا زمین بھی مل گئی تھی۔

پھول متی نے رجنی کمار کے قدموں میں پھول چڑھائے اور کہا۔ "تم تو اپنے دیوتا سمان ہو۔ اب گرو مہاراج یہ اور بتا دیں کہ اپنی بقیہ زندگی کیسی گزرے گی؟"

رجنی کمار نے وعدہ کیا۔ "وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔"

پھکو نے بیوی کو حکم دیا۔ "اب تو اندر جا، مجھے کچھ کام کی باتیں کرلینے دے۔"

پھول متی اندر چلی گئی تو پھکو نے رازداری سے کہا۔ "جو تشی جی! آج تم کو حاضری لگوانی ہے۔"

رجنی کمار نے وحشت زدہ انداز میں پوچھا۔ "کہاں؟"

پھکو نے شوخی سے جواب دیا۔ "اپنی ٹھکرائن کے پاس۔"

رجنی کمار نے صاف انکار کردیا۔ "اب میں ٹھکرائن سے نہیں ملوں گا۔ کوٹھی میں چھوٹے ٹھاکر جی موجود ہیں اور وہ شاید کسی موقع کی تلاش میں ہیں۔"

پھکو ہنسنے لگا۔ "بابو! تم چھوٹے ٹھاکر جی کو بالکل نہیں سمجھے جبکہ میں نے ان کو بہت جلد سمجھ لیا۔ اب تو کوٹھی میں ایک نیا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ تم چھوٹے ٹھاکر جی سے بالکل نہ ڈرو۔"

رجنی کمار پھکو کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

پھکو نے کہا۔ "دیکھو بھائی جو تشی جی! ٹھکرائن جب تک تم سے راضی ہیں، چھوٹے ٹھاکر جی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آج موقع ہے۔ میں تم کو وہاں پہنچائے دیتا ہوں، مل لو اور آگے کے معاملات طے کرلو۔"

رجنی کمار نے انکار جاری رکھا۔ "نہیں بھائی پھکو۔ اب ٹھکرائن سے اس گرام میں ملاقات کرنے کا یہ مطلب ہے کہ میں چوہے دان میں جا کر پھنس جاؤں۔"

پھکو نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی تو راج نگر گئے۔ کہہ رہے تھے، راج نگر کی کوٹھی کا انتظام دیکھیں گے لیکن بات کچھ اور ہے۔"

رجنی کمار کو یقین نہیں آیا کہ چھوٹا ٹھاکر راج نگر چلا گیا۔

پھکو نے کہا۔ "میرے آدمی بھی اِدھر اُدھر لگے ہوئے ہیں اور مجھے پل پل کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر جی نے میرے خاص آدمی پر بھروسا اور جو دھاکو اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔ ان دونوں کی چھوٹے ٹھاکر جی سے گاڑھی چھن رہی ہے۔ چھوٹے ٹھاکر جی ان دونوں پر کچھ خرچ بھی کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ جو مقام میں نے ٹھاکر جی کی خدمت کرکے حاصل کیا ہے، وہی مقام ان دونوں کو دلا جائے مگر وہ دونوں اپنے چیلے ہیں اور چھوٹے ٹھاکر جی کی ایک ایک بات مجھے بتا دیتے ہیں۔ جو دھا کہہ رہا تھا کہ پتا نہیں کیوں چھوٹے ٹھاکر جی تھانے دار سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ راج نگر بھی اسی سلسلے میں گئے ہیں۔ پر بھو اور جو دھا کو منع کیا ہے کہ تھانے دار سے ملاقات کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

رجنی کمار نے پوچھا۔ "یہ جو کچھ تو نے بتایا، کیا درست ہے؟"

پھکو نے کہا۔ "تم وقت نہ برباد کرو اور فوراً ٹھکرائن سے مل لو۔ وہاں سے کچھ اور باتیں معلوم ہو جائیں گی۔"

رجنی کمار اب بھی شک و شبے میں مبتلا تھا مگر پھکو نے اسے چپکے سے کوٹھی کے عقبی حصے میں داخل کردیا اور اس دروازے تک چھوڑ آیا جہاں رجنی کمار پہلے بھی جا چکا تھا۔

رجنی کمار کو دیکھتے ہی ٹھکرائن نے پھکو کو آواز دی اور رجنی کمار سے کہا۔ "پھکو کو روک، مجھے اس سے ضروری بات کرنا ہے۔"

رجنی کمار نے باہر رکنے کے پھکو کو آواز دی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا تو رجنی کمار نے کہا۔ "ٹھکرائن تجھ سے کوئی بات کریں گی۔"

پھکو تیز تیز قدموں سے چل کے ٹھکرائن کے پاس پہنچا اور سوالیہ نشان بن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ٹھکرائن نے کہا۔ "دیکھ پھکو! یہ رتن لال بڑا کائیاں ہے۔ ٹھاکر جی کے بھی کان کترنے کی فکر میں ہے۔ راج نگر تھانے دار

سے ملنے گیا ہے لیکن اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ وہ فوراً واپس بھی آسکتا ہے۔ چوکیدار سے کہہ کر وہ پھاٹک پر تالا لگا کے کہیں غائب ہو جائے تاکہ رتن لال اگر جلدی آ جائے تو بس چوکیدار کو ڈھونڈتا رہے۔"

پپکو چلا گیا۔ اب رجنی کمار کو یقین ہو گیا کہ پپکو نے اب تک جو کچھ بتایا وہ سب درست ہے۔

پپکو کے جاتے ہی ٹھکرائن نے رجنی کمار سے کہا۔ "دروازے کو اندر سے بند کر دے۔"

دروازہ اندر سے بند ہو گیا اور ٹھکرائن نے گلے شکوے شروع کر دیے۔ "ٹھاکر جی خود تو عیاشی کرتے پھرتے ہیں اور مجھ پر چوکی پہرا بٹھا دیا۔ تو جانتا ہے کہ ٹھاکر جی اپنے بھتیجے رتن لال کو کوٹھی میں کیوں لائے ہیں؟"

رجنی کمار نے پوچھا۔ "کیوں لائے ہیں؟"

ٹھکرائن نے کہا۔ "تو تو مجھے بہت بھولا لگتا ہے۔ مورکھ! یہ ان کا بھتیجا نہیں، میری جان پر بٹھایا ہوا ان کا چوکیدار ہے جو پوری کوٹھی میں بے روک ٹوک ہر جگہ آ جا سکتا ہے۔"

رجنی کمار نے لاتعلقی ظاہر کی۔ "یہ آپ کے گھریلو معاملات ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

ٹھکرائن نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ "تو کیسی بے گانگی کی باتیں کر رہا ہے۔ میں تو تجھے غیر نہیں سمجھتی۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "آپ غیر نہ سمجھیں، باقی سب ہی کی نظروں میں میں غیر ہی ہوں۔ جب آپ بلائیں گی تو ہی میں آ جاؤں گا۔ نہیں بلائیں گی تو اپنی مرضی سے کبھی بھی نہیں آ سکوں گا۔"

ٹھکرائن رجنی کمار سے بھڑکے بیٹھ گئیں اور گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "دراصل اس وقت میں نے تجھے بطور خاص اس لئے بلایا ہے کہ دیکھ پورے چوکیداری کے باوجود یہ کام ہو سکتا ہے۔ ٹھاکر جی کی اگر میں برابری نہیں کر سکتی تو ان کی ڈگر پر کچھ دور تو چل سکتی ہوں۔"

اس کے بعد ٹھکرائن آپے سے باہر ہو گئیں۔ ٹھکرائن میں بہت جوش و خروش اور والہانہ انداز پایا جاتا تھا۔ وہ اپنی اس رندی اور سرمستی میں بھی ٹھاکر رتن لال کو برا بھلا کہتی رہیں۔

جب چڑھی ندی اتر گئی تو ٹھکرائن نے اپنے بال درست کئے اور کہا۔ "دیکھ، وہ کونے میں رکھا صندوق کھول کے دیکھ۔ میں نے تیرے نام کی اس میں کتنی رقم ڈال رکھی ہے۔ میں تیرے نام سے بینک میں اکاؤنٹ بھی کھلوا سکتی تھی مگر تو اس میں پکڑا جائے گا کیونکہ ٹھاکر جی اور کشی کا بینک کے عملے سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے اور اس قسم کی باتیں زیادہ دنوں تک راز میں نہیں رہتیں۔"

رجنی کمار نے ٹھکرائن کے بے حد اصرار پر صندوق کو کھولا اور رقم گنی تو وہاں پورے پانچ ہزار روپے رکھے ہوئے تھے۔

رجنی کمار نے رقم گن کے صندوق بند کر دیا اور حسرت سے کہا۔ "اس کوٹھی میں میرا کوئی بھروسا نہیں۔ ٹھاکر جی کی ذرا سی ناراضی مجھے قتل کروا سکتی ہے اور یہی کام چھوٹے ٹھاکر جی بھی کر سکتے ہیں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس رقم پر میرا نام نہیں لکھا گیا۔"

ٹھکرائن نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "کس کی مجال ہے جو تجھے مارے۔ میں اس کو ٹھکانے لگا دوں گی۔ تو اسی کوٹھی میں رہے گا۔ ٹھاکر جی اور چھوٹے ٹھاکر یہاں رہیں یا نہ رہیں۔"

رجنی کمار نے بے یقینی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ یہ جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ درست ہو مگر فی الحال یہ بات میرے جیسے کسی آدمی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

ٹھکرائن نے اسے پیار کر لیا اور کہا۔ "ظالم تیرا یہی بھولا پن تو مجھے مار گیا۔ تو نے عورت کے بارے میں مشہور لفظ تریا چرتر تو سنا ہو گا مگر اسے دیکھا نہیں ہو گا۔ اب میں تجھے تریا چرتر دکھا بھی دوں گی۔"

○☆○

ٹھاکر جی نہایت غصے اور برہمی کی حالت میں چھ دن بعد واپس آئے۔

وہ اس بار بھی کرشنا کماری کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔

کشمر نے ان کا ساتھ تو دیا تھا مگر وہ بھی وکیل پر زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکا۔

وکیل نے اعتراف تو کیا کہ چتوال جی نے کرشنا کماری کو اس کے پاس چھوڑا تو تھا مگر بعد میں کرشنا کماری خود کہیں فرار ہو گئی۔ کہاں فرار ہو گئی، وکیل نے اس کی نشاندہی بھی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک دن کچھ لوگ آئے اور انہوں نے وکیل کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

وکیل نے سنا کہ باہر لوگ زور زور سے کہہ رہے تھے کہ کرشنا کماری کو باہر نکالو۔

وکیل نے باہر نکل کے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور کرشنا کماری کو کب سے جانتے ہو؟"

ان میں سے ایک بوڑھے نے کہا۔ "کرشنا کماری میری بیٹی ہے۔" اور دوسرے بوڑھے نے کہا کہ وہ اس کی بہو ہے۔ جب بیٹا مر گیا اور وہ دوہا ہو گئی تو ایک بار وہ الہ آباد گنگا جمنا کے سنگم پر اشنان کرنے آئی اور پیسے سے وہ غائب کر دی گئی۔ کچھ عرصہ اس کی تلاش ہوتی رہی اور پھر یہ سوچ کر عزیز رشتے دار صبر کر کے بیٹھ رہے کہ کرشنا نے گنگا میں آتما ہتیا کر لی ہو گی لیکن سالوں بعد کسی نے کرشنا کو وکیل کے پاس دیکھ لیا اور کرشنا کے گھر والوں کو خبر کر دی کہ کرشنا زندہ ہے اور دونوں گھروں کے لوگ کرشنا کو لینے آ گئے۔

کرشنا نے بھی اپنے باپ اور اپنے سسر کی تصدیق کی۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا تھا۔

وکیل نے جب یہ دیکھا کہ اگر ان لوگوں نے ہنگامہ کر دیا اور کرشنا نے بھی ان کا ساتھ دیا تو معاملہ پولیس تک پہنچے گا اور اخبار میں خبریں چھپنے لگیں گی۔ معاملہ اغلاً فاً اور قانوناً وکیل کے خلاف چلا جائے گا۔ چنانچہ وکیل نے کرشنا کماری کو ان کے حوالے کر دیا اور اپنی جان بچائی لیکن وکیل نے اپنا ایک آدمی ان کے پیچھے لگا دیا کہ وہ پتا لگائے کہ وہ کرشنا کماری کو کہاں لے جاتے ہیں۔ یہ آدمی بھی بس ایک حد تک دیہاتوں کی پگ ڈنڈیوں پر پیچھا کرتا رہا اور پھر کچھ پتا نہ چلا کہ وہ لوگ کرشنا کماری کو لے کر کہاں چلے گئے۔ ٹھاکر جی نے بھی ان پگڈنڈیوں پر سفر کیا مگر ناکام واپس آ گئے۔

ٹھاکر جی نے یہ ساری داستان سنانے کے بعد رجنی کمار سے کہا۔ "تو جو کچھ بھی بتاتا ہے وہ ہمیشہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ اب تو یہ معاملہ ہی بھر سنڈ ہو گیا اور پتا نہیں کرشنا کماری کہاں چلی گئی۔"

ٹھاکر جی نہ صرف غصے میں تھے بلکہ افسردہ بھی تھے۔ انہیں بات بات پر غصہ آ رہا تھا اور وہ اپنے کارندوں کو خوب ڈانٹ ڈپٹ رہے تھے۔

انہوں نے پھاٹک سے متصل رجنی کمار کے لئے تعمیر شدہ کمرے دیکھے تو اس پر چھوٹے ٹھاکر جی کو برا بھلا کہا اور حکم دیا۔ "اسے تڑوا دیا جائے۔"

رجنی کمار ٹھاکر جی کے سامنے سے ہٹ گیا اور ٹھاکر جی بڑبڑاتے ہوئے کوٹھی میں چلے گئے۔

چھوٹے ٹھاکر ...نے کارندوں سے کہا۔ "بس چاچا جی کی یہ بات بہت بری ہے کہ وہ غصے میں کسی کے مرتبے اور عزت کا خیال بھی نہیں کرتے۔ بھلا بتاؤ، خود ہی کمروں کی تیاری کا حکم دے گئے اور اب کہتے ہیں کہ انہیں تڑوا دو۔"

ٹھاکر جی کے کارندے چھوٹے ٹھاکر... کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملا سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ٹھاکر جی کی ملون مزاجی اور اشتعال چھوٹے ٹھاکر... کو کسی وقت بھی نکلوا سکتے ہیں۔ وہ لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے اور چھوٹا ٹھاکر تنہا رہ گیا۔

رجنی کمار کے لئے تیار کئے ہوئے کمرے میں چھوٹے ٹھاکر نے پرھوا اور جودھا کو بلوایا۔

یہ دونوں بھیگی بلی بنے ہوئے سامنے آ کے کھڑے ہو گئے۔

چھوٹے ٹھاکر نے احتیاطاً باہر نکل کر دیکھا کہ کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا اور پھر کمرے میں واپس پہنچ کے دونوں سے کہا۔ "یعنی ٹھاکر جی ناراض ہوئے تو تم دونوں بھی مجھے چھوڑ کے کہیں غائب ہو گئے۔"

جودھا نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی! میں تو اس لئے چلا گیا تھا کہ کہیں وہ مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دیں اور میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے جس کی شرمندگی آپ کو اٹھانا پڑے۔"

چھوٹے ٹھاکر ...نے پرھو سے پوچھا۔ "اور تو کیوں چلا گیا تھا؟"

پرھو نے جواب دیا۔ "صاحب! میں تو ٹھاکر جی کو دور سے آتے دیکھ کر ہی کھسک گیا تھا کیونکہ وہ جب بھی کچھ دن باہر رہ کے واپس آتے ہیں تو جو بھی ان کے سامنے آتا ہے، اس کی پٹائی کر دیتے ہیں۔"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "دیکھو! تم دونوں کئی دن میرے ساتھ رہے ہو۔ میں نے تھانے دار سے ملاقات کی اور کہاں کہاں گیا، تم دونوں جانتے ہو۔ تم اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا ورنہ ٹھاکر جی ہم تینوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دیں گے۔"

رات کو ٹھاکر جی نے پپکو کو اپنی بالائی خواب گاہ میں بلایا اور اس سے چھ دنوں کی روداد معلوم کی۔

پپکو نے کھرے پن سے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! آپ کا پورے علاقے پر اتنا رعب ہے کہ آپ علاقے میں موجود ہوں یا نہ ہوں، آپ کا رعب کام کرتا رہتا ہے۔"

ٹھاکر جی پپکو کے جواب سے بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ "یہ رتن لال اتنے دن کیا کرتا رہا؟"

پپکو نے جواب دیا۔ "ابھی چھوٹے ٹھاکر... نا تجربے کار ہیں۔ منشی سے کام سمجھتے رہے، تعلقے کا دورہ کرتے رہے، محنتی اور نئی جوان ہیں۔ دونوں کمرے بھی انہوں نے اپنی نگرانی میں تعمیر کروائے۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے۔ یہ اپنی تعلقے داری میری عدم موجودگی میں سنبھال لے گا؟"

پپکو نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! چھوٹے ٹھاکر... بھی آدمی کے بچے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ لیں گے۔ بس تجربے کی کمی ہے۔"

ٹھاکر جی نے چتوال جی اور وکیل کو بڑی گالیاں دیں اور کہا۔ "افسوس کہ وہ انگریز، کشمران دونوں کے درمیان پڑ گیا ورنہ میں تو ان دونوں کو کب کا جہنم رسید کر چکا ہوتا۔ دونوں نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔"

پپکو نے کہا۔ "ٹھاکر جی! آخر آپ کرشنا کماری کے لئے کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو میں خود پچاس کرشنا کماریاں آپ کے چرنوں میں ڈال سکتا ہوں۔"

ٹھاکر جی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور دونوں آنکھیں ابل پڑیں۔ "بے وقوف! کرشنا کماری کوئی مسئلہ نہیں۔ بات اپنی انا کی ہے، ٹھکرائی کی ہے، اپنے خاندان اور تعلقے کے وقار کی ہے۔ بھلا شیر کے آگے سے گیدڑ اس کا شکار لے جائیں، کیا شیر اپنی بے عزتی برداشت کر لے گا؟"

پپکو نے کہا۔ "ٹھاکر جی! یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ چھوٹے چھوٹے کام آپ اپنے چاکروں سے لیا کریں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ تعلقے کی طرف سے بے خبر ہیں اور آپ کا پدوسی زمیندار آپ کی کچھ زمین دبا بیٹھا ہے۔"

ایسا لگا جیسے چنگاریوں پر پیٹرول ڈال دیا گیا ہو۔ ٹھاکر جی غصے میں کھڑے ہو گئے اور دہاڑے۔ "وہ کون شامت زدہ زمیندار ہے جس نے میری زمین دبانے کی ہمت کی۔ میں تو اس کی ساری زمینیں ہتھیالوں گا۔"

اسی وقت ٹھاکر جی نے کوٹھی سے باہر نکل کے منشی اور چند کارندوں کو حکم دیا۔ "پکھو سے اس زمیندار کا پتا پوچھو اور اس کو اٹھا کے میرے پاس لے آؤ۔ اس کام کے لئے دس بیس' سو پچاس جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو' اپنے ساتھ لے جاؤ۔" اور منشی سے کہا۔ "تم یہ کام بدری اور مصراجی کے سپرد کردو۔"

بعد میں پکھو کا احساس ہوا کہ اس نے زمیندار والی بات وقت سے پہلے بتا دی ورنہ اسے یہ بات پانچ سات دن بعد ٹھاکر جی کے علم میں لانا چاہیے تھی۔

صبح تک واقعی ٹھاکر جی کے آدمی زمیندار کو اٹھا لائے اور اسے کوٹھی کے اندر' احاطے میں بچھی ہوئی ایک بینچ پر اس طرح بٹھا دیا جیسے وہ اس ڈیوڑھی کا چوکیدار ہو۔

ابھی صبح ہونے میں گھنٹا سوا گھنٹا باقی تھا۔ کوٹھی کا پھاٹک بند ہو گیا اور ٹھاکر جی کو اطلاع دی گئی۔ "آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی اور زمیندار بینچ پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

ٹھاکر جی اس طرح بالائی خواب گاہ سے برآمد ہوئے کہ ان کے آگے آگے پکھو لالٹین لئے چل رہا تھا۔

زمیندار کا خوف سے بہت برا حال تھا۔ اس نے ٹھاکر جی کو دیکھتے ہی ان کے پاؤں پکڑ لئے اور پوچھا۔ "ٹھاکر جی! مجھ سے کیا غلطی ہوئی کہ آپ نے مجھے مجرم کی طرح اٹھوالیا؟"

ٹھاکر جی نے پہلے تو اس کو بے تحاشا گالیاں دیں اس کے بعد پے در پے کئی طمانچے رسید کئے اور کہا۔ "شیر سے آنکھ لڑاتا ہے۔ شیر سے اس کا لقمہ چھینتا ہے۔ یہ تیری دوسری غلطی ہے۔"

زمیندار نے بلبلاتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ "ٹھاکر جی! آپ طاقتور ہیں۔ جو ظلم کریں گے' میں سہہ لوں گا لیکن مجھے میرا جرم تو بتائیں۔"

ٹھاکر جی نے پکھو سے کہا۔ "اسے اس کا جرم بتا۔"

پکھو نے کہا۔ "تو نے اپنے ٹھاکر جی کی کچھ زمین دبا لی اور پوچھتا ہے کہ میں نے کیا جرم کیا ہے۔"

زمیندار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! آپ مجھ سے گیتا اٹھوا لیں' میرے آدمیوں نے یہ غلطی کی تھی مگر میں نے وہ زمین واپس کر دی۔ آپ اپنے منشی کو بھیج کر معلوم کروا لیں مگر مجھے ذلیل نہ کریں۔"

ٹھاکر جی نے غصے میں کہا۔ "میں تو تیری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلوا دوں گا اور ہڈیاں پسوا کے اپنی کوٹھی کی بنیادوں میں ڈلوا دوں گا۔ آخر تو سمجھتا کیا ہے۔" پھر حکم دیا۔ "اس کو اوپر لے جا کے قید کر دو۔ اگر کوئی اس کی تلاش میں آئے تو اسے گولی مار دی جائے۔"

زمیندار کو کوٹھی کے عقبی حصے کی بالائی منزل کی کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔ وہ بلک بلک کے رو رہا تھا اور ٹھاکر جی سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

ٹھاکر جی نے کہا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ صبح میرے آدمی جا کے دیکھیں گے کہ تو نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ اس کے بعد ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔ اگر تو جھوٹا نکلا تو تیرا خلاصِ گمشدہ کا اشتہار ہی چھپتا رہے گا مگر تیرا پتا نہیں چلے گا۔"

دوسرے دن صبح منشی کچھ آدمیوں کو لے کر متنازع زمین دیکھنے گیا تو معلوم ہوا کہ زمین اب ٹھاکر جی کے قبضے میں ہے لیکن اس پر دو دن پہلے زمیندار کا قبضہ تھا۔

زمیندار کی گمشدگی نے اس کے علاقے میں ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ زمیندار کے آدمیوں کو بس اتنا معلوم تھا کہ زمیندار کو کہیں راستے سے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا ہے اور وہ ٹھاکر جی کے علاقے میں جاتے دیکھے گئے تھے۔

زمیندار کے آدمی بھی بہت مشتعل تھے۔ وہ بھی بندوقیں اور لاٹھیاں سنبھالے زمیندار کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ زمیندار کی کوٹھی میں پولیس پہنچ چکی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ زمیندار کے اغوا کے سلسلے میں اہلِ کوٹھی کو کس پر شبہ ہے؟

منشی نے وہاں جو کچھ دیکھا تھا اس کی تفصیل ٹھاکر جی کے گوش گزار کر دی۔

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "تجھے کچھ پتا ہے کہ زمیندار کے آدمیوں نے زمیندار کے اغوا کا کس پر شبہ کیا ہے؟"

منشی نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! میں تو زمیندار کی کوٹھی میں گیا نہیں' کوشش کروں گا کہ کسی سے معلوم کروا لوں کہ پولیس کو کیا بیان دیا گیا ہے اور شبے میں کس کا نام لیا گیا ہے؟"

ٹھاکر جی نے منشی کو تو چلتا کر دیا اور اپنے بھتیجے سے کہا۔ "دیکھ رتن لال' اب تجھے تعلقہ داری اور سپاہ گری کے ہتھکنڈوں کی عملی تربیت حاصل کرنا چاہیے۔"

رتن لال نے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں۔ آپ حکم دیں' میں تعمیل کروں گا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "کچھ آدمی لے اور میری طرف سے زمیندار کے گھر والوں سے افسوس کر اور ان سے کہہ کہ اس سلسلے میں' میں ان کی جو مدد کر سکتا ہوں' ضرور کروں گا۔ باتوں ہی باتوں میں ان سے یہ بھی پوچھ کہ انہوں نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے اور کس پر شبہ ظاہر کیا ہے۔ اگر انہوں نے شبے میں میرا نام لینے کی غلطی کی ہے تو' تو واپس آ کے زمیندار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے اور اس کی لاش گنگا میں بہا دے تاکہ اس کے گناہ دھل جائیں اور وہ پوتر ہو جائے۔"

چھوٹا ٹھاکر... ابھی راستے میں تھا کہ پولیس آتی دکھائی دی۔ راستے ہی میں چھوٹے ٹھاکر... کو یہ معلوم ہو گیا کہ زمیندار کے گھر

والوں نے کسی کا شبے میں نام تو نہیں لیا مگر اپنے بیان میں یہ ضرور کہا ہے کہ زمیندار کو اغوا کرنے والے ٹھاکر کے تعلقے میں گئے ہیں۔

چھوٹے ٹھاکر نے پولیس پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن پولیس والوں نے اس سے یہ ضرور پوچھا "تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

چھوٹے ٹھاکر... نے جواب دیا۔ "میں ٹھاکر... پرشوتم داس کا بھتیجا ٹھاکر رتن لال ہوں۔ چاچا جی کو کسی نے بتایا ہے کہ رات اپنے پڑوسی زمیندار کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ چاچا نے مجھے زمیندار کے گھر افسوس کرنے بھیجا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ اس سلسلے میں غمزدہ خاندان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن زمیندار کے گھر والوں نے تو یہ بتایا ہے کہ اغوا کرنے والے آپ کے تعلقے میں داخل ہوئے تھے۔ ہم اسی سلسلے میں ٹھاکر جی کے پاس جا رہے ہیں کہ دیکھیں وہ اس معاملے میں ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں۔"

چھوٹے ٹھاکر... نے انسپکٹر کو سمجھایا۔ "او بھائی انسپکٹر! چاچا جی ذرا سوچ سمجھ کر ادب قرینے سے بات کرنا۔ کہیں انہیں شبہ بھی ہو گیا کہ اغوا کے سلسلے میں ان پر شبہ کیا گیا ہے تو وہ تم سب کی ایسی تیسی کروں گے سیدھے انگریز کمشنر کے پاس پہنچیں گے اور پھر گورنر سے ملیں گے۔ تم لوگ حیثیت ہی کیا رکھتے ہو۔ وہ تو اغوا ہونے والے زمیندار کی زمینداری کو بھی خاک میں ملا دیں گے۔"

انسپکٹر کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ "ہم تو ٹھاکر جی سے مدد مانگنے جا رہے ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ ٹھاکر جی سے الجھنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

پولیس والے ٹھاکر جی کے پاس چلے گئے اور چھوٹے ٹھاکر نے زمیندار کی کوٹھی پر جا کے اپنے چاچا جی کی طرف سے افسوس کیا' انہیں تسلی دی۔ "چاچا جی نے کہا ہے کہ تم لوگ پریشان نہ ہو۔ اپنے چاچا جی تم سب کی ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔"

زمیندار کے گھر والوں کو شبہ تو کیا یقین تھا کہ زمیندار کے اغوا میں ٹھاکر... پرشوتم داس کا ہاتھ ہے کیونکہ چند دنوں سے کچھ زمین کا جھگڑا چل رہا تھا اور ماضی میں چودہ پندرہ سال پہلے بھی ایک تکلیف دہ سانحہ گزر چکا تھا۔

پیچھے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس نے سوچا۔ کاشت کار میں کہیں کسی درخت کے پیچھے چھپ گیا ہو گا۔

ٹھاکر رتن لال نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور کاشت کار کی تلاش شروع کر دی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ کاشت کار جوار کے اونچے اونچے پودوں کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو رہا ہو۔ اس کو پیچھے سے گدی پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے کہ میں تو تجھ سے بات کر رہا ہوں اور تو چھپ کے یہاں بیٹھ گیا۔"

کاشت کار نے کہا۔ "تو تم تعلقے دار جی کے بھتیجے ہو حالانکہ ان کے کسی بھتیجے یا بھانجے کا کسی نے کبھی کوئی ذکر نہیں سنا۔ پتا نہیں کہ تم کب آئے اور کہاں سے ٹپک پڑے۔"

ٹھاکر رتن لال کو کاشت کار کی بے تکلفی گراں گزری' غصے میں کہا۔ "میں نے تجھ سے اس پاگل کے بارے میں پوچھا تھا کہ یہ کون ہے اور تو ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔"

کاشت کار نے جواب دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی! یہ ایک پہنچے ہوئے مجذوب ہیں۔ لوگ انہیں پہنچے شاہ کہتے ہیں۔ بس یہیں ٹنگ دھڑنگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ بہت کم بولتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہوتا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے مجذوب کو اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ کاشت کار سے پوچھنا چاہا کہ ان مجذوب کا کہیں کوئی ٹھکانا تو ہو گا؟ لیکن اتنی دیر میں کاشت کار بھی غائب ہو چکا تھا۔

ٹھاکر رتن لال گھوڑے سے اترا تو مجذوب نے راس چھوڑ دی اور ایک طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ "پیالہ بھر چکا' بس چھلکنے ہی والا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے ایک کاشت کار کو روک لیا اور اس سے پوچھا۔ "یہ دیوانہ کون ہے؟"

کاشت کار نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

ٹھاکر رتن لال نے جواب دیا۔ "میں تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس کا بھتیجا ہوں۔ تمہارے زمیندار کی گمشدگی کی خبر سن کے چاچا جی نے افسوس کرنے بھیجا تھا۔"

کاشت کار نے کہا۔ "تو تم تعلقے دار جی کے بھتیجے ہو حالانکہ ان کے کسی بھتیجے یا بھانجے کا کسی نے کبھی کوئی ذکر نہیں سنا۔ پتا نہیں کہ تم کب آئے اور کہاں سے ٹپک پڑے۔"

ٹھاکر رتن لال کو کاشت کار کی بے تکلفی گراں گزری' غصے میں کہا۔ "میں نے تجھ سے اس پاگل کے بارے میں پوچھا تھا کہ یہ کون ہے اور تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔"

کاشت کار نے جواب دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی! یہ ایک پہنچے ہوئے مجذوب ہیں۔ لوگ انہیں پہنچے شاہ کہتے ہیں۔ بس یہیں ٹنگ دھڑنگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ بہت کم بولتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہوتا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے مجذوب کو اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ کاشت کار سے پوچھنا چاہا کہ ان مجذوب کا کہیں کوئی ٹھکانا تو ہو گا؟ لیکن اتنی دیر میں کاشت کار بھی غائب ہو چکا تھا۔

ٹھاکر رتن لال گھوڑے سے اترا تو مجذوب نے راس چھوڑ دی اور ایک طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ "پیالہ بھر چکا' بس چھلکنے ہی والا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے ایک کاشت کار کو روک لیا اور اس سے پوچھا۔ "یہ دیوانہ کون ہے؟"

کاشت کار نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

ٹھاکر رتن لال نے جواب دیا۔ "میں تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس کا بھتیجا ہوں۔ تمہارے زمیندار کی گمشدگی کی خبر سن کے چاچا جی نے افسوس کرنے بھیجا تھا۔"

کاشت کار نے کہا۔ "تو تم تعلقے دار جی کے بھتیجے ہو حالانکہ ان کے کسی بھتیجے یا بھانجے کا کسی نے کبھی کوئی ذکر نہیں سنا۔ پتا نہیں کہ تم کب آئے اور کہاں سے ٹپک پڑے۔"

ٹھاکر رتن لال نے زمیندار کے کئی دوسرے رشتے داروں سے بھی ملاقات کی۔ یہ سبھی زمیندار کی گمشدگی سے پریشان تھے اور کسی نے بھی شک و شبے میں تعلقے دار پرشوتم داس کا نام نہیں لیا تھا۔

جب ٹھاکر رتن لال ہر طرح اطمینان کر کے واپس جا رہا تھا تو ایک مجذوب نے ٹھاکر... رتن لال کے گھوڑے کی راس پکڑی اور کہا۔ "اپنے چاچا جی سے کہنا کہ پیالہ بھر چکا' پانی چھلکنے ہی والا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال گھوڑے سے اترا تو مجذوب نے راس چھوڑ دی اور ایک طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ "پیالہ بھر چکا' بس چھلکنے ہی والا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے ایک کاشت کار کو روک لیا اور اس سے پوچھا۔ "یہ دیوانہ کون ہے؟"

کاشت کار نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

ٹھاکر رتن لال نے جواب دیا۔ "میں تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس کا بھتیجا ہوں۔ تمہارے زمیندار کی گمشدگی کی خبر سن کے چاچا جی نے افسوس کرنے بھیجا تھا۔"

کاشت کار نے کہا۔ "تو تم تعلقے دار جی کے بھتیجے ہو حالانکہ ان کے کسی بھتیجے یا بھانجے کا کسی نے کبھی کوئی ذکر نہیں سنا۔ پتا نہیں کہ تم کب آئے اور کہاں سے ٹپک پڑے۔"

ٹھاکر رتن لال نے زمیندار کے کئی دوسرے رشتے داروں سے بھی ملاقات کی۔ یہ سبھی زمیندار کی گمشدگی سے پریشان تھے اور کسی نے بھی شک و شبے میں تعلقے دار پرشوتم داس کا نام نہیں لیا تھا۔

جب ٹھاکر رتن لال ہر طرح اطمینان کر کے واپس جا رہا تھا تو ایک مجذوب نے ٹھاکر... رتن لال کے گھوڑے کی راس پکڑی اور کہا۔ "اپنے چاچا جی سے کہنا کہ پیالہ بھر چکا' پانی چھلکنے ہی والا ہے۔"

کاشت کار نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر جی۔ اگر پہنچے شاہ نے یہ کہہ دیا ہے کہ پیالہ بھر گیا ہے اور چھلکنے ہی والا ہے تو بڑے ٹھاکر جی سے کہہ دینا کہ پہنچے شاہ کی کہی ہوئی کوئی بات آج تک غلط نہیں نکلی۔"

ٹھاکر رتن لال نے مجذوب کا پتا پوچھا۔ "میں اس سے ملنا چاہتا ہوں' وہ ملے گا کہاں؟"

کاشت کار نے جواب دیا۔ "پتا نہیں پہنچے شاہ کہاں ملیں گے مگر انہوں نے جو کچھ کہہ دیا اس کا بہت جلد تجربہ ہو جائے گا۔"

ٹھاکر رتن لال نے کاشت کار کو لالچ دیا۔ "اگر تو پہنچے شاہ سے میری ملاقات کروا دے تو میں تجھے انعام دوں گا۔"

کاشت کار نے کہا۔ "میں ان کو کہاں تلاش کروں گا۔ دو چار دن رکو تو شاید ملاقات ہو جائے ورنہ ان کے لئے تو مشہور ہے کہ ابھی وہ یہاں نظر آئے تو کچھ دیر بعد دس کوس دور صادق پور میں دیکھے گئے۔ اب پتا نہیں وہ یہاں ہیں بھی یا کہیں دور نکل گئے۔"

ٹھاکر رتن لال سوچ میں پڑ گیا اور پھر کچھ غور و فکر کے بعد کہا۔ "شاہ جی نے چاچا جی کو بددعا دے کے اچھا نہیں کیا۔ اگر وہ مجھے مل جائیں تو میں انہیں اٹھا لے جاؤں۔"

کاشت کار نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔"

ٹھاکر رتن لال نے کاشت کار کو دھمکی دی۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے پہنچے شاہ مجذوب سے ملوا ورنہ میں تجھ کو اٹھوا لوں گا۔"

کاشت کار نے شور کر دیا۔ "لوگو۔ دوڑو' تعلقے دار کا کتیا مجھے بھی اٹھانے کی دھمکی دے رہا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال گھبرا گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے جمع ہونا شروع ہو گئے۔

ٹھاکر رتن لال کے ساتھ آئے ہوئے آدمی بھی اپنے چھوٹے ٹھاکر کو تلاش کرتے ہوئے وہیں پہنچ گئے۔ ان میں اغوا شدہ زمیندار کے کارندے بھی موجود تھے۔

انہوں کو چاروں طرف دیکھ کے کاشت کار کا حوصلہ بڑھا' چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "اپنے پہنچے شاہ فرما گئے ہیں کہ پیالہ بھر چکا ہے اور اب چھلکنے ہی والا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے زمیندار کو اغوا ہوتے دیکھا' میں ان میں بدری ناتھ کو پہچانتا ہوں۔ یہ آدمی تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس کے ایسے ہی کام کرتا ہے۔"

اب بات اتنی بگڑ گئی تھی کہ ٹھاکر رتن لال کو اپنی جان بچانی مشکل ہو گئی۔

ایک بڑے میاں نے کہا۔ "تعلقے دار بڑا ہتیارا ہے۔"

کسی اور طرف سے آواز آئی۔ "ہتیارے نے کوئی آدمی پال رکھا ہے' کالا جادو جاننے والا۔ اس نے دو سال کے لئے برکھا ہی روک دی۔ ہمیں کنوؤں سے پانی دینا پڑ رہا ہے۔"

ایک بزرگ نے سب کو مشورہ دیا۔ "اپنی اپنی زبان قابو میں رکھو۔ بات وہ کرو جو وقت پڑنے پر ثابت بھی کر سکو۔"

زمیندار کے ایک کارندے نے ٹھاکر رتن لال پر لاٹھی سے وار کیا۔ "مارو ہتیاروں کو۔"

لیکن ٹھاکر رتن لال کے ایک آدمی نے اپنی لاٹھی پر یہ وار روک لیا اور لوگوں سے کہا۔ "ہم لوگ تمہارے زمیندار کی ہمدردی میں افسوس کرنے آئے تھے اور تم لوگ الٹے سیدھے الزام لگا رہے ہو۔ کیا تمہارے گاؤں میں مہمانوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جاتا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "ایک ایک کو پہچان لو۔ میں سب کو بند کروا دوں گا اور وہ بدری ناتھ کو دیکھنے والا کاشت کار کدھر گیا۔ اس کا نام اور پتا معلوم کرو۔"

وہ کاشت کار چپکے سے کھسک گیا تھا۔

اب ان لوگوں کا یہاں رکنا بے کار تھا کیونکہ یہ ڈر بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہاں کے دیہاتی ان پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔

اس نے واپسی اختیار کی۔

تقریباً ایک کوس چلنے کے بعد ٹھاکر رتن لال اپنے ساتھیوں سمیت ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ "تم لوگوں نے دیکھا بھی اور سنا بھی کہ یہاں کے لوگ اپنے چاچا جی کو ہتیارا کہتے ہیں۔"

کسی نے بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ سبھی خاموش رہے۔

چھوٹے ٹھاکر کو احساس ہو گیا کہ اس کے ساتھی بڑے ٹھاکر... سے ڈرتے ہیں اسی لئے خاموش ہیں۔ اس نے پوچھا۔ "تم لوگ یہاں کے بارے میں چاچا جی کو کیا رپورٹ دو گے؟"

ایک نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر' آپ پر لاٹھی سے حملہ ہوا تھا' یہ تو بتانا ہی پڑے گا۔"

دوسرے نے کہا۔ "وہ کاشت کار کی بات' جو کہتا تھا کہ زمیندار کو اپنے بدری نے اغوا کیا ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "ایک تو اپنے ٹھاکر جی کو ہتیارا بھی کہہ رہا تھا۔"

ایک کارندہ خاموش رہا۔ چھوٹے ٹھاکر نے اس سے پوچھا۔ "تو کیوں خاموش ہے؟ تو بھی تو کچھ کہہ۔"

اس نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر' یہ پہنچے شاہ کون ہیں؟"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "تو نے اچھا یاد دلایا۔ یہاں کوئی مجذوب پہنچے شاہ ہیں۔ مجھ سے ملے تھے۔ کہتے تھے کہ پیالہ بھر چکا ہے' بس چھلکنے ہی والا ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے کہا۔ "ان پہنچے شاہ کا نام تو میں نے بھی سنا ہے مگر ملا کبھی نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اشاروں میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو بعد میں سچ نکلتی ہے۔ بس ذرا صحیح مطلب نکالنے میں پریشانی

ہوتی ہے۔"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "واقعی پہنچے شاہ ملے تو تھے اور پتا نہیں کہ ان کی کہی ہوئی بات کا صحیح مطلب کیا ہے۔ اگر وہ دوبارہ ملیں تو میں ان سے اس کا مطلب ضرور پوچھوں گا۔"

اس آخری شخص نے کہا۔ "اگر چھوٹے ٹھاکر اجازت دیں تو میں پہنچے شاہ کو تلاش کروں۔"

چھوٹے ٹھاکر نے اجازت دے دی۔ "بالکل' اپنے چاچا جی تو رجنی کمار میں مگن ہیں۔ میں پہنچے شاہ کو پکڑتا ہوں۔ ان کا کسی بھی طرح پتا چلا۔"

ان باتوں کے بعد چھوٹے ٹھاکر نے بھی کو منع کر دیا کہ یہاں جو کچھ پیش آیا ہے اس کا چاچا جی سے ذکر نہ کیا جائے کیونکہ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ان میں سے ایک شخص پہنچے شاہ کی تلاش میں یہیں رک گیا باقی سب واپس چلے گئے۔

○☆○

ٹھاکر جی بہت غصے میں تھے۔ ٹھاکر رتن لال کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا خبر لائے ہو؟"

چھوٹے ٹھاکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "چاچا جی' آپ کی بڑی دھاک ہے۔ زمیندار کے گھر والے آپ کے شکر گزار ہیں کہ ان کے برے وقت میں آپ نے ان کی خبر لی۔"

بڑے ٹھاکر نے خوفناک نظروں سے بھتیجے کو گھورا۔ "لیکن کسی کاشت کار نے تو پولیس کو یہ بیان دیا ہے کہ اس نے زمیندار کو اغوا کرنے والوں میں اپنے بدری کو بھی دیکھا ہے۔"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "میں تو زمیندار کے گھر والوں سے ملنے گیا تھا۔ کاشت کاروں سے نہیں ملا۔ جس کاشت کار نے یہ بیان دیا ہے پولیس نے اس کا نام اور پتا تو بتایا ہوگا۔"

ٹھاکر جی نے جھنجلائے لہجے میں کہا۔ "پولیس بھی بدمعاشی کر رہی ہے۔ کاشت کار کا نام اور پتا نہیں بتایا مگر جب بات بڑھے گی تو اس کاشت کار کو بھی سامنے لانا پڑے گا۔"

اس وقت بڑے ٹھاکر... بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ پکا یک جیسے ان پر دیوانگی کا دورہ پڑا اور چیخنے چلانے لگے۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ جس طرح بھی ہو' اس کاشت کار کا نام اور پتا معلوم کرو۔ میں اس سور کے بچے کو نرک میں پہنچا دوں گا۔"

وہ اسی عالم میں رجنی کمار کے کمرے میں پہنچے اور اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "تو کب کام آئے گا۔ پڑے پڑے حرام کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ اس الو کے پٹھے کاشت کار ہی کی شکل دکھا دے جس نے اپنے بدری کو پہچان لیا ہے۔"

بڑے ٹھاکر... کو قرار نہیں تھا۔ رجنی کمار کے پاس بھی نہیں ٹھہرے۔ اندر ٹھاکرائن پر گرم ہو گئے اور پتا نہیں کیا کچھ کہہ ڈالا۔ انہیں شبہ تھا کہ ان کے خلاف کوئی بہت بڑی سازش ہو رہی ہے اور اس سازش میں ٹھاکرائن بھی شریک ہیں۔

ٹھاکرائن بھی گرم ہو گئیں۔ ٹھاکر جی نے ان سے پوچھا۔ "میرے پیچھے کس کس سے ملتی ہے اور کس قسم کی سازشیں کرتی رہتی ہے؟"

ٹھاکرائن نے بھی غصے میں جواب دیا۔ "میں تمہارے خلاف کسی سازش میں کیوں حصہ لوں گی اور تمہاری عدم موجودگی میں کس کی مجال ہے جو اس کوٹھی میں میرے پاس آئے اور ٹھاکر! یاد رکھو کہ آئندہ ایسی گری ہوئی بات نہ کرنا ورنہ میں بھی ٹھاکرائن ہوں۔ تمہاری اور اپنی جان ایک کر دوں گی۔ ایک ہی کٹاری سے دونوں مریں گے۔"

اس دھمکی کا ٹھاکر جی پر کچھ اثر ہوا اور وہ خاموشی سے کوٹھی سے نکل گئے۔ پھکو کو بلوایا کہ منشی کو تلاش کرے۔

منشی آگیا تو اسے بھیجی میں بٹھا کے راج نگر کے تھانے پہنچ گئے اور تھانے دار کو طلب کیا۔

تھانے دار کسی انکوائری پر گیا ہوا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہاں کا منشی کون ہے؟ ڈیوٹی انچارج۔ مجھے ایک ایف آئی آر کٹوانی ہے۔"

تھانے کے لوگ تھانے دار کی عدم موجودگی میں یہ ایف آئی آر نہیں کاٹنا چاہتے تھے' جواب دیا۔ "ٹھاکر جی' ذرا انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔"

ٹھاکر... یہاں بھی گرجنا برسنا شروع کر دیا' کہنے لگے۔ "میں نے پورے کے زمیندار کا اغوا ہوا۔ زمیندار کے گھر والوں میں سے کسی نے میرے آدمی بدری ناتھ کا نام لے لیا۔ کچھ دن پہلے اس زمیندار نے میری زمین ہتھیائی تھی۔ اب میرا آدمی بھی غائب کروا دیا۔ پتا نہیں بدری ناتھ کو مہوبن پورے کی پولیس اٹھا لے گئی یا زمیندار کے گھر والوں نے اغوا کرایا۔ بدری ناتھ کے اغوا کی ایف آئی آر درج کی جائے۔ میں نے دو گواہ بھی ظاہر کر دیا ہے۔ اب راج نگر کی پولیس کا یہ فرض ہے کہ وہ بدری ناتھ کو برآمد کرے۔"

ٹھاکر جی کو اس ایف آئی آر کے کٹوانے میں کچھ دقت لگا۔ ان کی عدم موجودگی میں کوٹھی کے سبھی لوگ بہت پریشان تھے۔ چھوٹے ٹھاکر کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں مہوبن پورے کی تفصیلات کا علم چاچا جی کو نہ ہو جائے۔

ٹھاکر... پر شوتم داس پر جنون کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ کرشنا کماری کو وقتی طور پر بھول چکے تھے اور وکیل کا خیال بھی دل سے نکال دیا تھا۔ ان کو شبہ تھا کہ زمیندار کے گھر والے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ جب انہیں اتنی بات معلوم ہو چکی ہے کہ زمیندار کے اغوا کرنے والوں میں بدری بھی شامل تھا تو یہ بات الہ آباد میں انگریز کمشنر تک بھی پہنچائی جا سکتی ہے اور اگر کسی طرف سے کمشنر پر زور پڑ گیا تو ان کی کوٹھی کی تلاشی بھی لی جا سکتی ہے۔

اب وہ زمیندار کو 'وعدے وعید لے کر چھوڑ بھی دیتے تو اس کے کسی وعدے یا عہد پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ رات کے اندھیرے میں زمیندار کی کوٹھی میں پہنچے۔

زمیندار کو کوٹھی کی بالائی منزل پر اسی کوٹھری میں قید تھا جہاں کبھی راجکو کو رکھا گیا تھا۔ اس کوٹھری میں دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا تھا اور لالٹین جلائی پڑتی تھی۔

اس وقت ٹھاکر جی کے ساتھ صرف پھکو تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔

یہ دونوں جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئے' زمیندار ٹھاکر جی کے قدموں میں گر گیا اور اپنے ناکردہ جرموں کی معافیاں مانگنے لگا۔

ٹھاکر جی نے کچھ دیر زمیندار کے چہرے پر نظریں جمائے رکھیں اور اس کے بعد آہستہ سے کہا۔ "بات تو بہت معمولی تھی۔ میں تجھے دو چار دن روک کے واپس بھیج دیتا مگر تیرے کسی آدمی نے موہن پورے کی پولیس کو بیان دے دیا ہے کہ تجھ کو میرے خاص آدمی بدری نے اغوا کیا ہے۔ اب تو بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

زمیندار نے ٹھاکر جی کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا۔ "ٹھاکر جی! اس بات کا فکر ہی نہ کریں۔ جس نے یہ بیان دیا ہے' میں اسے غائب کروا دوں گا اور آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

ٹھاکر جی نے پھکو کی طرف دیکھا۔ "تو کیا کہتا ہے؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! میں آپ کو کیا مشورہ دوں گا مگر یہ جانتا ہوں کہ چوٹ کھائے ہوئے ناگ پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔"

زمیندار نے پھکو کو بددعا دی۔ "تیرا ستیاناس ہو' تو نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

ٹھاکر جی نے پھکو سے پوچھا۔ "اپنا بدری کہاں ہے؟ اسے بھی یہیں اسی کوٹھری میں لے آ۔"

پھکو وہاں سے ٹل گیا اور ٹھاکر جی نے کرشنا کو دلاسا دیا۔ "دیکھ بھائی! بدری تجھے یہاں لایا تھا اور وہی تجھے یہاں سے لے جائے گا لیکن خبردار جو تو نے میرے خلاف زبان کھولی۔"

زمیندار نے ٹھاکر جی کے پاؤں دبانا شروع کر دیے۔ وہ دل و جان سے خوشامدیں کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پھکو بدری کے ساتھ واپس آیا۔ بدری بھی کچھ جھنگ گیا تھا۔ وہ ٹھاکر جی کو دیکھتے ہی گڑگڑانے لگا۔ "ٹھاکر جی! مجھے کیوں قید کر رکھا ہے؟"

ٹھاکر جی نے بڑے پیار سے کہا۔ "بے وقوف آدمی! باہر تجھے پولیس تلاش کر رہی ہے کیونکہ اس کمینے زمیندار کے کسی آدمی نے تجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے تو تیری حفاظت کی ہے۔"

بدری نے معصومیت سے پوچھا۔ "تو میں کب تک یہاں بند رہوں گا؟"

ٹھاکر جی کو ہنسی آ رہی تھی۔ "اس سوال کا جواب تو اوپر والا ہی دے سکتا ہے۔ میں مقدمے کو ختم کروانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس روز ختم ہو گیا تجھے آزادی مل جائے گی۔"

زمیندار نے کہا۔ "لیکن ٹھاکر جی! ابھی تو آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے بدری یہاں لایا ہے' وہی واپس بھی پہنچائے گا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں نے تجھ سے یہ وعدہ کیا ہے تو اسے پورا بھی کروں گا۔" اور پھکو سے کہا۔ "میں جس طرح کہوں تو اسے پورا بھی کروں گا۔" اور پھکو سے کہا۔ "میں جس طرح کہوں تو اسے پورا کرنا ہوگا۔ ذرا اپنے زمیندار کا اب خاص اسی طرح منصوبے پر عمل ہوگا۔ ذرا اپنے زمیندار کا اب خاص خیال رکھنا۔"

بدری نے پوچھا۔ "مجھے آپ نے کیوں بلوایا تھا؟"

ٹھاکر جی کا پارا ایک دم چڑھ گیا' غصے میں پھکو سے کہا۔ "تو نے کچھ بتایا کہ یعنی مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ میں نے اسے کیوں بلوایا تھا۔" اور اس کے ساتھ ہی ٹھاکر جی نے بدری کے دو طمانچے رسید کر دیے اور کہا۔ "میں نے اس لئے بلایا تھا جسے۔"

بدری اپنے گال سہلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ٹھاکر جی نے جاتے جاتے کہا۔ "اسے بھی یہیں زمیندار کے ساتھ بند کر دو۔"

زمیندار سہم گیا۔ ان دونوں کو ایک ہی کمرے میں مقفل کر دیا گیا۔

ٹھاکر جی کو چین نہیں تھا۔ نیچے اتر کے پھکو کو حکم دیا۔ "جا' رجنی کمار کو یہاں لے آ۔ آج میں اس کی بھی خبر لوں گا۔"

پھکو کو کوٹھی کے باہر نکلا اور رجنی کمار کی نئی رہائش گاہ پر زور زور سے دستک دی۔

رجنی کمار سویا ہوا تھا۔ ابھی وہ بیدار نہیں ہوا تھا کہ ٹھاکر رتن لال بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی بہت پریشان تھا' پھکو سے پوچھا۔ "آج چاچا جی بہت بے چین نظر آ رہے ہیں۔ یہ اوپر نیچے کیا کرتے پھر رہے ہیں؟"

پھکو نے ڈرے سہمے لہجے میں جواب دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر! کچھ نہ پوچھو۔ بھگوان ہم سب پر دیا کرے۔ آج تو اپنے ٹھاکر جی کی کھوپڑی گھوم گئی ہے۔"

پھکو نے دوبارہ زور زور سے دستک دی اور چھوٹے ٹھاکر سے کہا۔ "اس کو بھی طلب کیا ہے۔ دیکھو اس کی کیا درگت بنتی ہے۔"

رجنی کمار نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ پھکو اور چھوٹے ٹھاکر کو اتنی رات گئے اپنے دروازے پر دیکھا تو گھبرا کے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "جو تشی جی! ٹھاکر جی نے تم کو یاد کیا ہے۔ اسی وقت میرے ساتھ چلو۔"

چھوٹے ٹھاکر کے بھی کان کھڑے ہوئے' پھکو سے پوچھا۔ "میں بھی چلوں تیرے ساتھ؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "آپ کی مرضی' آپ چھوٹے ٹھاکر ہیں مگر اپنی مرضی سے اوپر چلیں۔ میرا نام نہ آئے کہ میں آپ کو لایا

ہوں۔"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "تیرا نام نہیں آئے گا۔ تو بے فکر رہ۔ ویسے چاچا جی اتنی رات کو اپنے جو تشی کو بلوا کے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔"

رجنی کمار جس حال میں تھا اسی میں ٹھاکر جی کے پاس چل دیا۔

ٹھاکر جی اپنی بالائی خواب گاہ میں چرخ کی طرح چل قدمی میں مشغول تھے۔ جیسے ہی کسی کی آہٹ سنی' رک کے دروازے کی طرف دیکھا۔

دونوں سے آگے رجنی کمار تھا۔ اس کے پیچھے چھوٹا ٹھاکر اور چھوٹے ٹھاکر کے پیچھے پچھو۔

چچا کے پچھو سے پوچھا۔ "میں نے اس اُلو کے پٹھے جوتشی کو بلوایا تھا اور تو رتن لال کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ تیرا دماغ اپنی جگہ ہے یا کہیں چرنے چلا گیا؟"

پچھو نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "ان کو میں نہیں لایا۔ یہ ضد کر کے اپنی مرضی سے آئے ہیں۔ میں نے تو انہیں منع بھی کیا تھا۔"

اب ٹھاکر جی نے بھتیجے کو حکم دیا۔ "تو سوتا کیوں نہیں؟ جا سو جا' صبح تجھ سے کئی کام لینا ہیں۔"

ٹھاکر رتن لال ادھر کچھ زیادہ ہی دلیر بلکہ گستاخ ہو گیا تھا' کہنے لگا۔ "چاچا جی! مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا کریں کیونکہ میں تعلقہ داری کے سارے گُر آپ سے سیکھنا چاہتا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے بھتیجے سے کہا۔ "اچھا ادھر بیٹھ جا۔" اور پچھو کو حکم دیا۔ "تو باہر جا' جب بلاؤں' آجانا۔"

پچھو خواب گاہ سے نکل گیا۔ اب ٹھاکر جی نے رجنی کو مخاطب کیا۔ "دیکھ بھئی رجنی کمار' میں نے بہت زیادہ برداشت کیا۔ رہنے کے لئے دو کمرے' بنوا دیئے' کھاتا ہے' پیتا ہے' اینڈتا ہے۔ آخر تو ہمارے کب کام آئے گا؟"

رجنی کمار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! آپ یقین کریں' میں آپ سے شام سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ اس وقت یہاں چھوٹے ٹھاکر بھی موجود ہیں ورنہ انہیں اسی وقت بلوانا پڑتا۔"

چھوٹے ٹھاکر کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ بڑے ٹھاکر نے غصے میں پوچھا۔ "یہ تو کیا اناپ شناپ بک رہا ہے۔ تو اسے کیوں تلاش کر رہا تھا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! آج شام سے کچھ پہلے میں اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ مجھے وہی پرانی ہاورائے عقل واقعات کی جھلکیاں دیوار پر دکھائی دیں۔ اس میں اپنے چھوٹے ٹھاکر اور ان کے کئی ساتھی بھی نظر آئے۔"

ٹھاکر جی نے رجنی کمار کو اور زیادہ اپنے قریب کر لیا اور پوچھا۔ "جلدی بتا کہ تو نے کیا دیکھا؟"

رجنی کمار نے کہا۔ "اپنے چھوٹے ٹھاکر کسی نئی بستی میں عورتوں سے باتیں کرتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ کچھ مرد بھی تھے اور انہیں کئی لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔ میرے کانوں نے سنا وہ زمیندار کے اغوا کی باتیں کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک نے کہا کہ میں نے ٹھاکر جی کے بدری ناتھ کو دیکھا' وہ اغوا کرنے والوں میں شامل تھا۔"

ٹھاکر جی نے ہاتھ کے اشارے سے چپ ہونے کا حکم دیا اور پوچھا۔ "چوہدری کو دیکھ لینے کی بات کر رہا تھا' اگر وہ تیرے سامنے آئے تو تو اسے پہچان لے گا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "بالکل پہچان لوں گا۔"

ٹھاکر جی نے اپنے بھتیجے کو دیکھا اور کہا۔ "دیکھ یہ اس کاشت کار کو پہچان لے گا۔ رجنی کمار' تو بہت کام کا آدمی نکلا! یہ تو کمال ہو گیا۔" پھر ٹھاکر جی نے رجنی کمار سے پوچھا۔ "ہاں تو اور تو نے کیا دیکھا؟"

رجنی کمار نے کہا۔ "پھر اچانک ایک دیوانہ سا آیا۔ کسی نے بتایا یہ پہنچے شاہ ہیں۔ اس دیوانے نے آتے ہی چھوٹے ٹھاکر سے کہا کہ پیالہ بھر چکا ہے' بس چھلکنے والا ہے۔

"وہ دیوانہ تو یہ کہہ کر غائب ہو گیا اور اپنے چھوٹے ٹھاکر پہنچے شاہ کی باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ پہنچے شاہ بڑے کراماتی آدمی ہیں۔ ابھی کمرے میں باتیں کر رہے تھے' دو چار دن بعد کوسوں کا فاصلہ طے کر کے کئی قافلے یہاں آئے گا تو یہ بتائے گا کہ پہنچے شاہ تو تین دن سے اپنے قصبے میں ہیں۔"

ٹھاکر جی کو کئی فکریں لاحق ہو گئیں' رجنی کمار کو حکم دیا۔ "تو کچھ دیر خاموش رہ' پہلے میں اپنے بھتیجے سے چند باتیں کر لوں۔"

بھتیجا یہاں سے بھاگنے کی فراق میں تھا کیونکہ اس نے یہ ساری باتیں سرے سے نہیں بتائی تھیں اور ٹھاکر جی اس کا محاسبہ کرنے والے تھے۔

اس کے بعد ٹھاکر جی نے اپنے بھتیجے سے کہا۔ "یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں رجنی کمار نے ہمیں بتائی ہیں' کیا وہ واقعی پیش آئی تھیں؟"

چھوٹے ٹھاکر نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "ہاں چاچا جی! مگر میں نے آپ سے اس لئے چھپایا تھا کہ میں آپ کے دل و دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا مگر میرا ایک آدمی موہن پورے میں رک گیا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو وہ کاشت کار پکڑا جائے گا اور اسے میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "اور وہ پہنچے شاہ کون ہیں اور ان کی بات کا تو نے کیا مطلب لیا ہے؟"

چھوٹے ٹھاکر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں نے تو کوئی مطلب نہیں لیا مگر موہن پورے کے لوگ کہہ رہے تھے کہ اپنے ٹھاکر جی سے کہنا کہ ان کے ظلم اور جبر کا زمانہ ختم ہوا اور چھلکنے کا یہ مطلب

ہے کہ ٹھاکر جی اب مزید ظلم کرنے کے لائق نہیں رہیں گے۔"

ٹھاکر جی ایک دم بپھر گئے۔ "میں کون سے ظلم کرتا ہوں جو اب مزید ظلم کرنے سے مجھے روک دیا جائے گا۔ چل دفع ہو یہاں سے' صبح تجھ سے باتیں ہوں گی۔"

چھوٹا ٹھاکر بھی یہی چاہتا تھا۔

اب پھر ٹھاکر جی رجنی کمار سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں تو اور تو نے کیا دیکھا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! میں نے بس اتنا ہی دیکھا تھا۔ لوگ پہنچے شاہ کا ذکر کر رہے تھے کہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔"

ٹھاکر جی نے حکم دیا۔ "کچھ اور دیکھنے کی کوشش کر' رجنی کمار۔ اتنے سے کام نہیں چلے گا۔"

رجنی کمار نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "ٹھاکر جی! میں بہت کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کو آپ کے مطلب کی باتیں بتاؤں لیکن بس تڑپ کے رہ جاتا ہوں۔"

ٹھاکر جی معلوم نہیں کیا سوچ رہے تھے' اچانک کہنے لگے۔ "میرے میں پھنس گیا ہوں۔ اگر زمیندار سے وعدے وعید لے کے اور حلوہ کر کے چھوڑ بھی دوں تب بھی اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ موہن پورے میں بدری کا چرچا بھی ہو رہا ہے۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

رجنی کمار نے خلاف توقع ایک عجیب سا سوال کر دیا۔ "ٹھاکر جی! وہ جو آپ ششما کاری کو والہ آباد سے لائے تھے' وہ کہاں ہے؟"

ٹھاکر جی نے چونک کر رجنی کمار کو دیکھا۔ "یہ اچانک تجھے ششما کاری کیوں یاد آ گئی؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "اصل بات تو یہ ہے کہ میں آپ پر پڑنے والی ہر بپتا کے بعد یہی سوچتا ہوں کہ اگر اس کو ٹھی میں ششما کاری ہے تو آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو بڑی بھاگوان کنیا ہے۔"

ٹھاکر جی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے۔ وہ کوٹھی میں ہی ہے۔ میں نے اسے کہیں اور پہنچا دیا ہے کیونکہ مجھے ٹھکرائن کی طرف سے اطمینان نہیں ہے۔ شاید اب مجھے ششما کو یہیں کوٹھی میں اپنے ساتھ رکھنا پڑے۔"

اس کے بعد ٹھاکر جی کچھ دیر چپ چاپ سوچتے رہے پھر حکم دیا۔ "اچھا اب تو جا' اور کوشش کر کہ تجھے کچھ اور معلوم ہو جائے۔ میں بھی کچھ کرتا ہوں۔"

رجنی کمار جانے لگا تو ٹھاکر جی نے آواز دے کے روک لیا۔ "ذرا ٹھہر جا۔"

رجنی کمار ٹھہر گیا اور مڑ کے انہیں دیکھنے لگا۔ ٹھاکر جی نے کہا۔ "دیکھ جو کچھ تو آئندہ دیکھے گا اس کا کسی اور سے ذکر نہیں کرے گا اور یہ جو آج تو نے رتن لال کے سامنے سب کچھ بیان کر دیا' آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

رجنی کمار نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "آئندہ میں خیال رکھوں گا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "اچھا پھر جا۔"

وہ رات کے پچھلے پہر پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلوا کے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں پڑ رہا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا تھا۔ اب وہ پہنچے شاہ کے جملے پر غور کر رہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر نے اس جملے کا جو مفہوم بتایا تھا وہ بڑا خطرناک تھا۔ اب اس نے ٹھاکر جی کے موجودہ معاملات کو شدت سے خود پر طاری کر لیا کہ شاید کچھ نظر آ جائے۔ اسے پوری امید تھی کہ ایسی ہی شدید کیفیات میں اسے کچھ نہ کچھ نظر آنے لگتا ہے۔

ابھی احساس کی شدت پوری طرح طاری نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اسے گمان گزرا کہ شاید ٹھاکر جی نے دوبارہ بلوا لیا ہے۔ وہ دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے سرگوشی میں جواب ملا۔ "دروازہ کھول' میں ٹھاکر رتن لال ہوں۔"

اسے دروازہ کھولنے میں تامل تھا کیونکہ وہ چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے مطمئن نہیں تھا' پوچھا۔ "چھوٹے ٹھاکر' مجھ سے کوئی خاص کام ہے؟"

چھوٹے ٹھاکر نے جھنجلی بھنچی آواز میں ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر' دروازہ کھول۔"

رجنی کمار نے دروازہ کھول دیا۔ چھوٹا ٹھاکر... اندر داخل ہوا اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

رجنی کمار اور زیادہ سہم گیا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آخر بات کیا ہے؟"

چھوٹے ٹھاکر نے غصے میں کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو چاچا جی کے سامنے کیا بکواس کر رہا تھا۔ اگر تجھے کچھ معلوم بھی ہو گیا تھا تو اس کا مجھ سے ذکر کرنا تھا۔ اب صبح ٹھاکر جی میری جو خبر لیں گے' میں ہی جانتا ہوں۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ میں خیال رکھوں گا۔"

چھوٹے ٹھاکر نے اسے کچھ دیر خوب خوب ڈانٹا پھٹکارا اور کہا۔ "مجھے تیری حرکتوں کا پتا چل گیا ہے۔ اگر تو نے میرے خلاف کوئی شرارت کی تو میں تجھے وہ سبق دوں گا کہ....."

رجنی کمار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ مجھے دھمکی مت دیں۔ مجھے ٹھاکر جی نے ابھی کچھ دیر پہلے ہدایت کی ہے کہ میں ان کے سوا کسی سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ آپ اسی وقت یہاں سے چلے جائیں کیونکہ ٹھاکر جی کا کوئی بھروسا نہیں کہ وہ ابھی ابھی آن ٹپکیں۔"

رجنی کمار کے سخت پڑ جانے کا چھوٹے ٹھاکر پر بھی اثر ہوا' کہنے لگا۔ "دیکھ بھائی! یہاں میری بھی ایک حیثیت ہے۔ اگر تو نے مجھے نظرانداز کیا تو سمجھ لے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے' اسی کے مطابق تیرے وجود کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ مجھے موت سے نہ ڈرائیں اور اب آپ یہاں سے جائیں۔"

چھوٹے ٹھاکر نے ایک دم پینترا بدلا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ تو میں تیرا امتحان لے رہا تھا۔ خوشی ہوئی کہ تو اپنے چاچا جی کا پکا وفادار ہے۔ بس جاتے جاتے تجھ سے ایک ہی درخواست کروں گا کہ اب جو کچھ تجھے نظر آئے یا معلوم ہو اور اس میں میرا بھی ذکر ہو تو اس کی پہلے مجھے اطلاع دینا۔ اس کے بعد میرے مشورے سے آگے بات کرنا۔"

رجنی کمار نے کوئی وعدہ نہیں کیا اور جیسے ہی چھوٹے ٹھاکر کے قدم باہر نکلے' رجنی کمار نے اپنے کمرے کو اندر سے بند کرلیا۔

○☆○

ٹھاکر جی کے لئے زمیندار کا مسئلہ بن چکا تھا۔ پولیس نے بھی تفتیش کا دائرہ وسیع کردیا تھا۔ وہ ٹھاکر جی کے آدمیوں سے پوچھ گچھ کرنے لگی تھی مگر ٹھاکر جی نے اس میں بھی سختی اختیار کی اور موہن پورے کی پولیس کو ڈانٹ دیا۔ "ہمارے جس آدمی کی ضرورت ہو اس سے ہمارے علاقے ہی میں پوچھ گچھ کی جائے۔ میں اپنے کسی آدمی کو موہن پورے کے تھانے تک نہیں جانے دوں گا۔"

موہن پورے کا تھانے دار بار بار بدری کو طلب کر رہا تھا مگر ٹھاکر جی نے اسے لاپتا قرار دے دیا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ "میرا آدمی کسی اور کا آلۂ کار بن گیا۔ وہ وہیں ہوگا جس کے لئے اس نے زمیندار کو اغوا کیا ہوگا۔"

ٹھاکر جی کو اب یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ زمیندار کو زیادہ عرصے تک چھپا کے نہیں رکھ سکتے کیونکہ اب یہ باتیں اخباروں میں بھی آنے لگی تھیں۔ اخباروں میں ٹھاکر جی کا نام تو نہیں لیا جا رہا تھا مگر اشارتاً یہ لکھا جا رہا تھا کہ ان واقعات کے پیچھے ایک صاحبِ اقتدار ہستی ہے۔

ٹھاکر جی بھی یہ خبریں پڑھ رہے تھے اور انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے گرد دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

وہ زمیندار کو کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے مگر یہ خوف بھی تھا کہ اگر زمیندار کو مار بھی دیا گیا تو اس کی لاش کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے گا۔

یہ امکان بھی پیدا ہوگیا تھا کہ ٹھاکر جی زمیندار اور بدری کو قتل کروا کے دونوں کی لاشیں اپنے تعلقے کے باہر کسی دریا میں پھکوا دیں مگر اس میں یہ اندیشہ تھا کہ دونوں کی لاشیں جب تعلقے سے باہر لے جائی جا رہی ہوں تو راستے میں کہیں دونوں لاشیں پکڑی جائیں اور ان کا نام لے لیا جائے۔

اب حالات زیادہ خطرناک تھے۔ کرشنا کماری کا معاملہ تو کسی جیسے سرد خانے میں پڑ گیا تھا۔ وکیل کی بھی خیر خبر نہیں ملی تھی۔

ان سب سے بڑھ کر جو نیا خطرہ نمودار ہو رہا تھا وہ ٹھاکر جی کے بھتیجے ٹھاکر رتن لال کی پراسرار حرکات و سکنات تھیں۔

چھوٹے ٹھاکر نے موہن پورے سے متعلق بہت سی خبریں چھپائی تھیں مگر رجنی کمار کے ذریعے ان میں سے کچھ کی خبر ٹھاکر جی کو ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے ٹھاکر نے راج نگر کے تھانے دار سے بھی کئی ملاقاتیں کی تھیں۔ ان ملاقاتوں کی تفصیل بھی ٹھاکر جی کو نہیں معلوم ہو سکی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے ان ملاقاتوں کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ چونکہ اسے بڑے ٹھاکر جی کی نیابت کرنی ہے اس لئے وہ اس طرح تربیت حاصل کر رہا ہے۔

ٹھاکر جی کو یہ بھی معلوم تھا کہ رتن لال' پرتال جی سے بھی کئی بار مل چکا ہے۔ یہ تمام باتیں ٹھاکر جی کو اس لئے گوارا تھیں کہ رتن لال ان کا بھتیجا تھا اور اپنے اس بھتیجے سے وہ ششانا کماری کی شادی کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ یہ بھتیجا حقیقتاً ان کے بیٹے کی جگہ تھا۔ اچھی تربیت پانے کے بعد یہ ٹھاکر جی کی بڑی اچھی نمائندگی کرسکتا تھا اور بڑے دقتوں میں بہت کام آسکتا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ٹھاکر... پرشوتم داس انتہائی اہم' نازک اور خطرناک معاملات میں رتن لال کو شامل نہیں کرتے تھے اور اسے لاعلم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

شہروں میں گاندھی جی کی اندولن نام کی تحریک چل رہی تھی۔ جگہ جگہ اس تحریک میں حصہ لینے والوں پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ گاندھی جی نے کوئٹ انڈیا (ہندوستان چھوڑ دو) کا نعرہ ہندوستانیوں کو دے دیا تھا۔

پوری سرکاری مشینری اس انقلابی تحریک کو کچلنے میں مشغول تھی اس لئے ملک کے دوسرے غیر سیاسی مسائل کی طرف سے چشم پوشی اختیار کرلی گئی تھی۔

ٹھاکر... پرشوتم داس کی نظریں ان علاقے معاملات پر تھیں اور ان کی دانست میں زمیندار اور بدری کو ٹھکانے لگانے کا اس سے بہتر موقع میسر نہیں آسکتا تھا۔

اس کی انہوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ مصراجی اپنے دونوں ساتھیوں میں تنہا باقی بچا تھا۔ چنانچہ ٹھاکر جی نے اس کو تخلیے میں طلب کیا اور کہا۔ "مصراجی! تجھ سے ایک نہایت اہم کام لینا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ اس کا کسی اور کو پتا نہ چلے۔"

مصراجی کو بدری کی بڑی فکر تھی۔ اسے بھی بس یہی معلوم تھا کہ بدری کہیں روپوش ہوگیا ہے اور پڑوسی زمیندار کے اغوا کے سلسلے میں پولیس اس کو تلاش کر رہی ہے۔

مصراجی نے کہا۔ "ٹھاکر جی! آپ حکم کریں۔ آپ کے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔"

ٹھاکر جی نے بدری کا ذکر کیا۔ "وہ بڑے کام کا آدمی تھا۔

انتہائی نڈر اور کسی بھی خطرے سے نہ ڈرنے والا۔ پتا نہیں وہ کس کے بہکاوے میں آگیا اور کیس روپوش ہوگیا۔ حالانکہ اگر اس سے کچھ غلطی بھی ہوئی تھی تو اس کو میرے پاس آنا چاہیے تھا۔ میں اپنا یہ خطرناک کام بھی اسی سے لیتا۔ اب جو وہ نہیں ہے تو تجھے کرنا پڑے گا۔"

مصراجی نے تردد سے پوچھا۔ "ٹھاکر جی! کام کیا ہے؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "دو لکڑی کے صندوق ہیں۔ انہیں اسٹیشن سے منتقر کے لئے بک کروانا ہے۔ بھیجنے والے کی جگہ کسی بھی فرضی آدمی کا نام لکھوا دینا اور وصول کرنے والے کی جگہ بھی کسی کا فرضی نام اور پتا لکھوا دینا۔ بس یہ ذرا سا کام ہے مگر انتہائی رازداری سے انجام دینا ہے۔ جب تو یہ کام کرکے واپس آئے گا تو میں تجھے ایک ایسا انعام دوں گا کہ تیری نسلیں مزے کریں گی۔"

مصراجی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "ان صندوقوں میں مال کون سا ہوگا؟"

ٹھاکر جی نے تیوریاں چڑھائیں۔ "میں کام لیتا ہوں' حکم دیتا ہوں مگر کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ کوئی میرے کسی بھی معاملے میں ٹانگ اڑائے یا کچھ پوچھ کرے۔ تو نے مجھ سے یہ بیہودہ سوال کیوں کیا؟"

مصراجی نے پوچھا۔ "مجھے یہ کام کب کرنا ہوگا؟"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "تو کل صبح دونوں صندوق بیل گاڑی میں رکھ کے اسٹیشن چلا جا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جیپ راستے میں مل جائے اور میری جیپ تیرے گھر کو پہنچا دے۔ اگر اسٹیشن پر کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہیں ٹرین کے ڈبے میں دونوں صندوق رکھ کے واپس آجانا لیکن یہ خیال رہے کہ راستے میں تجھے کوئی نہ روکے۔"

مصراجی نے کہا۔ "ٹھاکر جی! آپ ناراض نہ ہوں تو میں کچھ پوچھوں۔"

ٹھاکر جی نے دوبارہ تیوریاں چڑھائیں اور کہا۔ "پوچھ۔"

مصراجی نے کہا۔ "بیل گاڑی اور جیپ پر الگ الگ سفر کرنے کا کیا مقصد ہے؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میری جیپ کی راستے میں تلاشی بھی لی جاسکتی ہے لیکن بیل گاڑی کی تلاشی کوئی نہیں لے گا۔"

مصراجی نے کم فہم کیفیت میں جواب دیا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر میں پکڑا جاؤں اور بیل گاڑی سے کوئی ایسی ویسی چیز برآمد ہو تو میرا کیا بنے گا؟"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "تو پکڑا نہیں جائے گا کیونکہ جو تھانے دار میرا مخالف ہے' اسے شہر بلوا لیا گیا ہے۔ اس کا چارج وقتی طور پر نائب تھانے دار نے سنبھال لیا ہے اور وہ میرا اپنا آدمی ہے۔"

مصراجی نے بیل گاڑی تیار کروائی اور اسے کوٹھی کے اندر صحن میں کھڑا کردیا۔

اسی رات ٹھاکر جی نے زمیندار اور بدری کو مروا دیا اور ان کی لاشیں دو الگ الگ صندوقوں میں بند کرکے ان میں تالے ڈال دیئے۔

مصراجی کو صبح بیل گاڑی تیار ملی اور نصیحت گاڑی بان کی طرف پشت کرکے پاؤں لٹکا کے صندوقوں پر بیٹھ گئے۔ مصراجی گاڑی بان کے پیچھے ایک صندوق سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

بیل گاڑی کوٹھی سے نکل کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔

تقریباً دو کوس بعد پیچھے سے ٹھاکر جی کی جیپ آتی دکھائی دی۔ جب یہ جیپ قریب آئی تو معلوم ہوا کہ اس پر چھوٹے ٹھاکر کے علاوہ صرف ڈرائیور تھا' تیسرا کوئی نہ تھا۔

دونوں نصیحت کوئی رسماتی گیت گا رہے تھے۔

جیپ نے بیل گاڑی کے سامنے آکے اسے روک دیا اور پوچھا۔ "مصراجی! کیا لئے جا رہے ہو؟"

مصراجی کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ سوال کرنے والا چھوٹا ٹھاکر تھا۔ مصراجی نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! یہ سوال تو آپ نے بڑے ٹھاکر جی سے کیا ہوتا۔"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "بیل گاڑی کی رفتار سست کردو۔ آگے پولیس تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

مصراجی گھبرا گیا اور کہا۔ "تب پھر چھوٹے ٹھاکر ہمارے ساتھ ساتھ چلو کہ ہم پر اگر کوئی مصیبت پڑے تو اسے سنبھال تو لو۔"

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "مصراجی! تم فکر نہ کرو۔ میں معاملہ سنبھال لوں گا۔"

اور جیپ تیزی سے آگے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔

خلافِ توقع اسٹیشن سے کچھ پہلے پولیس نے جیپ کو روک لیا اور چھوٹے ٹھاکر کو نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ جیپ پر دو صندوق رکھے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں دو انسانی لاشیں ہیں۔"

یہ نائب تھانے دار شیو چرن تھا۔ ٹھاکر جی کا پکا نمک خوار۔

چھوٹے ٹھاکر نے جیپ سے اترکے ڈرائیور سے کہا۔ "تو بھی نیچے آجا۔" اور نائب تھانے دار شیو چرن سے کہا۔ "خوب اچھی طرح جیپ کی تلاشی لے لے۔ تو نے ہم پر یہ کیسا بیہودہ الزام لگایا ہے۔"

شیو چرن اور سپاہی جیپ کی تلاشی لیتے رہے۔ چھوٹے ٹھاکر نے ان سب کا مذاق اڑایا۔ "دو صندوق جن میں دو لاشیں رکھی گئی ہوں' انہیں سوئی کی طرح کیا تلاش کر رہے ہو؟"

تلاشی لینے کے بعد جب کچھ نہیں نکلا تو چھوٹے ٹھاکر نے شیو چرن سے کہا۔ "اپنے رونا بچے میں لکھو کہ تم نے جیپ کی تلاشی لی اور اس میں سے کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔"

شیو چرن نے ایک کاغذ پر اس عبارت کا لکھ کے چھوٹے ٹھاکر کے حوالے کیا اور روزنامچے میں بھی اس کا اندراج کرلیا۔

جیپ کچھ آگے جا کے ایک دوسرے راستے سے بیل گاڑی

کے پاس پہنچ گئی۔ بیل گاڑی رکوائی اور دونوں ٹھیتوں سے کہا۔ "ان دونوں صندوقوں کو فوراً جیپ پر رکھوا دو۔"

معراجی نے بیل گاڑی سے اترکے پوچھا۔ "وہ کیوں چھوٹے ٹھاکر؟"

چھوٹے ٹھاکر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "بے وقوف آدمی! آگے پولیس ان دونوں صندوقوں کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ میں اسی لئے اپنی جیپ تیری بیل گاڑی کے آگے پیچھے بھگا رہا تھا۔"

معراجی کو یہ اندازہ تو تھا کہ دونوں صندوقوں میں کوئی خطرناک چیز موجود ہے۔ فوراً دونوں ٹھیتوں کی مدد سے صندوق جیپ پر رکھوا دیے۔

چھوٹے ٹھاکر نے معراجی کو سمجھایا۔ "آگے پولیس والے بیل گاڑی کو روکیں گے اور پوچھیں گے کہ اس پر جو دو صندوق رکھے ہوئے تھے' وہ کہاں ہیں۔ تم مکر جانا اور کہنا کہ ہم تو اسٹیشن سے ٹھاکر جی کے ایک مہمان کو لینے آئے ہیں۔ ہمارے پاس صندوقوں کا کیا کام۔"

اور پھر دونوں ٹھیتوں کو سمجھایا۔ "دیکھو' تم بھی ان دونوں صندوقوں کا کوئی ذکر نہ کرنا۔ یہی کہنا کہ بیل گاڑی پر صندوقوں کا کیا کام۔" اور معراجی سے کہا۔ "معراجی! تم آخر میں شیو چرن سے یہ تحریر ضرور لے لینا کہ پولیس نے تلاشی لی مگر کچھ برآمد نہیں ہوا اور شیو چرن سے یہ بھی کہنا کہ یہ سب اپنے روزنامچے میں بھی لکھ لے۔"

دونوں صندوقوں کو جیپ پر رکھوا کے چھوٹا ٹھاکر نائب ہو گیا۔

معراجی حیران تھا کہ منصوبہ کیا تھا اور اب وہ سیکریٹل کیا تھا' شاید اس لئے کہ معراجی پر ٹھاکر جی کو اعتبار نہیں تھا اور اصل منصوبے سے معراجی کو لاعلم رکھا گیا تھا۔

بیل گاڑی کو بھی آگے پولیس نے روک لیا اور معراجی سے پوچھا۔ "وہ دونوں صندوق کہاں ہیں جنہیں لے کر تم چلے تھے؟"

معراجی نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا۔ "میری توبہ۔ یہ آپ مجھ پر کیسا الزام لگا رہے ہیں۔ کون سا صندوق! کیسا صندوق؟ میں تو ٹھاکر جی کے ایک مہمان کو لینے اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

اسی دوران میں چھوٹے ٹھاکر کی جیپ دونوں کے پاس سے گزر گئی۔

شیو چرن نائب تھانے دار نے بیل گاڑی سے کچھ برآمد نہ ہونے کی تحریر معراجی کو دے دی اور اپنے روزنامچے میں بھی اس کا اندراج کر دیا۔

کئی دنوں بعد دونوں کی لاشیں دریائے گنگا سے برآمد ہوئیں لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ دونوں کو اغوا کر کے کس نے قتل کر دیا اور دونوں کی لاشیں صندوقوں میں ڈال کے دریا میں بہا دیں۔

اخبارات میں ان کا بڑا چرچا ہوا مگر بڑے ٹھاکر جی پر شبہ کرنے کے باوجود کسی نے ان کا نام نہیں لیا۔

شہروں میں گاندھی جی کی اندولن نامی تحریک زوروں پر تھی اور ساری انتظامیہ اسی طرف لگی ہوئی تھی۔

زمیندار کے ورثا نے کمشنر تک رسائی حاصل کر لی تھی اور وہ اپنے ایک کاشت کار کے حوالے سے بتا رہے تھے کہ زمیندار کو ٹھاکر جی کے آدمی بدری نے اغوا کیا تھا مگر بعد میں دونوں کی لاشیں دریائے گنگا میں بہتے ہوئے دو صندوقوں سے برآمد ہوئیں۔

کمشنر کی مجبوری یہ تھی کہ ٹھاکر جی کا خاندان انگریزوں کا وفادار تھا اور زمیندار کے معاملے میں ٹھاکر جی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت یا شہادت بھی نہیں مل سکی تھی۔ بس راج نگر کے تھانے سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ زمیندار اور بدری کی گمشدگی کے دوران میں ٹھاکر جی کی جیپ اور بیل گاڑی کی مشتبہ حالتوں میں تلاشیاں لی گئی تھیں مگر ان کے پاس سے کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔

اس بار پھر ٹھاکر جی بہت بڑی واردات کر کے قانون کے ہاتھوں سے صاف بچ نکلے تھے۔

○☆○

اب ٹھاکر جی کو اس مجذوب پہنچے شاہ کی جستجو تھی جو حالتِ دیوانگی میں پیش گوئی کے ذریعے ٹھاکر جی کو خوفزدہ کر رہا تھا۔

ٹھاکر جی نے پہنچے شاہ کی تلاش میں اپنے کئی آدمی لگا دیے کہ وہ جہاں بھی ملے' اسے اٹھا کے کوٹھی پر لے آئیں۔ رگھو کہار نے کہا۔ "اب تیرے مقابلے میں ایک پاگل آیا ہے۔ اب اپنی ماورائی قوت سے پتا لگا کہ یہ پہنچے شاہ ہمیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچائے گا۔"

رجنی کمار بہت بشاش تھا۔ اس نے پہنچے شاہ کے بارے میں تو کوئی خبر نہ دی بلکہ ٹھاکر جی کو ایک دوسری خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔ "بڑے ٹھاکر جی! یہ آپ کے لئے بہت اچھا وقت ہے۔ رات میں نے دیکھا کہ آپ وکیل سے اس کے دفتر میں خوش خوش مل رہے ہیں اور وکیل بھی آپ سے بہت تپاک سے ملا تھا۔ تب میں چھوٹے لال جی بھی آگئے اور وکیل نے چھوٹے لال جی کو اپنے سامنے بٹھا لیا تھا۔ چھوٹے لال جی! اب اس کھیل کو ختم کر دو۔ بہت دن کرشنا کماری کو رکھ لیا' اب اسے ٹھاکر جی کے حوالے کر دو۔'

"پھر میں نے آپ کو بہت غصے کی حالت میں دیکھا۔ آپ نے وکیل سے پوچھا۔ 'یہ معاملہ کیا ہے؟'

"تو وکیل نے بتایا کہ یہ سارا چکر چھوٹے لال جی کا چلایا ہوا تھا اور وکیل ہی کے کہنے پر اب چھوٹے لال جی نے بدرجۂ مجبوری یہ فیصلہ کیا ہے کہ کرشنا کماری کو ٹھاکر جی کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ کرشنا کماری اب بھی ان کے سوا کسی کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔

"چھوٹے لال جی بہت شرمندہ تھے۔ وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ کرشنا کماری کے سلسلے میں 'انہوں نے جو زیادتی کی ہے' وہ اس کا نقصان بھرنے کو تیار ہیں۔"

ٹھاکر جی' رجنی کمار کے اچانک چپ ہو جانے سے پریشان تھے' بے چینی سے پوچھا۔ "آگے بتا' پھر کیا ہوا؟"

رجنی کمار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "پھر چھوٹے لال جی نے کرشنا کماری کو آپ کے حوالے کر دیا۔ اس وقت تو آپ دونوں سے کچھ نہیں بولے اور کرشنا کماری کو کوٹھی میں لے آئے مگر کرشنا کماری کو آپ نے کوٹھی کے جس حصے میں رکھا وہ بالکل کوئی الگ تھلگ جگہ تھی۔ وہاں مجھے اور بہت سی نوجوان لڑکیاں اور ادھیڑ عمر عورتیں نظر آئیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مرد بھی قیدیوں کی طرح ایک احاطے میں بند تھے۔ وہ عجیب سی جگہ تھی۔ میں نے تو یہاں کوئی ایسی جگہ دیکھی نہیں۔"

ٹھاکر جی نے رجنی کمار کو ڈانٹ دیا۔ "زیادہ بکواس نہ کر۔ جو کچھ تو نے دیکھا ہے اس پر تبصرے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ تُو تو بس یہ بتا کہ کرشنا کماری ٹھیک تو تھی اور میں نے اسے جس کمرے میں رکھا تھا وہاں کوئی اور بھی تھا؟"

رجنی کمار نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "بس ٹھاکر جی! اتنا ہی دیکھا تھا۔ کرشنا کماری جی کچھ بیمار لگ رہی تھیں۔"

ٹھاکر جی نے کچھ سوچتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہا۔ "وہ بیمار تو ہوگی۔ پتا نہیں ان بدمعاشوں نے اتنے دنوں تک اس سے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ جب وہ بیمار پڑ گئی ہوگی اور ان کے کام کی نہیں رہی ہوگی تو اسے ہمارے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔"

اس وقت ٹھاکر جی بہت اداس بھی تھے اور غصے میں بھی۔ رجنی کمار سے پوچھا۔ "میں نے ان دونوں کو مارا نہیں۔ یعنی میں نے انہیں معاف کیوں کر دیا اور چپ چاپ کرشنا کماری کو کیوں لے آیا؟"

رجنی کمار نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ ٹھاکر جی بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگے۔

اب ٹھاکر جی کے پاس صرف معراجی اور منشی کیدار ناتھ رہ گئے تھے۔ انہیں رگھو اور بدری جیسے دو آدمی درکار تھے مگر اعتماد کا ایک آدمی بھی نہیں مل رہا تھا۔ شاید اب وہ دونوں کو مار کے پچھتا رہے تھے۔ ان کے کئی اہم کام ان دونوں کی کمی کی وجہ سے نہیں ہو پا رہے تھے۔ معراجی اور منشی کیدار ناتھ ان دونوں جیسے نہیں تھے۔

جب سے رجنی کمار نے یہ بتایا تھا کہ کرشنا کماری ٹھاکر جی کو مل جائے گی انہیں اس ملنے کی ساعت کا بے چینی سے انتظار تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کی کچھ شکایتیں بھی ٹھاکر جی نے سنیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے دو آدمی چھوٹے ٹھاکر کے دائیں بائیں بازو بنے ہوئے ہیں اور ان دونوں کی ٹھاکر... رتن لال کے چھوٹے سے دربار میں وہی حیثیت تھی جو رگھو اور بدری کی ٹھاکر جی کی نظروں میں تھی۔

ٹھاکر جی نے جو دعا سے ٹھاکر رتن لال کی شکایتیں سنی تھیں۔ وہ ٹھاکر جی کو' ٹھاکر رتن لال کے بارے میں عجیب عجیب خبریں دیتا رہتا تھا۔ شروع شروع میں ٹھاکر جی نے ان پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا مگر وہ جو دعا کو نظروں میں رکھے ہوئے تھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا یہ محض راگھو یا بدری کی جگہ لے سکتا ہے؟

اسی دوران میں پربھو نے بھی ٹھاکر رتن لال کے بارے میں ٹھاکر جی کو جو دعا جیسی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ ٹھاکر جی نے پربھو کو بھی نظروں میں رکھ لیا۔

گویا اب ٹھاکر جی کو پربھو اور جو دعا کی شکل میں بدری اور راگھو کے متبادل مل گئے تھے۔ ان دونوں نے ٹھاکر جی کو ان کے بھتیجے رتن لال کے بارے میں ایک بات مسلسل اور تواتر سے بتائی تھی کہ ٹھاکر جی کا یہ بھتیجا ان کا وفادار نہیں ہے اور اس نے راج نگر کے تھانے دار سے بڑے تعلقات بڑھا رکھے ہیں۔

ٹھاکر جی نے اس سلسلے میں اپنے بھتیجے سے جب بھی باز پرس کی تو اس نے یہی عذر پیش کیا کہ اسے اس طرح تربیت حاصل کرنا پڑ رہی ہے کیونکہ بھگوان نہ کرے اگر ٹھاکر جی پر کوئی وقت پڑ جائے اور ان کی عدم موجودگی میں ٹھاکر رتن لال کو تھانہ کچہری کرنا پڑے تو اس کا اسے پہلے سے تجربہ ہونا چاہیے۔

ٹھاکر جی اس کی اس دلیل کو مسلسل مانتے رہے لیکن جو دعا نے ٹھاکر جی کو یہ بتا کے حیران کر دیا کہ اب رتن لال چھوٹے لال جی سے تعلقات بڑھا رہا ہے اور وکیل سے بھی خاصی بے تکلفی ہو گئی ہے۔

ٹھاکر جی نے ٹھاکر رتن لال کو تو وکیل کے پاس الہ آباد روانہ کر دیا اور ہدایت کی کہ وہ ہفتہ دس دن وکیل کے ساتھ رہے اور یہ دیکھے کہ وکیل سے کس طرح کام لیا جاتا ہے اور وکیل اپنے مؤکلوں کو کس طرح بے وقوف بناتا ہے۔

بھتیجے کی عدم موجودگی میں جو دعا اور پربھو' ٹھاکر جی کے بہت قریب ہو گئے اور ٹھاکر جی نے بھی ان دونوں سے چھوٹے چھوٹے غیر قانونی کام لینا شروع کر دیے۔

ٹھاکر جی نے جو دعا کو مقتول زمیندار کے گاؤں بھیج دیا اور کہا۔ "وہاں کوئی پہنچے شاہ مجذوب ہیں۔ ان کو تلاش کر اور کسی بھی طرح اسے میرے پاس لے آ۔"

جو دعا تو مہینوں پورے میں پہنچے شاہ کی تلاش میں نکل گیا اور پربھو کو چھوٹے لال جی کی کوٹھی پر روانہ کیا کہ وہ ٹھاکر رتن لال کی عدم موجودگی میں چھوٹے لال جی سے ملے اور چھوٹے ٹھاکر... کی طرف سے اس طرح کی باتیں کرتا رہ گویا ٹھاکر رتن لال نے اسے یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ چھوٹے لال جی سے خیر خیریت لیتا رہے اور اسی دوران میں پوچھے کرشنا کماری کا کیا ہوا؟ اس کو کب تک بڑے ٹھاکر جی کے حوالے کیا جا رہا ہے؟

پربھو راج نگر جا کے واپس آیا اور بتایا کہ چھوٹے لال جی بھی الہ آباد گئے ہوئے ہیں۔

ٹھاکر جی نے کہا۔ "اچھا اب تُو یہیں رہ۔ اب چھوٹے لال جی سے

کوئی بات نہ کرنا۔"

جودھا بھی تین دن بعد یہ خبر لے کر واپس آیا کہ پہنچے شاہ موہن پورے میں موجود ہیں مگر ان کو قصبے والوں نے کچھ ایسا گھیر رکھا ہے کہ انہیں یہاں تک لانا مشکل ہے۔

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "اس کی کوئی خاص بات؟ آج کل اس نے کیا رٹ لگا رکھی ہے؟"

پربھو نے کہا۔ "بڑے ٹھاکر جی! میں خود پہنچے شاہ سے ملا تھا اور میں نے ان سے پوچھا کہ شاہ جی میں بہت سی مصیبتوں کا مارا چھپتا پھر رہا ہوں اور میرا مالک مجھ سے ناراض ہے' آپ بتائیں کہ میں کب تک چھپتا پھروں گا؟"

ٹھاکر جی نے غصے میں کہا۔ "یہ کیا بیوقوفوں والا سوال کر دیا تو نے؟"

پربھو نے عاجزی سے عرض کیا۔ "بڑے ٹھاکر جی! آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں نے یہ سوال سوچ سمجھ کے نہیں کیا تھا بلکہ اس وقت میں بالکل بے اختیار تھا۔ میری زبان سے جو کچھ نکلا' بے اختیاری میں نکلا۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "پھر کیا جواب دیا اس نے؟"

پربھو نے کہا۔ "کہنے لگے تو کیوں بھاگے گا' مالک خود بھاگے۔ پیالہ بھر چکا' وہ تو چھلک کے رہے گا' اتنا کہہ کے مجھے بھگا دیا کہ جعلی آدمی دفع ہو جا۔"

بڑے ٹھاکر جی نے کہا۔ "اس کا مطلب کیا ہوا' اس قسم کے لوگ عجیب بے تکی باتیں کرتے ہیں کہ آدمی کے کچھ پلے ہی نہ پڑے۔"

پربھو نے محسوس کیا کہ اب ٹھاکر جی کچھ بے چین ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد پربھو کو تو رخصت کر دیا اور خود موہن پورے جانے کے منصوبے بنانے لگے۔ وہ اس مجذوب سے ملنے' باتیں کرنے اور کچھ پوچھنے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔

ٹھاکر رتن لال الہ آباد سے واپس آیا۔ وہ ٹھیک بارھویں دن واپس آیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وکیل کی بڑی تعریفیں کرتا رہا اور پھر ڈرتے ڈرتے ٹھاکر جی سے کہا۔ "چاچا جی' وکیل بہت اچھا آدمی ہے۔ پر جب میں واپس آ رہا تھا تو اس نے مجھ سے یہ ایک عجیب سی بات کہی۔ کچھ دیر پہلے وکیل کی چچا لال جی سے تو تو میں میں ہو گئی تھی۔ شاید ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی تھی پھر دونوں میں کسی نے بیچ بچاؤ کروا دیا اور وکیل نے مجھ سے کہا۔ 'چھوٹے ٹھاکر! اگر ہو سکے تو ہم دونوں کا تم ایک کام کر دو' چاچا جی! میں سوچنے لگا کہ میں ابھی اتنا بڑا کہاں ہے کہ ان دونوں کے کسی کام آؤں پھر پتا نہیں وکیل نے کسی کرشنا کماری کا ذکر کیا کہ وہ ان دونوں کے قبضے میں ہے۔ وہ اسے آپ کی امانت کہہ رہے تھے اور دونوں نے بالاتفاق کہا کہ ٹھاکر جی سے کہنا کہ وہ دونوں کو معاف کر دیں اور چچا لال جی اپنی زیادتی کا بھگتان بھی ادا کرنے کو تیار ہیں۔ میں نے ان دونوں سے کہہ دیا کہ میں تم دونوں کی یہ بات چاچا جی تک پہنچا دوں گا پھر وہ جو چاہیں کریں' میں کوئی ذمے داری نہیں لے سکتا۔"

اب ٹھاکر جی بہت زیادہ بے چین نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑبڑانے لگے۔ "دونوں ہی کمینے نکلے' میں تو انہیں جیل کی چکی پسواؤں گا۔ پتا نہیں دونوں نے اس غریب کا کیا حال کر دیا ہو گا۔"

اس کے بعد ٹھاکر جی بہت بے قرار اور بے چین رہنے لگے۔ وہ اندر سے آگ ہو رہے تھے۔ ان کے سینے میں آتش فشاں ابل رہا تھا۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے مگر طبیعت قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ پھٹکار کرنے لگے۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مٹھی میں بھونچال آیا ہو۔

ٹھاکر جی نے اپنے بھتیجے رتن لال کو بھی خوب خوب ڈانٹا کہ اس نے وکیل اور چچا لال جی سے تعلقات کیوں بڑھائے۔

ٹھاکر رتن لال نے اپنے چاچا کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا۔ "میں ان سے تعلقات کیوں بڑھاؤں گا۔ آپ ہی نے مجھے وکیل کے پاس بھیجا تھا۔ وہیں چچا لال جی بھی مل گئے اور دونوں نے مجھے آپ کا بھتیجا سمجھ کے مجھ سے اتنی باتیں کر لیں۔ اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ آپ ان دونوں سے ناراض ہوں گے تو میں انہیں اسی وقت منع کر دیتا کہ میں چاچا جی سے یہ بات نہیں کروں گا۔"

ٹھاکر جی نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔ "اچھا اب اٹھ جا لیکن میں ان دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔"

کئی دن بعد ٹھاکر رتن لال نے اپنا سامان سمیٹا اور چلتا سانس کا صندوق ہاتھ میں لٹکائے ٹھاکر جی کے پاس پہنچا اور جانے کی اجازت چاہی۔

ٹھاکر جی نے تین کے صندوق پر نظر کی پھر اس کے صاف ستھرے لباس کو دیکھا اور پوچھا۔ "کہاں چلا؟"

ٹھاکر رتن لال نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اپنے آبائی جھونپڑے کی طرف۔ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے دیکھا۔ ٹھکرائن بھی کہیں طرف سے آ کے کھڑی ہو گئی تھیں اور ایک طرف پچھو بھی کھڑا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کو رخصت ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر جی نے ٹھکرائن سے کہا۔ "دیکھ لے پچھو' یہ کہاں جا رہا ہے؟"

ٹھکرائن نے کہا۔ "تم خود پوچھو' جب تم کسی کی عزت آبرو کا خیال نہیں کرو گے تو گالیاں کھانے کے لئے کون تمہارے پاس رہے گا۔"

ٹھاکر جی نے پچھو سے کہا۔ "اس بکس لے کر اندر کیس رکھ دے۔"

پچھو نے آگے بڑھ کے بکس لے لیا۔ چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "چاچا جی! اس میں میرے اپنے کپڑے ہیں جو میں گھر سے لے کر یہاں آیا تھا۔"

ٹھاکر جی نے حکم دیا۔ "اچھا اب باتیں نہ بنا اور اندر جا۔"

ٹھاکر رتن لال رونے لگا اور کہا۔ "چاچا جی! آپ کی بڑی کرپا ہو گی' مجھے جانے دیں۔"

ٹھاکر جی ایک دم پھٹ پڑے۔ "سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا۔ اندر جا۔ میں تجھے اپنی مرضی سے لایا تھا۔ اب تو میری مرضی کے بغیر کس طرح چلا جائے گا۔ جا کے تو دیکھ' میں تو تجھے بند کروا دوں گا۔ آخر تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے!"

پچھو نے تین کا صندوق دوبارہ چھوٹے ٹھاکر کو تھما دیا اور کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! اندر جائیں' بات نہ بڑھائیں۔"

رتن لال چپ چاپ اندر چلا گیا۔

ٹھاکر جی کچھ دیر بڑبڑاتے رہے اور جب یہ دیکھا کہ اب ان کی بڑبڑاہٹ سننے کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تو چپ ہو گئے۔

دوسرے دن ٹھاکر جی نے رتن لال کو طلب کیا۔ اس وقت وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے' کہنے لگے۔ "ارے بے وقوف! تجھے تیرے گھر سے میں لایا تھا۔ شٹاشا سے میں تیری شادی کروں گا۔ تو خوش قسمت ہے کہ میرے بعد یہ تعلقے واری تجھ کو مل جائے گی اور تو حماقت میں اپنی خوش قسمتی کو لات مار کے بھاگ جانا چاہتا ہے۔"

ٹھاکر جی کو مسلسل رونا آ رہا تھا' کہنے لگا۔ "چاچا جی! اکیلے میں آپ مجھے دس جوتے لگا دیں' میں اف نہیں کروں گا مگر یہ جو آپ ہر کس و ناکس کو منہ لگا کے خوار کر دیتے ہیں تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈال کے چھت کی دھنی سے لٹک جاؤں۔"

ٹھاکر جی نے نہایت مشفقانہ انداز میں سمجھایا۔ "ارے احمق! تو اتنے دن سے میرے ساتھ ہے اور مجھے نہیں سمجھا۔ میرا دل برا نہیں ہے' زبان البتہ بری ہے۔ اب میں خیال رکھوں گا۔"

چھوٹے ٹھاکر نے ایک بار پھر اپنے چاچا کے پاؤں پکڑ لئے اور مگرمچھ کے سے زار و قطار رونا رہا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو ٹھاکر جی کا پاؤں گیلا کرتے رہے۔

آخر کچھ دیر بعد ٹھاکر جی نے اس کو اپنے قدموں سے اٹھایا اور سینے سے لگا لیا' کان میں پھسکے سے کہا۔ "ہم کل صبح موہن پورہ چلیں گے۔ تو بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔ سنا ہے پہنچے شاہ موہن پورے میں موجود ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے منع کیا۔ "چاچا جی' آپ وہاں نہ جائیں کیونکہ زمیندار کے گھر والوں کو آپ پر شبہ ہے۔ اگر وہ ہوش میں آ کر کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میں نے کوشش کی تھی کہ پہنچے شاہ کو الٹوا لوں لیکن میرے کسی آدمی کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ مجھے موقع ملا تو اپنے ساتھ لے آؤں گا۔"

ٹھاکر رتن لال بے بس ہو گیا کیونکہ ٹھاکر جی کے مقابلے میں اس کی دال نہیں گل سکتی تھی۔ یہ بھی طے تھا کہ ٹھاکر جی وہ ایک بار فیصلہ کر لیتے تھے' اس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے اور انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا کہ ان کا وہ فیصلہ غلط ہے یا صحیح۔

ٹھاکر رتن لال نے کہا۔ "چاچا جی! پھر ایسا کریں کہ دو چار دن بعد چلیں۔ میں اپنا کوئی آدمی بھیج کے زمیندار کے گھر والوں کو اطلاع دے دوں گا تاکہ وہ آپ کے شایانِ شان استقبال کریں۔"

ٹھاکر جی نے ڈانٹ دیا۔ "پاگل ہوا ہے۔ ایک طرف تو تو یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ مجھ پر شبہ کرتے ہیں' دوسری طرف مشورہ دیتا ہے کہ میں وہاں اچانک نہ جاؤں۔ اطلاع دے کے پہنچوں تاکہ وہ میرے خلاف کوئی سازش تیار کر لیں۔ میں کوئی انہیں پرسہ دینے تھوڑی جا رہا ہوں۔ مجھے تو پہنچے شاہ سے ملنا ہے۔"

رتن لال چپ ہو گیا۔ ٹھاکر جی نے رتن لال کو بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا اور کہا کہ صبح سات بجے تیار رہے۔

تین ٹھکرائن بھی تیار کیے۔ جودھا اور پربھو کو بھی حکم دیا گیا کہ ان دنوں کو بھی ساتھ چلنا ہے۔

جودھا اور پربھو کے نام پر رتن لال کے کان کھڑے ہوئے اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ٹھاکر جی کو یہ دو نام اچانک کیوں یاد آ گئے؟

ٹھاکر جی تو آرام کرنے چلے گئے۔ رتن لال پہلے تو رجنی کمار سے ملا اور کہا۔ "صبح بڑے معرکے کے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ وہاں زمیندار کے گھر والے ٹھاکر جی پر شبہ کرتے ہیں اس لئے پتا نہیں وہاں کیا صورتِ حال پیش آئے۔ تو ذرا اپنے چمکار سے بتا کہ ٹھاکر جی کا یہ سفر کیسا رہے گا؟"

رجنی کمار نے اس کو ٹال دیا اور کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر' میں کوشش کروں گا کہ مجھ پر وہ کیفیت طاری ہو جائے اور آپ جو جاننا چاہتے ہیں وہ معلوم ہو جائے۔"

رجنی کمار کے پاس سے وہ پربھو اور جودھا کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں اس وقت اپنی لاٹھیوں کو سرسوں کا تیل پلا رہے تھے۔

دونوں ٹھاکر رتن لال کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئے۔ جودھا نے پوچھا۔ "چھوٹے ٹھاکر! خیریت تو ہے' ہم سے کوئی کام؟"

چھوٹے ٹھاکر نے جواب دیا۔ "مجھے حیرت ہے کہ چاچا جی کو تم دونوں کا خیال کس طرح آ گیا؟"

پربھو نے کہا۔ "وہ مالک ہیں اور ہم سب ان کے چاکر ہیں۔ بدری اور راگھو کے بعد وہ ہم دونوں کو اکشیر کر لیتے ہیں۔"

چھوٹے ٹھاکر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "لیکن تم دونوں تو میرے آدمی ہو۔"

جودھا نے جواب دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر! یہ درست ہے کہ ہم دونوں آپ کے آدمی ہیں مگر ہماری نیا، تو بڑے ٹھاکر سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا حکم پہلے اور آپ کا ان کے بعد۔"

چھوٹے ٹھاکر نے تلخی سے کہا۔ "مجھے پہلے اور بعد سے کوئی سروکار نہیں۔ میں نے تم دونوں پر فالتو خرچہ کیا ہے' اس کا خیال رکھنا۔"

پربھو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! ہم پر ضرور

ہیں مگر وفاداری میں ہم اونچوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔"

جودھا نے دوسری طرح کی بات کی اور پوچھا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ نے ہم پر کتنا خرچہ کردیا ہے۔ جو اسے اکٹھا رہے ہیں یا اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر بڑے ٹھاکر کی ترجیح نہ دیں تو یہ ناممکن ہے۔ آپ اپنی جگہ اور بڑے ٹھاکر اپنی جگہ۔"

رتن لال نے جودھا کا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر پربھو سے کہا۔ "دیکھ پربھو! یہ کیسی باتیں کررہا ہے۔ اسے سمجھا کہ اپنی کھال میں رہے۔ مجھ سے وفاداری کرے گا تو فائدے میں رہے گا۔ بڑے ٹھاکر کی اپنے وفاداروں کا جو حشر کرتے ہیں' سب جانتے ہیں۔"

پربھو نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔"

جودھا نے اسی بگڑے انداز اور لب و لہجے میں بات کی۔ "تو کیا سمجھا دے گا' میں کوئی بچہ ہوں۔"

چھوٹے ٹھاکر نے محسوس کیا کہ بات بگڑ جائے گی اور پتا نہیں یہ پنچ ذات جودھا ٹھاکر سے کیا لگائی بجھائی کرے اور اس کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہو۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔ "اچھا اچھا بس یہ یاد رہے کہ تم دونوں کو کل صبح چاچی کے ساتھ موہن پورے چلنا ہے۔ ٹھیک سات بجے ہم چل دیں گے۔"

جودھا کے جو تیور تھے ان سے رتن لال رات بھر پریشان رہا۔ رات کو ٹھاکر کی ٹھکرائن سے جھڑپ ہوگئی۔ ٹھکرائن کو شکایت تھی کہ ٹھاکر ان دنوں تعلقے پر زیادہ دھیان نہیں دے رہے ہیں اور اپنا سارا وقت فضول کاموں میں صرف کررہے ہیں۔

ٹھاکر' ٹھکرائن کو اڈانٹنے لگے۔ "تو تعلقے کی بات کرنے والی کون ہوتی ہے۔ ایک تعلقے دار کو تعلقے داری کے علاوہ بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ تو کیا جانے۔

جن کے رتبے ہیں سوا' ان کو سوا مشکل ہے"

ٹھکرائن نے موہن پورہ جانے کی مخالفت کی۔ "میں تم کو وہاں نہیں جانے دوں گی۔ وہاں کے لوگ تمہارے دشمن ہیں۔ تم کو اگر کچھ ہوگیا تو میں کیا کروں گی۔"

ٹھاکر جی نے کہا "عجیب بے وقوف عورت ہے۔ مجھے کیا ہوگا! دور دور تک میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔"

ٹھکرائن نے کہا۔ "جب کوئی چھپ کے کسی پر وار کرتا ہے تو وہاں دھاک کام نہیں آتی۔"

ٹھاکر جی کو ایک دم ہنسی آگئی۔ "اری نیک بخت! چھپ کے حملہ کرنے کے لئے بھی بڑی ہمت چاہیے۔ کوئی کرکے تو دیکھے' میں اس کی پوری زمینداری کو خاک میں ملا دوں گا۔"

ٹھکرائن نے تھک ہار کے پوچھا۔ "ساتھ کون کون جارہا ہے؟"

ٹھاکر جی نے سارے نام گنوا دیے اور کہا۔ "دراصل میں پہلے شاہ کے پاس جارہا ہوں ورنہ زمیندار کو کون پوچھتا ہے۔"

ٹھکرائن نے پوچھا۔ "یہ رجنی کمار وہاں کیا کام آئے گا؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "وہاں اس جیسا ایک اور پاگل موجود ہے۔ میں کسی بھی طرح پہلے شاہ کو یہاں لے آؤں گا اور رجنی کمار کو ساتھ رکھوں گا۔ کہتے ہیں کہ پہلے شاہ جو بتاتے ہیں وہی ہوتا ہے۔"

ٹھکرائن نے کہا۔ "یہ عجیب شوق ہے کہ جہاں کوئی کل کی باتیں بتانے والا ملا' ٹھاکر جی نے اس کو قید کرلیا۔ میں پھر یہی کہوں گی کہ اپنی تعلقے داری پر دھیان دو۔ پہلے کبھی دو چار سال میں کشنر' ڈپٹی کشنر' کوتوال اور دوسرے بڑے بڑے لوگوں کی دعوتیں ہوجایا کرتی تھیں' کرشنا کماری کے چکر میں پڑ کے تم نے دعوتوں کا سلسلہ بھی بند کردیا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "یہ دعوتوں کی یاد دہانی تو نے خوب کرائی۔ میں ذرا دو چار کاموں سے فراغت حاصل کرلوں پھر سب کی شاندار دعوت کروں گا۔"

ٹھاکر جی نے اچانک موضوع ہی بدل دیا اور ٹھکرائن سے رتن لال کے بارے میں پوچھا۔ "یہ کیسا نوجوان ہے؟"

ٹھکرائن نے منہ بنایا۔ "جھوٹ پنڈے سے اٹھ کر محل میں آگیا ہے۔ محل والوں جیسا مزاج دو چار ماہ یا دو چار سال میں تو بننے سے رہا' عجیب الٹی سیدھی اور بے تکی باتیں کرتا ہے۔ کیا جن کو منہ نہیں لگاتے یہ انہیں سر چڑھا لیتا ہے۔ سچ کہتی ہوں' ایسا انسان بننے کے لئے ٹھیک بارہ سال چاہئیں کیونکہ بارہ سال میں گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے زور دیا۔ "اس پر نظریں رکھو' مجھے تو رتن لال نے بھی مایوس کیا ہے۔"

ٹھاکر جی کسی معاون و مددگار کے متلاشی تھے کیونکہ تعلقے داری میں اتنے بکھیڑے تھے کہ اب ٹھاکر جی کو اپنے جیسے آدمی کی ضرورت تھی جس کے ذہن میں نفع و نقصان کا احساس پایا جاتا ہو۔ یہ کام اولاد اچھی طرح انجام دے سکتی تھی مگر ٹھاکر جی اولاد سے محروم تھے۔ ایک عجتبا ملا بھی تو اسے کار آمد بنانے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔ ٹھاکر جی رعب اور دبدبے کے قائل تھے اور اپنے دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے وہ کسی بھی انسان کو مار سکتے تھے لیکن رتن لال نے تعلقے کے کارندوں کو بہت قریب کرلیا تھا۔ مالک اور نوکر کے درمیان بڑا فاصلہ ہونا چاہیے وہ رتن لال اور تعلقے کے نوکروں اور چاکروں کے درمیان مفقود تھا۔

ٹھاکر جی یہ بھی سوچتے تھے کہ رتن لال پہ جو لوگوں سے ملاقاتیں کرتا پھرتا ہے' پتا نہیں ان سے کس قسم کی باتیں کرتا ہوگا۔

اسی رات ٹھاکر جی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ رتن لال کی آزادی ختم' ٹھاکر جی اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھیں گے تاکہ وہ دیکھے اور سیکھے کہ تعلقے داری کس طرح چلائی جاتی ہے۔

صبح ساڑھے چھ بجے ٹھاکر جی کے ساتھ جانے والے تینوں آدمی کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے جمع ہوگئے۔ رجنی کمار' رتن لال' پربھو' جودھا اور تقریباً آٹھ ٹنسیت کوٹھی کے باہر ٹھاکر جی کے منتظر تھے۔

ٹھاکر جی اس قسم کے سفر عموماً بیل گاڑی میں کیا کرتے تھے لیکن اس بار وہ ایک شیورلیٹ اور دو جیپ موہن پورے لے جارہے تھے۔

خود تو رجنی کمار اور رتن لال کے ساتھ شیورلیٹ میں بیٹھے اور باقیوں کو جیپوں میں بٹھا دیا۔

ٹھاکر جی کی سواری موہن پورے میں داخل ہوئی تو پورے علاقے میں کھلبلی مچ گئی۔ ٹھاکر جی نے موہن پورے میں داخل ہوتے ہی زمیندار کے کارندوں کو بتا دیا "جاؤ زمیندار کے گھر والوں کو بتا دو کہ ٹھاکر... پرشوتم داس زمیندار کا پرسہ دینے آئے ہیں۔"

زمیندار کا بیٹا مہابیر سنگھ اپنے باپ کی جگہ زمیندار بن گیا تھا۔ جب اس کا باپ غائب ہوا تو وہ لکھنؤ کے کرسچن کالج میں تعلیم حاصل کررہا تھا لیکن اب وہ مستقلاً موہن پورے میں واپس آگیا تھا اور زمینداری سنبھال لی تھی۔ یہ بھی راجپوت تھا۔ خون میں راجپوتوں والی گرمی تھی اور ذہن بھی آن بان رکھتا تھا۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کے باپ کی موت کے پیچھے ٹھاکر... پرشوتم داس کا ہاتھ رہا ہوگا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔

اب جو مہابیر سنگھ کے کارندوں نے اسے یہ بتایا کہ ٹھاکر جی اس کے باپ کے پرسے میں اپنے لٹھیتوں کے ساتھ آرہے ہیں تو اسے کچھ تعجب بھی ہوا اور کچھ تشویش بھی ہوئی۔ غصہ بھی چڑھا مگر عقل نے سوجھ بوجھ پیدا کردی تھی اور طبیعت میں مالی اندیشی فطری طور پائی جاتی تھی۔

اس کی ماں نے اس خبر سے بڑی وحشت محسوس کی اور یہ فیصلہ کیا کہ بیٹے کو ٹھاکر جی سے نہ ملنے دیا جائے۔

لیکن مہابیر سنگھ کی دادی نے کہا۔ "مہابیر' ٹھاکر جی سے ضرور ملے گا کیونکہ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ مہابیر اپنے باپ کے قاتل کو بہت قریب سے دیکھے اور پہچان لے۔"

ماں کا کہنا تھا کہ ٹھاکر جی کسی اور ہی مقصد سے آئے ہیں۔ شاید وہ بھی زمیندار کے بعد مہابیر کو خود دیکھنا اور اپنے آدمیوں کو پہچنوانا چاہتے ہیں اس لئے مہابیر کو اس سے چھپانا چاہیے۔

مہابیر کی دادی کو ہندو راجپوت ہونے کے باوجود نیچے شاہ پر بڑا بھروسا تھا۔ انہیں یہ یقین تھا کہ نیچے شاہ نے ٹھاکر... پرشوتم داس کے برے انجام کی پیشگی خبر دے دی ہے اس لیے اب ٹھاکر جی' مہابیر سنگھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ دادی نے مہابیر کو حکم دیا کہ وہ اپنے کارندوں کے ساتھ آگے بڑھ کے ٹھاکر جی کا استقبال کرے اور اس سے خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ جہاں ٹھاکر جی کے آدمی ٹھہرائے جائیں وہاں احتیاطاً ان کے چاروں طرف اپنے ٹنسیت خفیہ طور پر تعینات کردیے جائیں اور ٹھاکر جی کو اسلحے سمیت اندر نہ آنے دیا جائے۔

بولے کہا۔ "اگر ٹھاکر جی اپنے اسلحے کے ساتھ اندر آئیں گے تو ہم میں سے کس میں ہمت ہے جو انہیں آنے سے روکے گا۔"

دادی نے بڑے تیکھے میں اکڑ کے کہا۔ "اسے میں روکوں گی۔ تم لوگ سامنے سے ہٹ جانا۔"

ٹھاکر جی کی سواری زمیندار کی حویلی کے احاطے میں داخل ہوئی تو انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مہابیر سنگھ اور اس کے کارندے ٹھاکر جی کے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔

گاڑی سے اترتے ہوئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو سامنے زمیندار کی ڈیوڑھی نظر آئی۔

احاطے کی اندرونی دیواروں کے کنارے کنارے کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ انہی کوٹھریوں میں چند شاندار کمرے بھی تھے۔ ان کوٹھریوں میں زمیندار کے کارندے رہتے تھے مگر شاندار کمرے مہمانوں کے لئے تعمیر ہوئے تھے۔

ٹھاکر جی نے گاڑی سے اترتے ہی مہابیر سنگھ کو سینے سے لگایا' سر پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہاتھ سے پیٹھ تھپتھپائی۔ "صبر بیٹے صبر۔ جس نے بھی تجھ پر یہ ظلم کیا بہت برا کیا۔ بھگوان اس کو معاف نہیں کرے گا۔"

مہابیر سنگھ کے پورے وجود میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اسے ٹھاکر جی کی منافقت پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ ٹھاکر جی کے تسلی آمیز چند لفظوں نے اسے بے قابو کردیا۔ اس کا دل بھر آیا اور آواز بھرا گئی۔ "بے شک ٹھاکر... چاچا! جس نے بھی ہم پر ظلم کیا ہے' اسے بھگوان معاف نہیں کرے گا۔"

ٹھاکر جی کے پیچھے رتن لال اور رجنی کمار کھڑے تھے۔

ٹھاکر جی نے رتن لال سے کہا۔ "بھتیجے! زمیندار کے بیٹے مہابیر سنگھ سے مل۔ میں بوڑھا ہورہا ہوں۔ آئندہ تم دونوں ہی تعلقات نبھاہو گے۔" اور مہابیر سنگھ سے کہا۔ "میرا کوئی بیٹا نہیں۔ بس یہ بھتیجا ٹھاکر رتن لال ہی میرا بیٹا ہے۔"

ٹھاکر جی کے ٹنسیت مصرانی' پربھو اور جودھا دونوں جیپوں سے اترکے دور پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

ٹھاکر جی نے مڑ کے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا تو مہابیر سنگھ نے اپنے دو کارندوں کو حکم دیا۔ "ان سب کو مہمان خانے میں ٹھہراؤ۔"

ٹھاکر جی' مہابیر سنگھ اور ان دونوں کے پیچھے رتن لال اور رجنی کمار آہستہ آہستہ ڈیوڑھی کی طرف چلنے لگے۔

ٹھاکر جی کہہ رہے تھے۔ "مجھے تو حیرت ہے کہ میرا اپنا انتہائی وفادار آدمی بدری کسی کا آلۂ کار بن گیا کہ اپنی بھی جان گنوائی اور زمیندار کو بھی اپنے ساتھ....."

مہابیر سنگھ نے ٹھاکر جی کو منع کیا۔ "ٹھاکر... چاچا! اب اس

ذکر کو چھوڑیں کیونکہ ناحق زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے چلتے چلتے مہابیر کو دوبارہ سینے سے لگا لیا۔ "بیٹے مہابیر! میں تو پرسہ دینے آیا ہوں' یہ ذکر تو ہو گا ہی۔"

ٹھاکر جی کی نظریں ڈیوڑھی پر گئیں تو وہاں دروازے پر ایک بوڑھی عورت کھڑی دکھائی دی۔ اس کے آن بان سے کھڑے ہونے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں۔

مہابیر نے بھی ڈیوڑھی کی طرف دیکھا کہ ٹھاکر جی کیا دیکھ رہے ہیں۔ وہاں دادی کو دیکھ کر مہابیر نے کہا۔ "وہ میری دادی ہیں۔ آپ کے استقبال کے لئے باہر نکل آئی ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "بہت شاندار خاتون لگتی ہیں۔"

جب یہ لوگ ڈیوڑھی کے دروازے پر پہنچے تو دادی نے ان کے سامنے کھڑے ہو کے ٹھاکر جی سے پوچھا۔ "ٹھاکر جی! تم نہتے ہو؟"

دادی کے اس سوال پر سب ہی چونک گئے۔ رتن لال نے اس شاندار بوڑھی عورت کو اس لئے غور سے دیکھا کہ اس نے پہلی بار ایک عورت کو ٹھاکر جی سے درشت لہجے میں سوال کرتے دیکھا تھا۔

رجنی کمار کے پورے جسم میں خوف سے سنسناہٹ دوڑ گئی تھی دیکھو اس بوڑھی کو ٹھاکر جی سے اونچی آواز میں بات کرنے کی کیا سزا ملتی ہے۔

ٹھاکر جی نے مہابیر کی دادی کو جواب دیا۔ "اماں جی! یہ آپ مجھ سے کیسا سوال کر رہی ہیں؟"

دادی نے اسی لب و لہجے میں کہا۔ "اگر اپنے ساتھ پستول لائے ہو تو اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

ٹھاکر جی کے چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ دادی کے ہاتھوں اپنی بے عزتی انتہائی جبر سے برداشت کر رہے ہیں۔ "اماں جی! میں یہاں پرسہ دینے آیا ہوں' اپنے ساتھ پستول یا کوئی دوسرا ہتھیار کیوں لاؤں گا۔" اور پیچھے مڑ کے اپنے بھتیجے رتن لال سے کہا۔ "تو اپنے ساتھ کوئی ہتھیار تو نہیں لایا۔ اماں جی بہت دکھی معلوم ہوتی ہیں۔ جوان جہان بیٹے کی حادثاتی موت نے شاید ان کا دماغی توازن ہی بگاڑ دیا ہے۔ ہمیں ان کی کسی بات کا بھی برا نہیں ماننا چاہیے۔"

رتن لال نے دادی سے کہا۔ "دادی ماں! آپ ہماری تلاشی لے لیں۔"

مہابیر نے آگے بڑھ کے اپنی دادی کو سمجھایا۔ "دادی ماں! ٹھاکر... چاچا اپنے مہمان ہیں' ان کی بے عزتی نہ کریں۔"

دادی غصے میں بڑبڑاتی اندر چلی گئیں اور مہابیر نے ٹھاکر جی کو اندر لے جا کے بڑے ہال میں بٹھا دیا۔

ٹھاکر جی جس صوفے پر بیٹھے تھے اس کے برابر ہی دوسرے صوفے پر مہابیر بیٹھ گیا اور عین مقابل دادی نے جگہ سنبھال لی۔

ٹھاکر جی کے پیچھے رتن لال اور رجنی کمار بیٹھ گئے۔

ٹھاکر جی نے مہابیر سے پوچھا۔ "بیٹے مہابیر! میں سخت مشکل میں ہوں کہ پرسہ کسے دوں' تمہیں یا اماں جی کو؟"

مہابیر نے جواب دیا۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ یہاں آئے آپ کی بڑی مہربانی' دادی ماں کی موجودگی میں آپ پرسہ انہی کو دیں۔"

ٹھاکر جی نے مہابیر سے کہا۔ "میں پرسہ تو انہی کو دوں گا لیکن تمہاری بڑی مہربانی کہ میرے بھتیجے اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے رجنی کمار کو کچھ دیر کے لئے یہاں سے لے جاؤ۔ میں اماں جی سے کچھ خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مہابیر کو ڈر لگا کہ ٹھاکر جی اس کے غیاب میں دادی ماں سے پتا نہیں کیا سلوک کریں' کہا۔ "ٹھاکر... چاچا! جو بات کرنی ہے' میرے سامنے کریں۔"

ٹھاکر جی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "تب پھر تم ان دونوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ میں وہ باتیں تمہارے سامنے بھی کر سکتا ہوں مگر ان دونوں کے سامنے وہ باتیں نہ ہوں تو بہتر ہے۔"

مہابیر نے رتن لال اور رجنی کمار کو ایک ایسے حصے میں پہنچا دیا جہاں بہت سی دیہاتی عورتیں کام میں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دھان کوٹ رہی تھیں' کچھ اناج میں سے کنکر پتھر چن رہی تھیں اور سامنے صحن میں ایک مور پر پھیلائے کھڑا رقص میں مشغول تھا۔

رجنی کمار کو ایک جھٹکا سا لگا اور اسے منشی کیدار ناتھ کے گاؤں کی وہ سانولی تیرہ سالہ لڑکی یاد آئی جسے کمہار نے ایک نالے سے اٹھا کے پال لیا تھا اور وہ تیرہ سالہ لڑکی رجنی کمار سے صرف یہی پوچھ رہی تھی کہ وہ اس کے ماں باپ کا پتا بتا دے اور رجنی کمار نے لڑکی کے سوال کے جواب میں بالکل یہی ماحول دیکھا تھا جو اس وقت اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

مہابیر دونوں کو چھوڑ کے ٹھاکر جی کے پاس واپس آ گیا۔

ٹھاکر جی نے دادی سے کہا۔ "اماں جی! میں یہ چاہتا تو نہیں تھا کہ آپ کے پوتے مہابیر کے سامنے آپ کے بیٹے کی وہ باتیں کروں جنہیں گزرے چودہ پندرہ سال ہو گئے مگر میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے کل کی بات ہو۔"

دادی نے غصے میں کہا۔ "ٹھاکر...! تم جس کام سے آئے ہو وہ کرو اور اپنے گھر واپس جاؤ۔ اس گھر میں زہر مت گھولو۔ تم تو بات کر کے چلے جاؤ گے اور بیٹے کے دل میں باپ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے گی۔"

ٹھاکر جی نے انتہائی بے مروتی اختیار کی اور کہا۔ "میں آپ کے بیٹے کی حادثاتی موت کے بارے میں بہت کچھ سنتا اور برداشت کرتا رہا۔ لوگوں نے میرا نام لیا کہ میں نے اس کو اغوا کروایا اور پھر قتل کروا کے دریا میں پھنکوا دیا۔ حالانکہ آپ لوگوں کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر مجھے آپ کے بیٹے کو قتل کروانا ہوتا تو چودہ پندرہ سال پہلے قتل کروا دیتا۔"

دادی نے غصے میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "بس ٹھاکری بس، آگے کوئی بات نہ کرنا۔"

ٹھاکری نے کہا۔ "اماں جی، آپ نے مجھے دروازے پر روکا کہ میں تلاشی دوں، کہیں چھپا کے پستول یا چاقو چھری تو نہیں لے آیا۔ آپ نے میری حیثیت کا بھی خیال نہیں کیا۔ اگر میں یہاں بری نیت سے آیا ہوتا تو میں یہ کام دو سروں سے کروا سکتا تھا۔ میں خود کہیں نظر بھی نہ آتا۔ آپ نے میرا بڑا اپمان کیا، بہت بے عزتی کی۔ یہ اس گھرانے کی طرف سے دوسری بڑی بے عزتی تھی۔ پہلی بے عزتی چودہ پندرہ سال پہلے آپ کے بیٹے نے....."

دادی نے بات پوری نہیں کرنے دی اور شور مچا دیا، مہاپر سے کہا۔ "تو اندر جا، مجھے ٹھاکری سے بات کرنے دے۔"

ٹھاکری نے کہا۔ "اماں جی! اگر مہاپر اندر بھی چلا گیا تو میں وہ بات مہاپر کو بعد میں بتا دوں گا کیونکہ آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ نرمی اور مروّت سے کام نہ لوں۔"

مہاپر کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا کیونکہ ٹھاکری نے جو لب و لہجہ اختیار کیا تھا اس سے دادی کی بے عزتی ہو رہی تھی اور وہ کچھ دب بھی رہی تھیں۔

دادی نے پھر مہاپر کو حکم دیا۔ "مہاپر! تو اندر جا۔ ٹھاکری سے میں بات کروں گی۔"

مہاپر نے دادی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ "نہیں دادی ماں، میں اندر نہیں جاؤں گا۔ ٹھاکری جو بات کرنا چاہتے ہیں وہ میرے سامنے کریں گے۔"

اسی وقت اندر سے مہاپر کی ماں بھی ان سب کے سامنے آگئی اور ٹھاکری سے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ٹھاکری جی! آپ کو لوگوں نے ہمارے خلاف ورغلایا ہو گا کہ ہم نے اپنے پتی کی موت کے سلسلے میں آپ کا نام لیا ہے۔"

ٹھاکری نے مہاپر سے کہا۔ "بھتیجے! مجھے انتہائی افسوس ہے کہ تم نوجوانی میں اپنے باپ سے محروم ہو گئے۔ اب تم ان دونوں عورتوں کو اندر بھیج دو تاکہ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے باپ کو کس نے قتل کر دیا، حالانکہ میں صرف پرسہ دینے آیا تھا مگر تمہاری دادی نے میری وہ بے عزتی کی ہے کہ اب میں اپنے دل کا بوجھ اسی طرح اتار سکتا ہوں کہ تمہارے باپ کے بارے میں تمہیں کچھ سچی باتیں بتا دوں۔"

مہاپر کی ماں روتی ہوئی اندر چلی گئی۔ وہ دادی ماں کو برا کہہ رہی تھی کہ انہوں نے ناحق ٹھاکری کی بے عزتی کروی اور اب ٹھاکری وہ ساری باتیں مہاپر کو بتا دیں گے جو اسے اب تک نہیں معلوم تھیں۔

اب دادی نے بھی غصے کے بجائے نرمی اختیار کی اور ٹھاکری سے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ٹھاکری! بھگوان کے لئے اس خاندان پر دیا کرو۔"

ٹھاکری نے کہا۔ "اماں جی! میں اب باز نہیں رہ سکتا۔ تمہارے بیٹے نے پندرہ سال پہلے میری بہن کو اغوا کروایا تھا۔ اسے پتا نہیں کہاں رکھا تھا پھر اس سے ایک بچی بھی ہوئی اور اس نے میری بہن کو نکال دیا اور اس کی بچی کو میرے ہی علاقے کے ایک نالے میں پھکوا دیا جسے ایک کمہار نے پال لیا۔ میں تمہارے بیٹے کو اس وقت قتل کر سکتا تھا مگر صرف اس خیال سے باز رہا کہ ہم دونوں کی داستانیں اخباروں میں چھپیں گی۔ میری بہن نے خود کشی کر لی اسے میں نے قتل کر دیا، اس راز سے صرف میں واقف ہوں اور میں نے اس معاملے کو اتنا دبائے رکھا کہ آج تک اس سے آپ واقف ہوں گی، مہاپر کی ماں جانتی ہو گی یا میں جانتا ہوں۔ چوتھا ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو ہماری عزت آبرو اچھالے۔ میں نے کئی بار مہاپر کے باپ سے کہا کہ وہ کمہار سے اپنی بچی لے لے اور اسے باعزت طریقے سے پالے مگر وہ اس سے ہی انکار کرتا رہا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ میری بہن جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتا دیا تھا اور میں خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا تھا۔ تم ایمانداری سے بتاؤ کہ میں نے اس وقت تو تمہارے بیٹے کو مارا نہیں پھر اتنے دنوں کے بعد اسے کیوں قتل کروں گا۔"

مہاپر نے دادی سے پوچھا۔ "دادی ماں! کیا یہ سب درست ہے؟"

دادی نے جواب دیا۔ "بیٹے! اب میں کیا کہوں، جوانی میں سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اگر تیرے باپ کو اس لڑکی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا کہ وہ ٹھاکری کی بہن ہے تو وہ اتنی بڑی غلطی نہ کرتا۔ یہ ٹھاکری کی زیادتی تھی کہ انہوں نے اپنے کسی عزیز رشتے دار کو اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ وہ شہر میں رہتی تھی اور تیرا باپ اسے شہر سے ہی لایا تھا پھر اچانک یہ خبر پھیلی ہوئی کہ ٹھاکر... پر شوم داس کی بہن اغوا کر کے یہاں لائی گئی ہے۔ لوگ چاہتے تھے کہ وہ یہاں رہے۔ وہ ہم سے الگ تھلگ رہی تھی ہونے کے بعد تیرے باپ نے معلوم نہیں کیوں اس کو ٹھاکری کے گاؤں کے ایک نالے میں پھکوا دیا پھر ٹھاکری کی بہن ٹھاکری کے پاس سے چلی گئی، ہم سب نہیں جانتے۔ بس اسی واقعے سے دونوں خاندانوں میں دشمنی ہو گئی۔ ٹھاکری یہی باتیں تجھ کو بتانا چاہتے تھے۔"

مہاپر نے پوچھا۔ "دادی ماں! پتا جی نے اپنی بیٹی کو ٹھاکری کے تعلقے کے کسی نالے میں کیوں پھکوا دیا تھا؟"

دادی نے ٹھاکری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹے مہاپر! اب میں کیا کروں۔ کچھ کہوں گی تو یہ ٹھاکری ہمیں جھٹلا دیں گے۔ حالانکہ میرے بیٹے کا یہ کہنا تھا کہ کسی نے ٹھاکری کی بہن کو یہاں سے اغوا لیا تھا۔ بچی کہیں اور پیدا ہوئی اور اسے نالے میں بھی کہیں اور نے پھکوایا، بعد میں مشہور ہوا کہ ٹھاکری کی بہن نے خود کشی کر لی جبکہ تیرے باپ کو یقین تھا کہ ٹھاکری نے اپنی بہن کو خود اغوا کروایا تھا اور جب بچی پیدا ہوئی تو ٹھاکری ہی نے اس کو

نالے میں پھکوا دیا اور اپنی بہن کو قتل کر دیا۔ پتا نہیں اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ مگر تیرا باپ یہ ساری باتیں یقین سے کہا کرتا تھا۔"

ٹھاکری نے نہایت دکھ سے کہا۔ "تو بھی ایک قتل اور مجھ سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ مجھ پر بدترین تہمت ہے کہ میں نے اپنی بہن کی بچی کو نالے میں پھکوا دیا جسے ایک کمہار نے پال لیا۔ میں تمہارے بیٹے کو اس وقت قتل کر سکتا تھا مگر صرف اس خیال سے باز رہا کہ ہم دونوں کی داستانیں اخباروں میں چھپیں گی۔ میری بہن نے خود کشی کر لی اسے میں نے قتل کر دیا، اس راز سے صرف میں واقف ہوں اور میں نے اس معاملے کو اتنا دبائے رکھا کہ آج تک اس سے آپ واقف ہوں گی، مہاپر کی ماں جانتی ہو گی یا میں جانتا ہوں۔ چوتھا ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو ہماری عزت آبرو اچھالے۔ میں نے کئی بار مہاپر کے باپ سے کہا کہ وہ کمہار سے اپنی بیٹی لے لے اور اسے باعزت طریقے سے پالے مگر وہ اس سے ہی انکار کرتا رہا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ میری بہن جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتا دیا تھا اور میں خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا تھا۔ تم ایمانداری سے بتاؤ کہ میں نے اس وقت تو تمہارے بیٹے کو مارا نہیں پھر اتنے دنوں کے بعد اسے کیوں قتل کروں گا۔"

مہاپر نے دادی سے پوچھا۔ "دادی ماں! کیا یہ سب درست ہے؟"

دادی نے جواب دیا۔ "بیٹے! اب میں کیا کہوں، جوانی میں سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اگر تیرے باپ کو اس لڑکی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا کہ وہ ٹھاکری کی بہن ہے تو وہ اتنی بڑی غلطی نہ کرتا۔ یہ ٹھاکری کی زیادتی تھی کہ انہوں نے اپنے کسی عزیز رشتے دار کو اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ وہ شہر میں رہتی تھی اور تیرا باپ اسے شہر سے ہی لایا تھا پھر اچانک یہ خبر پھیلی ہوئی کہ ٹھاکر... پر شوم داس کی بہن اغوا کر کے یہاں لائی گئی ہے۔ لوگ چاہتے تھے کہ وہ یہاں رہے۔ وہ ہم سے الگ تھلگ رہی تھی ہونے کے بعد تیرے باپ نے معلوم نہیں کیوں اس کو ٹھاکری کے گاؤں کے ایک نالے میں پھکوا دیا پھر ٹھاکری کی بہن ٹھاکری کے پاس سے چلی گئی، ہم سب نہیں جانتے۔ بس اسی واقعے سے دونوں خاندانوں میں دشمنی ہو گئی۔ ٹھاکری یہی باتیں تجھ کو بتانا چاہتے تھے۔"

مہاپر نے پوچھا۔ "دادی ماں! پتا جی نے اپنی بیٹی کو ٹھاکری کے تعلقے کے کسی نالے میں کیوں پھکوا دیا تھا؟"

دادی نے ٹھاکری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹے مہاپر! اب میں کیا کروں۔ کچھ کہوں گی تو یہ ٹھاکری ہمیں جھٹلا دیں گے۔ حالانکہ میرے بیٹے کا یہ کہنا تھا کہ کسی نے ٹھاکری کی بہن کو یہاں سے اغوا لیا تھا۔ بچی کہیں اور پیدا ہوئی اور اسے نالے میں بھی کہیں اور نے پھکوایا، بعد میں مشہور ہوا کہ ٹھاکری کی بہن نے خود کشی کر لی جبکہ تیرے باپ کو یقین تھا کہ ٹھاکری نے اپنی بہن کو خود اغوا کروایا تھا اور جب بچی پیدا ہوئی تو ٹھاکری ہی نے اس کو

ٹھاکری نے محبت سے مہاپر کا ہاتھ پکڑ لیا اور دادی کے جانے والے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری سے کہا۔ "بھتیجے، اصل بات تو یہ تھی کہ تیرا باپ میری بہن سے محبت کرتا تھا اور شاید اس نے چھپ کے شادی بھی کر لی تھی مگر جہاں تک میں جانتا ہوں، تیری دادی نے میری بہن کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی۔ اس نے میری بھانجی کو میرے علاقے کے گاؤں کے نالے میں پھکوایا اور اسی نے میری بہن کو نکلوایا اور قتل کروا دیا ورنہ تیرا باپ تو بہت شریف تھا اور اسی شرافت کی وجہ سے میں نے تیرے باپ سے انتقام نہیں لیا۔"

مہاپر نے کہا۔ "لیکن ٹھاکر... چاچا! ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ یہ کہہ رہے تھے کہ پتا نہیں آپ کی بہن نے خود کشی کر لی یا انہیں آپ نے مار دیا اور اب آپ دادی ماں کو قاتل قرار دے رہے ہیں۔"

ٹھاکری نے مہاپر کا ہاتھ دبایا۔ "بھتیجے! بات سمجھا کر، میں نے تیری دادی کو مخبوط الحواس جو دیکھا اور ان کی الٹی سیدھی حرکتوں پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ بڑھاپے نے تو انہیں عقل سے پیدل کر ہی دیا ہے، جوان بیٹے کی حادثاتی موت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا اب اس حالت میں اگر میں تیری دادی کو آئینہ دکھا دیتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتیں۔ ہم ٹھاکر ٹھہرے شریف خاندان کا وہ ذے دار انسان۔ بس اب زیادہ....." اور ٹھاکری کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

مہاپر نے ٹھاکری سے وعدہ کیا۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ کمہار کو لڑکی سمیت میرے پاس بھجوا دیں۔ وہ میری بہن ہے۔ میں اسے سوئیکار کر لوں گا۔"

ٹھاکری کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ "یہ ہے شریف ماں باپ اور اصل نسل کے راجپوت گھرانے کے خون کا اثر۔ میں کمہار کو تیری بہن کے ساتھ بھیج دوں گا۔"

کچھ دیر بعد دادی چپل وغیرہ لے کر آگئیں۔ دو نوکرانیاں پھلوں کے ٹوکرے رکھ کر واپس چلی گئیں۔ دادی نے مہاپر سے کہا۔ "ان دونوں کو بھی بلوا لے۔ یعنی ٹھاکری کے بھتیجے اور اس کے ساتھی کو۔"

مہاپر دونوں کو بلانے چلا گیا تو ٹھاکری نے رجنی کمار کے بارے میں بطور خاص دادی کو بتایا۔ "اماں جی! میرے بھتیجے کے ساتھ جو آیا ہے وہ ہمارے علاقے کا ناہی گرامی جوتشی ہے۔ اس نے ایک سال پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ یہاں دو سال بارش نہیں ہو گی۔ ایک سال تو سوکھے میں گزر گیا، دوسرا بھی بن برکھا گزر جائے گا۔ بڑے کمال کا نجومی ہے۔"

دادی نے بھی اس کا ذکر سن رکھا تھا، کہنے لگیں۔ "واہ ٹھاکری! آپ نے پہلے اس کا تعارف نہیں کروایا۔ برکھا تو اپنے علاقے میں بھی نہیں ہوئی۔ سبھی پریشان ہیں۔ کیا یہ ہمیں بھی کچھ بتائے گا؟"

ٹھاکری نے کہا۔ "کیوں نہیں بتائے گا۔ آپ اسے دو چار دن

اپنے پاس رکھیں اور پھر اس کے کرتوتوں کو دیکھیں۔ سچ کہتا ہوں' بڑے کام کا جوان ہے۔"

مہاجر دونوں کو لے آیا۔ دادی نے رجنی کمار سے پوچھا۔ "بیٹے! تو تو ہی ہے وہ نجومی جس نے دو سال کے لئے برکھا ہی روکا دی۔ ویسے تیرا نام کیا ہے؟"

رجنی کمار نے اپنا نام بتایا اور کہا۔ "دادی ماں! مجھ پر الزام نہ لگائیں کہ میں نے اس علاقے میں دو سال کے لئے سوکھا ڈال دیا ہے۔"

دادی نے کہا۔ "میں بھی تجھ سے کچھ پوچھوں گی۔ اپنے ٹھاکر جی نے اجازت دے دی ہے کہ میں دو چار دن تجھے اپنے پاس رکھوں۔"

رجنی کمار نے ٹھاکر جی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "دادی ماں! میرا علم تو اختیاری....."

ٹھاکر جی نے بات کاٹ دی۔ "تجھے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

مہاجر کو رجنی کمار کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے بھی رجنی کمار میں غیر معمولی دلچسپی لی اور کہا۔ "ٹھاکر... چاچا! اچھا کیا آپ نے اسے دو چار دن کے لئے ہمارے پاس چھوڑ دیا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "تو دو چار دن کی بات کر رہا ہے' میری طرف سے تو اسے ایک ہفتہ رکھ۔"

اب ماحول انتہائی خوشگوار ہو گیا تھا۔ سب پھل کھاتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔

اتنے میں حویلی کا کوئی نوکر کاندھے پر انگوچھا ڈالے مہاجر کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

مہاجر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ موہن پورے کا تھانے دار بھی تھا۔

تھانے دار نے ٹھاکر جی کو ادب سے سلام کیا اور کہا۔ "مجھے کسی نے بتایا کہ تعلقے دار صاحب تشریف لائے ہیں تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی سلام کرتا چلوں۔"

ٹھاکر جی کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور مہاجر سے پوچھا۔ "یہ خود آیا ہے یا اسے بلوایا گیا ہے؟"

تھانے دار نے عاجزی سے عرض کیا۔ "ٹھاکر جی! میں خود آیا ہوں۔ مجھے کسی نے بلوایا نہیں ہے۔"

ٹھاکر جی نے دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اماں جی! برا نہ مانیں' میرے ساتھ وشواش گھات ہوئی ہے۔"

مہاجر گھبرا گیا' کہنے لگا۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو یہ ہم شریفوں کی گھریلو باتوں کے درمیان کیوں مخل ہوا۔ بھتیجے! ہمیں نہیں معلوم کہ تمہارے خاندان میں پولیس والے اس طرح اچانک آ کے بے تکلفی سے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔"

تھانے دار کھڑا ہو گیا اور ٹھاکر جی سے کہا۔ "ٹھاکر جی! میں تو آپ کو سلام کرنے آیا تھا اور آپ نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔"

تھانے دار فوراً ہی باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مہاجر بھی باہر نکل گیا۔

دادی نے گھبرائے ہوئے انداز میں اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

اب میزبانوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔

ٹھاکر جی نے رجنی کمار کو سمجھایا۔ "دیکھ میں نے ان دونوں کو بڑی مشکل سے ٹالا ہے۔ اب تو میرا منصوبہ سن لے۔ تو یہاں ایک ہفتہ رہے گا۔ پتا نہیں تجھ سے کیا پوچھا جائے اس لئے تو یہاں اختیاری اور بے اختیاری کی بات نہیں کرے گا۔ یہاں تو جو تشی بن کے رہے گا اور انہیں ان کے سوالوں کے جوابات جھوٹ موٹ کچھ بھی بتا دینا۔ بس مجھے تیرے جھوٹ سے فائدہ پہنچنا چاہیے اور دیکھ کمہار کی لاوارث بیٹی کے بارے میں تجھے وثوق سے یہی کہنا پڑے گا کہ وہ زمیندار کی بیٹی ہے اور اسے اس گھر میں بیٹی کی طرح پالا جائے... کیونکہ لڑکی بڑی ہوگی ہے۔ جہاں پانچ برس بڑھے گی وہاں بند قفل کھل جائیں گے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کو یہ قبول کرلیں اور لڑکی کو قانونی حیثیت مستحکم ہو جائے۔ سمجھ گیا کہ میں اپنی بہن کی لڑکی کی وساطت سے کس طرح اس زمینداری پر شب خون مارتا ہوں۔ ان کو تو اپنی نانی یاد آ جائے گی۔"

اتنی ہدایات دینے کے بعد ٹھاکر جی دوبارہ تیوریوں پر بل ڈالے بیٹھ گئے اور جب مہاجر تنہا واپس آیا تو ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "اس دیوث تھانے دار کو کہاں چھوڑ آئے؟"

مہاجر نے جواب دیا۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ نے ناحق شبہ کیا۔ وہ بس یونہی یہاں آیا تھا۔"

ٹھاکر جی نے اسی طرح تیکھے انداز میں کہا۔ "بھتیجے! اپنے اپنے رہنے کے ڈھنگ ہیں۔ میری حویلی میں کوئی سے بڑا پولیس والا بھی اتنی بے تکلفی سے نہیں آسکتا۔"

مہاجر نے بڑی معافیاں مانگیں اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ان باتوں کا خاص خیال رکھے گا۔

اب ٹھاکر جی کا موڈ کچھ بدلا تھا مگر تیوریوں پر بل اب بھی تھے۔

اب ٹھاکر جی کو پہنچے شاہ کی فکر تھی۔ وہ پہنچے شاہ کے بارے میں پوچھنے کا موقع تلاش کر رہے تھے پھر خود ہی رجنی کمار کی تعریفیں شروع کر دیں۔

اسی دوران میں دادی بھی واپس آ گئیں اور مہاجر سے پوچھا۔ "تھانے دار چلا گیا؟"

مہاجر نے جواب دیا۔ "ہاں چلا تو گیا مگر میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ آئندہ جب آؤ تو وقت لے کر آؤ۔ وہ خود بھی بہت شرمندہ

تھا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "مجھے تو رجنی کمار نے پہلے سے بتا دیا تھا کہ اس گھر میں اچانک کوئی پولیس آفیسر آ جائے گا اور میری مزاجی کیفیت میں اشتعال پیدا ہو جائے گا۔"

رجنی کمار نے ٹھاکر جی کی مشکل آسان کر دی اور کہا۔ "ٹھاکر جی! مجھے تو جو تش ودیا آتی ہے مگر میں نے سنا ہے کہ موہن پورے میں کوئی پہنچے شاہ رہتے ہیں اور وہ یونہی حالتِ جنون میں جو بکواس کر دیتے ہیں وہ سچ ہو جاتی ہے۔"

ٹھاکر جی نے ایسا ظاہر کیا جیسے اچانک پہنچے شاہ یاد آ گئے ہوں' کہنے لگے۔ "ارے ہاں۔ وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ حالانکہ راج نگر سے چلتے وقت میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو' میں ان پہنچے شاہ سے ضرور ملوں گا۔"

مہاجر نے کہا۔ "ہاں ٹھاکر... چاچا! پہنچے شاہ بڑے عجیب آدمی ہیں۔ وہ جو بات کرتے ہیں اس کا مطلب نکالنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے تو ان کو اسی حویلی میں ایک کمرا دے رکھا ہے لیکن وہ یہاں رہتے نہیں ہیں۔ چپ چاپ کہیں نکل جاتے ہیں پھر چپ چاپ واپس بھی آ جاتے ہیں۔ مسلمان ہیں اور بہت اچھے آدمی ہیں۔"

ٹھاکر جی نے پہنچے شاہ کے ذکر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی' بے پروائی سے پوچھا۔ "اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟"

دادی نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! تمہارے آنے سے پہلے تو وہ اپنے کمرے میں موجود تھے۔ اب کا کچھ پتا نہیں۔"

ٹھاکر جی نے جیب سے گھڑی نکالی اور وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بس یہاں آدھا گھنٹا اور ہوں پھر واپس چلا جاؤں گا۔ اگر پہنچے شاہ اپنے کمرے میں ہوں تو ان سے ملوا دو ورنہ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔"

مہاجر نے اپنے نوکر رامو کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا۔ "دیکھ پہنچے شاہ اپنے کمرے میں موجود ہیں یا کہیں چلے گئے؟"

رامو جانے لگا تو ٹھاکر جی نے مہاجر سے کہا۔ "بھتیجے! ان کو مت تکلیف دو۔ ہم خود وہاں چلتے ہیں۔"

دادی کو پہنچے شاہ سے ٹھاکر جی کو ملوانا پسند نہیں تھا' کہنے لگیں۔ "مہاجر! ٹھاکر جی جلدی میں ہیں پھر کبھی ملوا دینا۔"

لیکن مہاجر نے رامو کو ڈانٹ کے حکم دیا۔ "تو کھڑا کیوں ہو گیا۔ جا دیکھ' پہنچے شاہ اپنے کمرے میں موجود ہیں یا نہیں۔"

ابھی رامو نے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ فوراً واپس آ گیا اور کہا۔ "پہنچے شاہ تو خود ہی یہاں آ رہے ہیں۔"

اس معمولی سی خبر نے ماحول میں بے چینی پیدا کر دی۔ ہر شخص اپنی جگہ بے چین نظر آنے لگا۔

ٹھاکر جی بے قراری سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ دادی بھی بہت بے چین نظر آ رہی تھیں۔

مہاجر نے ٹھاکر جی سے درخواست کی۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ ان سے بات کرنے میں ذرا احتیاط کیجئے گا۔ انہیں غصہ بہت جلدی آ جاتا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ایک عمر رسیدہ سرخ و سفید بے ترتیب داڑھی مونچھ والا شخص اندر داخل ہوا۔ وہ رام پوری سیاہ مخملی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "وہ دیوث آیا تھا' چلا گیا؟"

پھر اچانک پہنچے شاہ کی نظر رتن لال پر پڑی' دیکھ کر مسکرائے اور کہا۔ "میں نے تو تجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پیالہ بھر چکا' بس چھلکنے ہی والا ہے۔"

ٹھاکر جی اس عجیب و غریب دیوانے کی باتیں غور سے سنتے رہے اور پھر پہنچے شاہ سے پوچھا۔ "حضرت! یہ دیوث آپ کس کو کہہ رہے تھے؟"

پہنچے شاہ نے ٹھاکر جی کو ذرا غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "دیوث کسے کہتے ہیں' پوچھتا ہے' دیوث کون ہے' کمال ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ دیوث دیوث ہوتا ہے۔ سمندری آدمی' تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

ٹھاکر جی کے پلے کچھ بھی نہ پڑا کہ یہ پہنچے شاہ کیا کہہ رہے ہیں۔ دیوث' سمندری آدمی پتا نہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

دادی نے پہنچے شاہ سے ٹھاکر جی کی سفارش کی اور کہا۔ "شاہ صاحب! یہ تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس ہیں' راج نگر سے آئے ہیں۔ یہ آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

پہنچے شاہ نے ٹھاکر جی کو گھور کے دیکھا اور کہا۔ "انہیں چھوڑ دے۔ کیوں آہیں لیتا ہے۔ کب تک قید رکھے گا؟"

دادی نے ٹھاکر جی سے کہا۔ "آپ ان سے کچھ پوچھیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میں اس پاگل سے کیا پوچھوں۔ پتا نہیں یہ کیا کہہ رہا ہے۔ سمندری آدمی' انہیں چھوڑ دے' کیوں آہیں لیتا ہے۔ میں اس بکواس کا کیا مطلب لوں۔ یہ بزرگ تم ہی لوگوں کو مبارک۔"

اچانک پہنچے شاہ نے پھلوں میں سے ایک کیلا اٹھا لیا اور اسے چھیل کر ٹھاکر جی کو دکھایا۔ "ٹھاکر جی! کیلا رے اکیلا۔"

کیلا تو پہنچے شاہ نے کھا لیا اور پھر رٹ لگ گئی۔ "کیلا رے اکیلا' کیلا رے اکیلا۔"

اور پھر ٹھاکر رتن لال کی ٹھوڑی پکڑ لی اور کہا۔ "سنبھالے! پیالہ بھر چکا' بس چھلکنے کی دیر ہے۔"

مہاجر کی ماں پہنچے شاہ کی آواز سن کر دروازے کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ پہنچے شاہ خود بھی وہیں پہنچ گئے' پوچھا۔ "ڈرتی ہے' کس سے ڈرتی ہے؟"

مہاجر کی ماں نے پیچھے ہٹتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "شاہ جی! میرے بیٹے کو بچا لو۔"

پہنچے شاہ نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "اڑو بھنبیری' سادن آیا۔

اڑو بھنبیری سادن آیا۔"

پنچے شاہ کے پیچھے مہابر بھی آگیا اور ماں سے پوچھا۔ "آپ نے ان سے کچھ پوچھا تھا؟"

ماں نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میرے بیٹے کو بچالو۔ جواب میں شاہ جی رٹ لگائے ہوئے ہیں اڑو بھنبیری سادن آیا۔"

مہابر نے ماں کو سمجھایا۔ "شاہ جی نے ہمیں خوش خبری سنادی کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور ہمارے لئے اب ساون کا موسم آچکا ہے۔"

پنچے شاہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ "اڑو بھنبیری سادن آیا۔"

وہ سب خاموش اپنی اپنی جگہ معلوم نہیں کیا سوچ رہے تھے مگر اب ان کے کانوں میں بس یہی گونج رہا تھا۔ "اڑو بھنبیری سادن آیا۔"

مہابر اپنی جگہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹھاکر جی نے دادی سے کہا۔ "اماں جی! یہ تو بالکل ہی پاگل ہے۔ کبھی کچھ کہتا ہے اور کبھی کچھ۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہ محض کچھ پیسیاں چھوڑ کر چلا جاتا ہے' آپ لوگ انہیں بوجھتے رہیے۔"

دادی نے ٹھاکر جی کو سمجھایا۔ "ٹھاکر جی! شاہ صاحب کی شان میں گستاخی نہ کرو' پتا نہیں انہیں کب غصہ آجائے اور تمہارے حق میں بددعا کردیں۔"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "مجھے اس پاگل نے ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ مجھے اس سے مل کے یہ دکھ پہنچا کہ میں اس دیوانے سے ملاقات کرنے کے لئے یہاں تک کیوں آیا؟"

ٹھاکر جی نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپانے کی بڑی کوشش کی مگر حقیقتاً وہ اندر سے بہت پریشان تھے۔ ان کے کانوں میں پنچے شاہ کی آواز گونج رہی تھی۔ "انہیں چھوڑ دو۔ ان کی آہیں نہ لو' کیلا رہے اکیلا' سمندری آدمی' پیالہ بھر چکا ہے بس چھلکنے کی دیر ہے' سنپولیے لے' اڑو بھنبیری سادن آیا۔"

ٹھاکر جی ان اشاروں کنایوں کو خوب سمجھ رہے تھے اور اندر سے وہ دہل گئے تھے مگر دوسروں پر یہی ظاہر کررہے تھے کہ پنچے شاہ سے مل کے کچھ مزہ نہیں آیا۔

ٹھاکر جی نے دادی سے کہا۔ "اماں جی! اب میں جاؤں گا۔ زندگی رہی تو پھر حاضری دوں گا۔"

مہابر نے رسمًا رکنے کی درخواست کی جسے ٹھاکر جی نے مہابر کے سر پر ہاتھ پھیر کے مسترد کردیا اور کہا۔ "بھتیجے! اب جب کبھی آؤں گا تو ایک ہفتہ اس حویلی میں رہوں گا۔"

ابھی یہ لوگ باہر نہیں نکلے تھے کہ باہر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

یہ لوگ گھبرا کے باہر نکلے تو دیکھا پنچے شاہ ٹھاکر جی کے آدمیوں سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ وہ ان سب پر چیخ چیخ کر الزام لگا رہے تھے۔

"یہ سب ڈیوٹ ہیں۔ سب ڈیوٹ' مجھے اٹھانے آئے ہیں۔ زبردستی لے جائیں گے۔"

ٹھاکر جی نے یہ تو انہیں سنیں تو گھبرا گئے اور اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے کہا۔ "میں کہتا ہوں کہ اسے کون پنچے شاہ کہا ہے۔ پتا نہیں اب کیا بڑبڑا رہا ہے۔"

مہابر نے کہا۔ "مجھے خود حیرت ہے کہ شاہ صاحب آج پھر زیادہ بول رہے ہیں۔"

ٹھاکر جی اپنے بھتیجے رتن لال اور رجنی کمار کے ساتھ پنچے شاہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے تو مصراجی کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے جودھا کا گریبان۔ پرمو کے ایک پاؤں کو اپنے پاؤں سے دبا رکھا تھا اور پھر جیسے ہی انہوں نے ٹھاکر جی کو دیکھا' چلانا شروع کردیا۔ "ان کو تو نے اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ مجھے اٹھائیں تو سہی' دیکھنا کیسا مزہ چکھاؤں گا۔"

ٹھاکر جی نے غصے میں پہنچے شاہ کو حکم دیا۔ "پاگل! میرے آدمیوں کو چھوڑ دے۔ کیا میں پاگل ہوں جو تجھ جیسے پاگل کو اٹھواؤں گا۔"

پنچے شاہ نے تینوں کو چھوڑ دیا اور کیلا رہے اکیلا کہتے ہوئے کہیں غائب ہوگئے۔

ٹھاکر جی نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "چلو یہاں سے واپس چلتے ہیں۔"

مہابر نے معذرت کی۔ "ٹھاکر... چاچا! اپنے شاہ صاحب آج زیادہ ہی بول رہے ہیں۔ ان کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ رہا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "مجھے افسوس تو یہ ہے کہ مجھے اس پاگل سے ملنے کا اشتیاق تھا۔"

رجنی کمار ٹھاکر جی کی گاڑی کا دروازہ کھول کے کھڑا ہوگیا تو مہابر نے ٹھاکر جی سے کہا۔ "ٹھاکر چاچا! آپ نے رجنی کمار کو ایک ہفتے کے لئے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تو آپ کے ساتھ جارہا ہے۔"

ٹھاکر جی نے اپنے حافظے پر زور دیا اور کہا۔ "شاید میری کنجیوں کا گچھا اندر پھلوں کے پاس رہ گیا ہے' ذرا اسے منگوا دے۔"

مہابر خود بھاگا بھاگا اندر پہنچا۔ اس دوران میں ٹھاکر جی نے رجنی کمار کو سمجھایا۔ "تو ایک ہفتے کے لئے یہیں رک جا اور اس پاگل کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش کر کہ کیا اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! یہ آدمی تو خطرناک لگتا ہے۔"

ٹھاکر جی نے غصے میں کہا۔ "ارے یہ کیا کہہ دیا تو نے۔ یہ پاگل اور خطرناک! کیسی الٹی سیدھی بات کررہا ہے اور ہاں دیکھ' ان

سات دنوں میں تو ان سب کو اپنی بے سروپا پیش گوئیوں سے ڈرانے کی کوشش کر کہ یہ لوگ اس پاگل سے بدظن ہوجائیں۔"

رجنی کمار چپ ہوگیا۔

مہابر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا واپس آیا اور کہا۔ "ٹھاکر... چاچا! پھلوں کے پاس تو کنجیوں کا کوئی گچھا نہیں۔"

ٹھاکر جی نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور گچھا نکال لیا۔ "بھتیجے! میں واقعی سٹھیا گیا ہوں کہ کنجیوں کا گچھا اپنی جیب میں رکھا ہے اور تجھ سے پھلوں کے پاس تلاش کروا رہا ہوں۔" اور رجنی کمار سے کہا۔ "جا' تجھے ایک ہفتہ یہیں مہابر کے پاس رہنا ہے اور ان سب کو اپنی جوتش ودیا کا جادو دکھانا ہے۔"

رجنی کمار شیو رلیٹ کے پاس سے ہٹ کے مہابر کے پاس چلا گیا۔

مہابر نے رجنی کمار کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "دیکھ بھئی رجنی کمار! اب تجھے ایک ہفتہ ہمارے ساتھ رہنا ہے۔"

نصیبت دونوں جیپوں میں بیٹھ گئے اور پھر یہ قافلہ راج محل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ٹھاکر جی نے اپنی فیملی ایٹ میں مصراجی اور ٹھاکر رتن لال کو بٹھالیا تھا۔ جب ان کی پشتینی زمینوں کی حدود سے باہر نکل گئی تو ٹھاکر جی نے اپنے بھتیجے رتن لال کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "سنپولیے! تو نے پنچے شاہ کی باتیں سنیں۔ وہ تجھے سنپولیا کیوں کہہ رہے تھے؟"

ٹھاکر رتن لال نے دلیری سے جواب دیا۔ "یہ تو آپ نے پنچے شاہ سے ہی پوچھا ہوتا۔ میں تو ان کی ایک بات کا بھی مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

ٹھاکر جی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کوٹھی پر چل' معنی تو تجھے میں سمجھاؤں گا۔"

رتن لال نے کہا۔ "کیا مصیبت ہے چاچا جی! وہاں تو آپ یہ کہہ رہے تھے کہ وہ پاگل ہے' بکواس کرتا ہے اور اب آپ مجھے سنپولیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اس پاگل کی باتوں پر یقین کرلیا؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ واقعی پنچے شاہ ہے۔ اس نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اس کی باتوں پر عمل کروں گا اور پہل تجھ سے ہوگی۔"

ٹھاکر رتن لال نے کہا۔ "چاچا جی! میں تو یہاں سے جارہا تھا' آپ نے خود ہی روک لیا۔"

ٹھاکر جی نے مصراجی سے پوچھا۔ "اس نے تم تینوں کا..."

لیکن ٹھاکر جی نے کسی مصلحت سے خاموشی اختیار کی اور مصراجی سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔

کوٹھی پر پہنچنے کے بعد ٹھاکر جی نے بھی مختشر کردیا اور ٹھاکر رتن لال سے کہا۔ "اب تو کچھ آرام کرلے' تجھ سے پھر بات ہوگی۔"

رتن لال کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلا گیا۔

کوٹھی میں پھکو اور ٹھکرائن نے ٹھاکر جی کی پیشانی پر شکنیں دیکھیں تو دونوں نے سمجھ لیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے اور ٹھاکر جی کسی بات پر ناراض ہیں۔

ٹھاکر جی نے پھکو سے پوچھا۔ "میرے پیچھے یہاں کوئی آیا تھا؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "تھانے دار نے پیغام بھیجا تھا کہ الہ آباد کے کمشنر سے مل لیں۔"

ٹھاکر جی نے نہایت غصے کی حالت میں پوچھا۔ "یہ پیغام کون لایا تھا' کوئی سپاہی یا کوئی دوسرا تھانے کا آدمی؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "آدمی تو چتو لال جی کا تھا مگر سندیسہ تھانے دار نے بھجوایا تھا۔"

ٹھاکر جی نے اپنی خواب گاہ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر میں اوپر آکے میرے ہاتھ پاؤں داب دینا' بہت درد کررہے ہیں۔"

جب ٹھاکر جی اوپر جانے لگے تو سامنے سے ٹھکرائن نمودار ہوئیں' پوچھا۔ "کیا بات ہے ٹھاکر جی! بہت غصے میں لگتے ہو؟"

ٹھاکر جی نے اوپر جاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے اوپر آجانا' کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

ٹھاکر جی نے اوپر جاکے کپڑے تبدیل کیے اور مسہری پر لیٹ گئے۔ ان کے کانوں میں پنچے شاہ کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔

ٹھکرائن دبے قدموں اندر داخل ہوئیں تو ٹھاکر جی کو ان کی آمد کا احساس ہوگیا۔ فوراً کروٹ بدلی' ٹھکرائن کو سامنے دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور غصے میں ٹھکرائن سے کہا۔ "ٹھکرائن! تو نے کچھ سنا' پنچے شاہ رتن لال کو سنپولیا کہہ رہا تھا۔"

ٹھکرائن نے پوچھا۔ "سنپولیا کیوں کہہ رہا تھا؟"

ٹھاکر جی بھڑک گئے۔ "عجب ناہنجار کم عقل عورت ہے۔ وہ رتن لال کو سنپولیا کہہ رہا تھا۔"

ٹھکرائن نے کہا۔ "تو اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات ہے۔"

ٹھاکر جی کو اور زیادہ غصہ آیا۔ "اری بے وقوف عورت' تو بات سمجھتی کیوں نہیں۔ پنچے شاہ رتن لال کو اس لئے سنپولیا کہہ رہے ہوں گے کہ ہم رتن لال کو دودھ پلا پلا کے تندرست و توانا کررہے ہیں۔"

ٹھکرائن نے کہا۔ "ٹھاکر جی! تم تو پنچے شاہ کو لینے گئے تھے' پھر لائے کیوں نہیں۔"

ٹھاکر جی نے جھنجلائے لہجے میں جواب دیا۔ "میں اس سنکی باؤلے کو کس طرح لے آتا۔ وہ اپنے ہتھے ہی نہیں چڑھا ورنہ ضرور لے آتا۔"

ٹھکرائن نے پوچھا۔ "انہوں نے کوئی کام کی بات بتائی؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "ہوں اور سنو" انہوں نے رتن لال کو سنپولیا کہہ دیا۔ یہ کوئی کم اہم بات ہے۔ میں تو اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

ٹھکرائن نے جھنجلا کر کہا۔ "تم تو بس ایک رٹ لگائے ہوئے ہو 'سنپولیا' سنپولیا! آخر اس سنپولیے کے علاوہ بھی کچھ کہا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "وہ مجھے سمندری آدمی کہہ رہے تھے۔"

ٹھکرائن نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ "سمندری مچھلی ہوتی ہے' سمندری مگرمچھ ہوتا ہے' سمندری بلا ہوتی ہے۔ سمندری آدمی تو پہلی بار سنا ہے۔ تم ان میں سے کیا ہو؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "اچھا تو اس وقت جا۔ یونہی دماغ میں ورم چڑھ گیا ہے' تیری باتوں سے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

اسی دوران میں پچھو بھی وہاں پہنچ گیا۔ ٹھاکرائن نے ٹھاکر جی کو حکم دیا۔ "اب تو نیچے جا اور مجھے پچھو سے ہاتھ پاؤں دبوانے دے۔"

ٹھکرائن بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ "پہنچے شاہ نے کچھ اور بتایا ہوگا' تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

ٹھکرائن کے جاتے ہی ٹھاکر جی دوبارہ لیٹ گئے اور حکم دیا۔ "ہزا درد ہے' ذرا زور لگا کے دبا۔"

پچھو نے شانہ دباتے دباتے کہا۔ "ٹھاکر جی! آج آپ بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "کچھ دیر بعد جب جسم دبا چکنا تو میرے پاس مصراجی' پربھو اور جودھا کو لے آنا۔ ان تینوں سے کچھ بات کرنی ہے۔"

پچھو نے ہمدردی جتائی۔ "ان تینوں کو آپ نے پہلے تو کبھی یہاں بلوایا نہیں' اب اس وقت یہاں آئیں گے تو کیا سوہنیں گے۔"

ٹھاکر جی نے تنگ کر کہا۔ "کیا کہیں گے! ان کی مجال کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھیں۔"

پچھو نے دونوں شانے پکڑ رکھے تھے' تہمتہ سے کہا۔ "ٹھاکر جی! یہ آپ کی آرام کرنے کی جگہ ہے۔ اگر یہاں جودھا اور پربھو جیسے لوگ آنے لگے تو ان کے تو دماغ خراب ہو جائیں گے۔ برا نہ مانیں' آپ کی عزت کم ہو جائے گی۔"

ٹھاکر جی نے دونوں شانے چھڑا لئے اور پلٹ کے پچھو سے پوچھا۔ "کیا بکتا ہے؟"

پچھو نے پیچھے ہٹ کے ٹھاکر جی کا جوتا اٹھایا اور سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ "اس جوتے سے میری خوب پٹائی کریں۔ گن کے سو لگائیں مگر میں پھر یہی کہوں گا کہ جودھا اور پربھو جیسوں کو اس خاص کمرے میں نہ بلائیں۔ آخر ٹھاکرائی کی شان بھی تو کوئی چیز ہے۔"

ٹھاکر جی نرم پڑ گئے۔ "جوتے کو وہیں رکھ دے۔ ہاتھ دھو کے میرے شانے دبا۔"

پچھو جوتا رکھ کے ہاتھ دھونے چلا گیا۔

جب واپس آیا تو ٹھاکر جی بالکل نرم پڑ چکے تھے۔ "تو ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے کسی کو بھی اپنی خواب گاہ میں نہیں بلانا چاہیے' رجنی کمار کو بھی نہیں۔"

پچھو رو رہا تھا۔ "ٹھاکر جی! آپ کی آن بان اور شان کم ہو' یہ تو میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میں تو مصراجی' جودھا اور پربھو سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جب پہنچے شاہ نے دو کے گریبان اور تیسرے کے پاؤں دبا کے روکا تھا تو ان تینوں نے خود کو چھڑایا کیوں نہیں اور چپ چاپ کیوں کھڑے رہے؟"

پچھو نے کہا۔ "میری ان تینوں سے بات ہوئی تھی۔ وہ موہن پورے کی باتیں کر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں پہنچے شاہ کا ذکر کیا۔ تینوں یہی کہتے تھے کہ پہنچے شاہ کی گرفت بہت سخت تھی۔ جس کا پاؤں دبایا تھا وہ کہتا تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے مضبوط ہاتھوں سے پاؤں پکڑ لئے' تینوں میں سے کسی میں بھی اتنی طاقت نہیں تھی کہ پہنچے شاہ کی گرفت سے نکل جاتا۔ تینوں بہت ڈرے ہوئے تھے۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "مجھے ان تینوں سے یہی پوچھنا تھا۔ اب ان کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔ شانوں کے بعد پچھو ہاتھ دبانے لگا اور کچھ دیر بعد ٹھاکر جی پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئے اور حکم دیا۔ "اب پاؤں دبا۔"

اس وقت ٹھاکر جی گہری سوچ میں تھے' سوچتے سوچتے پوچھا۔ "پچھو' یہ اپنا بھتیجا رتن لال کبھی کوٹھی کے پچھلے حصے میں بھی گیا ہے؟"

پچھو نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! ذلیل بڑا کھوجی ہے۔ اپنے سامنے تو گیا نہیں' ہو سکتا ہے کبھی پہنچ گیا ہو۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "پہنچے شاہ کہہ رہے تھے کہ جنہیں قید کر رکھا ہے انہیں چھوڑ دو لیکن اب اگر انہیں چھوڑ دوں گا تو کام اس سے لوں گا۔ دوسرے وہ نکلتے ہی مجھے بدنام کرنا شروع کر دیں گے۔"

پچھو نے کہا۔ "ٹھاکر جی! اگر پہنچے شاہ نے کہا ہے تو انہیں چھوڑ دیں۔ اسی میں آپ کی بھلائی ہوگی۔"

ٹھاکر جی نے پاؤں کھینچ لئے۔ "کیا بکواس کرتا ہے۔ میں کوئی تجھ سے مشورہ لے رہا ہوں' جا دفع ہو۔"

پچھو چلا گیا۔

اس روز ٹھاکر جی بہت پریشان رہے۔

☆○☆

ٹھاکر جی کے کانوں میں پہنچے شاہ کی آواز گونجتی رہی۔ ان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ ٹھاکر جی کو یاد آتا رہا۔ "اڈو بھنبیری سادھن آیا" کا مفہوم سمجھنے کی وہ کوشش کرتے رہے مگر کوئی

مفہوم سمجھ میں نہ آیا۔ انہوں نے ٹھاکر جی کو سمندری آدمی کہا تھا۔ اس کا مفہوم بھی پلے نہ پڑا پھر کیلا رہے اکیلا کا مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو سنپولیا کہا تھا۔ یہ فقرہ بھی ٹھاکر جی کو پریشان کرتا رہا۔ وہ اس سلسلے میں ٹھاکر رتن لال سے باتیں کرتے ہوئے اس لئے گھبراتے تھے کہ ان کے کئی خطرناک جرموں کا وہ رازدار بھی تھا۔ اسے وہ نکال بھی نہیں سکتے تھے۔ مروانا بھی مشکل تھا۔ آخر وہ کس کس کو مرواتے لیکن وہ اس سنپولیے سے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔

ٹھاکر جی کو شبہ تھا کہ رتن لال چوٹالا جی سے بھی مل گیا ہے اور ٹھاکر جی ذرا سی سخت گیری رتن لال میں جذبۂ بغاوت پیدا کر سکتی تھی اور اس کے بعد یہ نوجوان بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

ٹھاکر جی نے پربھو اور جودھا کو بھی رتن لال سے بے تکلفی سے ملاقاتیں اور باتیں کرتے دیکھا تو ٹھاکر جی کو گویا اس پیچیدہ مسئلے کا حل مل گیا۔

انہوں نے مصراجی اور پچھو کو بھی پربھو اور جودھا کے پیچھے لگا دیا کہ وہ ان دونوں سے اندر کی باتیں معلوم کریں۔

خود انہیں جودھا کی باتوں سے ایسا لگا کہ وہ ٹھاکر رتن لال سے بیزار ہے اور ٹھاکر جی کے قریب آنا چاہتا ہے۔

ٹھاکر جی نے پہلے اس سے چھوٹے موٹے کام لینا شروع کر دیے تھے جس کے نتیجے میں وہ خود بخود ٹھاکر رتن لال سے دور اور ٹھاکر جی سے قریب ہونے لگا تھا۔ یہ طرزِ عمل رتن لال کی پریشانی میں اضافہ کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جودھا کو کس طرح منع کرے کہ وہ ٹھاکر جی کو راز کی باتیں نہ بتائے۔ اب جودھا نہ تو رتن لال سے ڈرتا تھا اور نہ اس سے کوئی مالی مدد لیتا تھا۔ اس سے بالکل کھنچ گیا تھا۔

رتن لال پربھو سے کام لیتا رہا کہ وہ جودھا کو سمجھاتا رہے کہ اگر جودھن لال سے ناراض ہے اور اس نے ٹھاکر جی کا قرب اور اعتماد حاصل کر لیا ہے تو ٹھیک ہے مگر اسے اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہیے۔

پربھو بار بار جودھا کو سمجھاتا تھا۔ "دیکھ جودھا! کوئی ایسی بات نہیں ہونا چاہیے جس سے بچا کھچا بھید میں جنگ ہو جائے۔" پربھو نے کہا۔ "یہ دونوں چکی کے دو پاٹ ہیں۔ اگر تو ان دونوں کے درمیان آ گیا تو خوامخواہ پس جائے گا۔"

جودھا نے ناراضی سے کہا۔ "میرا چھوٹے ٹھاکر سے کوئی جھگڑا نہیں مگر چھوٹے ٹھاکر کا یہ طعنہ دینا کہ انہوں نے مجھ پر بہت خرچہ کیا ہے' مجھے بہت برا لگا۔ بڑے ٹھاکر کی بات کچھ اور ہے لیکن چھوٹے ٹھاکر تو ابھی خود ہی طفلی ہیں۔"

پربھو نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر غلطی سے کچھ کہہ گئے ہوں تو الگ بات ہے ورنہ وہ بہت بھلے آدمی ہیں۔"

جودھا نے برا سا منہ بنایا۔ "بھلے آدمی! یہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ کتنے بھلے آدمی ہیں۔"

پربھو نے جودھا کو سمجھایا۔ "چل وہ تیرے کہنے کے مطابق بہت برے آدمی ہیں لیکن یہی سوچ کے اپنی زبان قابو میں رکھ کہ دو بڑوں کے جھگڑے میں چھوٹوں کو دور دور رہنا چاہیے۔"

لیکن مصراجی اور پچھو دوسری طرح باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں کو جودھا نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ دونوں سے بس یہی کہہ دیتا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر بہت اچھے آدمی ہیں۔

ان دونوں نے جودھا کی موجودگی میں پہنچے شاہ کی باتیں شروع کر دیں۔ مصراجی نے پچھو سے کہا۔ "ایک بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی کہ پہنچے شاہ نے چھوٹے ٹھاکر کو سنپولیا کیوں کہا؟"

پچھو نے جواب دیا۔ "بھائی مصراجی! میں تو وہاں موجود نہیں تھا ورنہ میں پہنچے شاہ سے پوچھ لیتا کہ ایسے بھلے مانس' نیک اور وفادار بھتیجے کو آپ سنپولیا کیوں کہہ رہے ہیں۔"

جودھا وہاں سے اٹھ کے چلا گیا۔

رتن لال ان تینوں کی چھپ کے نگرانی کر رہا تھا۔ جودھا کو الگ لے گیا' اتنی دور کہ پچھو اور مصراجی دونوں کو دیکھ سکیں اور نہ ان کی باتیں سن سکیں۔

رتن لال نے جودھا سے پوچھا۔ "دونوں کیا پوچھ رہے تھے؟"

جودھا نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! دونوں بہت موذی ہیں۔ وہ دونوں میرے پیچھے ٹھاکر جی کے لگائے ہوئے ہیں مگر میں جھگڑوں سے بچتا ہوں۔ پربھو کہتا ہے کہ دونوں ٹھاکر جی چکی کے دو پاٹ ہیں۔ میں ان دونوں کے درمیان میں آ کے خوامخواہ پس جاؤں گا۔"

رتن لال نے پوچھا۔ "وہ دونوں پوچھ کیا رہے تھے؟"

جودھا نے جواب دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر! زیادہ کھوج میں نہ پڑیں تو اچھا ہے۔"

رتن لال نے جودھا کی تعریف کی۔ "اندازہ ہوا کہ تو بہت کھرا ہے۔ میں نے تجھ سے زیادتی کی کہ تجھ پر احسان جتا دیا۔"

جودھا نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! اب وہ ذکر چھوڑیں' کوئی اور بات کریں۔"

رتن لال نے کہا۔ "میں نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔ پچھو پوچھ رہا تھا کہ پہنچے شاہ نے چھوٹے ٹھاکر کو سنپولیا کیوں کہا؟"

جودھا نے کہا۔ "ہاں وہ یہی بات کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ اس کا مطلب پہنچے شاہ سے پوچھو۔"

رتن لال نے کہا۔ "ویسے پہنچے شاہ کو ایسی غیر ذمے دارانہ بات حالتِ جذب میں بھی نہیں کہنا تھی۔ پتا نہیں انہوں نے یہ بات کیوں کہی؟"

جودھا نے کہا۔ "یہ بات انہوں نے کیوں کہی' آپ سے بہتر کون جانے گا۔"

رتن لال نے غلط محسوس کیا کہ اس شخص سے زیادہ باتیں

کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے' کہا۔ "میں نے تیرے جیسا سچا اور کھرا آدمی نہیں دیکھا۔"

جودھا نے رتن لال کو مشورہ دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر! ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات لیکن میری بات پر غور ضرور کریں۔ یہ آپ کا وکیل صاحب' چنو لال جی اور تھانے دار سے ضرورت سے زیادہ میل ملاپ رکھنا بہت خطرناک ہے۔"

رتن لال نے کہا۔ "میں ان سب کے باہمی جھگڑے ختم کروا دینا چاہتا ہوں۔ چنو لال جی معافیاں مانگ رہے ہیں اور ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کا ہرجانہ بھرنے کو تیار ہیں۔ وکیل بھی شرمندہ ہے۔ تھانے دار بھی یہی چاہتا ہے کہ تینوں پھر سے دوست ہو جائیں۔ اس میں برائی کیا ہے۔"

جودھا نے کہا۔ "یہ بڑے لوگوں کی باتیں ہیں' بڑے لوگ جانیں' لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اپنے ٹھاکر جی لفظ معافی کے معنی نہیں جانتے۔"

جودھا نے کسی کی آہٹ محسوس کی اور چپ چاپ فوراً ہی رتن لال کے پاس سے ہٹ گیا۔

یہ پرجھو تھا جو جودھا کو تلاش کر رہا تھا۔ ٹھاکر جی کو پتا نہیں کیوں اور کس لئے جودھا کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

○☆○

مہابیر اور اس کے گھر والوں نے رجنی کمار کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس سے بہت سے سوالات کئے۔

مہابیر نے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا جو کمسار کے گھر میں پرورش پا رہی تھی۔

رجنی کمار نے مہابیر کو بتایا۔ "مہابیر جی! یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ میں اس لڑکی سے مل چکا ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ میرے ماں باپ کون ہیں لیکن میں اسے کیا جواب دیتا۔"

مہابیر نے کہا۔ "اب تم اپنے علم کے ذریعے یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی اگر ہم رکھ لیں تو وہ ہمارے لئے کیسی ثابت ہوگی' بھاگوان یا منحوس؟"

دادی نے یہ باتیں سنیں تو غصے میں کہا۔ "اب وہ بھاگوان ہو یا منحوس' اس حویلی میں نہیں آئے گی۔"

رجنی کمار نے ٹھاکر جی کی ہدایت پر عمل کیا اور کہا۔ "مہابیر جی! جہاں تک جوتش ودیا کا تعلق ہے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ لڑکی بہت بھاگوان ہے۔ اسے اس حویلی میں رہنا چاہیے۔ آپ کو اس سے بہت فائدے پہنچیں گے۔"

دادی نے مہابیر کو ڈانٹا۔ "تو اس سے کس قسم کے سوال کر رہا ہے۔ اگر وہ لڑکی اس حویلی میں آگئی اور تو نے اس کو اپنے باپ کی بیٹی مان لیا تو ٹھاکر جی اپنی اس بھانجی کے ذریعے تیری زمینداری میں بھی شامل ہو جائے گا۔ مجھے تو یہ جوتشی بھی ٹھاکر جی کا آلۂ کار لگتا ہے۔"

مہابیر بھی دادی کی باتوں پر چونک گیا۔ اسے واقعی رجنی کمار پر شبہ ہوا کہ وہ ٹھاکر جی کا آدمی ہے اور ٹھاکر جی کے لئے ہی کام کر رہا ہے۔

مہابیر نے رجنی کمار سے بڑا خطرناک سوال کیا۔ "اگر تو واقعی بہت بڑا جوتشی ہے تو ذرا حساب لگا کے بتا کہ میرے پتا جی کو کس نے قتل کیا ہے۔ تو اگر قاتل کا نام نہیں بتا سکتا تو قاتل کے ٹھکانے کی سمت ہی بتا دے یا نام کا پہلا اکچھر ہی بتا دے۔"

رجنی کمار بہت الجھن میں پڑ گیا۔ وہ اس سوال کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے یہ نہیں معلوم تھا کہ مہابیر کے باپ کو ٹھاکر جی کی کوٹھی میں قتل کیا گیا ہے مگر کچھ کچھ شبہ ضرور تھا کہ مہابیر کے باپ اور پجاری کے قتل میں ٹھاکر جی ہی کا ہاتھ ہے۔

دادی نے غصے میں کہا۔ "کیا سوچ رہا ہے! صحیح صحیح جواب دے۔ اگر تجھے علم نجوم آتا ہے تو۔"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "مجھے مہابیر جی کے سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑے گی اس لئے میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ آپ لوگ مجھے کچھ وقت دیں۔"

مہابیر کی ماں نے کہا۔ "جب اپنے پاس پہنچے شاہ موجود ہیں تو پھر اسے کیوں روک لیا۔ ٹھاکر جی کا یہ پنڈت ہمیں کیا بتائے گا۔"

رجنی کمار نے سمجھ لیا کہ یہاں دال گلنی مشکل ہے' اسے یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔ رجنی کمار نے مہابیر کی خوشامد کر کے اسے چند گھنٹوں کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنے علم سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ مہابیر کے باپ کا قاتل کون ہے۔

دادی نے رجنی کمار سے نہایت نرمی سے پوچھا۔ "تو سچ سچ بتا کہ تو نے دو سال تک برہمانہ ہونے کی کوئی پیش گوئی کی تھی؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "مائی! آپ لوگ معلوم نہیں کیوں مجھ پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہیں۔ میں کس طرح یقین دلاؤں کہ میرا کسی کے مستقبل کا حال جاننے والا علم جھوٹا ثابت ہوا ہے۔"

مہابیر کی ماں نے کہا۔ "مہابیر! تو نے اسے روک لیا' ہو سکے تو اسے کل ہی چلتا کر دے۔"

مہابیر نے خاص حویلی کے احاطے میں بنے ہوئے مہمان خانے کا ایک کمرا رجنی کمار کو دے دیا اور کہا۔ "رجنی کمار جی! تم سے جو کچھ پوچھا گیا ہے اس کا کل تک جواب دے دو۔"

رجنی کمار کو جس مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا اس کے برابر والا کمرا پہنچے شاہ کا تھا۔ رجنی کمار نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہنچے شاہ کی آواز سنی۔ وہ چیخ رہے تھے۔ "بتانا پڑے گا' بتانا کیوں نہیں' پہلا اکچھر نہیں پورا نام بتا۔ سمت نہیں' جگہ دکھا۔"

رجنی کمار نے پہنچے شاہ کے کمرے میں جھانک کے دیکھا کہ پہنچے شاہ کسی سے مخاطب ہیں۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ پہنچے شاہ تنہا فرش پر بیٹھے بڑبڑا رہے تھے۔ "اکچھر نہیں' پورا نام بتا۔ سمت نہیں جگہ دکھا۔"

رجنی کمار پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ٹھاکر جی اسے کس مصیبت میں ڈال گئے۔ اس ماحول میں وہ ٹھاکر جی کے لئے کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

رجنی کمار نے اپنے کمرے سے باہر دیکھا۔ مہابیر سنگھ اپنی حویلی کی طرف واپس جا رہا تھا۔

اس کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ اس پر بستر کیا ہوا تھا۔ سرہانے تکیہ موجود تھا۔ ایک کونے میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی الماری رکھی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک کمہار نے پانی کی صراحی لا کر رکھ دی اور صراحی پر اوندھے منہ کٹورا رکھ دیا اور کہا۔ "شری مان جی! صراحی اور کٹورا رکھ دیا ہے۔ کوئی ضرورت ہو تو میں باہر موجود ہوں' بلوا لینا۔"

رجنی کمار بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں ایک پھنسے کس طرح گزرے گا اور یہاں سے راج نگر واپس جا کے ٹھاکر جی کو کیا جواب دے گا۔ وہ ٹھاکر جی کو بھلا بھی نہیں سکتا تھا اور ان لوگوں کو بے وقوف بھی نہیں بنا سکتا تھا۔

پہنچے شاہ فی الحال پھنس ہو گئے تھے۔

وہ کافی دیر یہی سوچتا رہا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

رات کو نو بجے کے لگ بھگ مہابیر سنگھ نے رجنی کمار کی مزاج پرسی کی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی کھانا کھا کے یک سوئی سے لیٹا تھا لیکن مہابیر سنگھ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ مہابیر سنگھ نے پوچھا۔ "رجنی کمار جی! حساب کتاب سے کچھ پتا چلا کہ میرے باپ کو کس نے قتل کیا تھا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "مہابیر سنگھ جی! آپ کو آپ کے سوال کا جواب ضرور ملے گا۔ میں کوشش کر رہا ہوں اور جس چکر میں دیر لگ رہی ہے اس سے بھی آپ کو آگاہ کر دوں گا لیکن اس میں شاید دو تین دن لگ جائیں۔"

مہابیر سنگھ نے پوچھا۔ "پہنچے شاہ کچھ بڑبڑا رہے تھے؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "میں نے کچھ غور نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ جب وہ بڑبڑا رہے ہوں تو میری آنکھ لگ گئی ہو اور میں نہ سن سکا ہوں۔"

مہابیر سنگھ نے رجنی کمار کو شک و شبے سے دیکھا۔ "کمال ہے کہ پہنچے شاہ کی بڑبڑاہٹ کئی دوسروں نے تو سنی مگر تو جو بالکل ان کے پاس ہی موجود تھا اسے نہیں سن سکا۔ صبح تجھ کو دادی ماں سے ملنا ہوگا۔ وہ تجھ سے بہت ناراض ہیں اور تجھے جلی جوتشی اور بہروپیا کہہ رہی تھیں۔"

اچانک پہنچے شاہ نے چیخنا شروع کر دیا۔ "اکچھر نہیں پورا نام بتا۔ سمت نہیں جگہ دکھا۔"

مہابیر نے کہا۔ "پہنچے شاہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا تو نے ان سے کوئی بات کی تھی؟"

رجنی کمار واضح محسوس کر رہا تھا کہ مہابیر سنگھ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے ورنہ جانتا ہے کہ رجنی کمار نے پہنچے شاہ کی یہ بڑبڑاہٹ پہلے بھی سنی ہے۔

مہابیر سنگھ نے پہنچے شاہ کے کمرے میں جھانک کے دیکھا۔ پہنچے شاہ پنشائی پر لیٹے بڑبڑا رہے تھے۔

رجنی کمار بھی مہابیر سنگھ کے پاس جا کے' پہنچے شاہ کو دیکھنے لگا اور کچھ دیر بعد پوچھا۔ "یہ کہہ کیا رہے ہیں' کس سے کہہ رہے ہیں یا انہیں کسی نے سکھا دیا ہے کہ شاید یہی کہو؟"

مہابیر سنگھ نے پیچھے ہٹتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "رجنی کمار جی! یہ اللہ والے لوگ ہیں۔ ان کو کوئی کیا سکھائے گا۔ دادی ماں کے بقول سکھائے ہوئے تو تم معلوم ہوتے ہو۔"

رجنی کمار کے جی میں آیا تھا کہ اب وہ مہابیر کو بتا دے کہ اسے جوتش کا علم نہیں آتا بلکہ اسے کوئی ماورائی قوت حاصل ہے جو کسی وقت بھی کچھ بتا سکتی ہے اور یہ قوت اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

حویلی کے دوسرے لوگ بھی رجنی کمار میں دلچسپی لے رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ یہ وہی جوتشی ہے جس نے دو سال کے لئے علاقے کی برکھا روک دی ہے۔

مگر یہاں بھی راجپوتی آن بان کام کر رہی تھی اور نوکروں چاکروں کی مجال نہیں تھی کہ وہ اجازت کے بغیر رجنی کمار سے بات کر لیتے۔

پوری رات ٹوٹ ٹوٹ کے نیند آئی۔ پہنچے شاہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو چکے تھے۔ وہ خاموش تھے مگر رجنی کمار کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ بڑبڑا رہے ہیں۔ "اکچھر نہیں نام بتا' سمت نہیں جگہ دکھا۔"

صبح مندر کی گھنٹیاں بجیں۔ کہیں دور سے اذان کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ اس کی یکسوئی ختم ہو چکی تھی۔ طبیعت اکھڑی اکھڑی تھی۔ کسی حال میں بھی اسے یہاں کسی نے سکھا دیا ہے کہ شاید یہی کہو؟

رجنی کمار نے ٹھاکر جی کے ظلم کی داستان مہابیر' اس کی ماں اور دادی ماں کو سنا دے اور ان سب کو بتا دے کہ اسے یہاں ٹھاکر جی نے چند خاص ہدایات دے کر چھوڑا ہے۔ وہ بالکل مجبور اور بے بس ہو رہا تھا۔ اب اس وقت اس کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ اپنی اس حالت کا ذمے دار شاہ جی کو قرار دے رہا تھا کہ انہی کی پراسرار روحانی قوت نے رجنی کمار کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہ پلنگ سے اترا اور پہنچے شاہ کو جھانک کے دیکھا۔ ان کی جگہ خالی تھی۔ وہ کہیں جا چکے تھے۔

اب اس نے کمرے سے باہر احاطے پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ دور گوشے میں ایک چھوٹا سا مندر موجود ہے۔ مہاویر مندر سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں خالی ٹوکری تھی جس کے پھول وہ مندر میں چڑھا آیا ہوگا۔ مہاویر سیدھا رجنی کمار کے کمرے میں آیا اور رجنی کمار کو بیدار دیکھ کر کہنے لگا۔ "تم تم جاگ گئے!"

رجنی کمار نے کہا۔ "مہاویر جی! میں بہت پریشان ہوں۔ رات بھر ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔ مجھے یہاں سے چلے جانے کی اجازت دیں۔"

مہاویر نے جواب دیا۔ "جو دوسروں کو پریشان کرے گا وہ پریشان تو ہوگا ہی' جانے کی اجازت دادی ماں سے لو۔"

رجنی کمار نے بے چینی سے پوچھا۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

مہاویر نے جواب دیا۔ "نہیں ابھی نہیں' ابھی دادی ماں آرام کر رہی ہیں۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "تب پھر آپ مجھے کوئی دوسرا کمرا دے دیں کیونکہ یہ پنچھے شاہ مجھے یہاں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔"

مہاویر نے کہا۔ "تھوڑی دیر میں رامو کو بھیجوں گا' اس کے ساتھ چلے آنا اور یہ باتیں دادی ماں سے کہنا کیونکہ اس حویلی میں انہی کا حکم چلتا ہے۔"

مہاویر چلا گیا۔ اچانک رجنی کمار پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ وہ خود کو کپڑے پھاڑ کر بھاگنے پر آمادہ پا رہا تھا۔ کوئی اس کے اندر بیٹھا کہہ رہا تھا کہ تجھ پر پنچھے شاہ نے قبضہ کر لیا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد رامو آیا اور رجنی کمار کو اپنے ساتھ حویلی میں لے گیا۔ اس بار اسے بیٹھنے کے لئے وہی جگہ دی گئی جہاں ٹھاکر جی بیٹھے تھے۔

رجنی کمار وہاں بیٹھ تو گیا مگر غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکل گیا۔ "اگر ٹھاکر جی... مجھے اپنی جگہ بیٹھا دیکھ لیں تو جان سے مروا دیں۔"

دادی ماں نے وہاں داخل ہوتے ہوئے اس کی یہ بات سن لی اور انہوں نے طنزاً کہا۔ "تیرے ٹھاکر جی لوگوں کو مروانے بہت ہیں۔"

رجنی کمار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دادی ماں رجنی کمار کے سامنے بیٹھ گئیں پھر مہاویر بھی آ گیا۔

سب کے آخر میں مہاویر کی ماں اندر داخل ہوئی اور کہا۔ "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بہروپیا ٹھاکر جی کا ایجنٹ ہے اور حویلی میں کسی خاص مقصد سے چھوڑا گیا ہے۔"

دادی ماں نے رجنی کمار سے پوچھا۔ "تو نے اپنے علم سے معلوم کیا کہ مہاویر کے باپ کو کس نے قتل کیا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ تو دیا کہ اس سوال کا جواب اتنی جلدی نہیں ملے گا جتنی جلدی کی آپ لوگ امید کر رہے ہیں۔"

دادی ماں نے کہا۔ "اچھا اب اس سوال کو جانے دے اور یہ بتا کہ ٹھاکر جی نے تجھ کو یہاں کیوں چھوڑا ہے؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "آپ لوگوں نے مجھے روکا اور ٹھاکر جی نے آپ کی بات رکھ لی اور ایک ہفتے کے لئے مجھے یہاں چھوڑ گئے۔"

مہاویر نے پوچھا۔ "تجھے علمِ نجوم آتا بھی ہے یا ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے؟"

مہاویر کی ماں نے کہا۔ "اسے کہیں ایسی جگہ پہنچا دو کہ ٹھاکر... ڈھونڈتا ہی رہے پھر یہ خود بخود سب کچھ بتا دے گا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "نہیں' ایسا مت کرنا۔ ٹھاکر... بہت برا آدمی ہے۔ معلوم نہیں کیسا طوفان اٹھا دے۔"

مہاویر نے جوش میں کہا۔ "پرشوتم داس جی ٹھاکر... ہیں تو میں بھی ٹھاکر... ہوں۔ لوہے کو لوہا کاٹ کے رکھ دے گا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "یہ اپنے پنچھے شاہ رات سے کیا رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ اچھر نہیں نام بتا' مت نہیں جگہ دکھا۔ جب تک اس کا مقصوم ظاہر نہ ہو جائے' رجنی کمار کو آرام سے رکھو۔"

رجنی کمار کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ "آپ لوگ مجھے جانے دیں۔ مجھے کچھ نہیں آتا۔ میری توبہ آپ لوگ مجھ پر رحم کھائیں۔"

دادی ماں نے کہا۔ "تو ہمیں پنچھے شاہ سے اجازت لینے دے۔ وہ جانے کی اجازت دے دیں گے تو ہم لوگ بھی اجازت دے دیں گے۔"

رجنی کمار کی بڑی خاطر کی گئی۔ ناشتا دیا گیا اور اس سے اچانک میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ تینوں قصائی کا کردار ادا کر رہے ہوں جو چاقو تیز کرنے سے پہلے خوب کھلا پلاتا ہے۔

دادی ماں نے مہاویر سے پوچھا۔ "یہ شاستری کہاں چلے گئے؟"

مہاویر نے بتایا۔ "وہ ہر روز صبح کہیں چلے جاتے ہیں۔ کسی کو کچھ بتا کے نہیں جاتے۔"

دادی ماں نے کہا۔ "شاہ جی آ جائیں تو انہیں روکنا کہ رات سے بڑی معنی خیز باتیں کر رہے ہیں۔ میں ان سے اس کا مقصوم پوچھ کے رہوں گی اور اس کو بھاگنے نہ دینا۔"

رجنی کمار کو ناشتا کروا کے بڑے ہال سے متصل کمرے میں پہنچا دیا گیا اور مہاویر نے کہا۔ "اب تو یہاں رہ' دادی ماں کا حکم ہے۔ باہر تیری کون نگرانی کرے گا اور یوں بھی تو شاہ جی سے دور رہنا چاہتا تھا۔"

اس کمرے میں ایک مسہری پڑی تھی۔ وہ اسی پر بیٹھ گیا۔ مہاویر نے باہر نکل کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا' بہ آوازِ بلند کہا۔ "اب تو یہیں رہ' شاہ جی آ جائیں' وہ جیسا حکم دیں گے اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔"

مہاویر بھی چلا گیا۔ یہاں بھی رجنی کمار پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ کوئی اندر سے اسے مجبور کر رہا تھا کہ بات نہ بڑھا اور جو کچھ جانتا ہے انہیں صاف صاف بتا دے۔

وہ کئی گھنٹے اسی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا رہا۔ یہاں اسے ٹھاکر جی بہت یاد آ رہے تھے۔ تقریباً دو بجے سناٹا ختم ہو گیا اور متصل ہال میں سے باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ دادی ماں مہاویر سے کہہ رہی تھیں۔ "دیکھتا وہ اپنے شاہ جی آئے یا ابھی تک غائب ہیں۔"

مہاویر کی آواز سنائی دی۔ "دادی ماں' پنچھے شاہ اس کاشت کار کو پکڑ لائے ہیں جس نے پاتی کو اغوا ہوتے دیکھا تھا اور ٹھاکر جی کے بدری کو پہچان لیا تھا۔"

دادی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔ "وہ دونوں ہیں کہاں؟"

باہر سے پنچھے شاہ کی آواز سنائی دی۔ "وہ کہاں چلا گیا؟ اسے جانے مت دینا' میں گواہ کو پکڑ لایا۔"

پنچھے شاہ نے کاشت کار کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ دونوں ہال میں داخل ہوئے اور پنچھے شاہ نے کاشت کار کو حکم دیا۔ "یہاں بیٹھ جا۔"

پنچھے شاہ نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر کاشت کار زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت ڈرا سہما تھا اور ہال میں بیٹھتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

پنچھے شاہ نے کاشت کار کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کی اور صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں نہیں' وہاں بیٹھ۔"

دادی ماں نے کاشت کار سے کہا۔ "شاہ جی جہاں بیٹھنے کا حکم دے رہے ہیں' وہیں بیٹھ جا۔"

کاشت کار نے ہاتھ جوڑے۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

پھر پنچھے شاہ نے بھی اصرار نہیں کیا اور میز پر رکھے ہوئے پھلوں میں سے نارنگی اٹھائی پھر کیرر کیرر کرتا دو بجے سنانے لگے۔

نگی کو نارنگی کہیں — بنے دودھ کو کھویا
نگی کو گاڑی کہیں — دیکھ کبیرا رویا

پنچھے شاہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے پھر رجنی کمار کو پوچھا۔ "وہ بائیسکوپ والا کہاں چلا گیا؟ اسے بلاؤ۔"

پنچھے شاہ کی بات کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ بائیسکوپ سے تو وہ واقف تھے کہ سنیما کو کہتے ہیں مگر ان کی حویلی میں بائیسکوپ والا کون تھا؟ ذہن پر زور دینے کے باوجود کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مہاویر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "شاہ صاحب! یہ آپ بائیسکوپ والا کسے کہہ رہے ہیں؟"

پنچھے شاہ نے جواب دیا۔ "وہی جو تماشے دکھاتا ہے۔ کہاں چلا گیا' اسے بلاؤ تو سہی۔"

دادی ماں نے پنچھے شاہ سے پوچھا۔ "شاہ صاحب! ہم ناسمجھ لوگ آپ کی باتیں نہیں سمجھ پاتے' کچھ بتائیں تو کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

پنچھے شاہ نے کسان سے کہا۔ "ان سب کو بتا تا کیوں نہیں کہ زمیندار کو کون پکڑ لے گیا۔"

کاشت کار نے جواب دیا۔ "شاہ صاحب! وہ بدری تھا' ٹھاکر... پرشوتم داس کا خاص آدمی۔ اس کے ساتھ تین چار دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان کو میں نہیں پہچانتا۔"

پنچھے شاہ نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "وہ کہاں گیا' اچھر نہیں نام بتا' مت نہیں جگہ دکھا۔"

پنچھے شاہ بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھے اور رجنی کمار کا کمرا کھول کے اندر داخل ہو گئے پھر بے ساختہ بولے۔ "اچھا تو تُو یہاں بیٹھا ہے۔ کب تک بچے گا۔ کیوں پریشان کرتا ہے؟"

رجنی کمار نے دادی ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔ "دادی ماں' بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کریں۔ میں اگر دو چار دن اور یہاں رہ گیا تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

دادی ماں نے پنچھے شاہ سے پوچھا۔ "شاہ صاحب! یہ بہت پریشان ہے۔ کیا اسے چلا جانے دیں؟"

پنچھے شاہ نے بھنی پھٹی نظروں سے رجنی کمار کو گھورا۔ "میں نے تجھ کو بلوایا تھا۔ وہ ٹھاکر جی میرے بلوانے سے تجھ کو یہاں لایا ہے' برکھا کروا۔"

اب رجنی کمار نے پنچھے شاہ کے پاؤں پکڑ لئے۔ "شاہ صاحب! خدا کے لئے مجھے جانے دیں۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

پنچھے شاہ نے پھر بارش کی بات کی۔ "بارش کروا دے اور چلا جا۔"

رجنی کمار نے مہاویر سے کہا۔ "آپ لوگوں نے مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے۔ میں کس طرح بارش کروا سکوں گا۔"

کاشت کار ابھی تک ہال ہی میں بیٹھا تھا۔ پنچھے شاہ اچانک اٹھے اور بڑی پھرتی سے کاشت کار کو پکڑ کے رجنی کمار کے پاس لے گئے۔ "اس نے تو دیکھا تھا۔ اب تو ان سب کو بھی دکھا دے۔ اپنا بائیسکوپ... اچھر نہیں نام بتا' مت نہیں جگہ دکھا۔"

رجنی کمار کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ اس کی کیفیت اس کو بے حال اور بے بس کرنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کی توانائی سلب کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مسہری پر لیٹ گیا۔ سرہانے گاؤ تکیہ رکھا تھا' سر اس پر ٹک گیا۔

اس کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں اور منہ سے جھاگ جاری ہو گئے۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے اور یہ بے بسی کی کیفیت ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔

مہاویر نے گھبرا کے کہا۔ "شاید اس نے کچھ کھا لیا ہے۔ دادی ماں' اب کیا ہوگا؟ ٹھاکر... چاچا تو قیامت کھڑی کر دیں گے۔"

دادی ماں بھی بہت پریشان نظر آ رہی تھیں' حیرت سے پنچھے شاہ کو دیکھا اور رحم طلب لہجے میں کہا۔ "شاہ صاحب! کچھ کریں

ورنہ یہ خاندان برباد ہو جائے گا۔"

مہاجر کی ماں نے کہا۔ "یہ بھی ٹھاکر... کی سازش لگتی ہے۔ شاید اس نے ہمارے کسی آدمی کو پیسے دے کر خرید لیا ہے اور اسی سے اس کو سنکھیا کھلوا دی۔ ٹھاکر... تو ہم پر قتل کا مقدمہ کروے گا۔"

رجنی کمار کی دونوں باہنوں سے جھاگ نکل نکل کے گاؤ تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

پنچے شاہ نے کہا۔ "بائیسکوپ شروع۔"

پنچے شاہ کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں۔ ان سب نے بھی اسی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کاشت کار چلایا۔ "ہاں بدری اسی طرح زمیندار کو لے گیا تھا' بالکل اسی طرح' یہ دیوار پر بائیسکوپ کہاں سے آگیا؟"

ان سب نے دیکھا کہ دو صحت مند آدمیوں نے زمیندار کو پکڑ لیا' تیسرے نے لگام کی طرح منہ میں انگوچھا پھنسا کے باندھ دیا۔

بدری نے دو سروں کی مدد سے زمیندار کو جیپ میں ڈال دیا اور جیپ راج نگر کی طرف روانہ ہو گئی اور پھر یہ جیپ ٹھاکر کی کوٹھی کے پھاٹک پر رکی۔ پھاٹک کھلا اور جیپ اندر داخل ہو گئی۔

مہاجر نے بے ساختہ کہا۔ "یہ ٹھاکر... چاچا کی کوٹھی ہے اور ٹھاکر ہی پتا جی سے کچھ کہہ رہے ہیں۔"

سبھی حیران تھے کہ وہ یہ کیا دیکھ رہے ہیں مگر ان کی نظریں دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔

ان سب نے زمیندار کو کوٹھی کے بالائی حصے میں لے جاتے دیکھا۔ وہاں ایک کمرے میں زمیندار ٹھاکر سے خوشامدانہ انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور ٹھاکر کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔

دادی ماں نے پنچے شاہ سے پوچھا۔ "شاہ صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

پنچے شاہ نے جواب دیا۔ "بڑھیا پاگل ہے۔ بائیسکوپ دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔"

پھر ان لوگوں نے بدری کو بھی زمیندار کے کمرے میں دیکھا۔

بدری بھی خوشامدانہ انداز میں ٹھاکر سے کچھ کہہ رہا تھا اور ٹھاکر کی آنکھوں میں خشونت نظر آ رہی تھی۔

پھر اچانک ٹھاکر جی نے زمیندار کو مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ زمیندار لہولہان ہو گیا۔

بدری بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ ٹھاکر جی نے بدری کو بھی کسی سے پٹوایا۔ اس شخص کے ہاتھ میں لوہے کا رولر تھا اور اس رولر سے اس نے بدری کے ہاتھ پاؤں کے جوڑ توڑ دیے۔ وہ چیخ رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی پھر اس شخص نے زمیندار کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے اور آخری بار سر کے پچھلے حصے میں زوردار ضرب لگائی۔ زمیندار چکرا کے فرش پر گر گیا۔

ٹھاکر جی نے خود بھی دونوں کے کئی لاتیں رسید کیں پھر منظر بدلا اور دونوں کی لاشیں الگ الگ دو صندوقوں میں بند کی گئیں۔ ان سب نے دیکھا یہ دونوں صندوق جیپ پر کہیں جا رہے ہیں۔ دونوں صندوقوں کے پاس ٹھاکر رتن لال بیٹھا نظر آیا۔

جیپ بھاگتی رہی اور پھر دونوں صندوق دریا میں پھینک دیے گئے اور رتن لال جیپ کو کوٹھی میں واپس لایا۔

یہ مناظر وہ سب دیکھتے رہے۔ انہیں اتنا ہوش بھی نہیں رہا کہ ان واقعات پر کوئی تبصرہ کرتے' رائے دیتے یا چیختے چلاتے۔

پھر اچانک دیوار پر تصویریں غائب ہو گئیں۔ ان سب کو جیسے ہوش سا آنے لگا۔

پنچے شاہ بڑبڑا رہے تھے۔ "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اچھر نہیں نام بتا' مست نہیں جگہ دکھا۔"

دادی ماں نے غصے میں کہا۔ "مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ میرے بیٹے کو ٹھاکر نے مارا ہے۔"

مہاجر نے کہا۔ "اے کاش! مجھے اس کا اس وقت علم ہو گیا ہوتا جب وہ قاتل یہاں آیا تھا۔ میں اسے قتل کر دیتا۔"

مہاجر کی ماں رو رہی تھی۔ "ظالموں نے کتنی بے دردی سے مارا ہے۔"

دادی ماں نے کہا۔ "افسوس کہ ہم نے شاہ صاحب کے طفیل یہ جو کچھ دیکھا ہے اس پر ہمارے بیان سے پولیس اور عدالت کو یقین نہیں آئے گا۔"

کاشت کار دم بخود بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے' آہستہ سے کہا۔ "یہ تو صاف قتل کا کیس ہے۔"

دادی ماں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ جو کچھ انہیں دکھائی دیا ہے اس کا رجنی کمار سے کوئی تعلق ہے۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہی تھیں کہ رجنی کمار کو سنکھیا کھلا دی گئی ہے اور اس کا دم نکل رہا ہے۔ انہوں نے پنچے شاہ سے کہا۔ "شاہ صاحب! اس مصیبت سے ہمارا پیچھا چھڑائیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ ٹھا... پولیس لے کر آ رہا ہو گا اور ہماری حویلی سے اپنے آدمی کی لاش... برآمد کروا کے ہم سب کو بند کروا دے گا۔"

مہاجر نے جوش میں آ کے دادی ماں کو تسلی دی۔ "آپ بالکل نہ ڈریں۔ میں تو اس کو پھونک کے اس کی راکھ دریا میں بہا دوں گا۔ آئے تلاشی لینے' ہمیں کیا پتا کہ رجنی کمار کہاں چلا گیا۔ وہ تو ٹھاکر جی کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔"

مہاجر کی ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ کرنا ہے' جلدی کرو۔ کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔"

پنچے شاہ نے رٹ لگا دی۔ "سمندری آدمی' اکیلا رہے' اکیلا۔"

کاشت کار نے رجنی کمار کو قریب جا کے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے حد خوش ہوا اور مہاجر سے کہا۔ "چھوٹے

ٹھاکر جی' یہ زندہ ہے۔"

مہاجر نے بھی قریب جا کے دیکھا تو رجنی کمار نے پلکیں جھپکائیں۔

پنچے شاہ نے رجنی کمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بائیسکوپ والا آدمی ہے۔ خود بھی دیکھتا ہے' دوسروں کو بھی دکھاتا ہے۔" پھر رجنی کمار کو حکم دیا۔ "اب اٹھ جا۔"

رجنی کمار کو اپنے وجود میں برقی رو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور خلافِ معمول اس کی قوت بہت جلد بحال ہو گئی۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

اس منظر نے سبھی کو ضرورت سے زیادہ حیران کر دیا اور وہ سب یہی سمجھتے رہے کہ پنچے شاہ نے مرتے ہوئے رجنی کمار کو جلا دیا ہے۔

پنچے شاہ "پیالہ بھر گیا ہے' اب چھلک بھی جا" کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ان لوگوں نے عافیت اسی میں جانی کہ رجنی کمار ان کے پاس رہنے دیا جائے۔

دادی ماں نے حکم دیا۔ "اب اٹھ جا' میرے ساتھ آ۔"

رجنی کمار نے اٹھتے ہوئے ہاتھوں سے جھاگ پونچھا اور چپ چاپ دادی ماں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

یہ سب ہال میں داخل ہو گئے۔

مہاجر نے رجنی کمار سے پوچھا۔ "یہ تو نے خود کھائی تھی یا کسی نے دھوکے سے کھلا دی تھی؟"

رجنی کمار بولنے میں نقاہت محسوس کر رہا تھا' کمزور آواز میں جواب دیا۔ "کیا چیز کھائی تھی' آپ کیا سمجھے؟"

دادی ماں نے کہا۔ "سنکھیا۔ سچ بتا کہ اگر اپنے کسی نوکر نے کھلائی تھی تو اس کا نام بتا۔ مہاجر اس کی کھال ادھیڑ دے گا۔"

رجنی کمار نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ "مجھے کسی نے بھی سنکھیا نہیں دی۔"

دادی ماں نے غصے میں پوچھا۔ "تو کیا تو نے خود کھائی تھی؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "میں نے خود بھی نہیں کھائی تھی۔"

دادی ماں گرجنے لگیں۔ "بکواس بند کر' نہ خود کھائی تھی نہ کسی نے کھلائی تھی پھر تیرا منکا کیوں ڈھلک رہا تھا۔"

مہاجر نے بھی نرمی سے سمجھایا۔ "دیکھ رجنی کمار! اگر تو نے ٹھاکر جی کی کسی ہدایت پر عمل کیا تھا اور ہمارے خاندان کو پھنسوا دینے کا کوئی منصوبہ تھا تو' تو مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دے ورنہ یہ کچھ لے کہ دادی ماں تو تجھ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دے رہی ہیں مگر میں تجھ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ ٹھاکر جی تیرا سات دن تک انتظار کریں گے اور پولیس اس سے پہلے ہی تجھ سے سب کچھ اگلوا لے گی۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں کہ میں نے سنکھیا نہیں کھائی تھی۔ میں تو اس وقت ہوں کہ پنچے شاہ کے حکم دیتے ہی مجھ پر یہ کیفیت کس طرح طاری ہو گئی۔"

مہاجر کی ماں نے کہا۔ "یہ عجیب باتوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ اپنے کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "سچ ہے۔ آپ لوگوں کو جب تک پوری بات نہ بتائی جائے' میری اس کیفیت کے بارے میں آپ لوگ کچھ بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔"

اور اس کے بعد رجنی کمار نے بالتفصیل سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ "نہ تو میں نجومی ہوں اور نہ جوتشی۔ مجھے کبھی بھی مستقبل کا حال اسی کیفیت اور دورے کے زیرِ اثر معلوم ہو جاتا ہے۔ میری یہ ماورائی قوت اختیاری نہیں ہے۔ ٹھاکر جی نے اسی لئے مجھے رکھ لیا کہ انہیں پیش آنے والے واقعات کا قبل از وقت علم ہو جاتا ہے۔"

وہ سب رجنی کمار کی باتیں بچوں کی طرح دلچسپی سے سنتے رہے۔ دادی ماں نے کہا۔ "اب ہمیں زیادہ بے وقوف نہ بنا۔ تیری ان باتوں پر کون یقین کرے گا۔"

رجنی کمار نے پنچے شاہ کے حوالے سے بات کی۔ "کیا آپ لوگوں نے نہیں سنا کہ پنچے شاہ مجھے بائیسکوپ والا آدمی کہہ رہے تھے اور مجھے مسلسل حکم دے رہے تھے کہ اچھر نہیں نام بتا' مست نہیں جگہ دکھا۔ میں نے بے اختیاری میں وہ سب کچھ دکھا دیا جو پنچے شاہ دکھانا اور بتانا چاہتے تھے۔ اب آپ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔ میں وہاں بھی یہی بیان دوں گا مگر آپ لوگوں نے جو کچھ دیکھا ہے' میں وہ تھانے دار کو نہیں دکھا سکوں گا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "ابھی پولیس کو خبر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خود تھکا تھکا معلوم ہوتا ہے۔ اسے اس کے کمرے میں پہنچا دے۔ یہ کچھ دیر آرام کر لے۔ دو چار گھنٹے بعد اس سے بات کروں گی۔"

مہاجر' رجنی کمار کو اس کے کمرے کی طرف لے کر چلا تو دادی ماں نے اشارے سے مہاجر کو بلایا اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ "کمرے کو باہر سے بند کر دینا۔ کہیں یہ چپکے سے بھاگ نہ جائے۔"

اس دوران میں کاشت کار' رجنی کمار کو اس کے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یار تم تو سچ مچ کے بائیسکوپ والے ہو۔ کچھ ہمیں بھی دکھاؤ' میں تمہارا چیلا بننے کو تیار ہوں۔"

مہاجر کو اپنے قریب دیکھ کر کاشت کار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! مچ کہتا ہوں مزہ آ گیا۔ ٹھاکر جی کے بدری نے اپنے زمیندار کو بالکل اسی طرح قابو میں کیا تھا۔"

مہاجر نے رجنی کمار کو کمرے کے اندر پہنچا دیا اور کہا۔ "اب تو چند گھنٹے آرام کر' میں ذرا آ کے تجھے دادی ماں کے پاس لے جاؤں

گا۔"

مہاہیر نے باہر نکل کے کمرے کو مقفل کردیا۔ کاشت کار نے پوچھا۔ "تو چھوٹے ٹھاکر اب میں جاؤں؟"

مہاہیر نے جواب دیا۔ "دادی ماں سے مل لے۔"

یہ دونوں ہال میں پہنچے تو وہاں دادی ماں مہاہیر کی ماں سے باتوں میں مشغول تھیں۔ انہوں نے رجنی کمار کی باتوں پر یقین کرلیا تھا۔ دادی ماں نے پھر بھی مہاہیر کو تھانے بھیج دیا اور کہا۔ "اس معاملے میں تھانے دار سے بات کر۔ دیکھ وہ کیا کہتا ہے۔"

کاشت کار نے دادی ماں سے پوچھا۔ "میں جاؤں؟"

دادی ماں نے حکم دیا۔ "ابھی تو تو مہاہیر کے ساتھ تھانے جا۔ یہاں شاید تیری ضرورت پیش آئے۔"

مہاہیر تھانے دار سے ملا اور اسے ساری تفصیل بتائی تو تھانے دار نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ "تو وہ نوجوان آپ کی حویلی میں موجود ہے۔"

مہاہیر نے جواب دیا۔ "ہاں' میں اسے کمرے میں مقفل کر آیا ہوں۔"

تھانے دار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! اس نوجوان کا تو بڑا چرچا ہے۔ راج نگر کا تھانے دار اس کا کئی بار ذکر کرچکا ہے اور اس نے ٹھاکر جی سے اس کو دو ایک دن کے لئے مانگا بھی تھا مگر ٹھاکر جی نے صاف انکار کردیا تھا۔ اسے ٹھاکر جی نے ایک ہفتے کے لئے آپ کی حویلی میں چھوڑ دیا' مجھے تو حیرت ہے۔"

مہاہیر بھی ان انکشافات سے حیران ہو رہا تھا۔ تھانے دار نے کہنے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اس نوجوان سے اسی وقت ملوں گا۔ آپ لوگوں کے طفیل میں بھی خوش قسمت کہلاؤں گا کہ میں نے اس انجوبۂ روزگار نوجوان کو دیکھ لیا۔"

تھانے دار مہاہیر کے ساتھ حویلی آیا۔

کاشت کار اکتایا ہوا تھا' حویلی کے پھاٹک پر پوچھا۔ "تو چھوٹے ٹھاکر! اب میں جاؤں؟"

تھانے دار نے اس کو ڈانٹ دیا۔ "کیا جاؤں جاؤں کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تو ہی تو زمیندار کے اغوا کا واحد چشم دید گواہ ہے۔ تجھے تو میں حوالات میں بند کروں گا۔"

کاشت کار ڈر گیا اور بھیگی بلی کی طرح دونوں کے پیچھے پیچھے حویلی میں داخل ہوا۔

تھانے دار کو ہال میں بٹھایا گیا۔

دادی ماں اور مہاہیر کی ماں بھی آگئیں اور رجنی کمار پر گفتگو چھڑ گئی۔

تھانے دار نے دونوں عورتوں کو بھی رجنی کمار کے بارے میں بتادیا اور مہاہیر سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ اس کو یہاں لائیں تو سہی۔"

مہاہیر' رجنی کمار کو لینے چلا گیا۔ تھانے دار نے دادی ماں کو بتایا۔ "آپ لوگ تو خوش قسمت ہیں کہ ٹھاکر جی اپنی یہ قیمتی چیز اپنی مرضی سے یہاں چھوڑ گیا ورنہ اسے تو وہ بلی کے گوکی طرح چھپاتا ہے۔"

دادی ماں نے پوچھا۔ "یہ تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ میرے بیٹے کو ٹھاکر جی نے اغوا کروایا اور اسی نے بدری سمیت میرے بیٹے کو مروا دیا اور اپنے بھتیجے کے ذریعے دونوں لاشیں دریا میں پھکوا دیں۔ کیا ہم ٹھاکر جی پر مقدمہ چلا سکتے ہیں؟"

تھانے دار نے کہا۔ "ناممکن' اگر یہ معاملہ عدالت کو بھی دکھلا دیا جائے' تب بھی ٹھاکر جی پر مقدمہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔"

مہاہیر رجنی کمار کو ساتھ لیے ہوئے ہال میں داخل ہوا۔

تھانے دار کو دیکھ کر رجنی کمار ڈر گیا۔

تھانے دار نے اس عجیب و غریب شے کو گھورا تو رجنی کمار کو یقین ہوگیا کہ اس نے جو کچھ دیوار پر دیکھا یا دکھایا ہے اس سے پولیس کیس بن چکا ہے اور رجنی کمار کو گواہ کی حیثیت سے پولیس اپنی تحویل میں لے لے گی۔ رجنی کمار نے تھانے دار کی خوشامد کی۔ "تھانے دار صاحب! میں آپ کو قسمیہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب نے جو دیوار پر دیکھا ہے اس کا مجھے پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔"

تھانے دار نے کہا۔ "میں تجھ کو تو اپنے ساتھ لے جاؤں گا کیونکہ مجھے تو تیری تلاش تھی۔"

مہاہیر نے پوچھا۔ "لیکن تم اسے کیوں لے جاؤ گے؟"

دادی ماں نے بھی مخالفت کی۔ "میں اس کو حویلی سے باہر نہیں جانے دوں گی۔"

مہاہیر کی ماں نے بھی مخالفت کی اور کہا۔ "یہ اس حویلی میں ٹھاکر... کی امانت ہے۔ یہ اگر تم لوگوں کے بہتے چڑھ گیا تو ٹھاکر... اس حویلی سے بیر باندھ لے گا اور پتا نہیں وہ ہمیں کس کس طرح پریشان کرے۔"

مہاہیر نے تھانے دار کو سمجھایا۔ "تھانے دار صاحب! ٹھاکر... کو اس دن دیکھا تھا۔ وہ خم کو یہاں دیکھ کر کتنا برہم ہوا تھا۔ اب اگر تم رجنی کمار کو یہاں سے لے گئے تو پتا نہیں ہم لوگوں کے خلاف کیسی مصیبت کھڑی کردے۔ ہاں اگر رجنی کمار سے ہمیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو یعنی ٹھاکر... پر رجنی کمار کی مدد سے قتل کا مقدمہ قائم ہوجائے تو رجنی کمار کو تمہارے حوالے کرنے کے بارے میں کچھ سوچیں بھی۔"

تھانے دار نے کہا۔ "آپ لوگ ٹھاکر... سے ڈرتے ہیں۔ ایک ذرا ہمت سے کام لیں تو اس کے خلاف قتل کا مقدمہ بھی قائم ہوسکتا ہے۔ اس طرح ڈرتے رہنے سے ٹھاکر... اور شیر ہوجائے گا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "اپنے پہنچے شاہ نے ٹھاکر... کے خلاف پیش گوئی کردی ہے۔ اگر وہ اشارتاً بھی یہ کہہ دیں کہ رجنی کمار کو تمہارے حوالے کردیا جائے تو میں اسے تمہارے حوالے کردوں

گی۔"

تھانے دار ہنسنے لگا۔ "آپ لوگ بہت کمزور عقیدے کے لوگ ہیں۔ وہ ننگ دھڑنگ پاگل انسان جسے کپڑے پہننے تک کا ہوش نہیں' بارہ بارہ کوس تک اس کی دور رس عظمت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ آپ لوگ اس دیوانے پر ایمان رکھتے ہیں' کمال ہے۔"

مہاہیر نے تھانے دار کو منع کیا کہ وہ بلاوجہ پہنچے شاہ کی مخالفت نہ مول لے کیونکہ اگر وہ ناخوش ہوگئے تو تھانے دار کو نقصان پہنچ جائے گا۔

تھانے دار نے کہا۔ "بہرحال' میں آپ لوگوں پر جبر تو نہیں کرسکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر رجنی کمار بچ کے نکل گیا اور آپ لوگ اسی طرح ٹھاکر... سے ڈرتے رہے تو کسی نہ کسی دن ٹھاکر... اس خاندان کو کوئی غیر معمولی نقصان پہنچا جائے گا۔"

مہاہیر نے پوچھا۔ "اچھا اگر ہم رجنی کمار کو تمہارے حوالے کردیں تو تم اس سے کیا کیا اور کس طرح پوچھ گے اور کتنے دن اسے اپنے پاس رکھو گے؟"

دادی ماں نے مہاہیر کو ڈانٹ دیا۔ "جب یہ تھانے دار پہنچے شاہ کو نہیں مانتا اور انہیں پاگل سمجھ رہا ہے تو بات یہیں ختم کردے۔"

تھانے دار نے رجنی کمار سے کہا۔ "تو خوش قسمت ہے جوان ایماندار لوگوں میں آگیا۔ نہ یاد رکھ کہ ٹھاکر... تجھ کو بھی مروا سکتا ہے۔"

تھانے دار نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں مگر اس کی پوری توجہ رجنی کمار پر تھی۔

مہاہیر یہ چاہتا تھا کہ رجنی کمار حویلی کے اندر ہی رہے اور تھانے دار کو اس سے جو کام بھی لینا ہے' یہیں لے۔ اسے تھانے دار پر یہ بھروسا نہیں تھا کہ اگر رجنی کمار کو تھانے دار کے حوالے کردیا جائے تو تھانے دار اس سے مفید مطلب پوچھ گچھ کرنے کے بعد حویلی میں واپس بھی بھیج دے گا۔

تھانے دار یہ چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے جو کچھ دیوار پر دیکھا تھا وہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تب فیصلہ کرے گا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

دادی ماں نے ہال سے متصل کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رجنی کمار سے کہا۔ "تو کمرے میں آرام کر' میں پھر تجھ سے بات کروں گی۔"

رجنی کمار تو یونہی تھانے دار سے ڈرا ہوا تھا۔ دادی ماں کے حکم کو غنیمت جان کے کمرے میں چلا گیا اور اسے اندر سے بند کرکے مسہری پر لیٹ گیا۔

تھانے دار اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوگیا تو مایوسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا تو میں بھی چلتا ہوں۔ جب آپ لوگ خود ہی قاتل کو تحفظ دے رہے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

مہاہیر نے دادی ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تو دادی ماں' تھانے دار صاحب کو جانے دیں؟"

دادی ماں بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ "ہاں اسے جانے دے۔ ضرورت ہوئی تو ہم خود ہی رجنی کمار کو اس کے پاس بھیج دیں گے۔"

مہاہیر نے تھانے دار کو حویلی کے باہر تک پہنچایا اور کہا۔ "ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ٹھاکر جیسے زبردست آدمی سے مقابلہ کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں اور دادی ماں بہت جلد گھبرا جاتی ہیں۔"

تھانے دار نے جاتے جاتے کہا۔ "لیکن ٹھاکر... مہاہیر سنگھ جی! رجنی کمار کو ٹھاکر... کے پاس مت جانے دیجئے گا۔ اسے یہاں سے کہیں اور پہنچا دیں اور ٹھاکر... جب اس کے بارے میں پوچھے تو یہی کہہ دیجئے گا کہ رجنی کمار سات دن بعد چلا گیا تھا۔ اس سے تو ہمیں بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔ وہ گئے آپ کے وہ پہنچے شاہ تو اس پر بھروسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی باتوں پر نہ تو پولیس یقین کرے گی' نہ عدالت' نہ کوئی اور سنجیدہ آدمی۔"

مہاہیر تھانے دار کو چھوڑ کے اندر گیا۔ دادی ماں مہاہیر کا بے چینی سے انتظار کررہی تھیں۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا' دادی ماں نے پوچھا۔ "وہ گیا؟"

مہاہیر نے جواب دیا۔ "ہاں گیا لیکن جاتے جاتے یہ مشورہ دے گیا ہے کہ رجنی کمار کو ٹھاکر کے پاس مت جانے دینا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے کہیں چھپا دو۔ اس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوں گی۔"

دادی ماں نے کہا۔ "تھانے دار کہتا تو صحیح ہے مگر ہم اسے کہاں چھپائیں گے اور اس سے راز کی باتیں کس طرح اگلوائیں گے۔"

مہاہیر نے کہا۔ "دادی ماں کچھ آپ ہی سوچیں۔ ویسے تھانے دار کی یہ بات درست ہے کہ اسے ٹھاکر کے پاس نہ جانے دیا جائے۔"

○☆○

پہنچے شاہ بازار میں کہتے پھر رہے تھے۔ "کٹ گیا ملک کٹ گیا' لوگ بھی کٹ گئے۔ سلیبوں والے چلے گئے۔"

لوگ پہنچے شاہ کی باتیں سن رہے تھے مگر ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھے۔

حویلی میں بھی یہ خبریں پہنچیں کہ پہنچے شاہ ملک اور لوگوں کے کٹنے کی باتیں کررہے ہیں اور سلیبوں والوں کی رخصتی کی خبر دے رہے ہیں۔

ان دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور پاکستان مخالف اخبارات بظاہر پاکستان کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ سیاسی ہندوستانی لیڈر قرارداد پاکستان اور تحریک پاکستان کی سخت مخالفت

کررہے تھے مگر یہی عناصر بالواسطہ طور پر پاکستان کا پروپیگنڈا کررہے تھے۔

دادی ماں نے پہنچے شاہ کی یہ باتیں سنیں تو انہیں بڑا دکھ ہوا اور مہاجر سے کہا۔ "تو پہنچے شاہ کو کسی طرح یہاں لے آ۔ میں ان سے پوچھوں گی کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' اس کی وضاحت تو کریں۔"

مہاجر دیوانہ وار پہنچے شاہ کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں مل نہیں رہے تھے۔ جب وہ تھکا ہارا حویلی میں آیا تو معلوم ہوا کہ پہنچے شاہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔

مہاجر نے پہنچے شاہ کے کمرے میں داخل ہو کے دیکھا۔ وہ یہاں بھی بڑبڑا رہے تھے۔ "سات سمندر پار والا چلا گیا۔ ملک کٹ گیا' لوگ کٹ گئے۔ ملک کٹ گیا' لوگ کٹ گئے۔"

مہاجر نے پہنچے شاہ کی آواز میں کچھ بھراہٹ محسوس کی جیسے وہ رو رہے ہوں۔

مہاجر نے جھک کے پہنچے شاہ کو دیکھا تو ان کی آنکھیں تو بند تھیں لیکن آنکھوں کے گوشوں سے آنسو ابل رہے تھے۔

مہاجر نے آہستہ سے کہا۔ "شاہ صاحب! یہ آپ رو رہے ہیں' کیا ہوگیا؟"

پہنچے شاہ نے آنکھیں کھولیں' مہاجر کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ "میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ آپس میں مت لڑو۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کا احترام کرے۔ سب کچھ لینے کی فکر نہ کرو۔ کچھ لو' کچھ دو مگر وہ جو صلیب والا ہے' وہ تو لڑوائے جائے گا۔ لڑوائے گا اور لڑوا تا رہے گا۔ وہ تو چلا گیا سات سمندر پار' بہت دور مگر اس کے بیٹے اس کا کام کرتے رہیں گے۔ بہت موذی ہے وہ صلیب والا۔ ہم اس سے بھی زیادہ موذی ہیں۔"

پہنچے شاہ کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔ انہیں نیند آگئی تھی۔ وہ سو چکے تھے اور اب ان کے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

مہاجر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا اور کافی دیر بیٹھا رہا۔ تقریباً چالیس پینتالیس منٹ کے بعد پہنچے شاہ اٹھ کے بیٹھ گئے اور مہاجر کو دیکھ کر کہنے لگے۔ "ٹھاکر... اپنی امانت لینے آرہا ہے۔ اسے مت روک' جانے دے۔"

مہاجر پہنچے شاہ کی ان باتوں سے پریشان ہوگیا اور عرض کیا۔ "شاہ صاحب! آپ کو دادی ماں یاد کررہی تھیں۔ اگر آپ کے مزاج میں آئے تو چلیں ورنہ دادی ماں یہیں آکے آپ سے مل لیں گی۔"

پہنچے شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور مہاجر ان کو بات کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ چپ چاپ بیٹھا جواب کا انتظار کرتا رہا۔

آخر پہنچے شاہ کچھ کہے سنے بغیر کھڑے ہوگئے اور مہاجر سے یہ بھی نہیں کہا کہ "چل دادی ماں کے پاس چلتے ہیں۔"

مہاجر ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ حویلی کی طرف جارہے تھے۔ جب حویلی کا دروازہ قریب آیا تو مہاجر نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا تاکہ پہنچے شاہ کو اندر داخل ہونے میں زحمت نہ ہو۔

پہنچے شاہ ہال میں داخل ہوتے ہی متصلہ کمرے میں داخل ہوئے اور رجنی کمار کو خبر سنائی۔ "ظالم آرہا ہے' تجھ کو لینے کے لئے۔ تارا ڈوب گیا زہرہ تارا۔"

مہاجر نے دادی ماں کو خبر دی۔ وہ بھاگی بھاگی ہال میں آئیں اور یہاں سے رجنی کمار کے کمرے میں چلی گئیں۔ رجنی کمار کا ہونق تھا۔ ٹھاکر کی مخالفِ توقع' قبل از وقت آمد کسی خطرے کی علامت تھی۔

اس نے پہنچے شاہ کی خوشامد کی۔ "شاہ صاحب' مجھے ٹھاکر سے بچالیں۔ واقعی وہ بڑے ظالم ہیں۔"

دادی ماں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ رجنی کمار ٹھاکر سے بچنے کی درخواست کیوں کررہا ہے۔

پہنچے شاہ نے پھر وہی پیغام دہرایا۔ "تارا ڈوب گیا' زہرہ تارا۔" اور پھر اچانک دادی ماں سے پوچھا۔ "تو زہرہ تارے کو کیا کہتی ہے' شکر تارا۔"

دادی ماں کا چہرہ بھی فق ہوگیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ زہرہ تارا ڈوب گیا' میں کیا پیغام موجود تھا۔ یہ ایک منحوس پیش گوئی تھی اور پتا نہیں کس کے لئے۔

دادی ماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "شاہ صاحب' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کس کے لئے کہہ رہے ہیں؟"

پہنچے شاہ نے مہاجر سے کہا۔ "وہ آرہا ہے۔ اس سے کہنا تارا ڈوب گیا' زہرہ تارا ڈوب گیا اور دیکھ وہ اپنی امانت لینے آرہا ہے۔ اسے روکنا نہیں' دے دینا اور اس سے کہہ دینا تارا ڈوب گیا' زہرہ تارا ڈوب گیا۔"

دادی ماں کی جان میں جان آئی' پوچھا۔ "کون آرہا ہے شاہ صاحب؟ کس کی امانت کی بات کررہے ہیں؟"

مہاجر نے دادی ماں کو بتایا۔ "آپنے شاہ صاحب ٹھاکر... پرشوتم داس کے آنے کی بات کررہے ہیں۔"

دادی ماں نے پریشان ہو کے پوچھا۔ "یعنی وہ پھر آرہا ہے' کیوں آرہا ہے؟"

رجنی کمار نے ان دونوں کی خوشامد کی۔ "آپ لوگ مجھے کہیں چھپادیں۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

لیکن پہنچے شاہ نے تاکید کی۔ "وہ اپنی امانت لینے آرہا ہے۔ اسے روکنا نہیں' اس کا تارا تو ڈوب گیا۔"

دادی ماں نے کوئی سوال کرنا چاہا مگر پہنچے شاہ نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اسے روکنا نہیں' اس کی امانت ہے' امانت تو وہ لے جائے گا۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

مہاجر اور دادی ماں رجنی کمار کو ہال میں لے آئے' دونوں کو

یقین تھا کہ ٹھاکر کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔

رجنی کمار خوف سے پیلا پڑ گیا تھا' وہ بہت گھبرایا ہوا تھا' کہنے لگا۔ "چھوٹے ٹھاکر! وہ مجھے مروا دے گا ورنہ وہ خود کبھی نہ آتا۔ میرا انتظار کرتا رہتا۔ آنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرور کوئی ایسی بات ہوگئی ہے کہ وہ مجھے لینے خود آرہا ہے۔"

دادی ماں نے رجنی کمار کے لب و لہجے کو بری طرح محسوس کیا' کہنے لگیں۔ "یہ تو اپنے ٹھاکر کے لئے کس قسم کی زبان استعمال کررہا ہے۔ تو تو ہمیں نمک حرام لگتا ہے۔ ٹھاکر... پرشوتم داس کتنے ہی برے سہی مگر تونے ان کا نمک کھایا ہے۔ اس لئے تجھے ان کا احترام کرنا چاہیے۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "آپ لوگ ٹھاکر کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتا ہوں۔ وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ شاید اب میں بھی ان کے ہاتھوں مارا جاؤں۔"

مہاجر نے دلاسا دیا۔ "نہیں' تجھے ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ شاہ صاحب نے تیرے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "ابھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے تو ابھی میں کہہ دیتا ہوں گے۔ مجھے تو اپنی زندگی خطرے میں نظر آرہی ہے۔"

دادی ماں نے کہا۔ "اب تو تُو یہاں سے چلا جائے گا اور پتا نہیں تیرا کیا حشر ہو۔ اب جانے سے پہلے تو اپنے بارے میں کچھ تفصیل سے بتا دے کہ تو ٹھاکر کی تک کس طرح پہنچا اور ٹھاکر نے تجھ کو اپنے ساتھ کیوں رکھ لیا؟"

مہاجر نے سب کچھ جاننے کے لئے محبت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

"دیکھ رجنی کمار! ہم تیرے ہمدرد ہیں۔ پتا نہیں ٹھاکر کب آئیں۔ ہم پہنچے شاہ سے بھی تیری سفارش کریں گے اور امید ہے کہ اگر پہنچے شاہ نے تیرے حق میں دو چار کلمات خیر کہہ دیے تو تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تو پریشان نہ ہو اور دادی ماں نے تجھ سے جو کچھ پوچھا ہے اس کا صحیح صحیح جواب دے دے۔"

رجنی کمار نے رک رک کے اپنی پوری داستان سنادی کہ اسے کس طرح اپنی ماورائی قوت سے اس علاقے میں دو سال برکھانہ ہونے کی بات معلوم ہوئی اور وہ اسے بتانے راج نگر آیا پھر ٹھاکر جی نے اسے اپنی کوٹھی میں بلوالیا اور پھر مختلف اوقات میں اسے اپنی ماورائی قوت سے کیا کچھ معلوم ہوتا رہا اور ٹھاکر جی کی دلچسپی اس کی ذات میں بڑھتی رہی۔ چتوال جی اور وکیل صاحب کا جگیرا' پولیس سے اَن بَن' کمشنر اور کوتوال کی آمد' ان سے ٹھاکر جی کے تعلقات' منشی کے گاؤں میں پیش آنے والے واقعات' وہاں کمہار کے ہاں تیرہ سالہ لڑکی سے ملاقات' جس کے بارے میں یہاں آکے معلوم ہوا کہ وہ ٹھاکر جی کی بھانجی ہے اور مہاجر کی بہن۔

ساری داستان سنانے کے بعد رجنی کمار نے کہا۔ "جب تک ٹھاکر جی میری ضرورت محسوس کریں گے' میں زندہ رہوں گا مگر اب وہ مجھ سے کوئی خطرہ محسوس کریں گے تو میں مارا جاؤں گا۔"

دادی ماں نے پوچھا۔ "تونے کبھی مہاجر کے باپ کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

رجنی کمار نے کہا۔ "دادی ماں' ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں نے صرف انہی باتوں کو جاننا چاہا جن کا تعلق ٹھاکر جی سے تھا لیکن یہاں آکے پہنچے شاہ کی حیرت انگیز قوت نے میرے زرخیز دماغ کو بھی اکسایا جو میں شاید کبھی بھی نہ دیکھ سکتا۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا یا جو لوگوں نے دیکھا وہ اس اعتبار سے نادر واقعہ ہے کہ ابھی تک مجھے اپنی ماورائی قوت سے مستقبل کے حالات معلوم ہوتے رہے تھے مگر یہاں مجھے ماضی میں پہنچادیا گیا کیونکہ میری اس قوت کے پیچھے پہنچے شاہ کی قوت کام کررہی تھی۔"

دادی ماں رجنی کمار کی داستان بہت دلچسپی سے سنتی رہیں اور پھر معلوم نہیں کیا سوچنے لگیں۔ آخر میں مہاجر سے کہا۔ "بیٹے! یہ تو بالکل بے گناہ ہے۔ ہم اس پر ناحق شبہ کرتے رہے۔"

مہاجر نے بھی ہمدردی کی۔ "ہاں اس کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ سیدھا سادہ اور بے گناہ ہے اور اتفاقیہ ٹھاکر جی کے چنگل میں پھنس گیا۔"

دادی ماں نے مہاجر سے کہا۔ "پہنچے شاہ نے اجازت دے دی ہے کہ اسے واپس جانے دیا جائے اس لئے اب اس کی نگرانی بھی بے سود ہے۔"

رجنی کمار نے دادی ماں کی خوشامد کی۔ "آپ پہنچے شاہ سے میرے حق میں دعا کروا دیں ورنہ مجھے اس ظالم پر کوئی اعتبار نہیں۔"

دادی ماں نے مہاجر سے کہا۔ "باہر کمرے میں پہنچے شاہ ہوں تو رجنی کمار کو ان کے حوالے کردے اور کہہ کہ رجنی کمار نے خود کو آپ کے حوالے کردیا ہے۔ اب آپ اسے سلامت رکھیں یا مروا دیں۔"

دادی ماں یہ کہہ کر اندر چلی گئیں اور مہاجر رجنی کمار کو لے کر پہنچے شاہ کے کمرے میں پہنچا۔

پہنچے شاہ اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ مہاجر نے رجنی کمار سے کہا۔ "آپ تو اپنے کمرے میں رہ اور جیسے ہی پہنچے شاہ آئیں' ان کے پاؤں پکڑ لے اور کہہ دے کہ میں نے خود کو آپ کے حوالے کیا۔ آپ زندہ رکھیں یا مروا دیں' میں ہر حال میں خوش رہوں گا۔"

مہاجر چلا گیا اور رجنی کمار نے اپنے کمرے کو اندر سے بند کرلیا۔

○☆○

پہنچے شاہ رات کے پچھلے پہر اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔

رجنی کمار ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ

پہنچے شاہ آگئے ہیں' وہ نہایت پھرتی سے ان کے کمرے میں پہنچا اور پہنچے شاہ کے پاؤں پکڑ لئے۔ "شاہ صاحب! میں نے خود کو آپ کے حوالے کیا۔ آپ مجھے زندہ رکھیں یا مروادیں۔"

پہنچے شاہ نے پاؤں پیچھے ہٹائے اور چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر جی سے ڈرتا ہے' ٹھکرائن سے دوستی کرتا ہے۔ ٹھکرائن سے کہہ کہ وہ تجھے بچائے۔"

رجنی کمار اور زیادہ سہم گیا اور کہا۔ "شاہ صاحب! میری توبہ میں نے تو آپ کے پاؤں پکڑ لئے' اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

پہنچے شاہ نے کہا۔ "تو میرے پاؤں کیا پکڑے گا' پکڑنے والے پکڑ لے گئے۔ زمیندار کو پکڑ لے گئے' بدری کو پکڑ لے گئے۔ ایک کاشت کار بچا تھا' اسے بھی پکڑ لے گئے۔ اب وہ ہم دونوں کو پکڑنے آرہا ہے۔ وہ ہمیں بھی پکڑ لے جائے گا۔"

پہنچے شاہ کو جیسے رٹ لگ گئی۔ ان کی تکرار جاری تھی۔ "کاشت کار کو بھی پکڑ لے گئے' وہ ہمیں پکڑنے آرہے ہیں' وہ ہمیں بھی پکڑ لے جائیں گے۔"

رجنی کمار پہنچے شاہ کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پہنچے شاہ نے بھی اس کو بھگایا نہیں۔ کافی دیر بعد وہ ذرا سی جگہ میں پاؤں سکیڑ کے لیٹ گئے اور رجنی کمار سے کہا۔ "تو بھی یہیں لیٹ جا۔"

رجنی کمار نے پوچھا۔ "شاہ صاحب! میں اپنے کمرے میں جاؤں؟"

پہنچے شاہ ناراض ہوگئے۔ "کتا ہے میں نے خود کو تمہارے سپرد کیا اور پھر پوچھتا ہے میں اپنے کمرے میں جاؤں۔ دو غلا کہیں کا۔"

رجنی کمار کو اشارہ مل چکا تھا کہ پہنچے شاہ نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے اس لئے اب اسے ٹھاکر جی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

ذرا سی چٹائی پر دونوں لیٹ گئے اور کچھ دیر بعد رجنی کمار کو ایسا لگا گویا پہنچے شاہ سو گئے ہیں۔ وہ خود صبح تک جاگتا رہا۔

مندر کے گھنٹوں نے اور مسجد کی اذان نے لوگوں کو بیدار کردیا۔

مہابیر مندر سے سیدھا پہنچے شاہ کے کمرے میں آیا اور یہاں دونوں کو ایک جگہ دیکھ کر کچھ حیران ہوا۔

رجنی کمار پہنچے شاہ کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔

مہابیر نے اشارے سے دوسرے کمرے میں چلنے کو کہا تو رجنی کمار نے منع کردیا اور آہستہ سے کہا۔ "اس وقت میں شاہ صاحب کی سرپرستی میں ہوں اس لئے شاہ صاحب کی اجازت کے بغیر میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا۔"

مہابیر کے چہرے پر رونق آگئی اور آہستہ سے پوچھا۔ "تو گویا بات بن گئی۔"

رجنی کمار نے تائید میں سر ہلایا اور آہستہ سے کہا۔ "ہاں بات بن گئی؟"

پہنچے شاہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے اور پھر بڑبڑانا شروع کردیا۔ "کاشت کار کو بھی پکڑ لے گئے' ہم دونوں کو بھی پکڑ لے جائیں گے۔"

مہابیر نے پہنچے شاہ کو سلام کیا اور پوچھا۔ "کون کس کو پکڑ لے گیا اور اب کون پکڑا جائے گا؟"

پہنچے شاہ نے چیخ کے کہا۔ "وہ پکڑا گیا' زمیندار اور بدری کو دیکھنے والا کاشت کار۔ اسے لوگ پکڑ لے گئے۔ اب ہم بھی پکڑے جائیں گے۔"

پہنچے شاہ بہت غصے میں تھے۔

مہابیر بھی اس خبر سے پریشان ہوگیا کہ اس کے باپ کے اخوا کا چشم دید گواہ کاشت کار بھی پکڑا گیا لیکن شاہ صاحب کے سوا موہن پورے کے کسی اور شخص نے یہ خبر نہیں دی تھی۔

ذرا دیر بعد حویلی کے پھاٹک کی طرف سے ایک نوکر بھاگتا ہوا آیا اور مہابیر سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! پورے موہن پورے میں یہ خبر گونج رہی ہے کہ رات سے وہ کاشت کار بھی غائب ہے جس نے اپنے زمیندار بابو کو اغوا ہوتے دیکھا تھا۔"

مہابیر یہ بری خبر سنانے کے لئے تیز تیز قدم اٹھاتا دادی ماں کے پاس پہنچا اور انہیں بھی یہ بری خبر سنادی۔ مہابیر کی ماں اور دادی ماں کا عجیب حال ہوگیا۔

دادی ماں نے کسی قدر ترش اور شاکی لہجے میں کہا۔ "یہ بھی اسی بھیڑیے کا کام ہے جسے لوگ ٹھاکر پرشوتم داس کہتے ہیں۔ کسی قانون اتنا بے بس کیوں ہے۔ اپنے پہنچے شاہ بھی کچھ نہیں کرتے۔"

مہابیر نے کہا۔ "یہ بری خبر شاہ صاحب ہی نے سنائی اور اب بیٹھے بڑبڑا رہے ہیں کہ وہ ہمیں بھی پکڑ لے جائیں گے۔"

مہابیر کی ماں کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "ہائے رام! تو اب ہم بھی پکڑے جائیں گے۔"

مہابیر نے کہا۔ "شاہ صاحب اپنے کمرے میں بڑبڑا رہے تھے کہ ہم بھی پکڑے جائیں گے' وہ ہمیں نہیں کہہ رہے تھے۔"

دادی ماں نے مہابیر کو ڈانٹ دیا۔ "پاگل ہوا ہے شاہ صاحب کو کون پکڑے گا۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ شاہ صاحب کو پکڑے۔ دیکھ لینا ہم میں سے کوئی نہ کوئی پکڑا جائے گا' اور مہابیر میری بات غور سے سن۔ باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میری شاہ صاحب سے لڑائی ہوگی۔ آخر وہ اس حویلی کی حفاظت کیوں نہیں کرتے۔ راج نگر کا بھیڑیا ایک ایک کرکے ہم سب کو اٹھا لے جائے گا اور شاہ صاحب اپنے لئے کچھ نہیں کریں گے۔"

مہابیر نے زور دیا۔ "دادی ماں! وہ اپنے لئے کہہ رہے تھے کہ ہم پکڑے جائیں گے۔"

دادی ماں نے جلدی جلدی ساری درست کی' پلو سر پر ڈالا اور مہابیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چل میرے ساتھ' آج شاہ صاحب سے فیصلہ

کروا کے رہوں گی۔"

دادی ماں سیدھی پہنچے شاہ کے کمرے میں پہنچیں اور مہابیر کا ہاتھ پہنچے شاہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ "منبھالیں اسے' یہی اپنا وارث بچا ہے مگر راج نگر کا بھیڑیا اسے بھی اٹھالے جانا چاہتا ہے۔"

پہنچے شاہ نے مہابیر کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور بڑبڑانا شروع کردیا۔ "وہ تو ہمیں پکڑنے آرہا ہے۔ کاشت کار کو لے گیا' ہمیں بھی لے جائے گا اور زہرہ تارا ڈوب گیا۔"

دادی ماں اب کسی وہم یا ابہام میں نہیں تھیں۔ پہنچے شاہ نے بات صاف کردی تھی۔

وہ اچانک تیزی سے اٹھے اور بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

دادی ماں نے مہابیر سے کہا۔ "اب تیری جان میں جان آئی ہے لیکن دل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ٹھاکر... پرشوتم داس اپنی امانت لینے آرہا ہے' اسے روکا نہ جائے۔ جانے دیا جائے۔"

تھانے دار کو ہنسی آگئی۔ "آپ لوگ اس دیوانے پر بڑا اعتقاد رکھتے ہیں حالانکہ اسے تو کپڑے پہننے تک کا ہوش نہیں۔ غالباً آپ لوگوں نے ہی اس کو کپڑے پہنائے ہیں۔"

مہابیر نے کہا۔ "تھانے دار! تم پہنچے شاہ کے بارے میں کوئی بات نہ کیا کرو۔ وہ بہت باکمال آدمی ہیں' دوسری باتیں کرو۔"

تھانے دار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ میری باتوں کا برا نہ مانیں کیا پہنچے شاہ نے یہ کہا ہے کہ ٹھاکر... پرشوتم داس رجنی کمار کو لینے آرہا ہے۔"

دادی ماں نے کہا۔ "ہاں انہوں نے ایسا کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس بار ٹھاکر... پہنچے شاہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

تھانے دار کو ہنسی آرہی تھی مگر دادی ماں کے احترام میں ضبط کرگیا۔

تھانے دار نے دادی ماں سے پوچھا۔ "زمیندار کے اغوا کا چشم دید گواہ ایک کاشت کار تھا۔ ٹھاکر جی نے اپنے آدمی معمراجی کے ذریعے اسے بھی اٹھوالیا۔ اب آپ لوگ بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ لوگ کیا کررہے ہیں؟"

مہابیر نے کہا۔ "چشم دید لوگ ایف آئی آر کٹوانے پر تیار ہیں۔ تم ایف آئی آر کاٹو اور کارروائی شروع کردو۔"

تھانے دار نے دادی ماں سے کہا۔ "آپ نے اپنے پوتے کی بات سنی۔ ایف آئی آر کٹوانے کی بات کررہے ہیں۔ کیا یہ ایف آئی آر کٹوانے والے ٹھاکر... پرشوتم داس کے خلاف مقدمے کی پیروی کرسکیں گے؟ ان میں اتنا دم ہے' ان میں اتنی ہمت ہے؟"

دادی ماں نے کہا۔ "غریب نادان ہیں' کچھ سمجھتے نہیں۔ ٹھاکر جی بہت ہی بدمعاش اور شری انسان ہے۔ وہ ان سب گواہوں کو بھی اٹھوالے گا یا انہی کو مجرم قرار دے دے گا۔ یہ تو ایک پیشی بھی نہیں بھگت سکتے۔"

بھی معمراجی کو اپنے آدمی کو لے جاتے دیکھا ہے اور ہم بھری عدالت میں گواہی دینے کو تیار ہیں۔"

تھانے دار نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو تم لوگ تھانے پہنچو' میں دادی ماں سے چند باتیں کرکے آرہا ہوں۔" اور مہابیر سے کہا۔ "آئیں چھوٹے ٹھاکر' اندر چلیں۔ مجھے دادی ماں سے چند باتیں کرنی ہیں۔"

مجمع میں لوگ باتوں میں مشغول تھے۔ وہ ٹھاکر... پرشوتم داس کو برملا برا بھلا کہہ رہے تھے۔

تھانے دار مہابیر کے ساتھ دادی ماں سے ملا اور وہاں پہلا سوال یہ کیا۔ "ٹھاکر... پرشوتم داس کا جادو گر رجنی کمار ہے یا چلا گیا؟"

دادی ماں نے جواب دیا۔ "ابھی ہے۔ پہنچے شاہ کہہ رہے تھے کہ ٹھاکر... پرشوتم داس اپنی امانت لینے آرہا ہے' اسے روکا نہ جائے۔ جانے دیا جائے۔"

تھانے دار کو ہنسی آگئی۔ "آپ لوگ اس دیوانے پر بڑا اعتقاد رکھتے ہیں حالانکہ اسے تو کپڑے پہننے تک کا ہوش نہیں۔ غالباً آپ لوگوں نے ہی اس کو کپڑے پہنائے ہیں۔"

مہابیر نے کہا۔ "تھانے دار! تم پہنچے شاہ کے بارے میں کوئی بات نہ کیا کرو۔ وہ بہت باکمال آدمی ہیں' دوسری باتیں کرو۔"

تھانے دار نے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ میری باتوں کا برا نہ مانیں کیا پہنچے شاہ نے یہ کہا ہے کہ ٹھاکر... پرشوتم داس رجنی کمار کو لینے آرہا ہے۔"

دادی ماں نے کہا۔ "ہاں انہوں نے ایسا کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس بار ٹھاکر... پہنچے شاہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

تھانے دار کو ہنسی آرہی تھی مگر دادی ماں کے احترام میں ضبط کرگیا۔

تھانے دار نے دادی ماں سے پوچھا۔ "زمیندار کے اغوا کا چشم دید گواہ ایک کاشت کار تھا۔ ٹھاکر جی نے اپنے آدمی معمراجی کے ذریعے اسے بھی اٹھوالیا۔ اب آپ لوگ بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ لوگ کیا کررہے ہیں؟"

مہابیر نے کہا۔ "چشم دید لوگ ایف آئی آر کٹوانے پر تیار ہیں۔ تم ایف آئی آر کاٹو اور کارروائی شروع کردو۔"

تھانے دار نے دادی ماں سے کہا۔ "آپ نے اپنے پوتے کی بات سنی۔ ایف آئی آر کٹوانے کی بات کررہے ہیں۔ کیا یہ ایف آئی آر کٹوانے والے ٹھاکر... پرشوتم داس کے خلاف مقدمے کی پیروی کرسکیں گے؟ ان میں اتنا دم ہے' ان میں اتنی ہمت ہے؟"

دادی ماں نے کہا۔ "غریب نادان ہیں' کچھ سمجھتے نہیں۔ ٹھاکر جی بہت ہی بدمعاش اور شری انسان ہے۔ وہ ان سب گواہوں کو بھی اٹھوالے گا یا انہی کو مجرم قرار دے دے گا۔ یہ تو ایک پیشی بھی نہیں بھگت سکتے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "میں تو ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ اگر آپ لوگ کچھ ہمت کر جائیں تو ٹھاکر... پرشوتم داس کی کھٹیا کھڑی ہو سکتی ہے۔"

مہابیر نے پوچھا۔ "ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم نے تو اپنے پتا کے خون کو بھی صبر و ضبط سے گوارا کر لیا۔"

تھانے دار نے کہا۔ "آپ لوگ اور خاص کر دادی ماں ہمت کریں۔ میں انہیں بھی الہ آباد لے چلوں گا' کمشنر سے ملوا بھی دوں گا۔ وہ بہت منصف مزاج ہے۔ ٹھاکر... پرشوتم داس کے خلاف بہت سی شکایتیں بھی پہنچ چکی ہیں۔ دادی ماں بھی اپنا مقدمہ اس کے سامنے پیش کر دیں۔ اگر وہ پسیج گیا تو ٹھاکر... پرشوتم داس کی شامت آجائے گی۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔"

دادی ماں نے انکار کر دیا اور اپنے معاملے کو بھگوان پر چھوڑ دیا۔

مہابیر نے کہا۔ "دادی ماں! آپ ہمت کریں۔ آپ کے ساتھ میں بھی الہ آباد چلنے کو تیار ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کمشنر ہمارا ساتھ ضرور دے گا۔"

دادی ماں نے مہابیر کو ڈانٹ دیا۔ "کیا بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ اگر کمشنر نے ہماری نہ سنی اور ٹھاکر... کو یہ ساری خبریں پہنچ گئیں تو اس وقت ہمارا ساتھ کون دے گا۔ ٹھاکر... تو ہمیں اتنا ستائے گا کہ تم اس کا قبل از وقت تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

تھانے دار نے مایوسی سے کہا۔ "یہی تو مشکل ہے کہ جو ظلم کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں ان میں حوصلہ نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ایک دن کے لئے رجنی کمار کو ہمارے حوالے کر دیں' آپ لوگوں نے یہ بھی نہیں کیا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "ٹھاکر... پرشوتم داس آنے والا ہے۔ وہ واپس چلا جائے پھر میں کچھ کروں گی لیکن خوب سوچ سمجھ کے۔"

تھانے دار نے پوچھا۔ "اس وقت رجنی کمار ہے کہاں؟ ذرا اس سے ملوائیں تو سہی۔"

دادی ماں نے کہا۔ "وہ تو آج چلا جائے گا۔ اس سے مل کے کیا کرو گے۔ کیا وہ ٹھاکر جی کے خلاف کوئی بیان دے سکتا ہے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ ٹھاکر جی کے خلاف کوئی بیان نہیں دے سکتا مگر اس سے مفید مطلب کچھ باتیں ضرور معلوم ہو سکتی ہیں۔"

دادی ماں چڑ گئیں اور اندر جاتے ہوئے کہا۔ "تو حویلی کے باہر جمع ہونے والوں کی خبر لے' کہیں توڑ پھوڑ نہ شروع کر دیں۔"

تھانے دار بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مہابیر سے کہا۔ "دادی ماں ٹھاکر... پرشوتم داس سے بہت ڈرتی ہیں۔ انہیں راضی کرو کہ کمشنر سے مل لیں۔"

مہابیر نے وعدہ کیا۔ "میں دادی ماں کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ واقعی اگر ٹھاکر... پرشوتم داس کے خلاف کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا گیا تو وہ ہم سب کا سانس لینا دوبھر کر دے گا۔"

حویلی کے باہر لوگ جمع تھے۔ تھانے دار نے ان سب کو سمجھایا۔ "یہاں کیوں جمع ہو۔ کوئی تمہارا آدمی اس حویلی میں تو بند نہیں ہے۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ' ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں۔"

تھانے دار چلا گیا۔ پولیس بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔

مہابیر اندر گیا تو دادی ماں نے اس کی خبر لے لی۔ "تو ان پولیس والوں کو نہیں جانتا۔ یہ تھانے دار جو باہر کھڑے غریبوں کی حمایت میں بول رہا تھا' یہی بعد میں ٹھاکر پرشوتم داس کا آلۂ کار بن جائے گا اور ایک ایک کو کاشت کاری کی گمشدگی کے سلسلے میں الزام لگا کے بند کر دے گا۔ ٹھاکر... پرشوتم داس جیسے لوگ تھانے دار جیسے لوگوں سے کام لیتے ہیں۔ مجھے تو اس تھانے دار پر ذرا سا بھی بھروسا نہیں۔"

مہابیر نے کہا۔ "اور دادی ماں! وہ تو کمشنر سے ملاقات کی بات کر رہا تھا۔ وہ تو بڑا اچھا مشورہ تھا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "وہ بڑا خطرناک مشورہ تھا۔ اگر اس کے کہنے سے میں انگریز کمشنر سے ملاقات کرنے چلی جاؤں تو یہی تھانے دار ٹھاکر... پرشوتم داس کو ہماری ساری خبریں پہنچائے گا۔ ہم سے بھی کمائے گا اور ٹھاکر... پرشوتم داس سے بھی۔ اگر میں انگریز کمشنر سے ملنے الہ آباد گئی بھی تو اس کا چرچا نہیں کروں گی۔"

مہابیر دادی ماں کی عقل و فراست کا قائل ہو گیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ دادی ماں کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا۔

تقریباً ڈھائی تین بجے ٹھاکر جی آ گئے۔ اس وقت بھی حویلی کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ تھانے دار نے یہاں چند سپاہی بھی کھڑے کر دیے تھے۔

اس بار ٹھاکر جی کے ساتھ منشی کیدار ناتھ بھی آیا تھا۔ جودھا اور پربھو بھی تھے۔ ٹھاکر جی کی شیورلیٹ میں ڈرائیور کے برابر منشی کیدار ناتھ بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر تنہا ٹھاکر جی بیٹھے تھے۔ ان کے برابر پستول رکھا ہوا تھا اور پشت پر رائفل پڑی تھی۔

ساتھ میں آئی ہوئی جیپ میں جودھا اور پربھو بندوقیں لئے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ دو لٹھیت بھی تھے۔

پھاٹک پر تعینات آدمی نے دادی ماں اور مہابیر کو ٹھاکر جی کی آمد کی خبر دی۔ مہابیر فوراً باہر پہنچا۔

ٹھاکر جی حویلی کے سامنے مجمع دیکھ کر پوچھ رہے تھے۔ "کیا بات ہے؟ یہ مجمع کیسا ہے؟ کیا حویلی میں کچھ ہو گیا ہے؟"

ایک سپاہی نے بتایا۔ "موہن پورے کا ایک کسان گم ہو گیا ہے بس اسی سلسلے میں یہ لوگ جمع ہو گئے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے برا سا منہ بنایا۔ "یہ موہن پورہ والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جب دیکھو کوئی نہ کوئی غائب کر دیا جاتا ہے۔ اب کون غائب ہو گیا؟"

ایک شخص نے چیخ کے کہا۔ "واہ ٹھاکری! مصراجی کے ذریعے آدمی اغوا لیتے ہو اور معصوم بن جاتے ہو۔"

ٹھاکری نے غصے میں شیو ریلٹ کا دروازہ کھولا اور منشی سے کہا۔ "یہ کون ہے اسے پکڑنا تو سہی' جانے نہ پائے۔"

لیکن اتنی دیر میں وہ صاف کو کہیں غائب ہو چکا تھا۔

ٹھاکری نے پولیس والوں سے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے وہ آدمی چاہیے جس نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔"

پولیس والوں نے بھی ٹھاکری کے تیور دیکھے تو چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔ مجمع بھی کم ہونے لگا۔

مہاویر اس بدمزگی کے بعد باہر پہنچا۔ ٹھاکری سے رام رام ہوئی اور وہ ٹھاکری کو گاڑی کے باہر دیکھ کر حیران ہوا۔ ٹھاکری کی تیوری پر بل دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا ٹھاکر جی؟"

ٹھاکری نے بھاگ جانے والے کو کئی موٹی موٹی گالیاں دیں اور کہا۔ "بھیجے! یہ موہن پورے والوں کو مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے کہ یہاں کوئی بھی حادثہ' سانحہ یا جرم ہو' یہاں کے لوگ بے تکلفی سے میرے کسی آدمی کا نام لے دیتے ہیں۔"

مہاویر نے بھانک پر کھڑے ہوئے اپنے آدمی سے پوچھا۔ "تو نے کچھ دیکھا یا سنا کہ کون کیا کہہ گیا؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "میں نے یہ آواز ضرور سنی کہ کوئی ٹھاکری سے کہہ رہا تھا کہ واہ ٹھاکری! مصراجی کے ذریعے آدمی اغوا لیتے ہو اور معصوم بن جاتے ہو۔ یہ کہہ کے وہ بھاگ گیا۔ میں نے تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی کہ وہ کون تھا۔"

مہاویر نے بھانک کھلوایا۔ ٹھاکری شیو ریلٹ میں دوبارہ بیٹھ گئے اور اپنے پاس مہاویر کو بٹھا لیا اور پھر یہ دونوں گاڑیاں اندر داخل ہو گئیں۔

ٹھاکری نے مہاویر سے کہا۔ "تم ابھی لڑکے ہو اور ٹھکرائی کرنا نہیں جانتے ورنہ کس کی مجال تھی کہ حویلی کے سامنے مجمع لگاتا اور اتنی بڑی بات کہہ کے نکل جاتا۔"

مہاویر نے کہا۔ "یہ آپ نے دوبارہ تکلیف کی' کوئی خاص بات؟"

ٹھاکری نے کہا۔ "میں رجنی کمار کو لینے آیا ہوں۔ کسی نے اطلاع دی تھی کہ رجنی کمار موہن پورے سے بھاگ گیا' وہ کہاں ہے؟"

مہاویر نے جواب دیا۔ "پتا نہیں جھوٹی افواہیں کون اور کیوں اڑاتا ہے۔ رجنی کمار حویلی میں موجود ہے۔ وہ کیوں بھاگے گا کیونکہ وہ تو آپ کا بے حد مداح ہے۔"

یہ لوگ ایک بار پھر اسی ہال میں بیٹھ گئے جہاں چند دن پہلے بیٹھے تھے۔

ٹھاکری نے دادی ماں سے شکایت کی۔ "ماں جی! پتا نہیں موہن پورے میں کون ایسا شخص میرا مخالف ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہو' لوگ اس گڑبڑ کے پیچھے میرا نام لیتے ہیں۔ سنا ہے کوئی کاشت کار غائب ہو گیا۔ حویلی کے باہر کوئی شخص میرے آدمی مصراجی کا نام لے رہا تھا کہ اس نے خود مصراجی کو اغوا کرتے دیکھا ہے۔ اب مجھے واپس جا کے مصراجی کو بلوا کے پوچھنا ہے کہ موہن پورے کے لوگ کاشت کار کے اغوا کے سلسلے میں اس کا نام کیوں لے رہے ہیں؟"

دادی ماں نے کہا۔ "پتا نہیں کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اب میں اپنے آدمیوں کو حکم دے دوں گی کہ وہ اپنے ساتھ ہتھیار رکھیں اور کسی دوسرے تعلقے کے کسی آدمی کو واردات کرتے دیکھیں تو جان سے ماردیں۔ عدالت کچہری میں ہم نمٹ لیں گے۔"

ٹھاکری نے آہستہ سے کہا۔ "اچھی تجویز ہے لیکن ماں جی' حکومت انگریز کی ہے۔ آپ بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گی۔"

ٹھاکری کی رسمی خشک میووں سے تواضع کی کئی ٹھرمار بار کسی میں پہلی جیسی گرم جوشی نہیں پائی جاتی تھی۔ ہر کوئی کھچا کھچا سا نظر آتا تھا۔

ٹھاکری نے بھی ان کی بے مہری محسوس کر لی تھی' پوچھا۔ "رجنی کمار کہاں ہے' اسے بلوا دیں؟"

دادی ماں نے مہاویر سے کہا۔ "کسی کو بھیج کے رجنی کمار کو بلوا لے۔"

مہاویر نے رامو کو آواز دی اور کہا۔ "جا بیٹا رجنی کمار کو بلا لا۔"

ٹھاکری نے ملامتی لہجے میں کہا۔ "بزرگ صحیح فرما گئے ہیں کہ گھر کھودتا ہے ہر روز کا آنا جانا۔ صرف دو سری بار آنے سے اتنی تبدیلی میں کمی آ گئی۔"

کسی نے ٹھاکری کی اس طنزیہ بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ٹھاکری کی بڑی بے عزتی ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ ان کا خون کھول رہا ہے اور وہ بہت ضبط و برداشت سے کام لے رہے ہیں۔

رامو رجنی کمار کو بلا لایا۔ ٹھاکری نے رجنی کمار کے سلام کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔ "چلنے کا موڈ ہے؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "اگر آپ تشریف لے چلنے تب بھی میں آ جاتا۔"

ٹھاکری نے کہا۔ "دراصل میں اپنے ایک ضروری کام سے جلالی پور گیا تھا۔ واپسی میں سوچا تجھے بھی لیتا چلوں۔"

کبھی دونوں کی گھنگھو سنتے رہے اور بے تعلق بنے بیٹھے رہے۔

ٹھاکری نے رجنی کمار سے پوچھا۔ "وہ دیوانہ آیا تھا؟"

رجنی کمار نے پوچھا۔ "کیا آپ پہنچے شاہ کی بات کر رہے ہیں؟"

ٹھاکری نے جواب دیا۔ "ہاں' اسی بابڑے کو پوچھ رہا ہوں۔ وہ آیا تھا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "ہاں پہنچے شاہ تشریف لائے تو

تھے۔"

ٹھاکری نے ذرا حیرت سے رجنی کمار کو دیکھا اور پھر دادی ماں اور مہاویر پر اچٹتی نظر ڈالی۔ "تو تو بھی ان لوگوں جیسی باتیں کرنے لگا۔ پہنچے شاہ تشریف لائے تھے یعنی اس حویلی میں پاگل دیوانے بھی آتے نہیں' تشریف لاتے ہیں۔"

دادی ماں نے غصے میں کہا۔ "ٹھاکر... اب بس بھی کرو۔ بہت بکواس کر لی۔ تم پہنچے شاہ کو اٹھائے آئے ہو اور یہ تمہاری زندگی کی سنگین غلطی ہو گی۔"

ٹھاکری حالتِ اشتعال میں فوراً کھڑے ہو گئے اور غصے میں کہا۔ "بڑھیا! یہ تو کسی زبان استعمال کر رہی ہے۔" ٹھاکری نے پستول نکال لیا تھا۔

دادی ماں ذرا بھی نہ گھبرائیں لیکن مہاویر فوراً اندر چلا گیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔

دادی ماں نے نہایت تحمل سے کہا۔ "ٹھاکری! اب اس پستول کو رکھ لو۔ اس کو بہت استعمال کر چکے۔ میرے دو آدمی برابر کے کمرے میں پستول لیے بیٹھے ہیں۔ تم مجھے مارو گے وہ تمہیں مار دیں گے۔ یہ کھیل بیٹھ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

رامو ڈرا سہما کھڑا تھا۔ دادی ماں نے رامو کو حکم دیا۔ "دروازے کو اندر سے بند کر لے ورنہ مہاویر غصے میں آ کے ٹھاکری کو مار دے گا۔"

رامو نے دروازہ بند کر لیا۔ ٹھاکری نے اسی میں عافیت جانی کہ بات کو زیادہ نہ بڑھائیں۔ انہیں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ دادی ماں نے اس بار پہلے سے کچھ انتظام کر رکھا ہے۔

ٹھاکری نے پستول جیب میں رکھ لیا اور کہا۔ "تم لوگوں نے بڑی بڑی بے عزتی کی ہے۔ حالانکہ میں اس حویلی میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ تو نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں اس پاگل کو پکڑنے آیا ہوں جسے تم سب پہنچے شاہ کہتے ہو۔ تیرا یہ الزام تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔"

اندر سے مہاویر دروازہ پیٹ رہا تھا۔ "دادی ماں! دروازہ کھولیں۔ آج میں اس ٹھاکر... کے ٹکڑے کر دوں گا۔"

دادی ماں نے مہاویر کو ڈانٹا۔ "تو اندر رہ۔ میں ٹھاکر... سے خود نمٹ سکتی ہوں۔"

ٹھاکری کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ اگر انہوں نے اب کوئی ذرا سی الٹی سیدھی حرکت کی تو انہیں اس ہال سے واپس جانا نصیب نہ ہو گا۔

انہوں نے اِدھر اُدھر رجنی کمار کو تلاش کیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر ہال سے نکل گیا تھا۔

ٹھاکری نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "بڑی بی! تم نے میری بے عزتی کی۔ یہ اچھا نہیں کیا۔ میں تمہارا مہمان تھا۔ یاد رکھو! کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔"

ٹھاکری ہال سے نکل گئے۔ باہر رجنی کمار کو دیکھ کر گرم ہو گئے۔ "ڈرپوک' بزدل کہیں کا۔ کوٹھی چل' دیکھ تیری کیسی خبر لیتا ہوں۔"

ہال کے باہر حویلی کے احاطے میں آج دادی ماں کے کئی آدمی اسلحہ لئے ٹہل رہے تھے۔ ٹھاکری کو اندازہ ہو گیا کہ اس حویلی کے احاطے میں جو ہتھیار بند نظر آ رہے ہیں ان کے علاوہ بھی کہیں نہ کہیں کچھ لوگ روپوش ٹھاکری اور ان کے آدمیوں کو نشانے پر لئے ہوں گے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ٹھاکری اور ان کے آدمی بارود کے ذخیرے میں پھنس گئے ہوں اور ان کی ذرا سی بے احتیاطی ٹھاکری کو ان کے آدمیوں سمیت بھک سے اڑا دے گی۔

ٹھاکری کے باہر جاتے ہی دادی ماں نے اندر کا دروازہ کھلوا دیا۔ مہاویر کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کہا۔ "تو ابھی بچہ ہے۔ میں ایک بار اس سے دھوکا اٹھا چکی ہوں۔ جب پہنچے شاہ نے اس موذی کی آمد کی خبر دی تھی' میں نے اسی وقت یہ انتظامات کر لئے تھے۔ مجھے اس لئے نہیں بتایا کہ تو نا سمجھ لڑکا ہے اور پہلے سے میرے منصوبے کی خبر مشہور ہو گئی تو یہ چالاک بھیڑیا کوئی واردات کر کے بچ نکلے گا۔"

مہاویر نے کہا۔ "آپ نے مجھے ناحق روکا۔ اس نے آپ کی بے عزتی کی میں تو اس کا خون پی جاتا۔"

دادی ماں نے مہاویر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بڑھیا تو ہوں۔ اب ذرا چھپ کے احاطے کا تماشا دیکھ۔ ٹھاکر... ایک دم گیدڑ بن گیا۔"

دونوں نے حویلی کے احاطے میں ٹھاکری کو اپنی شیو ریلٹ میں بیٹھتے دیکھا۔ انہوں نے رجنی کمار کو بھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ اچانک حویلی کا چھوٹا پھاٹک کھلا اور پہنچے شاہ اندر داخل ہوئے۔

دادی ماں پہنچے شاہ کو دیکھ کر بے چین ہو گئیں اور مہاویر سے کہا۔ "تو یہیں بیٹھ۔ اپنی رائفل سونے پر رکھ دے۔ خبردار میرے پیچھے نہ آنا۔ میں ان سب کو حویلی سے نکال کے واپس آؤں گی۔"

دادی ماں سب کی توقع کے خلاف تیز تیز قدم اٹھاتی شیو ریلٹ کی طرف بڑھیں۔ وہاں ٹھاکری اور پہنچے شاہ میں کوئی بحث چھڑی ہوئی تھی۔

پہنچے شاہ ٹھاکری کے ساتھ جانے پر مصر تھے اور ٹھاکری پہنچے شاہ سے کہہ رہے تھے۔ "میں اس حویلی سے آپ کو نہیں لے جاؤں گا کیونکہ حویلی کی بڑھیا بھاگی چلی آ رہی ہے' مجھ پر آپ کے اغوا کا الزام لگا دے گی۔"

پہنچے شاہ کہہ رہے تھے۔ "نہیں' تجھ پر کوئی الزام نہیں لگائے گا۔ میں نے تو سب کو بتا دیا کہ ٹھاکر... ہمیں لینے آ رہا ہے۔ میں تو تیرے ساتھ ضرور جاؤں گا۔"

دادی ماں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کس بات کا جھگڑا ہے؟"

ٹھاکری نے سر گاڑی کے باہر نکالا اور دادی ماں سے کہا۔

"اسے روکو! میرے ساتھ جانے کو کہہ رہا ہے۔ اگر اسے لے گیا تو تم لوگ مجھ پر اس دیوانے کے اغوا کا بھی الزام لگا دو گے۔"

پنچے شاہ نے زور زور سے گاڑی کا دروازہ پیٹا۔ "دروازہ کھول' کھول دروازہ۔ تو لینے آیا ہے' میں تو چلوں گا۔ زہرہ تارا ڈوب گیا۔ دروازہ کھول' میں تو چلوں گا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "اگر پنچے شاہ ساتھ جانے کی ضد کر رہے ہیں تو انہیں اپنے ساتھ لے جا۔ پنچے شاہ کا کوئی کنبہ ہے نہ کوئی خاندان' ان کے اغوا کا کون الزام لگائے گا۔ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کہیں بھی آئیں جائیں۔"

ٹھاکر جی نے منشی کیدار ناتھ کو آہستہ سے حکم دیا۔ "انہیں اپنے پاس بٹھا لے۔" اور دادی ماں سے کہا۔ "بڑھیا' یہ اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔ مجھ پر اس کے اغوا کا الزام نہ لگانا۔"

حویلی کا بڑا پھاٹک کھل گیا اور ٹھاکر جی کی شیورلیٹ اور جیپ باہر نکل گئی۔ پھاٹک دوبارہ بند ہو گیا۔

دادی ماں نے اسلحہ برداروں کو حکم دیا۔ "تم سب اب اس حویلی میں پہرا دیتے رہو کیونکہ اس بھیڑیے کا کوئی بھروسا نہیں کہ اچانک آئے اور واردات کر کے بھاگ جائے۔"

ایک پہرے دار کو پنچے شاہ کے جانے کا بڑا دکھ تھا۔ اس نے دادی ماں سے کہا۔ "ٹھکرائن! کہیں وہ پنچے شاہ کو بھی نہ مار دے۔ ٹھاکر... بڑا ظالم ہے۔"

دادی ماں نے بے نیازی سے کہا۔ "نہیں' وہ پنچے شاہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پنچے شاہ کئی دن سے رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ 'چالا بھر گیا۔ چھٹکنے کی دیر ہے۔ کیلا رہے اکیلا۔' اب تو وہ مسلسل کہہ رہے تھے کہ تارا ڈوب گیا۔ زہرہ تارا ڈوب گیا۔"

○☆○

ٹھاکر جی کچھ دیر تو خاموش رہے کیونکہ اب ان کو دادی ماں کے علاقے سے گزرتے ہوئے یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں کسی طرف سے ٹھاکر جی پر حملہ نہ کر دیا جائے۔ دادی ماں نے ٹھاکر جی کو بتا دیا تھا کہ انہوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا ہے کہ ہر وقت وہ مسلح رہیں اور جہاں کہیں کسی کو اغوا ہوتے دیکھیں' فائر کھول دیں۔ ٹھاکر جی کو اس پر حیرت تھی کہ دادی ماں نے پنچے شاہ کو لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور اب اندیشہ تھا کہ ٹھاکر جی پر اغوا کا الزام لگا کے ان پر کسی طرف سے اچانک حملہ کروا دیا جائے۔

لیکن جب وہ اپنے علاقے میں داخل ہو گئے تو انہوں نے دادی ماں' مہاجر اور موہن پورہ والوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے رجنی کمار کو دو طمانچے لگائے اور کہا۔ "مجھے اس بڑھیا کے پاس لاوارث چھوڑ کے باہر نکل گیا تھا۔"

پنچے شاہ نے پلٹ کے رجنی کمار کو دیکھا اور ٹھاکر جی سے کہا۔ "بائیسکوپ والے کو کیوں مارتا ہے؟"

ٹھاکر جی نے منشی کیدار ناتھ سے کہا۔ "اس پاگل کو پکڑ کے بیٹھ۔ اس سے کہہ کہ یہ پیچھے مڑ کے نہ دیکھے۔"

منشی کیدار ناتھ پنچے شاہ کا ذکر سن چکا تھا اور وہ پنچے شاہ کی روحانی قوت سے ڈرتا تھا' اب سے عرض کیا۔ "شاہ صاحب! سیدھے بیٹھیں' پیچھے مڑ کے نہ دیکھیں۔"

پنچے شاہ نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "دو طمانچے لگا دیے۔ سنسکاری آدمی نہیں جانتا کہ زہرہ تارا ڈوب گیا۔"

ٹھاکر جی "زہرہ تارا ڈوب گیا" کے برے مفہوم سے خوب واقف تھے۔ وہ شیورلیٹ میں دورانِ سفر میں پہلی بار پنچے شاہ سے ڈرے تھے۔

انہوں نے مظلوم اور مسکین صورت بنائے افسردہ رجنی کمار سے آہستہ سے پوچھا۔ "حویلی میں بڑھیا یہ کیا کہہ رہی تھی کہ پنچے شاہ نے ان سب کو پہلے سے بتا رکھا ہے کہ میں پنچے شاہ کو اغوا کر جاؤں گا؟"

رجنی کمار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! یہ پنچے شاہ سچ مچ وہاں سب کو بتا چکے تھے کہ ٹھاکر جی مجھے یعنی رجنی کمار کو لینے آ رہے ہیں اور آپ میرے ساتھ پنچے شاہ کو بھی لے جائیں گے۔"

ٹھاکر جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تو یہ پنچے شاہ اتنے خطرناک آدمی ہیں۔ مجھے بھی ان کا احترام کرنا چاہیے۔"

رجنی کمار نے اپنی رائے نہیں دی اور کہا۔ "آپ ٹھہرے ٹھاکر جی' راج نگر کے بہت بڑے ٹھاکر۔ کوئی آپ کو کیا مشورہ دے گا لیکن پنچے شاہ سے آپ نہ الجھیں۔"

ٹھاکر جی نے آہستہ سے کہا۔ "پہلے میں اس کو ٹھیک کر لوں۔" اس کے بعد اس سے نمٹوں گا۔ میں..." ٹھاکر جی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔

رجنی کمار کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔

آگے پنچے شاہ سیٹ پر بیٹھے گنگنا رہے تھے۔

"جی میں آتا ہے لگا دوں آگ کوہِ طور میں
پھر خیال آتا ہے موسیٰ دو بدن ہو جائے گا"

ٹھاکر جی نے پنچے شاہ کا شعر سنا تو سوچ کر رجنی کمار سے پوچھا۔ "یہ کبھی چپ بھی ہو جاتا ہے یا یونہی بولتا رہتا ہے؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! یہ کبھی کبھی زیادہ بولتے ہیں ورنہ چپ ہی رہتے ہیں۔"

پنچے شاہ نے مڑ کے ٹھاکر جی کو دیکھا۔ "موسیٰ تو بے وطن ہو گیا۔ کوہِ طور میں آگ بھی لگ گئی۔ موسیٰ تو بے وطن ہو گیا۔"

ٹھاکر جی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس مخبوط الحواس شخص کی باتوں نے ٹھاکر جی کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹھاکر جی نے رجنی کمار سے پوچھا۔ "کبھی اس پاگل کے بارے میں بھی تیری ماورائے عقل قوت نے کچھ بتایا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا لیکن ٹھاکر جی آپ مانیں یا نہ مانیں' پنچے شاہ عجیب و غریب آدمی ہیں۔"

کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے شیورلیٹ رک گئی اور اس کے پیچھے جیپ بھی۔ منشی کیدار ناتھ اتر کے پھاٹک کھلوانے گئے مگر

دربان کالیں پتا نہ تھا۔

ٹھاکر جی نے گاڑی سے اترے اور اپنے آس پاس جمع ہونے والے کارندوں سے پوچھا۔ "یہ دربان کہاں مر گیا؟"

ایک کارندے نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "ٹھاکر جی! آپ نے چھوٹے ٹھاکر کو کہیں اندر بند کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس طرح نکل بھاگے مگر پھر چوکیدار رمضان اور کئی دوسرے آدمیوں نے ان کو پکڑ لیا اور اندر لے جا کر بند کر دیا۔ دربان نے پھاٹک میں بڑے بڑے دو تالے ڈال دیے اور خود کہیں چھپ گیا۔"

ٹھاکر جی کو غصہ آ گیا۔ "جب میں نے اس کو اندر بند کر دیا تھا تو اس کو میرے پیچھے کس نے آزاد کر دیا۔"

کسی کے پاس بھی ٹھاکر جی کے اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

پربھو' جودھا اور منشی کیدار ناتھ دربان کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد دربان باغ کے ایک گوشے سے نمودار ہوا۔ وہ ہانپتا کانپتا دوڑتا ہوا آیا اور ٹھاکر جی کے پاؤں پکڑ لیے۔ "ٹھاکر جی! میں پھاٹک میں تالا لگا کے اس لئے ہٹ گیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر جی حمایتیوں کو لوگ آ گئے تھے اور مجھے حکم دے رہے تھے کہ میں پھاٹک کھولوں۔ میں انہیں دھوکا دے کر اور تالے لگا کر فرار ہو گیا۔"

ٹھاکر جی نے دربان کو ٹھوکریں رسید کیں اور پوچھا۔ "میرے یہ حرام خور کارندے کہاں مر گئے تھے؟"

دربان کے منہ پر ٹھوکر لگنے سے دو دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون جاری ہو گیا مگر اس نے اف تک نہیں کی۔ چپ چاپ اٹھا اور غصے کے عالم میں قفل کھولتے ہوئے جواب دیا۔ "پتا نہیں کہاں مر گئے تھے۔"

ٹھاکر جی نے منشی کیدار ناتھ' جودھا اور پربھو کو حکم دیا۔ "تم لوگ پنچے شاہ کے پاس جاؤ۔ انہیں بھاگنے نہ دینا۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "تو میرے ساتھ آ۔"

اسی وقت ایک طرف سے مہاراجی بھاگتا ہوا آیا اور بدحواسی میں کہنے لگا۔ "ٹھاکر جی! آپ کے بھتیجے بھولا لال جی کے چند غنڈے آئے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس کھڑی تھی۔ یہ غنڈے چھوٹے ٹھاکر سے ملنا چاہتے تھے۔"

ٹھاکر نے کہا۔ "تو میرے ساتھ کوٹھی میں چل۔"

ٹھاکر جی' رجنی کمار اور مہاراجی کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہوئے تو انہوں نے دربان کو بھی اندر بلا لیا اور کہا۔ "پھاٹک کو اندر سے بند کر لے۔ جب تک میں خود کھولنے کا حکم نہ دوں' پھاٹک نہیں کھلے گا۔"

کوٹھی کے کسی گوشے سے پھکو نمودار ہوا۔

ٹھاکر جی نے پھکو کو حکم دیا۔ "مہاراجی کو اوپر زمینداروں والے کمرے میں چھپا دے۔ اسے موہن پورہ میں لوگوں نے پہچان لیا ہے۔ پولیس اس کا پیچھا کر رہی ہے۔"

مہاراجی کا خون خشک ہو گیا' سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "ٹھاکر جی! اب کیا ہو گا؟"

ٹھاکر جی نے غصے میں جواب دیا۔ "ہو گا کیا' کچھ نہیں ہو گا۔ ایک تو یہ کہ تم لوگ جتنے پرانے ہو رہے ہو اتنے ہی بے احتیاط اور عقل سے کورے ہوتے جا رہے ہو۔ ہر کام پھوہڑ پنے اور بے ڈھنگے انداز میں کرتے ہو۔ کسی کو اغوا کرتے ہو تو خود کو پہچنوا بھی دیتے ہو اور جب پولیس پیچھا کرتی ہے تو مجھ سے پوچھتے ہو کہ ٹھاکر جی اب کیا ہو گا۔" مہاراجی چھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پھکو اسے کوٹھی کے عقبی حصے کی بالائی منزل پر لے گیا۔ مہاراجی پھکو کی خوشامد کرنے لگا۔ "پھکو! مجھے بچا لے' ٹھاکر مجھے مروا دے گا۔"

پھکو نے کہا۔ "مت گھبرا' میں تیری سفارش کروں گا۔"

پھکو اسے اوپر بند کر کے اور سفارش کا جھوٹا دلاسا دے کے جان چھڑا کے نیچے آ گیا۔

ٹھاکر جی' رجنی کمار کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے بھتیجے رتن لال کو ایک کمرے میں قید دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا تھا۔

ٹھاکر جی نے رجنی کمار سے کہا۔ "تو اتنے دنوں تک موہن پورے کی حویلی میں کیا کرتا رہا' یہ سب تو میں تجھ سے بعد میں پوچھوں گا۔ فی الحال تو اپنی ماورائے عقل قوت سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر کہ اگر میں اپنے بھتیجے رتن لال کو مروا دوں تو میرے خلاف کوئی ہنگامہ تو نہیں کھڑا ہو گا۔"

رجنی کمار کو ایسا لگا جیسے اس کے قتل کی منصوبہ بندی کی گئی ہو' ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "ٹھاکر جی! رتن لال ایک ناتجربے کار نوجوان ہے۔ اسے آپ نے کچھ بنا دیا ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کا کوئی ولی وارث بھی نہیں پھر اس کی گمشدگی پر ہنگامہ کون کھڑا کرے گا۔"

ٹھاکر جی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے' غصے میں کہا۔ "عجیب احمق آدمی ہے۔ میں کچھ پوچھ رہا ہوں' یہ مجھے مشورے دے رہا ہے۔"

رجنی کمار نے گھبرا کے جواب دیا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ آپ کے سوال کا جواب میرے اختیار میں نہیں ہے۔ کچھ وقت دیجئے۔ جیسے ہی جواب ملے گا' میں آپ کو بتا دوں گا۔"

ٹھاکر جی نے پھکو کو آواز دی۔ پھکو آیا تو اس سے کہا۔ "اسے کوٹھی کے اندر والے پرانے کمرے میں بند کر دے اور اس وقت تک بند رکھ جب تک اسے میرے سوال کا جواب نہ مل جائے۔"

پھکو نے رجنی کمار سے کہا۔ "مہاشے جی! آئیں میرے ساتھ۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "ٹھاکر جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "اب تجھے پتا چلے گا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور آئندہ کیا کروں گا۔ بہت حرام کی روٹیاں توڑ لیں' فراڈیا کہیں کا۔"

پھکو نے رجنی کمار کو کوٹھی کے اندر والے نچلے حصے میں پہنچا دیا اور نرمی سے کہا۔ "تم گھبرانا نہیں۔ ٹھاکر کا غصہ وقتی ہے'

ہانڈی کے ابال کی طرح۔ مجھ سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

اب ٹھاکرجی نے ٹھکرائن کی خیریت اور ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "یہ رتن لال کو کس نے چھوڑ دیا تھا۔ کوٹھی میں میرے بعد تیرا حکم چلتا ہے۔"

ٹھکرائن نے جواب دیا۔ "مجھے کیا پتا کہ اسے کس نے چھوڑ دیا تھا۔ ٹھاکر...! تم مجھے اپنے دھندوں میں مت ڈالو۔ کسی کو قید کردیا، کسی کو مروا دیا۔ ان سارے برے کاموں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

ٹھاکرجی نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کردیا۔ "اب لوگوں کی اتنی ہمت بڑھ گئی ہے کہ میری کوٹھی کے باہر اپنے فنڈے بھیجنے لگے ہیں اور پولیس ان کی دور سے پشت پناہی کرتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ چتوالال نے اتنی ہمت کیسے کی؟"

ٹھکرائن نے غصے میں جواب دیا۔ "مجھے کیا پتا کہ چتوالال نے اتنی ہمت کیسے کی۔ چتوالال کے پاس جاؤ، اس سے یہ سوال کرو۔"

ٹھاکرجی پر دیوانگی کا دورہ پڑا۔ "بکواس کرتی ہے، زبان چلاتی ہے۔ میں سب کو قتل کردوں گا۔ کوٹھی کو آگ لگا دوں گا۔ تجھے کو خاک میں ملا دوں گا۔ آخر تم لوگ سمجھتے کیا ہو۔"

ٹھکرائن پاگل کے سامنے سے ہٹ گئیں اور جاتے جاتے کہا۔ "کوٹھی تمہاری، تعلقہ تمہارا، جو چاہو کرو۔ سب کو لائن میں کھڑا کرکے گولی مارو اور بعد میں خود کو مارلو تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ہی ختم ہوجائے۔"

کوٹھی کی نوکرانیاں بہت سہمی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنی جانیں خطرے میں نظر آرہی تھیں۔

اس وقت ٹھاکرجی ہوش میں نہیں تھے۔ بے تحاشا تیز تیز چلتے ہوئے پھاٹک پر پہنچے اور دربان سے پوچھا۔ "منشی کیدار ناتھ کہاں ہے، اسے بلا۔"

دربان نے چھوٹا پھاٹک کھولنا چاہا تو ٹھاکرجی نے اس کی پٹائی کردی۔ "یہ تجھ سے پھاٹک کھولنے کو کس نے کہا۔"

دربان نے گدی سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "منشی جی باہر ہیں۔"

ٹھاکرجی نے کہا۔ "اچھا کھول پھاٹک۔"

پھاٹک کھل گیا اور ٹھاکرجی پھاٹک کے باہر نکل گئے۔ رجنی کمار کا کمرا کھلا ہوا تھا۔

ٹھاکرجی کو دیکھتے ہی منشی کیدار ناتھ اندر سے نمودار ہوا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "جی ٹھاکرجی!"

ٹھاکرجی نے پوچھا۔ "پنچھے شاہ کہاں ہے؟"

منشی کیدار ناتھ نے جواب دیا۔ "وہ اندر زمین پر آرام کررہے ہیں۔"

ٹھاکرجی نے مشتعل ہوکے منشی کیدار ناتھ کی بھی پٹائی کردی۔ "بول میں نے تجھ سے کیا کہا تھا۔ پنچھے شاہ کو بند کردے اور تو نے انہیں کھلا چھوڑ رکھا ہے۔"

منشی کیدار ناتھ پٹتا رہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے بچاؤ کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ٹھاکرجی! پنچھے شاہ بے ضرر آدمی ہیں۔ خود سے آپ کے ساتھ آئے ہیں، بھاگیں گے کیوں۔"

ٹھاکرجی کو اور غصہ چڑھا۔ اب ہاتھوں کے ساتھ لاتیں بھی کام کرنے لگیں۔ "زبان چلاتا ہے، بحث کرتا ہے، نمک حرام۔ دیوث کہیں کا۔"

منشی کیدار ناتھ پٹ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "ٹھاکرجی! مجھے ماریں اور ماریں خوب ماریں۔ مجھے جان سے ماردیں۔ مجھے دیوث کس نے بنایا، آپ نے۔"

ٹھاکرجی کو مارتے مارتے ایک دم پربھو اور جودھا کا خیال آیا۔ ایک دم پلٹے اور دربان سے پوچھا۔ "یہ جودھا اور پربھو کہاں مرگئے؟"

دربان نے ایک کارندے کو اشارے سے بلایا تو ٹھاکرجی نے دربان کو دو ہاتھ اور رسید کردیے۔ "اشارے کرتا ہے، دوڑ کے بلاتا نہیں ہے۔ خود کو ٹھاکر... سمجھتا ہے۔"

جب کارندہ ڈرتے ڈرتے قریب آیا تو ٹھاکرجی نے خوفناک آواز میں حکم دیا۔ "جودھا اور پربھو کہاں مرگئے، نہیں بلاتا۔"

کارندے نے جواب دیا۔ "ان دونوں کو چتوالال کے ساتھ راج نگر لے گئے۔"

ایسا لگا جیسے جلتی آگ پر پیٹرول ڈال دیا گیا ہو۔

ٹھاکرجی نے حکم دیا۔ "ڈرائیور کو بلاؤ۔ آج میں چتوالال کو مار کے یہ قصہ ہی ختم کردوں گا۔"

ٹھاکرجی بھاگ کے کوٹھی میں گئے اور وہاں پستول اور رائفل تلاش کرنے لگے۔

پچھو یہ سارا تماشا دیکھ بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ اس نے مشتعل ٹھاکرجی کو سمجھایا۔ "ٹھاکرجی! آپ مجھے ماردیں گے، میں آپ کو رائفل اور پستول کے ساتھ باہر نہیں جانے دوں گا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے دشمن آپ سے عقل کی جنگ لڑ رہے ہیں۔"

ٹھاکرجی کو کچھ کچھ ہوش آیا، کہنے لگے۔ "جودھا اور پربھو نے تو کمال ہی کردیا۔ دونوں میرے دشمن چتوالال کے پاس چلے گئے۔"

پچھو نے کہا۔ "ٹھاکرجی! چھوٹا منہ بڑی بات۔ برا نہ مانیں، وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ معاملات کو سمجھیں اور ہوش و حواس سے کام لیں۔"

ٹھاکرجی غصے میں کھول رہے تھے مگر اب جیسے انہیں بریک لگ گیا تھا، کہنے لگے۔ "مجھے ان تمام معاملات کے پیچھے رتن لال کا ہاتھ لگتا ہے۔ اسے اسی وقت میرے پاس لاؤ۔ میں اس سے معلوم کروں گا کہ اس نے کیا کیا چکر چلا رکھے ہیں۔"

پچھو نے کہا۔ "ٹھاکرجی! پہلے آپ اپنے ہتھیاروں کو کمرے سے ہٹائیں۔ اندر ٹھکرائن کو دے دیں کہ وہ انہیں کہیں چھپا دیں۔ اس کے بعد چھوٹے ٹھاکر سے بات کریں۔"

ٹھاکرجی نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "تو مت گھبرا۔ اسے بلا تو سہی میں اسے نہیں ماروں گا۔"

پچھو نیچے گیا اور ٹھاکر رتن لال کو بتایا۔ "چلیں، آپ کو ٹھاکرجی یاد کررہے ہیں۔"

ٹھاکر رتن لال نے غصے میں کہا۔ "ٹھاکرجی سے کہو کہ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ مجھے جانے دیں۔"

پچھو نے ٹھاکر رتن لال کا شانہ پکڑ کے اٹھانے کی کوشش کی۔ "آپ چلیں تو سہی۔ ٹھاکرجی... بہت نرم پڑ گئے ہیں اور آپ کو بڑے پیار سے بلا رہے ہیں۔"

ٹھاکر رتن لال نے اپنے شانے سے پچھو کا ہاتھ ہٹایا۔ "بے وقوف نہ بنا، چاچا جی آدھے پاگل ہیں۔ انہیں تو کسی پاگل خانے میں داخل کروانا چاہیے۔"

پچھو بے حد تجربہ کار آدمی تھا۔ اپنے آس پاس کا جائزہ لیا اور آہستہ سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ یہ کیسی زبان استعمال کررہے ہیں۔ اس طرح تو آپ معاملے کو اور بگاڑ دیں گے۔"

ٹھاکر رتن لال نے کہا۔ "معاملہ تو کب کا بگڑ چکا۔ اب اور کیا بگڑے گا۔ ٹھاکرجی سے کہو ان کو تحفظ داری انی کو مبارک، مجھے یہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دیں۔"

پچھو نے مایوسی سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ ٹھاکرجی کے اوپر نہ جا کے بڑی غلطی کررہے ہیں کیونکہ آپ خوب جانتے ہیں کہ ٹھاکرجی کا حکم نہ ماننے والے کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

ٹھاکر رتن لال نے جواب دیا۔ "خوب جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اب ٹھاکرجی کا حکم کم از کم مجھ پر نہیں چل سکتا۔"

پچھو مشکل میں پڑ چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واپس جا کے ٹھاکرجی کو کیا جواب دے کہ ٹھاکر رتن لال پچھو کی پشت پر دیکھتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

پچھو نے بھی مڑ کے دیکھا تو ٹھاکرجی خود آچکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "تو تم دونوں ابھی باتوں ہی میں مشغول ہو۔"

ٹھاکر رتن لال نے جواب دیا۔ "ٹھاکر... چاچا! رات سے اپنی طبیعت کچھ خراب ہے۔"

ٹھاکرجی نے پچھو سے کہا۔ "تو باہر جا، دیکھ ڈرائیور آیا یا نہیں۔"

پچھو چلا گیا اور ٹھاکرجی نے نرمی سے بھتیجے رتن لال سے پوچھا۔ "مجھے کچھ پتا ہے کہ پربھو اور جودھا کو چتوالال کے آدمی لے گئے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

رتن لال نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ دونوں واپس آئیں تو انہی سے یہ سوال کیجئے گا۔"

ٹھاکرجی کے چہرے کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ بہت برداشت سے کام لے رہے ہیں۔ ٹھاکرجی نے کہا۔ "دیکھ رتن لال! میں اپنے آس پاس کچھ تبدیلیاں محسوس کررہا ہوں۔ ان تبدیلیوں سے تیرا کتنا تعلق ہے، مجھے صرف اتنا معلوم ہوجائے تو میں تجھے شہر واپس بھیج دوں گا۔"

رتن لال نے کہا۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ یقین کریں، میں تعلقے کے ہر معاملے سے لاتعلق ہوگیا ہوں۔ میں اس ماحول سے تنگ آکے واپس جانا چاہتا ہوں۔"

ٹھاکرجی نے کہا۔ "بھتیجے! آج تو جس لب و لہجے اور طمانیت سے مجھ سے بات کررہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کچھ اور ہے۔ مجھے بتا دے کہ اصل بات کیا ہے، میں تجھے نہیں روکوں گا۔"

رتن لال نے کہا۔ "میں نے کہہ تو دیا کہ کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی بات ہے تو اس کا مجھے علم نہیں۔"

پھر رتن لال کچھ دیر خاموش سوچتا رہا اور کہا۔ "مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ کی محبوبہ کرشنا کماری مرگئی اور چتوالال جی نے جودھا اور پربھو کا اسی لئے بلوایا ہے کہ وہ کرشنا کماری کی لاش آپ تک پہنچا دیں۔"

ٹھاکرجی کو ایک جھٹکا اور لگا، کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اس خبر پر یقین نہیں کرسکتا کیونکہ جودھا اور پربھو کو میں نے اتنا اختیار نہیں دیا کہ وہ اپنی مرضی سے کرشنا کماری کی لاش لینے چتوالال کے گھر جائیں۔ بات کچھ اور ہے۔" پھر باہر جاتے ہوئے کہا۔ "میری طبیعت خراب ہے۔ تو آرام کر، اب میں تیری مزاج پرسی کو آدھی رات کے بعد آؤں گا۔"

ٹھاکرجی نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ وہاں منشی کیدار ناتھ، پچھو اور ڈرائیور، تینوں کھڑے ہوئے تھے۔

ٹھاکرجی نے ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی نکال، میں راج نگر جاؤں گا۔"

پچھو نے درخواست کی۔ "ٹھاکرجی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

ٹھاکرجی نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے۔ تو بھی میرے ساتھ چل۔"

منشی کیدار ناتھ نے عرض کیا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

ٹھاکرجی نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔ "تو بھی ساتھ چل۔"

پچھو نے رجنی کمار کو بھی ساتھ لے لیا۔

پچھو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے اور ٹھاکرجی کے کیا ارادے ہیں۔ وہ دوڑا دوڑا رجنی کمار کے پاس گیا اور اسے بھی لے آیا۔

اتنی دیر میں ٹھاکر جی پنچے شاہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ پنچے شاہ نے ٹھاکر جی کو دیکھتے ہی فارسی کا ایک شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

"ہم خدا خواہی ہم دنیائے دوں"

ایں خیال است و محال است و جنوں"

(ہم خدا اور کمینی دنیا کو ایک ساتھ طلب کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بہت دشوار، خواب و خیال اور پاگل پنے کی خواہش ہے)

ایسا لگتا تھا کہ جیسے ٹھاکر جی کی مایوسی قلبی ہو گئی ہو، آہستہ سے پنچے شاہ سے کہا۔ "میاں جی! میں تو آپ کو یہاں اس لئے لایا تھا کہ آپ سے پوچھوں کہ میں جس بھنور میں پھنس گیا ہوں اس سے نکل بھی سکوں گا یا نہیں اور آپ ہیں کہ بس کوئی فقرہ کہہ دیتے ہیں یا کوئی شعر پڑھ دیتے ہیں۔ میری ناقص عقل اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔"

پنچے شاہ نے اپنا شعر کئی بار پڑھا اور پھر مسلسل دہرانے لگے۔

ٹھاکر جی نے تنگ آ کے پنچے شاہ کا پیچھا چھوڑا اور جب وہ بالکل باہر آ گئے تو انہوں نے پنچے شاہ کی آواز سنی۔ "جو اَب تک بویا تھا سو کاٹ، جو اَب تک بویا تھا سو کاٹ۔"

گاڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھولے ان کا منتظر تھا۔ ٹھاکر جی گاڑی میں بیٹھ گئے تو ان کے بعد پھکو منشی کیدار ناتھ اور رجنی کمار بھی بیٹھ گئے۔

ٹھاکر جی نے حکم دیا۔ "شیو ناتھ کے مندر چل۔"

راستے بھر بالکل خاموشی رہی اور شیو ریٹ راج نگر کی طرف بھاگتی رہی۔

کچھ دیر بعد یہ گاڑی شیو ناتھ کے مندر کے سامنے رک گئی۔

ٹھاکر جی نے گاڑی سے اتر کے تینوں سے کہا۔ "آج میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ سوچا، اس موت و زندگی کے کھیل میں شیو ناتھ جی سے مدد مانگ لوں۔ تم تینوں بھی میرے لئے شیو ناتھ جی سے دعا مانگو کہ میں موت و زندگی کے اس کھیل میں کامیاب رہوں اور میرے ہاتھ سے میرا دھرم بھی نہ جائے۔"

یہ چاروں کافی دیر مندر میں رہے۔ کسی چیلے نے پنڈت جی کو خبر کی کہ آج مدتوں بعد ٹھاکر جی مندر میں تشریف لائے ہیں۔

پنڈت جی تقریباً پشتم مندر میں آئے۔ ان کا پیٹ کافی آگے نکلا ہوا تھا۔

انہوں نے ٹھاکر جی کو آنکھیں بند کئے کچھ بدبداتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی قریب ہی جا کے کھڑا ہو گیا۔

دعاؤں سے فارغ ہونے کے بعد ٹھاکر جی نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے پنڈت جی کو دی اور کہا۔ "اس سے اناتھوں کو کھانا کھلوا دینا اور ان سے کہنا کہ میرے حق میں دعا کریں۔"

اب گویا ٹھاکر جی میں بڑی توانائی آ گئی تھی۔ انہوں نے مندر کی گھنٹیاں بجا کے خود دعا مانگ کے، دوسروں سے دعا منگوا کے اور اناتھوں کے لئے کھانے کی رقم دے کے یہ سمجھ لیا تھا کہ انہوں نے موت اور زندگی کے بڑا اس کھیل میں جیت حاصل کر لی ہے۔ ٹھاکر جی، پھکو سے کہنے لگے۔ "دیکھ پھکو! ایشور کو اس طرح راضی کیا جاتا ہے۔"

اب ان کا دل واقعی ہلکا ہو گیا تھا۔ راستے میں پھکو نے پوچھا۔ "ٹھاکر جی! آپ اجازت دیں تو میں جودھا اور پرمو کی خیر خیریت لے لوں۔"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

رجنی کمار سے کہا۔ "اب تو بھی یکسو ہو جا اور دو چار گھنٹے میرے لئے وقف کر دے۔ ممکن ہے شیو جی تجھے کچھ دکھا دیں۔"

راستے میں ایک جگہ تھانے دار کھڑا ٹھاکر جی کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹھاکر جی نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ "گاڑی روک، شاید یہ اپنے ہی انتظار میں کھڑا ہے۔"

ٹھاکر جی نے باہر سر نکال کر پوچھا۔ "کیا بات ہے تھانے دار! کس کا انتظار کر رہا ہے؟"

تھانے دار نے کہا۔ "میں تو آپ کے پاس آنے والا تھا مگر کسی نے بتایا کہ آپ شیو ناتھ جی کے مندر میں تشریف رکھتے ہیں۔ سن کے بڑی خوشی ہوئی کہ اپنے ٹھاکر جی کو شیو ناتھ جی ملا گئے۔"

ٹھاکر جی نے کھرے لہجے میں کہا۔ "کام کی بات کیا ہے، یہی شرفا سڑکوں پر بات نہیں کرتے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "ٹھاکر جی، کمشنر صاحب آنے والے ہیں۔ مجھے ہدایت دی گئی ہے کہ میں آپ کو پابند کروں کہ آپ اگلے ہفتے کوٹھی میں رہیں، کہیں جائیں نہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "آج بھی ہفتہ ہے یعنی وہ آج ہی کے دن مجھ سے ملاقات کرنے آئیں گے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کمشنر صاحب کی غایتِ تشریف آوری کیا ہے؟"

تھانے دار نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! ہم کمشنر صاحب سے یہ نہیں پوچھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں کسی شخص کے لیے ہدایت کی گئی ہے۔"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا لیکن اگر کمشنر صاحب اس ہفتے کے بجائے اگلے ہفتے تشریف لاتے تو بہتر تھا۔"

تھانے دار نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ کمشنر صاحب انگلینڈ واپس جا رہے ہیں اسی لئے وہ اپنے جملہ احباب سے ملاقاتیں کرتے پھر رہے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "تم میرا سندیسہ کمشنر تک پہنچا دینا۔ اگر وہ اگلے ہفتے آ بھی گئے تو کوئی حرج نہیں۔"

بات ختم ہو گئی۔ ٹھاکر جی نے ڈرائیور سے کہا۔ "اب چلا

گاڑی، بات ہو گئی۔"

ٹھاکر جی نے اپنے تینوں آدمیوں سے کہا۔ "اپنی انگریز سرکار میں بڑی بات ہے۔ انگریز کمشنر تک وقت مانگتا ہے۔"

پھکو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے اپنے ٹھاکر جی کی۔"

منشی کیدار ناتھ نے کہا۔ "سنا ہے ٹھاکر جی کے پرکھوں نے اٹھارہ سو ستاون کے غدر میں کئی انگریزوں کو پناہ دی تھی اور ان کی جانیں بچائی تھیں۔ انگریز احسان شناس ہوتا ہے اور جو کوئی اس پر ذرا سا بھی احسان کر دیتا ہے، یہ زندگی بھر اس کا احسان مند رہتا ہے۔"

ٹھاکر جی نے بھی انگریزوں کی تعریفیں شروع کر دیں۔ "بے شک انگریز قوم کا کوئی جواب نہیں۔ یہ ہمارے لیڈروں کو پتا نہیں کیوں آزادی درکار ہے۔ کون سی آزادی، کیسی آزادی درکار ہے۔ گاندھی اور جواہر پورے ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے جناح نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا ہے۔ میرا بس چلے تو میں انگریزوں سے کہوں کہ تم یہیں رہو، ہمیں آزادی نہیں چاہیے۔"

گاڑی کوٹھی کے پھاٹک پر رک گئی۔

ٹھاکر جی اتر کے پنچے شاہ کے کمرے میں گئے۔

اس وقت پنچے شاہ بے وقت کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ سجدے میں گرے ہوئے پتا نہیں زیرِ لب کیا بڑبڑا رہے تھے۔

ٹھاکر جی مسہری پر بیٹھ گئے اور تینوں ان کے سامنے ادب سے کھڑے ہو گئے۔

ٹھاکر جی نے رجنی کمار سے کہا۔ "تو یہیں میرے پاس رک۔" اور باقی دونوں سے کہا۔ "تم دونوں باہر چلے جاؤ۔"

رجنی کمار کو رکا ہوا اور دونوں باہر چلے گئے۔

ٹھاکر جی نے رجنی کمار سے کہا۔ "رجنی کمار جی! آج کل میرا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ کرتا رہتا ہوں لیکن میں تم لوگوں سے جو زیادتی کرتا ہوں اس پر بعد میں پچھتاتا ہوں۔ میں پنچے شاہ کو بھی اسی لئے لایا تھا کہ ان سے اپنے بارے میں کچھ معلوم کروں مگر یہ زبان کھولتے بھی ہیں تو ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو میرے پلے نہیں پڑتی۔ تو ان کے پاس بیٹھ، میں اندر جا کے کپڑے وغیرہ بدل لوں۔"

ٹھاکر جی چلے گئے۔ رجنی کمار ٹھاکر جی میں جو حیرت انگیز تبدیلی دیکھ رہا تھا اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ رجنی کمار پنچے شاہ کے پاس بیٹھا ان کے سر اٹھانے کا انتظار کر رہا تھا۔

کافی دیر بعد پنچے شاہ نے سر اٹھایا اور اچانک رجنی کمار کے کان میں کہا۔ "کچھ پتا ہے، برکھا کیوں رک گئی تھی۔ یہاں ایک ظالم رہتا ہے۔ کہانی سناؤں! ظالم کی بستی میں برکھا نہیں ہوتی۔ ابھی ابھی میں نے دیکھا، یہاں انگریز گھس آئے ہیں۔ میں نے ٹھاکر کو بھگا دیا۔ وہ صفایا کر گیا۔ سمندری آدمی اکیلا رہے اکیلا۔"

رجنی کمار نے پنچے شاہ کی ایک ایک بات ذہن نشین کر لی مگر وہ ان باتوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

کوٹھی میں بڑا سکون تھا یا کہ ٹھاکر جی پُرسکون تھے۔

اب ٹھاکر جی کو جیسے کسی کی بھی فکر نہیں رہی تھی۔ جودھا، پرمو ایسے نائب ہوئے کہ واپس ہی نہیں آئے۔ ٹھاکر جی نے ان دونوں کے بارے میں کئی بار پوچھا مگر نفی میں جواب ملنے کے باوجود انہوں نے کسی قسم کی بے چینی نہیں ظاہر ہونے دی۔ وہ اپنے بالائی کمرے میں بند پتا نہیں کیا کر رہے تھے۔ انہوں نے رجنی کمار کو بھی نہیں بلایا۔

اور پھر حیرت انگیز طور پر ٹھاکر جی پھکو کے سوا مسلسل دس گھنٹے کسی کو دکھائی نہیں دیے اور نہ کسی نے ان کی آواز سنی۔

رجنی کمار نے کئی بار پھکو سے پوچھا۔ "ٹھاکر جی کہاں ہیں؟"

پھکو ہر بار یہی جواب دیتا۔ "وہ بہت مصروف ہیں۔ اپنے تعلقے کے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہیں۔"

رجنی کمار نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں؟ وہ ابھی تک بند ہیں یا چھوڑ دیے گئے؟"

پھکو نے بتایا۔ "چھوٹے ٹھاکر تعلقے سے بیزار ہو کے شہر واپس چلے گئے۔"

رجنی کمار نے منشی کیدار ناتھ کے بارے میں پوچھا۔ "منشی بھی نظر نہیں آتا، وہ کہاں چلا گیا؟"

ابھی پھکو نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پنچے شاہ نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "بائیسکوپ والے، بائیسکوپ والے، اس سے کیا پوچھتا ہے۔"

پھکو نے پنچے شاہ کی یہ ناقابلِ فہم اور عجیب و غریب بات سنی تو رجنی کمار سے پوچھا۔ "یہ بائیسکوپ کی کیا بات کر رہے ہیں؟"

رجنی کمار نے بڑی بے چینی محسوس کی۔ اس پر پراسرار کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا اور پھکو سے کہا۔ "بیٹھ جا۔"

اس کے بعد رجنی کمار کی طاقت جاتی رہی۔ پاؤں سے جھاگ جاری ہو گئے۔ سامنے دیوار پر مناظر ابھرنے لگے۔ اس نے دیکھا۔ انگریز کمشنر بہت سائے پولیس والوں کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہوا اور پھر کمشنر تو باتوں میں مشغول ہو گیا اور پولیس کوٹھی کے مختلف حصوں میں کچھ تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ خاصی ہڑبونگ نظر آ رہی تھی۔ پولیس کے ہجوم میں چھوٹے ٹھاکر بھی نظر آئے اور پرمو اور جودھا بھی، وکیل اور چتو لال بھی دکھائی دیے لیکن زخمی حالت میں۔ ان میں ایک عورت ایک بچی کی انگلی پکڑے کونے میں کھڑی پولیس کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ یہیں موہن پورہ کے اغوا شدہ کاشت کار کی لاش دکھائی دی اور معمر اجی بھی زخمی حالت میں کاشت کار کی لاش کے پاس کھڑا تھا۔

پھکو انگریز کمشنر سے باتیں کرتا نظر آیا۔ یہیں منشی کیدار ناتھ بھی موجود تھا۔

کسی طرف سے مہابیر اور دادی ماں بھی نمودار ہوئیں اور انگریز کمشنر سے باتیں کرنے لگے لیکن اب وہاں ٹھاکر جی کا پتا نہ تھا۔ ٹرین، بہت بڑی ندی، اسٹیمر۔ ٹھاکر جی ٹرین میں بھی نظر آئے، اسٹیمر میں بھی اور پھر ایک سمندری جہاز ٹھاکر جی کو لے کر غائب ہوگیا۔

مناظر ختم ہوگئے۔ پھکو پر سکتہ طاری تھا۔ وہ بے حد پریشان... گم صم بیٹھا تھا۔

پنچے شاہ نے پھکو کے ہلکی سی چپت رسید کی۔ "جو بوئے گا، سو کاٹے گا۔ دیوث کہتا ہے دیوث بنا تا ہے۔ بائیسکوپ ختم، ظالم گیا، برکھا ہوگی۔"

رجنی کمار بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ پھکو نے اس کی باچھوں سے جھاگ اپنی دھوتی سے پونچھے۔ اب وہ کبھی تو رجنی کمار کو دیکھ لیتا اور کبھی پنچے شاہ کو دیکھنے لگتا۔

کافی دیر بعد رجنی کمار بیٹھ گیا اور پھکو سے پوچھا۔ "تو نے کچھ دیکھا؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "ہاں دیکھا تو مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا تھا۔"

رجنی کمار نے کہا۔ "جو کچھ دیکھا، اسے بھول جا۔ بہت برا حال ہے۔ توبہ توبہ، ٹھاکر جی نے سن لیا تو قیامت کھڑی ہوجائے گی۔ پنچے شاہ صحیح کہتے ہیں کہ جیسا بویا ہے ویسا کاٹو گے۔"

پھکو نے کمرے سے نکل کے باہر کا جائزہ لیا۔ وہاں سناٹا تھا۔ دوبارہ رجنی کمار کے پاس گیا اور پوچھا۔ "یہ سب کیا تھا؟"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "کوٹھی میں چھاپا پڑنے والا ہے۔ یہاں بھونچال آنے والا ہے۔"

پھکو نے کہا۔ "لیکن کمشنر تو ٹھاکر جی کا دوست ہے اور وہ تو ہفتے کو ٹھاکر جی سے وداعی ملاقات کرنے آرہا ہے۔"

رجنی کمار نے جواب دیا۔ "پتا نہیں کیا کرنے آرہا ہے۔"

پھکو نے پنچے شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے سیتل پاٹی پر لیٹے ہوئے تھے۔ پھکو نے کہا۔ "میاں جی نے اچھا بائیسکوپ دکھایا۔"

رجنی کمار سے اٹھا نہیں جارہا تھا۔ پھکو کو مشورہ دیا۔ "خبردار جو اس کا کہیں تذکرہ کیا۔ یہ سمجھ لے کہ ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

اس روز رات کے تقریباً نو بجے ٹھاکر جی نے اچانک پھکو کو آواز دی اور جب پھکو ان کے سامنے پہنچا تو اس سے پوچھا۔ "آج کیا دن ہے؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "سوم وار، چند گھنٹوں بعد منگل وار لگ جائے گا۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "انگریز کمشنر کب آئے گا؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "سنیچر کو آنے کے لئے کہا ہے۔"

ٹھاکر جی انگلی کی پوروں پر حساب لگاتے رہے۔ "تو ابھی بیچ میں چار دن ہیں۔ وہ پانچویں دن مجھ سے ملنے آئے گا۔"

اس وقت ٹھاکر جی گہری سوچ میں تھے۔ پتا نہیں کیا سوچ رہے تھے۔ پھکو نے پوچھا۔ "میرے لئے کوئی حکم؟"

ٹھاکر جی نے جواب دیا۔ "ہاں تیرے لئے کئی حکم ہیں۔ تو صبح ٹھکرائن کو ان کے میکے چھوڑ آ۔ اس کے بعد تجھ کو میرے چند اہم کام انجام دینا ہیں۔ اب میرے پاس نہ تو راگھو ہے نہ بدری نہ مصرا جی۔ جودھا اور پربھو نے میرے لئے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ وہ دونوں پتا نہیں کس طرح دھوکے سے چتو لال جی، وکیل اور کرشنا کماری کو اڑا لائے۔ عقل نہیں مانتی کہ ان دونوں جاہلوں نے اتنا بڑا کارنامہ کس طرح انجام دیا۔"

پھکو نے پوچھا۔ "لیکن وہ سب کہیں نظر تو نہیں آتے۔ انہیں آپ نے کہاں رکھا ہے؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "پھکو! میں تجھ کو آج بتاتا ہوں کہ مجھ میں کوئی راکشش گھسا ہوا ہے۔ وہ مجھے ذرا ذرا سی بات پر مشتعل کردیتا ہے۔ میں لذت آزار ہوں۔ کسی کو اذیت دے کے لطف و لذت محسوس کرتا ہوں۔ میں جب کسی کو پیٹتا یا پٹواتا ہوں تو مجھے ایک سرور سا حاصل ہوتا ہے اور جب کسی کو قتل کرتا ہوں تو گویا مجھے وقتی طور پر سکون حاصل ہوجاتا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے پچھتاوا بھی ہوتا ہے اور مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوجاتی ہے۔"

ٹھاکر جی بولتے بولتے چپ ہوگئے اور پھکو ٹھاکر جی کی آگے کی باتیں سننے کے لئے بے قرار ہورہا تھا۔

ٹھاکر جی نے کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ رتن لال نے مجھ سے دغا کی ہے۔ وہ کچھ کھل کے بتاتا نہیں ہے مگر اس کا سکون اور اس کا اطمینان چغلی کھا رہے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ بہرحال یہ میرے ہاتھوں آخری چند قتل ہوں گے۔ رتن لال، موہن پورہ کا کاشت کار، مصرا جی، وکیل صاحب اور چتو لال جی۔ یہ میرے آخری شکار ہیں پھر میں یہاں سے کرشنا کو لے کے چند ماہ کے لئے کہیں چلا جاؤں گا۔ ٹھکرائن تعشے کی دیکھ بھال کرے گی۔ اس کے بعد جب میں واپس آؤں گا تو از سرِ نو زندگی شروع کروں گا۔ ابھی تو میرے ساتھ یہ اتفاق لگا ہوا ہے کہ ایک کو مارتا ہوں تو دوسرا قتل ہونے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ میں قتل کرنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔"

رات کے بارہ بجے تک ٹھاکر جی اپنی خواب گاہ میں بیٹھے پھکو سے باتیں کرتے رہے۔ پھر یہیں ٹھاکر جی نے رتن لال کو طلب کیا تو پھکو نے کہا۔ "ٹھاکر جی! وہ یہاں آنے سے پہلے بھی انکار کرچکے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "رجنی کمار کہاں ہے؟"

پھکو نے جواب دیا۔ "میاں جی اور رجنی کمار ایک ہی کمرے میں رہ رہے ہیں۔"

ٹھاکر نے کہا "پہنچے شاہ کا تو کوئی بھروسا نہیں کہ وہ کب تک یہاں رہیں گے میرے ساتھ۔ خود آگئے تھے' خود ہی چلے بھی جائیں گے۔ کہتے ہیں کہ میں نے جیسا بویا تھا ویسا ہی کاٹوں گا۔ پتا نہیں اس سے ان کی کیا مراد ہے۔ رجنی کمار کو یہیں رہنے دینا۔ وہ بھلا آدمی ہے۔ میں واپس آکے اس کے لئے کچھ کروں گا۔"

ٹھاکر جی ایکدم اٹھے اور پھکو سے کہا۔ "آ' میرے ساتھ چل۔"

انہوں نے پستول سنبھالا اور پھکو کو لے کے ٹھاکر رتن لال کے کمرے میں پہنچ گئے۔

وہ سویا ہوا تھا۔ ٹھاکر جی نے ٹھوکر مار کے بیدار کیا۔ "اٹھ میرے ساتھ چل۔"

ٹھاکر رتن لال نے آنکھیں کھولتے ہی ٹھاکر جی کو پستول تانے دیکھا تو خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ "ٹھاکر... جاجا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "میں تجھ کو بلاتا ہوں اور تو آنے سے انکار کردیتا ہے' تیری یہ مجال۔"

رتن لال کھڑا ہوگیا "آپ بلائیں اور میں نہ آؤں' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ چلیں کہاں چلنا ہے۔"

ٹھاکر جی نے جیب سے رسی کا ایک ٹکڑا نکالا' اسے پھکو کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر لے جاکر باندھ دے۔"

پھکو نے حکم کی تعمیل کی اور رتن لال کہتا رہا۔ "ٹھاکر... چاچا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر بندھ چکے تھے۔ ٹھاکر جی نے رتن لال کو حکم دیا۔ "میرے آگے آگے چل۔" اور پھکو سے کہا۔ "یہاں کوئی لاٹھی ہے؟"

پھکو کونے میں کھڑی ہوئی لاٹھی اٹھا لایا۔ ٹھاکر جی نے کہا۔ "تو بھی اس کے بائیں جانب پیچھے پیچھے چل۔ جہاں کہیں رکے لاٹھی سے اس کی ٹانگیں توڑ دینا۔"

رتن لال نے چلتے چلتے کہا۔ "ٹھاکر... چاچا! آپ اپنے وفادار بھتیجے سے اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں۔"

کوٹھی کے صحن کے بائیں سمت کا یہ حصہ بھینسوں کے کھڑے کرنے کے لئے وقف تھا۔ اس کے برابر ہی کوٹھی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گاڑیوں' بھینسوں اور بیل گاڑیوں کے لئے جگہیں بنی ہوئی تھیں۔ انہی میں جانوروں کے باڑے بھی تھے۔ کہیں بیل بندھے ہوئے تھے' کہیں گائے اور کہیں گدھے۔ یہیں گھوڑوں کا اصطبل بھی تھا۔ یہ خاصا گندہ اور گھٹیا حصہ تھا کہ انسان ادھر جاتے ہوئے کراہت محسوس کرے۔

ٹھاکر جی پستول کی زد پر ٹھاکر رتن لال کو گھوڑوں کے اصطبل تک لے آئے۔ یہاں اصطبل کے گھوڑوں کے درمیان ایک پتلی سی گلی تھی جو ایک دروازے پر ختم ہوجاتی تھی۔ اس دروازے میں اوپر سے نیچے تک بڑے بڑے تین قفل پڑے ہوئے تھے۔

ٹھاکر جی نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کے پھکو کی طرف پھینکا اور حکم دیا۔ "تالے کھول۔"

پھکو نے تالے کھولے اور پھر دروازہ کھول کے وہ سب دوسری طرف پہنچ گئے۔

کوٹھی کا وہ حصہ عجیب و غریب تھا۔ ہر طرف سے بند' بالکل جیل کی طرح۔ یہاں بہت سی بیرکیں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ لالٹینیں جل رہی تھیں۔ حالانکہ کوٹھی میں بجلی تھی مگر یہاں لالٹینوں کا استعمال ہو رہا تھا۔

ٹھاکر جی نے رتن لال کو ایک کوٹھری میں لات مار کے دھکیل دیا جس کا دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ پھکو سے کہا۔ "دروازے کو باہر سے بند کردے۔"

اندر رتن لال چیخ رہا تھا۔ "ٹھاکر... چاچا! مجھے نہیں مارو۔"

ٹھاکر جی نے پھکو سے کہا۔ "اس سے کہو خوب چیخے۔ اس کی آواز باہر نہیں پہنچے گی۔"

پھکو نے یہ حصہ ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ آج یہاں دوسری بار آیا تھا۔ یہ ٹھاکر جی کا نجی قید خانہ تھا۔ یہاں وہ لوگ لائے جاتے تھے جنہیں ٹھاکر جی اپنی نجی قید میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں ٹھاکر جی کے ان دشمنوں کو بھی قید کیا جاتا تھا جنہیں سسکا سسکا کے مارنا ہوتا تھا۔ ٹھاکر جی نے ان سسک سسک کر مرنے والوں سے بہت لطف اندوز ہوتے ہوئے یہاں ٹھاکر جی نے کرخت آواز میں پکارا۔ "رنبیرا کدھر مر گیا؟"

رنبیرا لالٹین لئے ہوئے آگیا۔ یہ صحت مند کالا بھجنگ بالکل دراوڑی نسل کا کوئی قدیم آدمی لگتا تھا۔ وہ شاید سویا ہوا تھا۔ ٹھاکر جی نے اس کے چہرے کے غصے سے دیکھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ اس کی آنکھوں میں نیند ہے یا نہیں' پوچھا۔ "سو گیا تھا؟"

رنبیرا نے جواب دیا۔ "ہاں ٹھاکر جی! ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔"

ٹھاکر جی بڑبڑانے لگے۔ "کس پر اعتبار کیا جائے' مستعد اور ہوشیار آدمی نہیں ملتا۔"

رنبیرا نے کہا۔ "ٹھاکر جی! رات تو سونے کے لیے بنی ہے۔ بس زرا یونہی آنکھ لگ گئی تھی۔"

ٹھاکر جی نے یہاں بھی اپنے لئے ایک خاص ہال نما کمرا بنوا رکھا تھا مگر یہ پہلی منزل کے بجائے نیچے ہی تھا۔ یہاں بھی مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیوار گیر چار الماریاں تھیں۔ ایک بڑی میز تھی اور تقریباً ڈیڑھ درجن کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اندرونی حصے میں جہاں یہ ہال نما کمرا ختم ہوتا تھا وہاں بھی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بھی کوئی کمرا تھا اور اس میں بھی یا تو کوئی

رہتا تھا یا یہاں ٹھاکر جی کی آسائشوں کا سامان رکھا تھا۔

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "کرشنا کماری کہاں ہے؟"

رنبیرا نے جواب دیا۔ "ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے جھڑک دیا۔ "حاضر کے بچے' پہلے یہاں روشنی تو کر' اندھیرے میں لاکے بٹھا دیا۔"

اس حصے میں بھی بجلی نہیں تھی۔ رنبیرا نے پانچ لالٹینیں جلا دیں جن سے خاصی روشنی ہوگئی۔ ٹھاکر جی نے اسے پھر ڈانٹا۔ "وہ گیس کی بتیاں کہاں ہیں۔ انہیں کیوں نہیں جلاتا۔"

رنبیرا نے کہا۔ "اب کچھ دیر بعد گیس بتیاں بھی جل جائیں گی۔ ان کے جلانے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔"

اب رنبیرا نے پوچھا۔ "ٹھاکر جی! اب آپ یہ بتائیں کہ میں آپ کے دو کاموں میں پہلے کون سا کام کروں؟"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "دو کون سے کام؟"

رنبیرا نے جواب دیا۔ "پہلے تو آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ میں کرشنا کماری جی کو بلا لاؤں اور میں ان کو بلانے جا ہی رہا تھا کہ آپ نے مجھے ان کے بلانے کا حکم دے دیا۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "دوسرے نوکر چاکر کہاں ہیں؟"

رنبیرا نے جواب دیا۔ "وہ اپنی کوٹھریوں میں پڑے سو رہے ہیں۔ ان کو اس وقت نہیں جگانا چاہیے۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "چلو یہ ٹھیک ہے۔ اب تو پہلے گیس بتیاں جلا دے اس کے بعد کرشنا کماری جی کو لے آ۔"

رنبیرا نے فوراً تین گیس بتیاں جلائیں اور انہیں چھت سے لٹکے ہوئے لوہے کے آنکڑوں میں پھنسا کے لٹکا دیا۔ ہال نما کمرا خاصا روشن ہوگیا۔

ٹھاکر جی ایک مسہری پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئے اور پھکو سے کہا۔ "کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ جا۔"

پھکو نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں ٹھاکر جی' میرے لئے یہ فرش ہی کافی ہے۔"

ٹھاکر جی نے زرا غصے میں حکم دیا۔ "کرسی کھینچ لے اور میرے قریب بیٹھ جا۔ تو نے میری بڑی خدمت کی ہے۔"

پھکو ایک کرسی اٹھا لایا اور اس پر کچھ اس طرح بیٹھا جیسے وہ بھاگنے ہی والا ہو۔

ٹھاکر جی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "پھکو تو نہیں جانتا کہ چنو لال جی اور وکیل میرے دوست بھی بنے رہے اور برابر ماری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کرشنا کماری کا جو حشر کیا ہے' میں دیکھتا ہوں تو خون کے آنسو رو دیتا ہوں۔ یہ دونوں تو مجھ سے زیادہ سفاک نکلے۔ آج میں ان دونوں کا حساب چکتا کردوں گا۔"

پھکو نے ٹھاکر جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ٹھاکر جی! میں قسم کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ جیسا دیالو آدمی نہیں دیکھا۔ آپ نے مجھے اور منشی کیدار ناتھ کو مکانات بنوا کے دیے اور کھیتی باڑی کے لئے زمین بھی دی۔ بھلا اتنا کوئی مالک اپنے نوکروں کے ساتھ کہاں کرتا ہے۔"

ٹھاکر جی نے نہایت رعونت سے کہا۔ "یہاں یعنی اس وقت جہاں تو بیٹھا ہے' یہ میری زمین ہے۔ یہاں میری حکومت ہے۔ یہاں پولیس نہیں آسکتی اور انگریز سرکار بھی یہاں مداخلت نہیں کرسکتی۔"

پھکو نے تائید میں گردن ہلائی۔ "بے شک' بے شک۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں' سچ کہہ رہے ہیں۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "آج میں آخری بار چند غداروں اور وفا ناشناسوں کو موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ وکیل اور چنو لال جی کے لئے اخباروں میں تلاش گمشدہ کے اشتہار چھپیں گے۔ غریب کاشت کار اور معمراجی ناحق مارے جائیں گے۔ میں بھی کیا کروں' مجبور ہوں۔ وکیل اور چنو لال جی کو یہیں کہیں دفن کروا دوں گا یا پھر کیا کرم کروں گا تاکہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور پھر ہفتے کو کمشنر صاحب سے وداعی ملاقات کرکے آسام نکل جاؤں گا۔ کمشنر صاحب انگلینڈ چلے جائیں گے۔ تو میری عدم موجودگی میں ٹھکرائن کی مدد کرتا رہے گا اور ٹھکرائن تعلقے دار بنی علاقے پر حکومت کریں گی پھر جب بھی میں واپس آؤں گا تو بقیہ زندگی آرام و سکون سے گزاروں گا۔ شیو ناتھ جی کا مندر ہوگا' تعلقہ ہوگا' کوٹھی ہوگی' تم سب ہوگے اور میں ہوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ بڑی پیاری زندگی ہوگی۔"

پھکو اس طرح گوش بر آواز تھا جیسے وہ کوئی حکایت لذیذ سن رہا ہو' آہستہ سے کہا۔ "بھگوان آپ کو کامیاب کرے۔"

ٹھاکر جی ایک دم پھر بے چین ہوگئے۔ "تجھ سے دعا کی درخواست کس نے کی تھی! کبھی کبھی تو بھی بک جاتا ہے۔ تو نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔"

پھکو نے ٹھاکر جی کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ "مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ پتا نہیں بے اختیاری میں میرے منہ سے کیا نکل گیا۔"

ٹھاکر جی نے اپنے پاؤں کھینچ لئے اور کہا۔ "آئندہ خیال رکھنا۔"

رنبیرا کرشنا کماری کو لے کر آگیا۔ کرشنا کماری کے ساتھ اس کی بیٹی ششاما بھی تھی۔

کرشنا کماری کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ وہ بیمار لگ رہی تھی۔ ٹھاکر جی کرشنا کماری کو کچھ دیر دیکھتے رہے' پوچھا۔ "کرشنا کماری' یہ تیری صحت کو کیا ہوگیا؟"

کرشنا کماری نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "ٹھاکر جی! مجھے آپ کے دوستوں نے بہت ستایا ہے۔ دونوں وحشی جانور تو تھے ہی مگر ان کے دوستوں نے مجھ سے جو برتاؤ کیا ہے' میں بیان نہیں کرسکتی۔ اب میں آپ کے کام کی نہیں رہی۔"

اور وہ مسہری کے پائنتی بیٹھ کے رونے لگی۔

ٹھاکر جی نے تسلی دلاسا دینے کے بجائے بے رخی سے کہا۔
"بے شک تو اپنے کام کی نہیں رہی۔ میں نے تیری خاطر کتنی خاک چھانی ہے اور کتنے پاپڑ بیلے ہیں' یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ میری عزت و آبرو داؤ پر لگ گئی' میں نے بدمعاشوں کی طرح توڑ پھوڑ کی' آدمی مارے' پولیس کا مقابلہ کیا' کوٹھی میں ٹھکرائن سے جھگڑتا رہا مگر تجھے ان بدمعاشوں سے حاصل نہیں کر سکا حالانکہ اگر تو ذرا سی ہمت کر جاتی تو میرے پاس پہنچ سکتی تھی۔"
کرشنا کماری کا چہرہ فق ہو گیا' آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ٹھاکر جی! میں تو صرف آپ کی خاطر' آپ کے لئے زندہ رہی ورنہ وہاں میرے لئے خود کشی بہت آسان تھی۔"
ٹھاکر جی نے پھکو سے کہا۔ "ایک کرسی اور اٹھالا۔"
پھکو کرسی لینے گیا تو ٹھاکر جی نے پھکو کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر بیٹھ جا۔ میری مسیحی کو ناپاک نہ کر۔"
کرشنا کماری نے ٹھاکر جی کے پاؤں پکڑنے چاہے تو ٹھاکر جی نے دونوں پاؤں کھینچ لئے اور پیچھے ہٹ گئے پھر حکم دیا۔ "کرسی خالی ہے۔ اس پر بیٹھ جا اور جو بات تجھے کہنی ہو' اطمینان سے کہتی رہ۔"
کرشنا کماری نے اپنی بیٹی ششنا کا ہاتھ پکڑ کے مسہری پر بٹھا دیا اور خود کرسی پر جا بیٹھی' پوچھا۔ "ٹھاکر جی! میں تو بہت بری اور گندی عورت ہوں۔ دھوکا دھی' آپ نے سارا دیا۔ یہ لڑکی آپ کی ہے۔ اس کے لئے کیا حکم ہے؟"
ٹھاکر جی نے لڑکی پر بھی کوئی توجہ نہیں دی اور کہا۔ "جب میں تجھ کو قبول نہیں کر رہا تو اس لڑکی کو کیا قبول کروں گا۔ ہو سکتا ہے یہ لڑکی بہت بھاگوان ہو لیکن اس بھاگوان سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ میں اس کے لئے اپنے دوری رشتے کے بھتیجے ٹھاکر رتن لال کو شہر سے کوٹھی میں لایا۔ سوچا تھا کہ ششنا کا دوار رتن لال سے کروں گا اور وہ تعلقہ داری میں میرا ہاتھ بٹائے گا مگر اس نے بھی ہاتھ دکھانا شروع کر دیئے اور میرے دل سے اتر گیا۔ شاید اس کا بھی آج آخری دن ہے۔ تیری یہ بھاگوان بیٹی اس کو بھی نہیں بچا سکتی۔"
کرشنا کماری نے پوچھا۔ "میں اسے کہاں لے جاؤں؟ یہ آپ ہم دونوں پر بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں۔"
ٹھاکر جی نے پھکو کو حکم دیا۔ "اس لڑکی کو اناتھ آشرم میں داخل کروا دینا اور کہنا کہ اس کے حساب میں اناتھ آشرم کو سو روپے ماہانہ ملتے رہیں گے۔"
اچانک ٹھاکر جی کو خیال آیا کہ رنبیرا بھی ان کے پیچھے کھڑا ان کی باتیں سن رہا ہے' کڑک کے حکم دیا۔ "رنبیرا' پیچھے کھڑا کیا کر رہا ہے۔ سامنے آ۔"
رنبیرا سامنے آگیا اور ٹھاکر جی سے کرشنا کماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر جی...! آپ اس دکھیاری سے انیائے کر رہے ہیں۔ اس پر بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ اس کا تو خیال کیا ہوتا۔"
ٹھاکر جی پر پاگل پنے کا دورہ پڑا' چیخ کر پوچھا۔ "کیا بکواس کر رہا ہے رنبیرا؟ یہ تو بول رہا ہے۔"
رنبیرا نے ایک طرف بھاگ کر جاتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر جی! آج آپ کو نیائے کرنا ہوگا۔ میں مقدمے کے دوسرے فریقوں کو بھی لاتا ہوں۔"
ٹھاکر جی نے پستول نکال لیا تھا مگر رنبیرا کے یہ عجلت بھاگ جانے کی وجہ سے انہیں پستول چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔
اب ٹھاکر جی نے کرشنا کماری کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا۔
"تو تو یہیں بھی چکر چلا دیا اور رنبیرا کے منہ میں زبان دے دی۔"
کرشنا کماری نے کہا۔ "ٹھاکر جی! بھگوان کے لئے آپ مجھے اتنا نہ گرائیں۔"
اس وقت ٹھاکر جی کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے پھکو سے کہا۔ "آج یہاں پہلا خون رنبیرا کا ہوگا۔ اس نمک حرام کو ایسی سزا دوں گا کہ اس کی آتما بھی بھٹکتی پھرے گی۔"
تھوڑی دیر بعد چتو لال جی' وکیل اور ان کے ساتھ رنبیرا بھی آگئے۔
ٹھاکر جی کا خیال تھا کہ چتو لال جی اور وکیل کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوں گے مگر دونوں آزاد تھے۔ جودھا اور پربھو بھی کھلے ہاتھوں میں پھکو کی طرح لاٹھیاں تھیں۔
ٹھاکر جی کو یہاں غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کا ایک پستول ان کی بچت کے لئے کافی تھا۔ چتو لال جی نے جودھا اور پربھو کو حکم دیا۔ "ہم دونوں کے لئے دو کرسیاں اٹھالا۔"
وہ دونوں تابعداروں کی طرح گئے اور دو کرسیاں اٹھا لائے۔
ان دونوں نے کرسیاں کھینچیں اور ان پر بیٹھ گئے۔
پھکو بھی بہت حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ جودھا اور پربھو نے اپنے ٹھاکر جی کی ملازمت چھوڑ دی اور ان دونوں کے پاس چلے گئے۔ ٹھاکر جی نے جودھا اور پربھو سے پوچھا۔ "تم دونوں مجھ سے پوچھے بغیر ان دونوں مجرموں کو کرسیاں پیش کر رہے ہو؟"
پربھو نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! یہاں تو یہ دونوں آپ کے مہمان ہیں۔"
ٹھاکر جی مسہری سے اتر کے کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "اُلو کے پٹھے' سؤر کے بچے! یہ کس نے ان دونوں بدمعاشوں کو ہمارا مہمان بنا دیا ہے۔"
یہ کہہ کر ٹھاکر جی نے وکیل اور چتو لال جی کو یکے بعد دیگرے گولی مار دی۔
اتنی دیر میں رنبیرا چھوٹے ٹھاکر کو لے کر آگیا۔ چھوٹے ٹھاکر کے ہاتھ بھی کھلے ہوئے تھے۔ ٹھاکر جی نے تیسری گولی ٹھاکر رتن لال کے پیٹ میں اتار دی۔
پھکو نے سوچا کہیں کوئی گولی غلطی سے اس کی طرف نہ آجائے۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ جودھا اور پربھو بھی کہیں غائب ہو چکے تھے۔ رنبیرا پھکو کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔
یہ دونوں اصطبل والے دروازے سے نکل کے کوٹھی کے احاطے میں آگئے۔ یہاں گیس بتیاں جل رہی تھیں اور ہر طرف پولیس ہی پولیس نظر آرہی تھی جو نارچوں کی مدد سے کوٹھی کے اندر ٹھاکر جی کی طرف جانے کے راستے تلاش کر رہی تھی۔ کمشنر اور کوتوال شہر بھی یہاں موجود تھے۔
رنجی کمار کو بھی تھانے دار اس احاطے میں لے آیا تھا۔ شاید کوٹھی کے باہر کے کارندے جان بچا کے کہیں بھاگ گئے تھے۔
تھانے دار نے رنبیرا اور پھکو کو اصطبل کی طرف سے آتے دیکھا تو ان دونوں سے پوچھا۔ "کوٹھی کے دوسرے حصے میں جانے کا کہاں سے راستہ ہے؟"
پولیس کو دیکھ کر پھکو گڑگڑانے لگا۔ "صاحب! ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہم بے گناہ ہیں۔"
پھکو نے رنبیرا کو پولیس کے صاحب دیکھا تو اصطبل کی طرف چلا گیا۔
پولیس والے پھکو کو سائیس سمجھے جو ان کے خیال میں گھوڑوں کی مالش کرتے کرتے یہاں رہتا ہوگا۔
لیکن پھکو نے دوسری طرف جانے کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور ٹھاکر جی کی طرف چلاتا ہوا دوڑا۔ "ٹھاکر جی! ٹھاکر جی! پولیس آگئی۔ انگریز کمشنر بھی کوتوال شہر کے ساتھ آیا ہوا ہے اور یہ لوگ آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔"
ٹھاکر جی اپنی بقیہ تین گولیاں بھی کسی پر ضائع کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے ہال نما کمرے سے نکل کے کوٹھی کے بالکل عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے پھکو کو آواز دی۔ "ادھر آ میرے پاس' اصطبل والا دروازہ مضبوطی سے تو بند کر دیا ہوگا۔"
پھکو نے کہا۔ "جی ٹھاکر جی! مگر یہ آپ نے کیا کیا؟"
ٹھاکر جی نے غصے سے پھکو کو گھورا۔ "تو مجھ سے سوال کر رہا ہے کہ یہ میں نے کیا کیا۔"
ٹھاکر جی نے یہاں بھی کئی گاڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور کو اس بزنگ میں اس کی کوٹھری سے بلوا لیا تھا۔
ٹھاکر جی اور ڈرائیور میں کیا بات ہوئی' پھکو نہیں جانتا تھا۔ ٹھاکر جی اطمینان سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "پھکو! مجھ سے میرے اپنوں نے دغا کی۔ یہاں لینی کوٹھی کے اس حصے میں عورتوں اور لڑکیوں کا ایک اناتھ آشرم بھی ہے۔ ان میں شمی کپور ارما تھ کی کوئی عزیزہ بھی ہوگی۔ یہاں بیگار کیمپ بھی ہے۔ کچھ لاشیں بھی اِدھر اُدھر پڑی ہوں گی۔ پولیس والے یہاں اتنی آسانی سے نہیں پہنچیں گے لیکن پہنچیں گے ضرور۔"
وہ کہتے کہتے رک گئے۔
ڈرائیور نے کہا۔ "ٹھاکر جی! اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہاں سے فوراً نکل چلیں۔"
ٹھاکر جی نے کہا۔ "تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"
پھکو زار و قطار رو رہا تھا۔ ٹھاکر جی نے ڈرائیور سے کیا کہا' پھکو نہیں سن سکا۔ بس یہ سنا کہ ٹھاکر جی پٹنے شاہ کے حوالے سے کہہ رہے تھے۔ "بڑے میاں نے کوہ طور میں آگ لگا دی اور موسیٰ کو بے وطن کر دیا۔"
گاڑی کوٹھی سے نکل گئی۔
کمشنر اور کوتوال شہر نے کوٹھی کے اس حصے کا راستہ معلوم کر لیا تھا لیکن یہاں لوہے کا جو دروازہ کوٹھی کے دونوں حصوں کے مابین حد فاصل بنا ہوا تھا اس کو توڑ کے گرا دینا بہت مشکل کام تھا۔
رنبیرا نے اس دروازے کا پتا بہت دیر بعد بتایا۔ شاید اس لئے کہ ٹھاکر جی پولیس کے ہاتھ نہ آئیں۔ اس نے اپنا حق نمک ادا کر دیا تھا۔
جب پولیس' کمشنر اور کوتوال شہر کے ساتھ اس حصے میں داخل ہوئی تو پھکو نے چیخ چیخ کر ان سب کو اس حصے میں بلوا لیا جہاں کئی زخمی خون میں لت پت پڑے تھے۔
پھکو چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا۔ "صاحب' ان زخمیوں کو فوراً اسپتال پہنچائیں ورنہ یہ مر جائیں گے۔"
دو گولیاں کرشنا کماری اور ششنا پر بھی چلائی گئی تھیں مگر شاید ان دونوں کو بھاگتے ہی بحالتِ بدحواسی مارا گیا تھا اس لئے نشانہ چوک گیا تھا۔ کرشنا کماری کی داہنی پنڈلی زخمی ہوئی تھی اور ششنا کا بایاں شانہ۔
کمشنر نے زخمیوں کو فوراً شہر بھجوایا۔ زخمیوں کو لے کر تھانے دار گیا تھا۔
رات کے پچھلے پہر کوٹھی کے اس حصے میں بڑی چہل پہل تھی۔
پھکو' رنبیرا' جودھا اور پربھو حراست میں لے لئے گئے۔ بیس سے مو ہن پورہ کے کاشت کار اور مصراجی کی لاشیں ملیں۔ انہیں ٹھاکر جی کسی دریا میں نہیں پھکوا سکے تھے۔
اناتھ آشرم سے بہت سی نوجوان اور ادھیڑ عمر عورتیں برآمد کی گئیں۔ انہیں مختلف شہروں اور مقامات سے اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ پولیس نے ان کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ صبح تک کوٹھی کے اس حصے کی چھان بین ہوتی رہی۔
اس حصے کو رنبیرا کے علاوہ آٹھ دوسرے کارندے سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ لوگ ایک عرصے سے ٹھاکر جی کے مظالم برداشت کر رہے تھے لیکن جب راگھو' بدری اور مصرا جیسے وفادار قتل کر دیئے گئے تو ٹھاکر رتن لال نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے

ورغلانا شروع کردیا۔ جب ٹھاکر رتن لال سے ٹھاکرجی کی اُن بَن ہونے لگی تو ٹھاکر رتن لال نے اپنے روابط بڑھانے شروع کیے۔ اسے کوٹھی کے اس حصے کا بھی علم ہوگیا تھا۔ وہ ٹھاکرجی کے کئی جرائم سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ موہن پورہ کے زمیندار کا قتل' اس کے ساتھ اپنے خاص آدمی بدری کو مروا دینا ٹھاکر رتن لال کو بہت ناگوار گزرا تھا۔ اسی ایک واقعے سے ٹھاکر رتن لال خود کو بھی غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا اور اس نے یہ ساری روداد انگریز کمشنر کو بتا دی تھی۔

اسی دوران میں منصوبے میں وکیل اور چوہدری جی کو بھی شامل کرلیا گیا تھا۔ جودھا اور پربھو کو پولیس نے راضی کرلیا کیونکہ ان دونوں کو پولیس نے باور کرا دیا تھا کہ ٹھاکرجی اپنے جرائم کی طویل فہرست کے حوالے سے ایک نہ ایک دن گرفتار ہو جائیں گے۔

پولیس کے دباؤ کے علاوہ بھی ٹھاکرجی کے آدمی بہت دل برداشتہ اور خوفزدہ تھے اسی لئے وہ ٹھاکرجی کے خلاف رتن لال کا ساتھ دینے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ ٹھاکرجی کے بعد تعلقے کا نظم و نسق یہی تاجر بے کار نوجوان سنبھالے گا اور تعلقے کے کارندے بھی مزے کریں گے۔

کمشنر نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اپنی انگلینڈ واپسی کا جھوٹ موٹ اعلان کردیا اور ہفتے کے دن وداعی ملاقات کا شیڈول دیا۔

چوہدری جی اور وکیل سے درخواست کی گئی کہ دونوں کسی نہ کسی طرح ٹھاکرجی کے پنگل میں پھنس جائیں تاکہ جب کوٹھی کی تلاشی لی جائے تو یہ دونوں معزز حضرات بھی ٹھاکرجی کی قید سے برآمد ہوں۔ یہ کام ٹھاکر رتن لال کی مدد سے جودھا اور پربھو سے لیا گیا اور دونوں سے ایک بڑے انعام کا وعدہ بھی کیا گیا۔

چنانچہ پربھو اور جودھا کو بیا بہت ہوشیاری سے چوہدری جی اور وکیل کو لے آئے۔ ان کے ساتھ کرشنا کماری بھی آگئی۔

کمشنر کو ملال تھا کہ وہ منصوبے کے مطابق وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ اگر وہ ٹھیک بارہ بجے کوٹھی میں داخل ہو جاتا تو ٹھاکرجی کو اتنی بھیانک کارروائی کرنے کا موقع نہ ملتا کیونکہ جو کچھ ہوا وہ توقع کے خلاف بھی تھا۔ اگر نصف شب کو ٹھاکرجی کی گرفتاری کے بعد رتن لال' پربھو اور جودھا کی راہنمائی میں پوری کوٹھی کی تلاشی لی جاتی تو... کوٹھی سے موہن پورہ کے کاشت کار اور مہاجی کی لاشیں برآمد ہو جاتیں۔ زمیندار اور بدری کے قتل کی گواہی ٹھاکر رتن لال سے لی جاتی۔ اس سے پہلے جو بہت سے جرائم ہوتے رہے تھے' ان کی گواہیاں رنبیرا اور اس کے ساتھیوں سے لی جاتیں۔

ٹھاکرجی کو گرفتار کرانے تک پہنچانے کے لئے بہت سا مواد موجود تھا لیکن ٹھاکرجی بچ کے نکل گئے تھے۔

ٹھاکرجی کی جستجو اور تلاش میں ہر اول دستہ پولیس روانہ کی گئی مگر ٹھاکرجی کہیں روپوش ہو چکے تھے۔ کمشنر اور کوتوالِ شہر رات بھر کوٹھی میں رہے۔

ٹھکرائن بہت پریشان تھیں۔ انہیں واقعات کی تفصیل کا علم نہیں تھا اور انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ ٹھاکرجی فرار ہو چکے ہیں۔ پھکو کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔

رجنی کمار اور پہنچے شاہ اپنے کمرے میں بند تھے۔ شاید ان دونوں کو پولیس نے باہر سے بند کردیا تھا۔

صبح موہن پورہ کی دادی ماں اور مہابیر بھی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ دادی ماں کو پہنچے شاہ کی بڑی فکر تھی۔ وہ انگریز کمشنر سے ملیں اور اس سے پہنچے شاہ کے بارے میں پوچھا کہ... ٹھاکرجی موہن پورہ سے ایک مسلمان مجذوب پہنچے شاہ کو یہاں لائے تھے' انہیں ان کے بارے میں بتایا جائے۔

انگریز کمشنر نے پھکو کو طلب کیا اور کہا۔ "موہن پورہ کی زمیندارنی کچھ پوچھ رہی ہیں' تو ہی انہیں کچھ بتا سکتا ہے۔"

جب دادی ماں نے پہنچے شاہ کے بارے میں پھکو سے پوچھا تو وہ پہنچے شاہ اور رجنی کمار دونوں کو دادی ماں کے پاس لے گیا۔

انگریز کمشنر اور کوتوالِ شہر حیرت سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ رجنی کمار سے تو یہ دونوں پہلے بھی مل چکے تھے لیکن پہنچے شاہ سے پہلی بار ملے تھے۔

دادی ماں نے پہنچے شاہ سے پوچھا۔ "ٹھاکر نے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟"

پہنچے شاہ نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "میرا کام ختم' میری دنیا ختم۔"

انگریز کمشنر پہنچے شاہ کی بے ربط اور بے معنی باتیں غور سے سنتا رہا اور کوتوالِ شہر سے آہستہ سے پوچھا۔ "یہ پریشان حال آدمی کون ہے؟"

کوتوال شہر پہنچے شاہ کے بارے میں بڑا بہت جانتا تھا۔ اس نے انگریز کمشنر کو سمجھایا۔ "جناب! جس نے یہ رجنی کمار ٹھاکر... پرشوتم داس کا خاص آدمی ہے اور اس سے وہ کام لینے والے واقعات جان لیا کرتے تھے اسی طرح یہ پہنچے شاہ موہن پورہ میں ایک مجذوب بزرگ ہیں جو بہت سی پیش آنے والی باتوں کی خبر قبل از وقت دے دیتے ہیں۔ موہن پورہ کا زمیندار خاندان ہندو راجپوت ہونے کے باوجود اس مسلمان مجذوب کا بہت معتقد ہے۔"

انگریز کمشنر مسکرایا اور کہا۔ "یہ ہندوستانی بہت توہم پرست ہوتے ہیں اور یہ رجواڑے اپنی حویلی میں ایک نہ ایک ایسا آدمی ضرور رکھتے ہیں۔"

کوتوال انگریز کمشنر کو کوئی جواب نہ دے سکا مگر پہنچے شاہ کی ثنائیہ میں کہنے لگا۔ "جناب! آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں مگر پہنچے شاہ بڑے عجیب آدمی ہیں۔ دادی ماں کہہ رہی تھیں کہ ٹھاکرجی کے اس انجام کی خبر پہنچے شاہ نے ہفتوں پہلے دے دی تھی۔"

انگریز کمشنر کو پہنچے شاہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا۔

"کوتوال! اسے میرے پاس لاؤ۔"

کوتوال نے دادی ماں سے کہا۔ "ٹھکرائن! پہنچے شاہ کو اپنے کمشنر صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

دادی ماں نے بے رخی سے جواب دیا۔ "اس سے کہو وہ یہیں آ کے شاہ صاحب سے بات کرے۔ میں شاہ صاحب سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ جایئے آپ کو کمشنر صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

کوتوال کو تامل تھا کہ وہ یہ بات کمشنر سے کس طرح کہے۔ مہابیر نے دخل دیا اور کوتوال سے کہا۔ "اگر آپ کو یہ کہنے میں تکلف ہو تو میں کمشنر سے کہہ دوں۔"

انگریز کمشنر نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ اٹھ کے پہنچے شاہ اور دادی ماں کے قریب چلا گیا۔

پہنچے شاہ اب بھی وہی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ "میرا کام ختم' میری دُنیا ختم۔"

کمشنر نے دادی ماں سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے' آپ اس کا مطلب سمجھیں؟"

دادی ماں نے جواب دیا۔ "ہاں میں ان کا مطلب سمجھ گئی۔ شاہ صاحب ٹھاکر کے ساتھ اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے اور اب ٹھاکر... کا سارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ گویا شاہ صاحب کی یہاں ڈیوٹی لگی تھی کہ ٹھاکر کے کام ختم کروا دیا جائے اور یہ جو آپ لوگوں نے ٹھاکر... اور اس کی کوٹھی کے خلاف کارروائی کی ہے اس کے پیچھے پہنچے شاہ کا غیبی ہاتھ موجود ہے۔"

کمشنر نے کہا۔ "ٹھکرائن! آپ کا بینا مارا گیا تھا لیکن آپ نے ایف آئی آر میں ٹھاکرجی کا نام نہیں لیا جبکہ انتظامیہ اور عدلیہ از خود کارروائی نہیں کرتی۔ اس بار آپ خود ہم سے ملیں اور درخواست کی کہ ہم ٹھاکر پرشوتم داس کے خلاف کارروائی کریں۔ اس کے بعد ہم نے اور پولیس نے ٹھاکرجی کے خلاف اتنا بڑا جال بچھایا اور اب آپ یہ فرما رہی ہیں کہ اتنی بڑی کارروائی کے پیچھے اس فقیر کا ہاتھ تھا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "تم انگریز لوگ ہماری بات نہیں سمجھو گے۔ کیا تم لوگ یہ نہیں سن رہے ہو کہ پہنچے شاہ بار بار کہہ رہے ہیں' اپنا کام ختم' اپنی ڈیوٹی ختم۔"

کمشنر مسکرایا۔ "اچھا دیوی جی' اب آپ اس فقیر سے پوچھیں کہ ٹھاکر... کہاں چلا گیا اور اسے ہم کہاں تلاش کریں؟"

دادی ماں نے بے دلی سے کہا۔ "جب تمہیں پہنچے شاہ کی روحانی قوت پر اعتبار ہی نہیں تو میں شاہ صاحب سے یہ کیوں پوچھوں کہ ٹھاکرجی کہاں ہیں اور کہاں ملیں گے۔"

کمشنر نے کوتوال سے کہا۔ "اس فقیر سے تم پوچھو کہ ٹھاکر... کہاں چلا گیا اور ہم اسے کہاں تلاش کریں؟"

کوتوال نے احترام سے پہنچے شاہ سے سوال کیا۔ "میاں جی! اپنے کمشنر صاحب پوچھ رہے ہیں کہ ٹھاکرجی کہاں چلے گئے اور کہاں ملیں گے؟"

پہنچے شاہ نے جھک کے کمشنر کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "تیرا بھی بستر گول' تیری قوم کا بھی بستر گول۔ فرنگی کا بستر گول۔ ٹھاکر... سمندری آدمی ہے' سمندر میں چلا گیا' مغل بادشاہ کی پناہ میں۔"

کمشنر نے دادی ماں سے کہا۔ "آپ نے فقیر کا جواب سن لیا اب اس کا مطلب مجھے سمجھائیں۔"

دادی ماں کو کمشنر کی باتوں سے تکلیف پہنچ رہی تھی' جواب دیا۔ "میں شاہ صاحب کی باتوں کا مطلب تو نہیں سمجھ سکی' جو تمہیں سمجھاؤں لیکن شاہ صاحب کے لفظوں کی صداقت پر مجھے یقین ہے۔"

کمشنر نے کہا۔ "بھلا سمندر میں ٹھاکر... کہاں جائے گا اور مغل حکومت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی۔ کوئی مغل بادشاہ ٹھاکر... کو کیا پناہ دے گا۔"

دادی ماں کمشنر کی باتوں سے کڑھ رہی تھیں۔

کمشنر نے کوتوال سے کہا۔ "اگر کوئی ہوش مند مجھ سے یہ کہتا کہ تیرا بستر گول' تیری قوم کا بستر گول تو میں اسے بند کروا دیتا۔ میری قوم کی حکومت اتنے وسیع رقبے پر ہے کہ اس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ یہ فقیر میرا بھی بستر گول کر رہا ہے اور میری قوم کا بھی۔"

○☆○

ٹھاکر... پرشوتم داس اور ان کے جرائم کی خبریں اخبارات نے خوب بڑھا چڑھا کے شائع کیں۔ ٹھاکرجی کی تصویریں چھاپی گئیں اور پولیس ٹھاکرجی کی تلاش میں سرگرم ہو گئی۔

رجنی کمار کو بھی بڑی شہرت ملی اور پہنچے شاہ کو بھی وہ شہرہ ملا کہ لوگ ان کی تلاش میں موہن پورہ پہنچنے لگے۔

ٹھاکر رتن لال کو بچا لیا گیا تھا۔ ٹھاکر رتن لال نے پولیس کی مدد کی تھی اس لئے ٹھکرائن کو اس پر آمادہ کرلیا گیا کہ تعلقے کی دیکھ بھال رتن لال کرے اور ٹھکرائن تعلقے کی مالکہ بن کے رہیں۔

پھکو کو پوچھ گچھ کے بعد اس لئے چھوڑ دیا گیا کہ اسے ٹھاکرجی کے کسی جرم میں شریک نہیں پایا گیا۔ پربھو اور جودھا کو انعامات ملے لیکن ٹھکرائن نے ان دونوں کو اپنے تعلقے سے نکلوا دیا۔

اناتھ آشرم کی عورتوں کو دوسرے دھرم شالاؤں میں منتقل کردیا گیا۔

رنبیرا اور اس کے ساتھیوں کو سزائیں ہو گئیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی قاتل نہیں ثابت کیا جا سکا۔

پہنچے شاہ مسلسل یہی کہتے پھر رہے تھے۔ "کمشنر کا بستر گول' فرنگی کا بستر گول۔ ٹھاکر... سمندری آدمی سمند رمیں ہے۔ وہ تو مغل بادشاہ کی پناہ میں چلا گیا' اکیلا رہے اکیلا۔"

برصغیر میں تحریکِ آزادی نے زور پکڑ لیا تھا اور گلی کوچوں اور بازاروں میں نعرے لگ رہے تھے "بٹ کے رہے گا ہندوستان' بن

کے رہے گا پاکستان۔"

○☆○

ٹھاکر... پرشوتم داس کو خطرات کا احساس ہوگیا تھا اور انہوں نے فرار کا منصوبہ بہت پہلے سے بنالیا تھا چنانچہ جب پولیس ان کی تلاش میں کوٹھی میں داخل ہوئی تو ٹھاکر جی نے پہلے تو راج نگر کے قصبے میں باغ والی کوٹھی سے وہ رقم لی جو ایسے ہی آڑے وقتوں کے لئے یہاں رکھی گئی تھی پھر ڈرائیور سے کہا۔ "مجھے اسٹیشن پہنچادے۔ میں الہ آباد جاؤں گا۔"

لیکن اس وقت اسٹیشن پر سیالدہ جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ٹھاکر جی اسی میں بیٹھ گئے اور نیسار کے راستے سیالدہ سے فرید پور اور پھر فرید پور کے قصبے راجباڑی میں قیام کیا۔

وہ مشرقی بنگال کے ان علاقوں میں اس لئے آئے تھے کہ یہاں کم پڑھے لکھے لوگ رہتے تھے اور ٹھاکر جی کی تلاش شمالی ہند میں یا جنوبی ہند میں ہوتی رہے گی اور ادھر کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔

ٹھاکر جی کی داڑھی بڑھ گئی اور شکل ایسی ہوگئی کہ اخبار میں چھپنے والی تصویروں کی مدد سے بھی ان کو نہیں پہچانا جاسکتا تھا۔

ٹھاکر جی اپنے بارے میں چھپنے والی خبروں سے باخبر رہنے کے لئے کلکتہ سے اخبارات منگواتے رہے مگر کلکتہ کے اخبارات کو... بولی کے واقعات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی کوئی مختصر سی خبر چھپ جاتی تھی۔ اس سے ٹھاکر جی کو اتنا ضرور معلوم ہوگیا کہ ہندوستانی پولیس ٹھاکر جی کو دہلی میں تلاش کررہی ہے کیونکہ مشہور بزرگ پہنچے شاہ نے کشف کو یہ بتایا تھا کہ ٹھاکر... پرشوتم داس مغل بادشاہ کی پناہ میں ہے۔ پولیس نے بادشاہوں کے مقبرے کی عمارتوں میں ٹھاکر جی کو تلاش کیا کہ شاید وہ یہاں کہیں مجاور بن کے بیٹھ گیا ہو۔ آگرہ، سکندرہ، دہلی اور لاہور کے مغل شاہی مقبروں کی عمارتوں میں ٹھاکر... پرشوتم داس کو تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں بھی نہ ملے۔

راج نگر میں چنو لال ہی چل بسے اور الہ آباد کے وکیل کو بھی نہیں بچایا جاسکا۔ کرشنا کماری بچالی گئی اور اسے رجنی کمار کی سفارش پر کوٹھی میں رہنے کو جگہ دے دی گئی۔ ٹھاکر... رتن لال نے اپنے حق کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے ششما سے شادی کرلی۔

رجنی کمار کو ٹھکرائن نے کوٹھی میں رکھا تو ضرور مگر اب وہ محتاط ہوگئی تھیں۔ اس کی مالی مدد بھی کی گئی اور اسے منشی کیدار ناتھ کے ساتھ لگادیا گیا۔

چونکہ رجنی کمار کو ایک عجیب و غریب صلاحیت حاصل تھی اسی لئے سبھی کو رجنی کمار سے دلچسپی تھی لیکن رجنی کمار پہنچے شاہ کا مرید ہوچکا تھا۔ وہ سوہن پورہ پہنچے... شاہ سے ملاقات کرنے پہنچا، مہاجر کا مہمان ہوا لیکن پہنچے شاہ سوہن پورہ میں موجود نہیں تھے۔ پانچ دن قیام کرنے کے بعد جب وہ راج نگر واپس جانے والا تھا تو اچانک پہنچے شاہ بھی حویلی میں داخل ہوئے۔ وہ دربانوں سے پوچھ رہے تھے۔ "بائیسکوپ والا کہاں ہے؟ بائیسکوپ والا کدھر ہے؟"

دادی ماں اور مہاجر نے آگے بڑھ کے پہنچے شاہ کا استقبال کیا۔ ان دونوں کے پیچھے رجنی کمار تھا اور رجنی کمار کے پیچھے مہاجر کی ماں۔ ان سب نے پہنچے شاہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں ہال میں لے کے بیٹھ گئے۔

اس وقت ان سب کو وہ دن یاد آئے جب ٹھاکر... پرشوتم داس یہاں آکے بیٹھے تھے۔

یہ گھرانا پہنچے شاہ کا بہت احسان مند تھا ورنہ دادی ماں کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ پرشوتم داس مہاجر کو بھی مروادیں گے۔ دادی ماں نے پہنچے شاہ سے درخواست کی۔ "شاہ صاحب! اب آپ کہیں نہ جائیں، ہمارے ساتھ اس حویلی میں رہیں۔"

شاہ صاحب نے مہاجر سے پوچھا۔ "تو اپنی بہن کو نہیں لایا؟"

اس عجیب سے سوال نے سبھی کو چونکا دیا لیکن رجنی کمار اس سوال کا مطلب سمجھ گیا اور دادی ماں سے کہا۔ "آپ راج نگر کے تعلقے سے کمہار کے گھر سے اپنی پوتی کو بلوالیں۔"

یہ بڑا تکلیف دہ حکم تھا جو دادی ماں اور مہاجر کے دل و دماغ کو لرزائے دے رہا تھا۔ ٹھاکر... پرشوتم داس کی بھانجی جس نے کمہار کے گھر پرورش پائی ہو وہ اس حویلی میں کسی طرح بھی قبول نہیں کی جاسکتی تھی۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا پھر پہنچے شاہ نے مہاجر سے بڑی شفقت سے کہا۔ "اپنی بہن کو لے آ، سوچ مت۔"

مہاجر نے کہا۔ "آپ کا حکم سر آنکھوں پر، میں کل ہی اسے لے آؤں گا۔"

دادی ماں نے پوتے کو گھورا تو پہنچے شاہ نے بڑبڑانا شروع کردیا۔ "بائیسکوپ ختم، بائیسکوپ ختم۔"

وہ رجنی کمار کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ اسے وحشت ہونے لگی۔ پہنچے شاہ نے کہا۔ "ظالم گیا، اب تو یہ کہا کہ ظالم گیا، بائیسکوپ ختم۔"

پھر پہنچے شاہ اچانک اٹھے اور ہال نما کمرے سے نکل کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دادی ماں نے پہنچے شاہ کے جانے کا کوئی اثر ہی نہیں لیا۔ انہوں نے مہاجر سے کہا۔ "میں شاہ صاحب کو راضی کرلوں گی۔ اس کمہار کی لڑکی کو اس حویلی میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

مہاجر نے سرکشی اختیار کی۔ "دادی ماں! آپ پہنچے شاہ کو کس طرح راضی کرلیں گی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ وہ آپ کی پوتی ہے، اسے اس حویلی میں ضرور آنا چاہیے۔"

دادی ماں غصے میں کھڑی ہوگئیں۔ "وہ یہاں نہیں آئے گی۔ میں نے کہہ دیا، وہ یہاں نہیں آئے گی۔"

اور دادی ماں ہال سے نکل گئیں۔

اسی رات کے پچھلے پہر دھواں دھار بارش ہوئی اور دور دور تک کا علاقہ جل تھل ہوگیا۔ ہر طرف بارش کی خوشی منائی گئی۔ رجنی کمار کی دو سال کی بارش نہ ہونے کی پیش گوئی پونے دو سال میں جھوٹی ہوگئی۔

مہاجر نے صبح دادی ماں سے کمہار کے گھر جانے کی اجازت مانگی اور کہا۔ "دادی ماں! ٹھاکر... پرشوتم داس ظالم تھے اور ان کے ظلم اور ناانصافی کی سزا سب نے اس طرح بھگتی کہ پونے دو سال تک بارش ہی نہیں ہوئی۔ اب آپ ٹھاکر... پرشوتم داس کی جگہ نہ لیں اور اپنی معصوم پوتی پر ظلم نہ کریں۔"

دادی ماں ٹھاکر... پرشوتم داس کی طرح آپے سے باہر ہوگئیں اور انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مہاجر کے کئی طمانچے رسید کردیے۔ "مجھے ظالم پرشوتم داس سے ملا رہا ہے، مجھے ظالم کہہ رہا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ اس پنچ کمہار کی بیٹی اس حویلی میں نہیں آئے گی۔"

مہاجر نے کہا۔ "دادی ماں! آپ نے مجھے مارا، ٹھیک ہے لیکن اپنی پوتی کو پنچ کمہار کی بیٹی نہ کہیں۔ اگر وہ اس حویلی میں نہیں آئے گی تو میں بھی اس حویلی میں نہیں رہوں گا۔"

اور مہاجر کمہار کے گھر سے اپنی بہن کو لانے کے لیے جانے لگا۔

پہنچے شاہ اپنے کمرے سے مہاجر کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ رجنی کمار نے بڑی مایوسی سے مہاجر سے کہا۔ "چھوٹے ٹھاکر! آپ ادھر جارہے ہیں تو مجھے بھی وہیں چھوڑ دیجئے گا۔"

رجنی کمار کو واپسی کے وقت مہاجر کی ماں اور دادی نے کوئی اہمیت ہی نہ دی اور رجنی کمار دونوں کو سلام کرکے اور جواب نہ پاکے باہر نکل گیا۔

مہاجر نے رجنی کمار کو برابر والی سیٹ پر بٹھایا لیکن گاڑی جیسے ہی اسٹارٹ کی، پہنچے شاہ گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ "میں بھی چلوں گا میں بھی چلوں گا۔"

مہاجر نے گاڑی روک دی اور رجنی کمار کو پچھلی سیٹ پر بھیج دیا اور اپنے برابر پہنچے شاہ کو بٹھالیا۔

دادی ماں اور ان کی بہو دونوں دور سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

جب گاڑی حویلی کے پھاٹک سے نکل گئی تو دادی ماں نڈھال ہوکے صوفے پر گر گئیں اور بہو کو قریب بلا کے کہا۔ "بہو! مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر میں نے شاہ صاحب کی بات نہ مانی تو حویلی اجڑ جائے گی لیکن میں پنچ کمہار کی بیٹی کو بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ مہاجر نے دھمکی دے دی ہے کہ اگر اس کی بہن حویلی میں نہیں رہے گی تو وہ بھی اس حویلی میں نہیں رہے گا۔"

مہاجر کی ماں کو ان معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیونکہ زمینداری اور حویلی کے معاملات کی ذمے داریاں دادی ماں نے سنبھال رکھی تھیں۔ اب جو کمہار کی پروردہ ٹھاکر... پرشوتم داس کی بھانجی کا مسئلہ اٹھا تو دادی ماں نے اس کو اپنی حویلی میں آنے سے روکا جبکہ پہنچے شاہ نے اسے حویلی میں لاکے رکھنے کا حکم دیا تھا۔ مہاجر کی ماں بھی دادی کی طرح اسے حویلی میں نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن پہنچے شاہ کے حکم کی وجہ سے وہ بھی مجبور ہوگئی تھی۔

○☆○

ٹھاکر... پرشوتم داس نے اخبارات کی خبروں سے یہ محسوس کرلیا تھا کہ پولیس ان کا پیچھا کررہی ہے اور انگریز کشمزان کو ہر قیمت پر گرفتار کرنا چاہتا ہے۔

ہندوستان میں ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی اس لئے وہ راجباڑی سے گوالندو گھاٹ پہنچے۔ ان کے سامنے دریائے برہم پترا بہہ رہا تھا مگر یہاں اس کا نام بدل گیا تھا اور اسے لوگ دریائے میگھنا کے نام سے جانتے تھے۔

ٹھاکر... پرشوتم داس نے دریائے میگھنا کے اس کنارے سے دوسرے کنارے کو دیکھا تو درختوں کی ایک لکیر سی دکھائی دی۔ دریا کا پاٹ بہت زیادہ تھا۔ ٹھاکر... پرشوتم داس نے اتنے چوڑے پاٹ والا دریا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہاں ایک اسٹیمر مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹھاکر جی بھی اس میں بیٹھ گئے۔ یہ اسٹیمر کرتا رکا تا چاندپور پہنچا۔ راستے میں جہاں بھی اسٹیمر رکا، وہاں مشینی موسیقی کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ تم تم مغنائی پیچنے والوں کی آوازیں تھیں۔

انہوں نے چاندپور میں اسٹیمر چھوڑ دیا اور ٹرین سے رنگون پہنچے۔ وہاں لال ڈگی کے قریب ایک ہوٹل میں چند دن قیام کیا مگر یہاں بھی گرفتاری کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ خوب سوچ سمجھ کے ہندوستان چھوڑنے کا منصوبہ بنایا اور پھر ایک بحری جہاز سے رنگون کا رخ کیا۔

جب وہ خلیج بنگال سے رنگون کی طرف جارہے تھے تو ٹھاکر... پرشوتم داس کو اچانک پہنچے شاہ یاد آئے جو ٹھاکر جی کو سمندری آدمی کہا کرتے تھے۔ اب ٹھاکر جی دریائے میگھنا سے خلیج بنگال تک سمندری میں سفر کررہے تھے۔

رنگون میں اترنے کے بعد وہ کسی ٹھکانے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہاں ہندوستان کے بہت سے تاجر خاندان آباد تھے۔ یہ کچھ دن تو ہوٹلوں میں بسر کرتے رہے مگر انہیں ہر ہر قدم پر یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی نہ کوئی ہندوستانی انہیں پہچان کے انگریزوں کے حوالے کردے گا کیونکہ انہیں بہت جلد یہ معلوم ہوگیا تھا کہ یہاں ہندوستان سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور ہندوستانی اخبارات میں ٹھاکر... پرشوتم داس کی خبریں بھی چھپ رہی ہوں گی اور تصویریں بھی۔ کوئی بھی ہندوستان سے آنے والا تاجر ان کو پہچان سکتا تھا اس لئے ٹھاکر کو ہوٹلوں سے بھی وحشت ہونے لگی۔ یہاں وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اسی پریشانی اور ادھیڑبن میں وہ ایک معمولی ہوٹل میں جو لب سڑک واقع تھا، بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ہوٹل کے سامنے ایک پریشان حال درویش اردو میں گانے لگا۔ اس کے چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے۔

اس کی آواز میں بڑا درد تھا اور لوگ اس میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ شخص گا رہا تھا۔

"جن کنین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگن بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں
ایسی انکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے
جن کی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلیاں تھیں
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاہ سے پلیاں تھیں"

آواز میں بڑا درد تھا۔ ٹھاکر کی کو اس میں کچھ اپنی آپ بیتی بھی محسوس ہوئی۔ ان کا دل بھر آیا اور چہرے میں گداز پیدا ہو گیا۔

لوگوں کو بڑا مزہ آ رہا تھا۔ انہوں نے اس درویش کو کچھ دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور ایک طرف چل دیا۔ ٹھاکر کی کو اس شخص میں کشش محسوس ہوئی۔

ہجوم میں کسی شخص کا بھی وہ حال نہیں ہوا تھا جو ٹھاکر... پرشوتم داس کا ہو گیا تھا۔ انہوں نے تو اس شخص کے درد بھرے کلام اور پُرسوز آواز کی وجہ سے کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

ہوٹل کا بیرا ٹھاکر کی محویت اور بے چینی کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ یہ بھی کوئی ہندوستانی ہندو تھا۔ اس نے ٹھاکر سے پوچھا۔

"صاحب! کیا بات ہے، کھانا تو کھالیں بہ"

ٹھاکر نے پوچھا۔ "یہ کون تھا اور کس کا کلام سنا رہا تھا؟"

بیرے نے پوچھا۔ "کیا آپ یہاں نئے آئے ہیں؟"

ٹھاکر کا دل دھک دھک کرنے لگا، جواب دیا۔ "ہاں میں سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔"

بیرے نے جواب دیا۔ "صاحب! کہتے ہیں کہ جب ہندوستان میں ستاون کا غدر پڑا تھا تو غدر کے ایک سال بعد انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں قید کر دیا تھا۔ آخری دنوں میں ان کے ساتھ ان کی بیوی زینت محل، پیارا بخت، اس کی بیوی اور ایک چھوٹی سی بچی بھی تھے۔ یہ شخص بھی اسی شاہی خاندان کا فرد ہے۔ یہ خود اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا لیکن لوگ بتاتے ہیں کہ یہ شاہی خاندان ہی کا کوئی فرد ہے اور اپنے دادا بہادر شاہ ظفر کا کلام سناتا رہتا ہے۔"

ٹھاکر... پرشوتم داس نے اس درویش کا پتا پوچھا۔ "یہ کہاں رہتا ہے؟"

بیرے نے جواب دیا۔ "صدر بازار کے قریب جہاں گھڑ دوڑ کا پرانا میدان ہے وہاں ایک سڑک کا نام ہے واکل روڈ، یہاں مسٹر ڈاسن کی بیتک کمپنی ہے۔ وہیں احاطے میں بادشاہ اور اس کی بیگم کے مزار ہیں۔ یہ درویش بھی وہیں مزار پر دیکھا جاتا ہے۔"

ٹھاکر... پرشوتم داس مذکورہ پتا پوچھتے ہوئے آخری مغل تاجدار کے مزار پر پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے کئی آدمیوں کو فاتحہ پڑھتے دیکھا۔ ٹھاکر جی کی وضع قطع سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔

دونوں قبروں کے قریب ایک چھوٹی سی کٹیا تھی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔ ایک مزار کے سرہانے بیری کا درخت لگا ہوا تھا۔

ٹھاکر جی کٹیا میں بیٹھ گئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ درویش اسی کٹیا میں رہتا ہے اور دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد وہ شام کو یہاں ضرور آئے گا۔

یہاں آ کے یہ احساس ہوا کہ انہیں اس کٹیا سے بہتر پناہ گاہ نہیں مل سکتی کیونکہ رنگون شہر میں آنے جانے والے ہندو ان کو پہچان سکتے تھے لیکن اس مزار پر صرف مسلمان ہی آ سکتے تھے اور مسلمانوں سے ان کو کوئی خوف نہ تھا۔

وہ شام تک درویش کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

مغرب سے ذرا پہلے توقع کے مطابق درویش آیا، دونوں قبروں کے سرہانے دو چراغ جلائے اور کچھ لوبان سلگایا اور پھر اپنی کٹیا میں داخل ہوا۔ یہاں ٹھاکر... پرشوتم داس کو دیکھ کے پوچھا۔ "دوپہر کو ہوٹل میں کھانا تم کھا رہے تھے؟"

ٹھاکر جی نے حیرت سے اس باخبر درویش کو دیکھا اور جواب دیا۔ "ہاں، آپ نے مجھے دیکھا تھا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "ہاں دیکھا تھا۔ فرنگی بہت بدلحاظ ہے۔ تیرا پیچھا کر رہا ہے؟"

ٹھاکر جی کو تو جیسے جان نکل گئی، گھبرا کے پوچھا۔ "میاں! میں کہاں جاؤں؟"

درویش نے جواب دیا۔ "تو یہیں رہ۔ اب تو آخری مغل بادشاہ کی پناہ میں ہے۔"

ٹھاکر... پرشوتم داس نے اسی کٹیا میں رکنا کیا۔

زمانہ بہت بڑا استاد ہے۔ یہ بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔ اگر ٹھاکر... پرشوتم داس کو انگریزی سرکار کا خوف نہ ہوتا تو وہ اس کٹیا میں ایک ساعت بھی رہنا گوارا نہ کرتے۔

یہاں انہیں اپنا تعلقہ یاد آتا، اپنے لوگ یاد آتے، اپنے جرائم، اپنی سخت گیری، اپنا غصہ، اپنا ظلم اور اپنے اختیارات سب ہی کچھ یاد آتا اور آخر میں پہنچے شاہ کا یہ فقرہ "کیلا رہے اکیلا" بڑی شدت سے یاد آتا۔

وہ رات کو انہی خیالوں میں گم رہتے اور درویش کبھی کبھی ان سے پوچھ لیتا۔ "خوش تو ہو۔ پریشان مت ہونا، تم تو صرف تعلقہ دار تھے۔ یہاں تو بادشاہ نے اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ صبر و شکر سے زندگی گزار دی۔"

ٹھاکر جی نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر انہیں اپنا ماضی بہت

ڈائجسٹوں کے مقبول ترین سلسلے (کتابی شکل میں)

منور 6 حصے (مکمل)
گمراہ 8 حصے (مکمل)
مجاہد 11 حصے (مکمل)
یوتا 35 حصے (جاری ہے)

طالوت 3 حصے (مکمل)
شاطر 2 حصے (مکمل)
مدیوں کا بیٹا 5 حصے (مکمل)
بازی گر 4 حصے (جاری ہے)

غلام رومیں (مکمل)
انا 2 حصے (مکمل)
سوہنا گھاٹ کا پجاری (مکمل)
اقابا 2 حصے (مکمل)

اسیر ہوس
سبز قدم
شیطان صفت
دست انتقام

نمک ویلیٹ کی چوریاں دو حصے

قیمت فی حصہ -/40 روپے
ڈاک خرچ فی کتاب -/16 روپے
بیرون ملک فی کتاب مع اخراجات
5 امریکی ڈالر

کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر 23
34، رمضان چیمبرز، ملیوریا اسٹریٹ۔
آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی 74200
فون نمبر 2628517 فیکس 2637960

شدت سے یاد آتا رہا۔

وہ اسی سوچ میں سو گئے۔ رات کے پچھلے پہر ان کی آنکھ کھل گئی۔ درویش نہایت درد بھری آواز میں اپنے دادا کا کلام گا رہا تھا۔

کون نگر میں آئے ہم، کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر کو، من میں اپنے ہراسے ہیں
دیس نیا ہے، بھیس نیا ہے، رنگ نیا ہے، ڈھنگ نیا
کون وہاں آنند کرے ہے اور رہتے کون اداسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسیرا، بیت گئی، وہ گئی تھوڑی سی
ان سے کہہ دو سو نہ جاویں نیند میں جو نمنداسے ہیں

ٹھاکری کی ہچکیاں لگ گئیں۔ وہ کلام سنتے رہے اور روتے رہے۔

صبح درویش نے ٹھاکری کو بتایا۔ "جو بیت گیا سو بیت گیا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ واپس جاؤ گے تب بھی کچھ نہیں ملے گا۔ فرنگی جا رہا ہے، اس کے ساتھ تعلقے داری بھی جا رہی ہے۔"

برصغیر میں تحریکِ آزادی زور پکڑ گئی تھی۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس متحدہ ہندوستان کی آزادی چاہتی تھی مگر مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ پیش کر کے بٹوارے کا مطالبہ کر دیا تھا اور مسلم اکثریت والے صوبوں میں پاکستان نام کی ایک علیحدہ مملکت حاصل کرنے پر بضد تھے۔ وہ اپنے مطالبے کی حصولیابی میں کامیاب ہو گئے اور چودہ اور پندرہ اگست انیس سو سینتالیس میں دو نئی مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ کانگریس نے ہندوستان کی آزادی حاصل کر لی اور مسلمانوں نے مشرقی اور مغربی دو بازوؤں پر مشتمل پاکستان نامی ایک نئی مملکت حاصل کر لی۔

ہندوستان نے آزاد مملکت میں جو اصلاحات کیں ان سے جاگیرداری، تعلقے داری اور زمینداری کا خاتمہ ہو گیا۔

انگریز ہندوستان سے چلا گیا، ملک کی کایا پلٹ گئی لیکن ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا، رنگون کے کٹیا نشین تعلقے دار کو اس کی تفصیلی خبریں نہیں مل رہی تھیں۔

انہوں نے انگریزوں کے خوف سے نہ صرف اپنے وطن سے منہ موڑ لیا تھا بلکہ انہیں اخبارات سے بھی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ آخری مغل تاجدار کی طرح ٹھاکر... پرشوتم داس نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

وہ جس درویش کے ساتھ کٹیا میں رہتے تھے اس نے ٹھاکر جی کو بہت متاثر کیا تھا اور اس کٹیا نے ٹھاکر جی کو سرنا پا قنوطی بنا کے رکھ دیا تھا۔ اس کٹیا کے باہر کی ہر شے سے ٹھاکر جی کو خوف آتا تھا۔

انہیں کٹیا سے باہر نکلنے میں یہی خطرہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ کہیں انہیں پہچان نہ لیا جائے کیونکہ رنگون میں بہت زیادہ ہندوستانیوں کی آمد تھی۔ چھ لال جی کے خاندان کا کوئی فرد، جو ٹھاکر جی سے واقف ہو، یہاں آ سکتا تھا۔ چھ لال جی کے جاننے والے بھی کاروباری تھے۔ ان میں سے کوئی فرد بھی ٹھاکر جی کو پہچان سکتا تھا۔

اسی طرح الہ آباد کے وکیل آنند نرائن کے حلقے کا کوئی شخص ٹھاکر جی کو شناخت کر سکتا تھا۔

موہن پورہ کے زمیندار مہاویر سنگھ کے عزیزوں یا واقف کاروں میں سے کوئی شخص رنگون میں ٹھاکر... پرشوتم داس کو دیکھ کر ہندوستانی انتظامیہ کو اطلاع دے کے ٹھاکر جی کو پکڑوا سکتا تھا لیکن مغل تاجدار کے مزار سے ملحق یہ کٹیا اس لئے بہت زیادہ محفوظ تھی کہ یہاں صرف کچھ درد مند مسلمان آخری مغل تاجدار کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آیا کرتے تھے۔ انہیں دنیا کے بکھیڑوں سے نہ تو کوئی دلچسپی ہوتی تھی اور نہ اس کا ہوش۔ یہاں آنے والے زائرین کے دل و دماغ پر دنیا کی بے ثباتی کے نقوش گہرے ہوتے تھے۔

اس طرح انہوں نے رنگون کی کٹیا میں ۱۹۵۴ء تک گزر بسر کی اور اس روز ان پر مایوسی نے سخت غلبہ کیا جب ان کی کٹیا کے رفیق درویش نے ان کو یہ بتایا کہ اس کی رنگون میں ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے اور اب اسے کہیں اور چلا جانا پڑے گا۔

اس کے بعد درویش واپس نہیں آیا۔ ٹھاکر جی اس درویش کا مدتوں انتظار کرتے رہے۔ مزار پر آنے جانے والوں میں سے کسی نے کٹیا میں پڑے ہوئے اس لاوارث شخص میں دلچسپی نہ لی جب اسے یہ معلوم ہوا یہ لاوارث شخص ہندوستانی ہے اور اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے واپسی کی مقدرت نہیں رکھتا تو ان کے لئے چندہ کیا گیا۔

ٹھاکر جی نے آخری وقت تک اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ وہ ہندو ہیں۔

انہیں ہندوستان پہنچا دیا گیا۔

لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن پر اترنے کے بعد انہیں یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آئی کہ یہاں سے وہ کہاں جائیں۔

اسٹیشن پر انہیں برسوں بعد براڈ گیج سے جڑ جانے والی ٹرین نظر آئی۔ اب اس ٹرین کا نام بھنڈا ایکسپریس رکھ دیا گیا تھا۔

ٹھاکر جی ڈرتے ڈرتے اس ٹرین میں بیٹھ گئے اور ٹرین کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔

برسوں بعد وہ جو منا نظر دیکھ رہے تھے اس کا دل پر کچھ عجیب اثر ہو رہا تھا۔ کبھی وہ ان راہوں میں تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس کی حیثیت سے سفر کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ نوکر چاکر ہوا کرتے تھے۔

راج نگر گو کہ اسٹیشن سے آٹھ دس میل دور تھا مگر اسٹیشن کا نام اسی قصبے کے نام پر رکھا گیا تھا۔

اسٹیشن پر اترنے کے بعد ٹھاکر جی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اب یہاں اسٹیشن سے راج نگر جانے کے لئے بسیں موجود تھیں۔ ان کا دل اب بھی دھڑک رہا تھا کیونکہ جس علاقے میں وہ کبھی سب سے زیادہ صاحبِ اختیار ہوتے تھے اور ان کے دبدبے کا یہ حال تھا

کہ لوگ ان کا نام سن کے کانپ جاتے تھے۔ آج وہ ایک گمنام اجنبی کی طرح اپنے علاقے اور اپنی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔

راستے میں کئی نئی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں۔ یہاں سکھوں کی شکلیں نظر آ رہی تھیں حالانکہ جب وہ یہاں سے گئے تھے تو اس علاقے میں ایک سکھ بھی موجود نہیں تھا۔

راستے میں کئی فیکٹریاں بھی نظر آئیں۔

بس نے ان کو راج نگر کے تھانے کے سامنے اتار دیا۔ اب تھانے کی عمارت کا حلیہ بھی بدل گیا تھا اور قصبے کی آبادی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

بس سے اترنے کے بعد ٹھاکر جی کچھ دیر سوچتے رہے کہ اب وہ کہاں جائیں۔

آخر کار انہیں اپنا راج نگر والا باغ یاد آیا۔ اس باغ میں انہوں نے پھکو کی بیوی پھول وتی اور منشی کیدار ناتھ کے لئے دو مکانات تعمیر کروائے تھے۔

وہ چھ لال جی کی حویلی کے سامنے سے گزرے تو یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ اب وہاں ایک چار منزلہ عمارت کھڑی تھی اور اس عمارت کے بالائی حصوں پر بہت سے کاروباری اداروں کے بورڈ آویزاں تھے۔

چھ لال جی کی یہ حویلی اپنے محلِ وقوع کی وجہ سے پہچانی جا رہی تھی۔

ٹھاکر جی نے ایک پان والے کی دکان سے ایک پان خریدا اور پوچھا۔ "یہاں کہیں چھ لال جی نامی ایک بہت بڑے بیوپاری رہا کرتے تھے، اب وہ کہاں ہیں؟"

پنواڑی نوجوان تھا۔ اپنے عمر رسیدہ چاچا کو آواز دی۔ "چاچا جی، یہ چھ لال جی کو پوچھ رہے ہیں۔"

چاچا جی پان کی ڈھولیاں ٹوکرے میں رکھ رہے تھے، دور ہی سے جواب دیا۔ "انہیں میرے پاس بھیج دے۔"

نوجوان پنواڑی نے کہا۔ "جب میں بچہ تھا تو چھ لال جی کو ٹھاکر... پرشوتم داس نے قتل کر دیا تھا۔ آگے کا حال چاچا سے پوچھو وہ بتائیں گے۔"

ٹھاکر جی، چاچا کے پاس گئے۔ چاچا کو دیکھتے ہی ان کا کچھ عجیب سا حال ہو گیا۔ یہ چاچا ٹھاکر جی کا رمضانی تھا جو ان کی بھی چلایا کرتا تھا۔

رمضانی نے ٹھاکر جی کو سرسری نظروں سے دیکھا لیکن اس لئے نہیں پہچان سکا کہ ان کی داڑھی مونچھ کے بال گنڈھ گئے تھے اور سر کے بال بھی بہت بڑھے ہوئے تھے۔

رمضانی نے کہا۔ "نئے معلوم ہوتے ہو۔ چھ لال جی کو تو بتیارے ٹھاکر... پرشوتم داس نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد چھ لال جی کا خاندان الہ آباد منتقل ہو گیا۔ ان کی یہ حویلی ایک شرنار تھی نے خرید کے بہت سے دفاتر بنوا دیے۔"

پھر اچانک رمضانی کو معلوم نہیں کیا خیال آیا کہ اس نے ٹھاکر جی کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کو چھ لال جی سے کوئی کام تھا؟"

ٹھاکر جی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ رمضانی انہیں ان کی آواز سے پہچان لے گا۔

ٹھاکر جی اپنے باغ کی طرف چل دیے اور رمضانی ان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

ٹھاکر جی کو اپنا باغ بھی نہیں ملا۔ باغ کا صفایا ہو چکا تھا اور اب اس مضافت علاقے میں بہت سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ انہی میں منشی کیدار ناتھ اور پھول وتی کے مکانات تھے مگر اب ان میں آباد دوسرے لوگ تھے۔

ٹھاکر جی کی وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ ان کا اپنے علاقے میں کوئی ٹھکانا نہیں تھا جبکہ رنگون میں ان کی ایک کٹیا تو تھی۔

وہ اپنی کوٹھی کی طرف گئے تو وہاں بھی باغ غائب تھا۔ ان کی کوٹھی کی جگہ ایک بہت بڑا تین منزلہ کالج کھل گیا تھا۔

اب ان کی وحشت عروج کو پہنچ گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ یہاں کے لوگ کہاں چلے گئے اور یہ کون لوگ ہیں جو یہاں آ کے آباد ہو گئے۔

وہ دوبارہ راج نگر واپس گئے اور اسی پنواڑی کی دکان پر پہنچ کے نوجوان پنواڑی سے کہا۔ "یہاں کسی تعلقے دار ٹھاکر... پرشوتم داس ہوا کرتے تھے اور ان کی یہیں کہیں کوئی کوٹھی بھی تھی۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

نوجوان پنواڑی گاہکوں کو پان لگا لگا کے دے رہا تھا۔ اس نے اچٹتی نظروں سے ٹھاکر جی کو دیکھا اور کہا۔ "پھر آگئے، ٹھاکر... تو میرے بچپنے سے غائب ہے۔ اس نے بہت سارے قتل کئے تھے۔ پولیس اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ایسا غائب ہوا کہ کسی کو کچھ پتا ہی نہ چلا۔ کہیں مر کھپ گیا ہو گا۔"

ٹھاکر جی کے جی میں آئی کہ وہ رمضانی سے بات کریں اور پوچھیں کہ سب کہاں چلے گئے لیکن رمضانی سے پوچھنے میں یہ خوف تھا کہ اگر اس نے پہچان لیا تو ٹھاکر جی کی بڑی ہتی ہو جائے گی اور ان کے دشمنوں کو خبر لگ گئی تو وہ بڑی آسانی سے ٹھاکر جی کی مٹی پلید کر کے رکھ دیں گے۔

وہ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے پنواڑی کی دکان سے جیسے ہی ہٹے، گلی کے نکڑ پر رمضانی نے ان کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر ٹھاکر جی کے پاؤں پکڑ لئے۔ "ٹھاکر جی! اتنے دنوں آپ کہاں رہے؟"

ٹھاکر جی کا بھی دل بھر آیا۔ اسے قدموں سے اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تو نے مجھے پہچان لیا۔"

رمضانی نے پوچھا۔ "آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟"

ٹھاکر جی نے رقت زدہ آواز میں جواب دیا۔ "میں اپنے وطن اور اپنے تعلقے میں پردیسی اور اجنبی ہوں۔ میرا کوئی گھر در نہیں۔"

رمضانی نے ٹھاکر جی کو اپنے ساتھ لیا اور اسی باغ والی آبادی میں لے گیا جہاں ٹھاکر جی نے پھول دتی اور منی کیدار ناتھ کو مکانات بنوا کر دیے تھے۔ اسی نئی آبادی میں رمضانی کا مکان تھا' دو کمروں والا۔ ایک کمرا اوپر بنا ہوا تھا۔

وہ ٹھاکر جی کو اوپری منزل میں لے گیا اور کہا۔ "آپ یہاں آرام کریں۔ آپ سے رات کو باتیں ہوں گی۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "یہ اس باغ کو کیا ہوا؟ اس کے درخت کس نے کٹوا دیے؟"

رمضانی نے کہا۔ "ٹھاکر جی! ملک آزاد ہوا تو ملک کے بیچھی حصے میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ہندو' مسلمان اور سکھ خوب خوب لڑے۔ بہت سے مسلمان پاکستان چلے گئے اور پاکستان سے سکھوں اور ہندوؤں کا ایسا ریلا آیا کہ اللہ اللہ۔ انہیں حکومت نے بھی آباد کیا اور آنے والے شرنارتھی خود بھی اِدھر اُدھر بس گئے۔ باغات کٹ گئے' ان کی جگہ بستیاں بس گئیں۔ تعلقہ داری' زمینداری ختم کر دی گئی اور لوگوں نے یا تو خود کھیتی باڑی شروع کر دی یا پھر اپنا روپیہ کاروبار میں لگا دیا۔"

رمضانی نے ٹھاکر جی کے لئے صراحی اور آبخورے کا انتظام کر دیا حالانکہ رنگون میں کٹیا کے قیام کے دوران میں ہندو مسلم چھوت چھات کا تصور کب کا ختم ہو چکا تھا لیکن رمضانی کو ان باتوں کا کچھ پتا نہ تھا اس لئے وہ ٹھاکر جی کے عقیدے کا احترام کر رہا تھا۔

اس نے ٹھاکر جی سے کہا۔ "یہ چارپائی پڑی ہے۔ شام کو میں آپ کے لئے نیا بستر لاؤں گا لیکن آپ کسی کے بھی کہنے سے اپنا دروازہ نہ کھولیے گا۔ ویسے میں نیچے سے بھی دروازے کو بند کر دوں گا۔"

اوپری کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ ٹھاکر جی پلنگ پر لیٹے لیٹے باہر کا نظارہ کرتے رہے۔ یہاں سے ان کی کوٹھی پر تین منزلہ تعمیر کیا ہوا کالج صاف نظر آ رہا تھا۔

اب ان کے پاس سوچنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ان کا ماضی تھا' یہ علاقہ تھا' مظالم تھے' اختیار و اقتدار تھا۔ بہت سے لوگ تھے۔ پھکو' رجی کمار' ٹھاکر رتن لال' ٹھکرائن۔ پتا نہیں وہ کس کس کو یاد کرتے رہے۔ بیس قریب ہی چتلا بھابی کی حویلی تھی جو اب غائب ہو چکی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان بارہ پندرہ سالوں میں بہت سے لوگ مر کھپ گئے ہوں گے اور ابھی ایسے لوگ بھی زندہ ہوں گے جو ٹھاکر جی سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ یہ لوگ ٹھاکر جی کو پہچان بھی سکتے ہیں' بالکل اسی طرح جس طرح رمضانی نے پہچان لیا تھا۔

رات کو رمضانی سبزی اور پوریاں لے کر آگیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر جی! برا نہ مانیے گا' بازار میں آپ کا بڑا تجا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی بڑے بڑے بالوں والا بوڑھا راج نگر کے بازاروں' گلی کوچوں اور ٹھاکر... پرشوتم داس جی کی کوٹھی کے آس پاس چکر لگاتے دیکھا گیا ہے۔ شکر کی بات یہ ہے کہ کسی نے آپ کو میرے اس کمرے میں داخل ہوتے نہیں دیکھا۔"

ٹھاکر جی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور پرانے ٹھاکر... پرشوتم داس ایک بار پھر گویا زندہ ہو گئے' رعب دار لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے' میں سب سمجھتا ہوں کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ میں بس ایک رات یہاں گزاروں گا اور صبح جب تو یہاں آئے گا تو میں تجھے نہیں ملوں گا۔"

رمضانی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ٹھاکر جی! جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں' آپ ہی کا ہے۔ ٹھکرائن نے میری اتنی مدد کر دی تھی کہ میں نے یہ چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے بھتیجے کو بیٹا بنا لیا اور اس کو پان کی دکان کروا دی۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "یہ سب کہاں چلے گئے؟ ٹھکرائن کہاں ہیں؟ رتن لال کیا کر رہا ہے؟ پھکو زندہ ہے یا مر گیا؟ منی کیدار ناتھ کا کچھ پتا نہیں' رجی کمار کہاں چلا گیا؟ میں ان سب سے ملنا چاہتا ہوں مگر کہاں اور کس طرح ملوں؟"

رمضانی نے جواب دیا۔ "ٹھکرائن اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئیں۔ ٹھاکر رتن لال نے حساب کتاب میں گھپلا کیا اور چوٹ دے کے بمبئی چلا گیا۔ رجی کمار کے بارے میں اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ الہ آباد میں کرشنا کماری کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی مادرائے عقل قوت آپ کے جاتے ہی چھن گئی تھی۔ اس کی قوت پہنچے شاہ نے چھین لی تھی۔ پھکو اور منی کیدار ناتھ اپنے مکان اور زمینیں بیچ کر پتا نہیں کن شہروں میں چلے گئے۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "یہ کرشنا کماری اور رجی کمار الہ آباد میں کس مکان میں رہتے ہیں؟"

رمضانی نے جواب دیا۔ "ٹھکرائن نے ان دونوں کی بھی مالی مدد کر دی تھی۔ اب پتا نہیں کہ رجی کمار الہ آباد میں کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے لیکن سنا یہی ہے کہ کرشنا کماری نے رجی کمار کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔"

ٹھاکر جی نے شنتما کماری کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ٹھاکر جی کے چلے جانے کے بعد بیمار پڑی اور مر گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ رتن لال نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے مار دیا۔

ٹھاکر جی نے یہ سب کچھ نہایت تحمل سے سنا لیکن اس وقت ان کی بہت بری حالت تھی۔ وہ انتہائی ضبط اور برداشت سے کام لے رہے تھے۔

رمضانی نے اپنے طور پر کہنا شروع کیا۔ "ٹھاکر جی! آپ اپنے مالک ہیں۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرے ساتھ رہیں۔ ویسے اگر آپ ٹھکرائن کے پاس گئے تو آپ کے سسرالی آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ موہن پورہ کے مہاجر سنگھ کو اگر پتا چل گیا کہ آپ یہاں آئے ہوئے ہیں تو وہ آپ کی بے بسی اور مجبوری کو دیکھ کر معلوم نہیں کیسا انتقامی

سلوک کرے۔"

ٹھاکر جی نے پوچھا۔ "موہن پورہ میں ایک پہنچے شاہ ہوتے تھے۔ آج کل وہ کہاں ہیں؟"

رمضانی نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! وہ تو بڑے غضب کے بزرگ تھے۔ ان کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے ہی کہا کرتے تھے کہ فرنگی چلا گیا تو لوٹ کٹ مر رہے ہیں تو جناب! واقعی آزادی کے ملتے ہی بہت خون بہا۔"

ٹھاکر جی کو پھر غصہ چڑھا۔ "رمضانی' میں تجھ سے پوچھتا کچھ ہوں اور تو جواب کچھ اور دیتا ہے۔ میں نے پہنچے شاہ کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہیں؟"

رمضانی نے جواب دیا۔ "پچھلے دنوں ان کا کچھ عجیب طرح انتقال ہو گیا۔ وہ مہاجر سنگھ کی حویلی کے باہر ایک کٹیا میں پڑے رہتے تھے مگر کبھی کبھی کئی کئی ہفتے غائب ہو جاتے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک شخص پہنچے شاہ سے ملنے آیا۔ پہنچے شاہ اس سے مل کے بہت خوش ہوئے۔ کہتے ہیں کہ پہنچے شاہ نے اس نئے شخص کا مہاجر سنگھ سے تعارف کروایا اور کہا کہ میری ڈیوٹی ختم ہو گئی' اب میری جگہ یہ ڈیوٹی دے گا۔ اس کا خیال رکھنا۔ مہاجر سنگھ ان کی باتوں کا کچھ اور ہی مطلب سمجھے مگر دو سرے دن سو کے اٹھے تو پتا چلا پہنچے شاہ گزر گئے۔ موہن پورہ والوں نے ان کا کفن دفن کیا اور اب پہنچے شاہ کی کٹیا میں پہنچے شاہ کا سمان رہتا ہے۔ وہ بھی عجیب بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اس کا بھی پہنچے شاہ جیسا حال ہے کہ کبھی تو وہ موہن پورہ میں نظر آتا ہے۔ کبھی جلالی پور میں دکھائی دیتا ہے۔ ویسے ٹھاکر... مہاجر سنگھ اس کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

ٹھاکر جی کا ماتھا ٹھنکا' پوچھا۔ "ان نئے صاحب کی کوئی خاص بات جو لوگوں میں مشہور ہو گئی ہو؟"

رمضانی نے جواب دیا۔ "ٹھاکر جی! یہ نئے بزرگ کلام اچھا سناتے ہیں' آواز میں بڑا درد ہے۔"

ٹھاکر جی نے رمضانی سے کہا۔ "اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ بس تو میرا ذرا سا ساتھ دے دے۔ یہ معلوم کر کہ یہ نئے بزرگ ان دنوں مہاجر کی حویلی کے باہر کٹیا میں موجود ہیں یا نہیں؟"

رمضانی نے کہا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اب تو بسیں بھی چلتی ہیں۔ صبح جاؤں گا' دو گھنٹے بعد واپس آ جاؤں گا۔"

بالائی کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ رمضانی کا بھتیجا بھی اوپر پہنچ گیا اور کمرے میں ٹھاکر جی کو دیکھ کر بہت حیران ہوا' کہنے لگا۔ "چاچا جی! یہ بڈھا یہاں کیا کر رہا ہے! یہ تو دن میں اپنی دکان پر بھی دو بار آیا تھا۔"

رمضانی نے ٹھاکر جی سے کہا۔ "آپ ابا دو ازہ بند کر کے سو جائیں۔" اور بھتیجے کو نیچے لے جا کے سمجھایا۔ "خبردار ان بڑے میاں کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

صبح کی پہلی بس سے رمضانی موہن پورہ گیا پھر دو گھنٹے کے اندر ہی واپس آ گیا اور اوپر جا کے ٹھاکر جی کو بتایا۔ "فوراً نکل چلیں' نئے شاہ صاحب کٹیا میں موجود ہیں۔"

ٹھاکر جی فوراً ہی رمضانی کے ساتھ بس میں بیٹھ کر موہن پو روانہ ہو گئے۔

جب یہ دونوں حویلی کے باہر کٹیا میں پہنچے تو اس وقت یہ شاہ صاحب نہایت پُرسوز آواز میں گا رہے تھے۔

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگن بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں

ٹھاکر جی کو ان نئے شاہ صاحب کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ وہ یہی کلام اسی درد بھری آواز میں رنگون میں بھی سن چکے تھے لیکن تیسرے شعروں کی یہ مختصر غزل جتنی یہاں حسب حال اور حسب کیفیت تھی اتنی رنگون میں بھی نہیں تھی۔

ٹھاکر جی کو لوگوں کی موجودگی میں شاہ صاحب کے پاس جانے میں تامل ہوا کیونکہ یہاں قدم قدم پہ پکی دھرکا لگا ہوا تھا کہ اگر انہیں کسی نے پہچان لیا تو اب وہ بالکل بے یار و مددگار تھے۔ نہ ان کے پاس نوکر چاکر تھے نہ گاڑی تھی اور نہ ٹھکانا تھا۔

انہوں نے رمضانی سے کہا۔ "جا اندر دیکھ' شاہ صاحب کے پاس کون کون موجود ہے۔"

رمضانی اندر گیا اور فوراً واپس آیا اور کہا۔ "فوراً اندر چلیں۔ اس وقت شاہ صاحب کے پاس صرف دو آدمی ہیں۔ میں انہیں چلتا کر دوں گا' آپ بات کر لیجئے گا۔"

ٹھاکر جی رمضانی کے ساتھ اندر گئے تو دونوں آدمی خود ہی باہر چلے گئے۔

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورسز | بیسک سٹینو ٹائپ اسٹینوگرافی | بیوٹی پارلر کورسز
اردو مڈل کورسز (آٹھویں جماعت) | ڈرافٹسمین | انٹیریئر ڈیزائننگ | ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
ریڈیو ٹی وی سی آئی انجینئرنگ | الیکٹریشن | کمپیوٹر | اسکول ٹیچنگ میتھڈ
انٹرمیڈیٹ ٹیکسٹائل | ٹوٹو گرافی | صحافت | امپورٹ ایکسپورٹ
فنڈامنٹل بینکنگ | شمسی توانائی | کوکنگ میکنگ | فلاور میکنگ
آئل پینٹنگ | میڈیکل ایڈ | ڈینٹل ٹیکنیشن | لیڈیز ٹیلرنگ
انٹیریئر ڈیکوریشن اینڈ آرٹ | پبلک ریلیشن آفیسر | نیوز ریڈر ٹرینر | مہر سازی
یہ تمام کورسز دو سو صفحات پر مشتمل تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پریکٹیکل نوٹس کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھیجے جاتے ہیں۔ کورس کی مکمل فیس بمعہ رجسٹریشن فیس صرف 1237 روپے ہے۔ کورس مکمل ہونے پر سند دی جاتی ہے۔ کورس میں داخلہ بھیجنا ہوتا ہے۔ جوابی لفافے کیساتھ خط لکھیں۔
اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس 1237 جی پی او اسلام آباد

ٹھاکر جی نے دیکھا شاہ صاحب سر جھکائے پُرسوز آواز میں رنگون والی غزل گانے میں مشغول تھے پھر جیسے ہی آخری مصرعے کے آخری دو لفظ ادا کیے' ٹھاکر جی نے آہستہ سے انہیں مخاطب کیا۔ "شاہ صاحب!"

شاہ صاحب نے چونک کے ٹھاکر جی کو دیکھا اور کہا۔ "ارے تو یہاں بھی آگیا اور بھول گیا کہ تو سمندری آدمی ہے۔"

ٹھاکر جی نے کہا۔ "شاہ صاحب! آپ تو مجھے کچھ بتائے بغیر ہی یہاں چلے آئے۔"

شاہ صاحب نے کہا۔ "میں نے تجھ سے کہا نہیں تھا کہ وہاں میری ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب میری ڈیوٹی یہاں لگی ہے۔"

ٹھاکر جی کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا' خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ "میرے لئے کیا حکم ہے۔ میں کہاں جاؤں؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "میں کیا بتاؤں کہ تو کہاں جائے۔ کیا تجھے حکم نہیں دیا گیا تھا کہ مغل بادشاہ کے پاس پناہ لے۔ تو وہاں کے سوا جہاں بھی جائے گا پکڑا جائے گا۔ کیلا رہے اکیلا' سمندری آدمی۔"

اسی وقت مہابیر اپنی دادی ماں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

اب ٹھاکر... مہابیر سنگھ کڑیل جوان تھا اور دادی ماں بہت زیادہ لٹ گئی تھیں۔

دادی ماں نے کہا۔ "شاہ جی' سنا ہے آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔"

شاہ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ٹھاکر جی وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ رمضانی ٹھاکر کی آڑ میں کر کے سامنے خود کھڑا ہو گیا تاکہ ان دونوں میں سے کوئی ٹھاکر جی کو پہچان نہ لے۔

مہابیر سنگھ نے کہا۔ "شاہ صاحب ہم بھی شہر جا رہے ہیں کیونکہ وہاں ہم نے کارخانے لگا لئے ہیں۔ اب یہاں نہیں رہیں گے۔ اس کو تڑوا کے مکانات بنوا دیں گے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ شہر چلیں۔"

شاہ صاحب ایک دم کھڑے ہو گئے اور کٹیا سے نکلتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہہ جو دیا' سمندری آدمی! میرا پیچھا چھوڑ اور مغل بادشاہ کی پناہ میں چلا جا۔ کیلا رہے اکیلا۔" اور شاہ صاحب کہیں غائب ہو گئے۔

دادی ماں اور ٹھاکر... مہابیر سنگھ برسوں بعد پہنچے شاہ کے چند کلمات ان نئے شاہ صاحب کی زبان سے سن رہے تھے۔

یہ دونوں تو ان شاہ صاحب سے کچھ اجازت لینے اور شاہ صاحب سے ساتھ رہنے کی درخواست کرنے آئے تھے مگر انہوں نے ان کی درخواست کا تو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایسا لگا جیسے وہ ٹھاکر... پرشوتم داس سے مخاطب ہوں۔

اسی سوچ بچار کے دوران میں مہابیر سنگھ کی توجہ رمضانی کی طرف گئی۔ وہ اسے سالوں پہلے ٹھاکر جی کی کوٹھی میں دیکھ چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ مسلمان ہے اور ٹھاکر جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ اس کے نام سے بھی واقف تھا۔

اب جو رمضانی کو دیکھنا چاہا تو معلوم ہوا وہ بھی جا چکا ہے۔

پھر اچانک رمضانی کے ساتھ آئے ہوئے وحشی بوڑھے کا خیال آیا تو دادی ماں سے پوچھا۔ "دادی ماں' ٹھاکر... پرشوتم جی کا گاڑی بان رمضانی کہاں چلا گیا؟"

دادی ماں نے محسوس کیا جیسے مہابیر کا دماغ چل گیا ہو۔ "کون رمضانی؟ کس گاڑی بان کی بات کر رہا ہے تو؟"

مہابیر سنگھ دادی ماں کو چھوڑ کے کٹیا سے نکل کے سڑک کی طرف بھاگا۔ وہاں ایک بس راج نگر کی طرف گرد اڑاتی جا رہی تھی۔

دادی ماں بھی کٹیا سے نکل کے اپنے پوتے مہابیر کو منہ لٹکائے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

اس نے قریب آتے ہی دادی ماں سے کہا۔ "دادی ماں' آپ مانیں یا نہ مانیں' رمضانی کے ساتھ وحشی بوڑھا ٹھاکر... پرشوتم داس تھا۔"

دادی ماں نے کہا۔ "تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔"

ٹھاکر... مہابیر سنگھ نے راج نگر جانے کی دادی ماں سے اجازت چاہی تو انہیں بہت ڈر لگا۔ انہوں نے مہابیر کو جانے سے روک لیا۔

یہ لوگ کئی ہفتے بعد شاہ صاحب کی واپسی کے منتظر رہے مگر وہ واپس نہیں آئے۔ غالباً وہ کہیں اور چلے گئے تھے۔

کافی دنوں بعد مہابیر رمضانی کو تلاش کرتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اس سے باتیں ہوئیں تو رمضانی نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر جی! اب ٹھاکر... پرشوتم داس کا ذکر نہ کریں۔ یہ سچ ہے کہ اس دن وہ حویلی کے باہر کٹیا میں شاہ صاحب سے ملنے گئے تھے کیونکہ وہ ان شاہ صاحب سے پہلے سے واقف تھے۔ انہوں نے ٹھاکر جی پھر وہیں چلے گئے جہاں انہوں نے پناہ لی تھی۔ کسی مغل بادشاہ کی پناہ میں۔"

ٹھاکر... مہابیر نے کہا۔ "یہ اپنے نئے شاہ صاحب کے ہو گئے؟"

رمضانی نے کہا۔ "اس دن میں ٹھاکر جی کے ساتھ تک گیا تھا۔ وہاں شاہ صاحب بھی موجود تھے اور یہ دہراتے پھر رہے تھے۔

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

اس کے بعد کسی کو بھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ داس نے کس مغل بادشاہ کے ہاں پناہ لی ہے۔ ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں اب ان کی کہاں ڈیوٹی لگی ہے؟

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام